دکن میں اُردو

دکن میں اُردو

یعنی

جُنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی

مؤلّف

نصیر الدّین ہاشمی

چوتھی بار۔ پاکستان ۱۹۵۲ء
۱۳۷۲ھ

پریس سویرا آرٹ پریس لاہور

تعداد ۱۰۰۰

قیمت عـ۱۰/

ملنے کا پتہ

اُردو مرکز
گنپت روڈ، لاہور

مکتبہ معین الادب
اُردو بازار، لاہور

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ چوتھی طباعت

زمانہ طالب علمی میں مضمون نگاری اور انشاء کی کوئی خاص مشق حاصل کئے بغیر تقریباً تیس سال پہلے "دکن میں اردو" کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا۔ ڈرتے ڈرتے جب اس کو اہلِ ملک کے سامنے پیش کیا گیا تو اس کو امید سے بڑھ کر قبول عام حاصل ہوا۔ اور چھ ماہ کے اندر پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔

دوسرا ایڈیشن کسی قدر ترمیم اور اضافہ کے بعد مکتبہ ابراہیمیہ نے شائع کیا۔ دوسرے اڈیشن کے شائع ہونے کے بعد سرکار عالی نے اپنی مشہور فیاضی اور علم دوستی سے رقمی صلہ عطا کرنا چاہا۔ مگر اس کی بجائے مؤلف کو ایک سال کے لئے یورپ کی روانگی زیادہ مناسب اور مفید معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس کی یہ درخواست سرکار عالی نے ازراہِ مکرمت منظور فرمائی۔ جس کے لئے میں عالی جناب مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت آن جہانی۔ جناب نواب سرامین جنگ بہادر مرحوم اور جناب نواب سرمسعود جنگ بہادر مرحوم کا شکر گزار ہوں۔

یورپ سے جو کچھ مواد فراہم ہوا اس کو "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے نام سے شائع کیا جا چکا اور پھر اس کے بعد دکھنی اردو کے متعلق جو کچھ مزید معلومات

فراہم ہوتی گئیں۔ اس کو بھی مختلف مضامین کی صورت میں ہندوستان اور دکن کے مشہور رسالوں میں شائع کر دیا گیا۔ اس طرح آج سے تیس سال کے بہ نسبت جبکہ "دکن میں اردو" کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تھا زمین آسمان کا فرق ہو گیا۔

"دکن میں اردو" ایک مستقل سعی و کوشش کا مقدمہ ثابت ہوئی، اور اس کے شائع ہونے کے بعد مختلف اصحاب ذوق اس موضوع کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اور اب نتیجہ یہ ہے کہ پرانے نظرئے بہت کچھ بدل گئے اور جدید معلومات کا بے حد اضافہ ہوا۔ اور اب یہ کتاب ایک جداگانہ صورت اختیار کر چکی ہے۔ بعض اہم ترمیمات کا بیان بے محل نہ ہوگا

۱۔ کتاب کی ترتیب بالکل تبدیل کر دی گئی ہے۔ سابق میں اردو کی ابتدا اور قطب شاہی و عادل شاہی اور مغلیہ اردو کی قدرے صراحت کے بعد صرف سلطنت آصفیہ کے زمانہ میں اردو کی ترقی کے چار دور قائم کئے گئے تھے۔

اب اردو کی ابتدا کے متعلق ضروری مباحث کے بعد بلحاظ ارتقاء تدریجی حسب ذیل سات دور قائم کئے گئے ہیں:-

پہلا دور	سنہ ۷۰۰ھ	تا	سنہ ۹۰۰ھ	بہمنی اردو
دوسرا دور	سنہ ۹۰۰ھ	تا	سنہ ۱۱۰۰ھ	قطب شاہی و عادل شاہی اردو
تیسرا دور	سنہ ۱۱۰۰ھ	تا	سنہ ۱۱۳۶ھ	مغلیہ اردو
چوتھا دور	سنہ ۱۱۳۶ھ	تا	سنہ ۱۲۲۰ھ	سلطنت آصفیہ اور اردو
پانچواں دور	سنہ ۱۲۲۰ھ	تا	سنہ ۱۳۰۱ھ	" "

چھٹا دور سنہ ۱۳۰۱ھ تا سنہ ۱۳۳۶ھ سلطنت آصفیہ اور اردو

ساتواں دور از سنہ ۱۳۳۶ھ تا سنہ ۱۳۷۰ھ "

۲ - سابق میں قطب شاہی اور عادل شاہی اردو کے بعد، مدراس وغیرہ کی آج تک کی حالت کے متعلق ایک فصل میں بحث کی گئی تھی اس کو حذف کر دیا گیا ہے اور "مدراس میں اردو" ایک مستقل کتاب شائع کر دی گئی ہے۔

۳ - ابتدائے اردو اور پہلے تین ادوار میں جدید معلومات کے لحاظ سے بہت کچھ اضافہ کیا گیا ہے۔ اس اضافہ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ سابق میں کل (۵۵) صفحوں میں جو بیان آیا تھا وہ اب کئی سو صفحوں پر پھیل گیا ہے۔

۴ - ابتدائی تین دور کی طرح آخری چار ادوار میں بھی اضافہ کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ کسی قدر کمی اور ترتیب میں بھی ترمیم کر دی گئی ہے۔

ہر حال بحیثیت مجموعی پہلے اور دوسرے اڈیشن کے مدّ نظر یہ چوتھا اڈیشن بالکل جداگانہ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور مجھے توقع ہے کہ کتاب کا یہ اڈیشن مزید تحقیق و کاوش کا ایک نیا زینہ ثابت ہوگا۔

مجھے ابتدا سے اس امر کا اعتراف ہے کہ میں کوئی محقق اور ادیب نہیں ہوں اور نہ شاعر و مضمون نگار۔ نہ عربی و فارسی کا منتہی ہوں، اور نہ انگریزی میں کوئی خاص ملکہ حاصل ہے۔ البتہ مجھے اپنی زبان کی خدمت کا شوق ہے اور اپنی استطاعت کے موافق تحقیق اور تنقید کے بعد اپنے معلومات پیش کر دیا کرتا ہوں۔ میں اس امر پر خدائے بزرگ و برتر کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ میں یہ قوت اور ہمت عطا فرمائی۔

آخر میں مرحوم وحید الدین سلیم کو یاد کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے اس
موضوع کا راستہ دکھایا۔

ہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دکن میں اُردو

یعنے

جنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اُس کی ترقی

مُقدّمہ

گلستانِ ہند کے شمالی چمن میں مغربی دروازوں سے باغبانوں نے آکر اُردو کا بیج بویا، گنگا اور جمنا نے آبیاری کر کے چھوٹے سے پودے کو اگایا اسی کے قریب قریب گلزارِ دکن میں بھی انہیں ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا۔ کرشنا اور گوداوری وموسیٰ درخت کے اگانے میں معاون ہوئیں۔ ہنوز شمالی چمن کا درخت بار آور نہ ہوا تھا کہ دکھنی پودا زمین کی عمدگی اور بر وقت آبیاری سے بہت جلد تر و تازہ، سر سبز و شاداب ہو گیا۔ لیکن قبل از وقت بار آوری سے پھلوں میں کثرت ہو کر زیادہ مٹھاس باقی نہ رہی۔

اسی اثنا میں ایک دکھنی باغبان نربدا کے اس پار جا پہنچتا ہے اور اپنے فن

زراعت دانی سے شمالی چمن کے درختوں کی پرداخت کرتا ہے۔ پرانی شاخیں قطع و برید کرکے چمن کی آراستگی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پھر تو تھوڑی ہی مدت میں چمن سرسبز اور درخت بار آور ہو جاتے ہیں۔ چمن نئے نئے گل بوٹوں سے اپنی بہار دوبالا کر دیتا ہے پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ بہار کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ خزاں اس کی جگہ لے لیتی ہے، باغ کے خوبصورت پھول مرجھا جاتے ہیں۔ درخت عریاں چمن تاراج اور باغباں برباد ہو جاتے ہیں۔

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن　　اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

جمنا کے ساحل کو ایسی حالت میں پاکر کچھ باغبان گومتی کے کنارے جا پہنچتے ہیں اور وہاں کے چمن کی آراستگی اور درختوں کی آبیاری میں مشغول ہو جاتے ہیں، مگر یہاں بھی ان کو قیام اور دوام حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ عرصہ تک ستلج کی وادی میں قیام کرنے کے بعد وہاں اپنی نشانیوں کو چھوڑ کر اپنے قدیم مامن و مسکن دکن کی طرف پلٹ آتے ہیں۔

یہاں کا چمن گو خزاں سے برباد نہ ہوا تھا، درخت پھلوں سے خالی نہ ہوئے تھے۔ پھول زمانہ کی نیرنگیوں کے باعث کملا نہ گئے تھے تاہم عمدہ مسالہ اور نئے مصلحوں کی ضرورت تھی تاکہ طرزِ جدید کے آلات اور نو ایجاد کھاد کو جو یورپ کے گلزاروں کی چمن بندی میں کارآمد تھے استعمال کریں۔ باغبانوں نے اس گر کو دریافت کرلیا اور نئے ساز و سامان کے ساتھ چمن کی آراستگی میں مشغول ہو گئے۔

صفحاتِ آیندہ آپ کو اس کی حقیقت سے بخوبی آگاہ کریں گے۔ اور میرے مافی الضمیر کو روشن کردیں گے، تاہم اس امر کا خیال رہے کہ میں نہ تو انگریزی سے واقف ہوں اور نہ عربی و فارسی سے کماحقہ آگاہ۔ مجھے اس امر کا دعویٰ نہیں کہ میں انشا پرداز یا مضمون نگار ہوں، نہ تو مجھ کو شاعری و سخن سنجی میں دخل ہے اور نہ شعر فہمی کا ذوق، ان تمام امور سے

لحاظ سے میری تالیف کا کیا رتبہ ہونا چاہئے خود ناظرین غور فرما سکتے ہیں۔

مگر اس میں شک نہیں میں نے تلاش و تجسس اور غور و مطالعہ کے بعد اس کو مرتب کرنے کی جسارت کی ہے۔ سب سے بڑی دشواری فراہمی مواد کی تھی۔ کیونکہ ایک امر کے دریافت کرنے کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ کرنا ضرور ہوتا تھا۔ مغربی ممالک کے پریس اس امر کا خاص انتظام رکھتے ہیں کہ جو کتاب طبع ہو اس کے مضامین اور جن جن امور کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہو اس کی فہرست مرتب کر کے کتاب کے ساتھ لگادی جاتی ہے جس کے باعث اہل مغرب جب کسی تصنیف یا تالیف کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے لئے فراہمی مواد میں دشواری پیدا نہیں ہوتی برخلاف اس کے ایشیائی افراد خصوصاً اہل ہند کے لئے یہ آسانی نہیں ہے کیونکہ یہاں عموماً ہر کتاب کے ساتھ فہرست کے نہ ہونے سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ مطلوبہ داخلہ کس صفحہ پر درج ہے۔ البتہ مغربی ممالک میں جو کتابیں عربی زبان کی شائع ہوتی ہیں ان میں یہ انتظام ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس خوبی سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ مصر اور بیروت میں بھی اس اصول کی پابندی ہوتی ہے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے مستند کتابوں سے لکھا ہے اگرچہ ابتدا میں میرا ارادہ ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مضمون طویل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ ایک کتاب کی سی صورت ہو گئی، اس کتاب میں میں نے ان اصحاب کے کلام کو بھی پیش کیا ہے جو دہلی نہیں تھے بلکہ یہاں صرف بود و باش اختیار کر لی تھی اور یہیں پیوند زمین ہوئے میں نے اس امر کو اس لئے جائز رکھا ہے کہ میرا اور غالب جن پر دہلی ناز کرتی ہے وہ درحقیقت دہلی کے نہیں تھے بلکہ آگرے کو ان کا وطن ہونے کی عزت حاصل تھی۔ لیکن انہوں نے دہلی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ اور دہلی ہی کے ہو رہے تھے۔ اس لئے وہ دہلوی شمار

ہو گئے۔ میر لکھنؤ میں آکر پھر نہ دہلی گئے نہ آگرہ، وہیں ان کا مدفن ہوا۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے میں نہ شاعر ہوں اور نہ سخن فہمی و سخن سنجی کا مدعی۔ پس جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں اپنی استعداد اور اپنی پسند کا لحاظ رکھا ہے۔ درحقیقت ہر شخص کا انتخاب اس کے مذاق کے مناسب ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کا مذاق یکساں نہیں ہو سکتا۔ کسی کو سوز و گداز پسند ہوتا ہے تو کوئی شیرینی و لطافت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ کوئی کلام کی سادگی کو پسند کرتا ہے تو کوئی رنگینی اور نزاکت کو۔ غرض یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک کا مذاق یکساں ہو۔ اگر ناظرین کو انتخاب میں کوئی سقم نظر آئے تو اس میں میرے مذاق کا قصور اور کمی ہوگی نہ کہ شاعر کا نقص۔

المختصر میری دو سالہ محنت کا جو کچھ ثمرہ ہے وہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے پیش ہے۔ فقط!

خاکسار

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد دکن

۷ صفر ۱۳۴۲ھ

جنوبی ہند میں اُردو کی ابتدا اور اُسکی ترقی

تمہید:- کوہ بندھیاچل کا جنوبی حصّہ بھی علم و ہنر کی ترقی میں دنیا کے اور کسی حصّہ ملک سے کم نہیں رہا۔ اس سرزمین نے بھی وہ وہ باکمال ہستیاں پیدا کیں جنہوں نے گلشن گیتی کے چمن کو رنگ برنگ کے علمی گل بوٹوں سے آراستہ و مزین کیا اور اپنی ظاہری ہستی کو نابود کرنے کے بعد بھی غنچۂ روزگار پر سرسبز و شاداب علمی گلشن اپنی یادگار چھوڑ گئے۔

ہندوستان کا مشہور مورخ فرشتہ اور فارسی کے نامور باکمال شاعر ظہوری نے یہیں عمر بسر کی۔ بلبل شیراز داستان ایران کو پیغام طلب کیا گیا، علاوہ ازیں سلطنت بہمنیہ کا مشہور مدرسہ جس کے کھنڈر اب تک بیدر میں اپنے بانی محمود گاواں کی یاد تازہ کرنے کے لئے موجود اور زبان عال سے گویا ہیں کہ میرا بانی تعلیم سے کیسا گہرا ذوق کیسی دلچسپی اور اصلاح قومی کے لئے کیسا بے چین دل رکھتا تھا۔

اسی کی خاک میں مولانا عبدالعلی بحر العلوم چشم و چراغ فرنگی محل آرام فرما رہے ہیں! در سرزمین دکن ہی کو اس امر کا فخر حاصل ہے کہ اردو کا نہ صرف پہلا شاعر اور مذہبی و علمی تصنیف کا موجد یہیں سے جلوہ نما ہوتا ہے بلکہ اردو زبان کی یونیورسٹی قائم ہو کر چار دانگ عالم میں اپنا غلغلہ بلند کرتی ہے۔

لہ سلطان محمود شاہ بہمنی نے خواجہ حافظ شیرازی کو طلب فرمایا تھا۔ مگر بعض وجہ سے وہ نہیں آئے۔ (فرشتہ)

اُردو کی ابتدا:- جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بود و باش اختیار کرتی ہے تو یہ امر ناگزیر ہے کہ بول چال اور کام کاج میں ایک کے الفاظ دوسرے کی زبان میں منتقل ہوں۔

ہندوستان ہمیشہ غیر اقوام کا آماجگاہ رہا ہے۔ آریہ قوم نے شمالی ہند پر حملہ کیا اور یہاں کے قدیم باشندوں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ ان لوگوں کی زبان تامل اوڑیا اور تلگو وغیرہ تھی۔ چنانچہ آج تک دکن میں یہ قدیم زبانیں مروّج ہیں۔ فاتحوں نے خیال کیا کہ عام شودروں (مفتوح) کی زبان سے اپنی زبان بلند پایہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے قواعد و اصول ترتیب دئے اور اپنی زبان کا نام سنسکرت رکھا لیکن ان کی سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے اور ہوتے ہوتے پراکرت زبان خود بخود پیدا ہوئی۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ پراکرت زبان ہی کل شاہی دفاتر اور دربار کی زبان ہوگئی۔ عام طور سے مذہبی کتب وغیرہ اسی زبان میں مرتب ہونے لگیں۔

لیکن تقریباً پندرہ سو سال بعد جب کہ راجہ بکرماجیت کے سر پر تاج شاہی آیا تو قدیم سنسکرت زبان کو پھر سے عروج حاصل ہوا اور وہ آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگی غرض اس طرح شاہی دربار امرا اور پنڈتوں کی زبان سنسکرت رہی مگر عوام میں وہی پراکرت مروّج تھی۔

پراکرت:- آج سے پہلے پروفیسر ویبر کی تحقیقات کی مدد سے چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان میں بیس سے زیادہ پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں جن میں سے پانچ زیادہ مشہور تھیں یعنی پالی۔ جین۔ مہاراشٹری۔ سورآسنی اور مگدھی۔

سورآسنی کا دوسرا نام برج بھاشا ہے۔ یہ زبان بہت وسیع علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک اس کی وسعت تھی۔ اردو زبان کا مخزن اسی برج بھاشا

کو قرار دیا گیا تھا مگر جدید تحقیقات کی رو سے یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔
اردو کی ابتدا کے متعلق اس وقت جو مختلف نظریے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔
الف۔ اس کی ابتدا پنجاب سے ہوئی۔
ب۔ اس کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔
ج۔ اس کی ابتدا دکن سے ہوئی۔
د۔ اس کی ابتدا دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی۔
یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی۔
سندھ کی اسلامی حکومت کا آغاز ۹۲ھ ؁ ۷۱۲ء سے ہو چکا تھا۔ اور صدیوں تک وہ یہاں حکومت کرتے رہے۔ حکومت کی رواداری اور ہندو مسلمانوں کے عام طور سے ملنے جلنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی تبادلہ خیالات کے مواقع پیدا ہو گئے۔ ان حالات کے مد نظر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج سے جو زبان بنی اس کا آغاز اسی مقام سے ہوا ہے تو غلط نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو تحقیقات ہوئی ہے اس کے لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ ان فاتحین کی اصلی زبان عربی تھی اس لحاظ سے جو زبان عالم وجود میں آتی وہ عربی اور سوراسنی سے مشترک ہوتی مگر چونکہ اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے اس لئے ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی۔ سندھ کے بعد مسلمانوں کی آمد سواحل ملیبار اور کرناٹک پر ہوئی شیوخ

عرب اور سرداران آل ہاشم تجارت اور تبلیغ دین کی دھن میں صدہا میل سمندر کی راہ طے کر کے پرامن طریقہ سے سواحل ہند پر پہنچے، اور اپنی کوشش وجد وجہد سے سواحل کے ہندوؤں میں خاص رسوخ حاصل کر لیا۔ اپنی ملنساری اور نیک مزاجی سے ان کے دلوں میں گھر کر لیا اور وہ سواحل سے گزر کر اندرونِ ملک میں دور تک پہنچ گئے۔ اپنی مسجدیں تعمیر کیں، اپنی حکومتیں قائم کیں۔ اپنے مذہب کی اشاعت کی اپنی تعلیم کی تلقین کی۔

مشہور و معروف مسلم سیاح ابن بطوطہ (جنہوں نے علائی فتح کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۷۴۳ھ میں ان سواحل کا سفر کیا تھا) کے سفرنامہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسلامی اثر ہمہ گیر تھا۔ اس کے بعض بیانات حسب ذیل ہیں:۔

الف۔ شہر بدپٹن[1] سے چل کر ہم فندرینہ[2] پہنچے۔ یہ بڑا شہر ہے۔ بازار اور باغات اس میں بکثرت ہیں۔ اس میں مسلمانوں کے تین محلے ہیں۔ ہر محلہ میں مسجد ہے اور جامع مسجد سمندر کے کنارے واقع ہے۔ (عجائب الاسفار ۲۹۱)

ب۔ وہاں سے چل کر ہم کالی کٹ میں پہنچے۔ مالابار میں یہ بہت بڑا بندر ہے یہاں کا راجہ سامری کہلاتا ہے۔ امیر التجار کا نام ابراہیم شاہ ہے وہ بحرین کا باشندہ ہے، اس شہر کا قاضی فخر الدین عثمان بھی بڑا سخی ہے۔ خانقاہ کا شیخ شہاب الدین گازرونی ہے۔ (صفحہ ۲۹۲)

ج۔ پانچویں دن ہم کنجی گری پہنچے .... مسلمان سوداگر بھی اس شہر میں بہت ہیں۔ ان میں سب سے بڑا علاء الدین آدجی شہر آدہ کا رہنے والا ہے۔

---

[1] کالی کٹ کے قریب بے پور کے نام سے موسوم ہے۔

[2] کالی کٹ سے سولہ میل شمال میں پندرانی کے نام سے موسوم ہے۔

اس شہر کا قاضی ایک فاضل ہے۔ مسلمانوں میں بڑا آدمی محمد شاہ بندر ہے۔ اس کا بھائی تقی الدین بڑا فاضل ہے۔ اس شہر کی جامع مسجد بھی عجیب ہے۔ خواجہ مند نے اس کو تعمیر کیا تھا۔ مسلمانوں کی اس شہر میں بڑی عزت ہے۔ راجہ کا نام تبردی ہے۔ وہ مسلمانوں کی نہایت عزت کرتا ہے۔ (صفحہ ۲۹۸)

۵۔ دوسرے دن صبح کو منورٹ[1] پہنچے۔ یہ شہر ایک بڑی کھاری پہ واقع ہے۔ اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگوری ہیں۔ انہوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی، فقیہہ اسمٰعیل جو کلام اللہ پڑھاتے ہیں اس شہر میں رہتے ہیں۔ وہ نہایت پرہیزگار خوش خلق اور فیاض ہیں۔ اس شہر کا قاضی نورالدین علی ہے ۔۔۔۔ یہاں کی عورتیں خوبصورت اور باعصمت ہوتی ہیں، سب کی سب حافظ قرآن ہوتی ہیں۔ اس شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے اور تیئیس مکتب لڑکوں کے ہیں۔ یہاں کا بادشاہ جمال الدین ہے۔ اس کو مالابار کے لوگ کچھ معین خراج دیتے ہیں یہ بادشاہ سلطان جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت ہے ہمیشہ باجماعت نماز پڑھتا ہے۔ جب میں اس کے پاس ٹھیرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلا لیتا تھا فقیہہ علی[2] اور فقیہہ سمٰعیل بھی موجود ہوتے تھے۔ (صفحہ ۲۷۹)

اب یہ امر خاص طور سے غور طلب ہے کہ جب مسلمانوں نے مدتوں دکن میں بود و باش کی اور حکومت قائم کی، تجارت کی، مذہب کی اشاعت کی، تعلیم دی۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا یہاں کے ملکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا۔ ہر وقت کام کاج خرید و فروخت میں ان سے سابقہ رہتا تھا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا، جو

---

[1] اس کو اب ہونور کہتے ہیں۔ احاطہ بمبئی میں شمالی کنڑا کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔

[2] یہ فقیہہ علی ملا علی مہائمی ہیں جو تفسیر رحمانی کے مصنف ہیں۔

دونوں غیر قوموں کے لئے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوتی۔ اس لحاظ سے جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے وہ بہت بڑی حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔ مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع آتے ہیں۔ اس لئے ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔

پنجاب کے مولد ہونے کے متعلق مولفت "پنجاب میں اردو" مولانا محمود شیرانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، مگر جب تک مسعود کا ہندی دیوان دستیاب نہ ہو ان کی تحقیقات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری[1] کی رائے ہے پنجابی زبان اردو کی ماں نہیں ہو سکتی بلکہ بہن ہو سکتی ہے۔

سندھ، دکن، پنجاب کے خارج ہو جانے کے بعد اب صرف دوآبہ گنگا وجمنا باقی رہتا ہے جو اردو کے مولد ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ماہران لسانیات یعنی پروفیسر موسیو جیولس بلاک۔ پروفیسر ٹرنر۔ پروفیسر بیلی۔ پروفیسر چیٹرجی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری کی تحقیقات کی رو سے اردو کا سرچشمہ وہ زبان ہے جو پنجابی اور برج دونوں کی ماں تھی[2]۔ یعنی پراکرت زبان جو مسلمانوں کی آمد کے وقت پشاور سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔

مسلمان فاتحین شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اول انھوں نے پنجاب میں قیام کیا مگر اس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک مغل اور افغان تھے جن کی زبان عام طور سے زیادہ تر فارسی تھی پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اس زمانہ میں یہاں "جدید ہندو آریائی دور کی پراکرت" زبان

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو ہندوستانی لسانیات۔ [2] ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات۔

بولی جاتی تھی، اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی، اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی۔

دکن میں اُردو کی ابتدا:۔ شمال کے فاتحین نے جب ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کرلی تو یہ نئی زبان بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس سرزمین برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رُخ کیا۔

اولاً علاء الدین خلجی کے ملک کافور نے دکن پر مسلسل حملے کیئے۔ ۷۱۰ھ میں راس کماری تک علائی علم پہنچ گیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا سیلاب محمد تغلق کے زمانہ میں اٹھا اور دکن میں جاکر رکا۔ محمد تغلق نے نہ صرف دکن پر فوج کشی کی بلکہ دیوگڑھ کو دولت آباد سے موسوم کرکے اس کو اپنا پائے تخت بھی قرار دے دیا۔ اس کے باعث نہ صرف فوجی اشخاص بلکہ اہل علم وفضل، اہل حرفہ اور تجار سب ہی دہلی چھوڑ کر دکن آگئے۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے دہلی کو مراجعت کی مگر ایک بڑے گروہ نے یہاں بود و باش اختیار کرلی۔

یہ فاتح اپنے ساتھ جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو ونما حاصل کرنے لگی کیونکہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے، یہاں نہیں تھی اس کے برخلاف شمال میں برج مروج تھی جو وہاں کے دیسی باشندوں کی عام زبان تھی، اس طرح یہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی۔ عام طور سے بدیسی اور دیسی دونوں نے استعمال کی۔ یہ بات واضح ہے کہ دوآبہ گنگا وجمنا اور دکن کے علاقوں میں بہت فاصلہ حائل ہے، دکن میں جدید زبان جب بولی جانے لگی تو مسافت کی دوری کی وجہ سے اس پر برج کا صرف وہی اثر باقی رہا جو سرزمین برج سے نکلنے سے قبل

اس میں قائم ہو چکا تھا۔

غرضکہ اس طرح اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور عام طور سے ہر شخص اسی کو بولنے لگا اور وہ کام کاج میں بھی آنے لگی۔

اُردو کے نام:- شمال میں اب تک اس جدید زبان کا کوئی نام رائج نہیں تھا مگر دکن میں وہ دکھنی کے نام سے موسوم ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ شمالی ہند میں بھی ریختہ اور اردو اور اردوئے معلی کے ناموں سے موسوم ہوئی۔ وہاں ان ناموں کی ابتدا کب سے ہوئی اس کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ چونکہ یہ امور ہمارے مبحث سے خارج ہیں اس لئے اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

دکن میں یہ زبان ہندی اور دکھنی سے موسوم رہی ہے۔ قدیم سے قدیم دکھنی شعرا اور مصنفین نے اس کو ہندی اور دکھنی کے نام ہی دئے ہیں۔ ۱۲۰۰ھ تک بھی دکھنی اور ہندی کا نام رائج تھا۔

وجہی کہتا ہے:-

دکھنی میں جوں دکھنی مٹھی بات کا — ادا نیں کیا کوئی اس دہات کا

(قطب مشتری)

ابن نشاطی کہتا ہے:-

اسے ہر کس کتیں سمجھا کوں توں بول — دکھنی کے باتاں ساریاں کوں کھول

(پھول بن)

رستمی کہتا ہے:-

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر — بولیا معجزہ یو کمال خان دبیر

(خاور نامہ)

نصرتی کہتا ہے :۔

صفائی کی صورت کی ہے آرسی   دکھنی کا کیا شعر ہوں فارسی

(گلشنِ عشق)

میراں یعقوب کہتے ہیں :۔

"اپنی حیات کے وقت منجے ارشاد کئے تھے جوں شمائل الاتقیا کتاب کون ہندی زبان میں لیاوے تا ہر کس کے تئیں سمجھا جاوے :"

(شمائل الاتقیا)

آگاہ المتوفی ۱۲۲۰ھ نے لکھا ہے :۔

ولے بعض یاروں کا ایسا ہوا   سو ہندی زبان یہ رسالہ ہوا

(رسالہ فرقہ ہائے اسلام)

دیگر

ہے دکھنی میں مجکوں مہارت بتی   کہ النصر منکم کہیئے نصرتی

قاضی بدرالدولہ المتوفی ۱۲۸۰ھ لکھتے ہیں :۔

"لیکن دیکھا کہ بازارِ علم کا بہت کاسد ہوگیا اور علم کے جاننے والے دنیا سے گزر گئے ...... تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا "

(فوائد بدریہ)

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ دکن میں اردو کا نام عام طور سے دکھنی اور ہندی تھا۔ اگرچہ یہاں ایک اور نام ریختہ کا بھی استعمال ہؤا ہے مگر اس کو سب سے پہلے ولی اورنگ آبادی نے استعمال کیا ہے :۔

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دے   رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

دکن میں زمانۂ ولی سے پہلے ریختہ صرف اس کلام کو کہتے تھے جس میں مصرعوں کے بعض ارکان واونادفارسی اور بعض دکھنی ہوتے تھے مثلاً

دیدم نظر بہروپ چو اس شوخ چکہ مستانہ را
گفتم بیا مندر منے روشن بکن کاشانہ را

چنانچہ کلیات شاہی سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ریختہ کے عنوان سے جو غزل لکھی گئی ہے وہ تمام تر اسی قسم کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح دکن میں اردو کا نام دکھنی رکھا گیا تھا اسی طرح شمالی ہند میں وہ پہلے پہل ریختہ کے نام سے موسوم ہوئی ہوگی اور ولی نے بھی اس کا استعمال اپنے سفر دہلی کے بعد کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دکھنی شعرا کے قطع نظر شمالی ہند کے شعرا نے لفظ ریختہ کو عام طور سے استعمال کیا ہے[1]۔

---

[1] میر صاحب فرماتے ہیں:۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے | معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

قائم کہتا ہے:۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ | ایک بات لچر سی بہ زبان دکھنی تھی

اثر کہتا ہے:۔

ریختہ نے یہ تب شرف پایا | جبکہ حضرت نے اس کو فرمایا

دکن میں اُردو نثر و نظم کی ابتدا

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب دکن شمالی ہند کی اسلامی حکومت میں شامل ہو گیا تو اسی وقت سے یہاں بول چال میں جدید زبان کا رواج شروع ہو گیا اور پھر جب محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنا مستقر حکومت قرار دیا تو اس میں اور ترقی ہوئی اور عالم و جاہل، امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ ہر شخص اسی دکھنی زبان میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ صاحب حال درویش بھی اسی زبان میں وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کے والد نے جن کا انتقال ۷۳۱ھ میں ہوا اپنا تخلص راجہ[۲] رکھا تھا جو آج تک شاہ راجو یا سید راجا کے نام سے مشہور ہیں۔

اسی طرح حضرت زین الدین خلد آبادی المتوفی ۷۷۱ھ کا آخری کلام "منجہ مت بلادہ" مشہور ہے۔

---

[۱] مشکواۃ النبوت (مخطوطہ کتب خانہ آصفی)

[۲] انڈیا آفس میں ایک فارسی دیوان ہے نمبر (۲۰۱۷) ایتھے بہت ممکن ہے کہ یہ دیوان آپ ہی کا ہو۔ مصنف کیٹلاگ نے کوئی صراحت نہیں کی ہے اور اصل مخطوطہ سے بھی کوئی مواد حاصل نہیں ہوا۔ دیوان بالکل مختصر ہے صرف (۱۷) ورق ہیں۔ سرورق پر لکھا گیا ہے "اشعار تصنیف راجا یہ ہندی"۔ مگر افسوس کوئی ہندی شعر مذکور نہیں ہے۔ سب فارسی غزلیں یا مثنوی ہے۔ تخلص کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:-

راجا کہ تماشائے جہاں سر عظیم است — اما چہ تواں کرد کہ ایں چشم نداریم

گفت راجا تا کُجا سلطان خوباں رخ نمود — صد ہزاراں سجدہ کردم حسن زیبا یافتم

بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو آپ کے مرید عرض کرنے لگے کہ وصیت کی جائے اور کوئی خلیفہ مقرر کیا جائے اس پر آپ نے پہلے تو منہ پھیر لیا اس کے بعد جب آپ کے ایک مرید خاص نصیر الدین بدہیری نے دوبارہ یاد دہانی کی تو اس وقت آپ نے فرمایا "منجہ مت بلادہ"[1]

دکھنی نثر کی ابتدا:۔ اس امر کا ابھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اردو احاطہ تحریر میں کب آئی مگر بلاخوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آئی اور چونکہ اس کی سرپرستی صاحب حال و قال درویشوں نے کی تھی اور وہی اس وقت کے مسلمان قوم تھے اور ان کے مریدوں کی تعداد صدہا بلکہ ہزاروں سے متجاوز ہوتی تھی اور پھر وہ مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اس لئے اکثر مرشد اپنے مریدوں کی تلقین اور تبلیغ کی غرض سے رسالے قلم بند فرمایا کرتے۔ چونکہ عام طور سے اب دکھنی زبان کا رواج ہو چلا تھا اس لئے اس زبان میں بھی اس قسم کے رسالوں کا لکھا جانا ناگزیر تھا۔

جدید تحقیقات کی رو سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی المتوفی ۸۲۵ھ وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس کی ابتدا کی اور معراج العاشقین اور ہدایت نامہ وغیرہ مرتب فرمائے[2] اس کی مزید صراحت آگے درج کی جائیگی اور نمونہ بھی دیا جائے گا

---

[1] روضۃ الاقطاب تاریخ خلد آباد مطبوعہ مصنف رونق علی مرحوم

[2] اگرچہ بعض اصحاب شیخ عین الدین گنج العلم المتوفی ۷۹۵ھ کے بعض رسالوں کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر یہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ اس لئے وثوق کے ساتھ اس کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

دکھنی کا پہلا شاعر اور نظم کی ابتدا

شاعری کا انسانی ترقی میں خاص حصہ رہا ہے اخلاق کی تہذیب اور تمدن کی اصلاح میں جو کارہائے نمایاں اس سے ظہور میں آئے وہ اور وسائل سے نہیں آئے نظم کے باعث ہی فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت و جنبش ہوتی ہے۔

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا نہایت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتدا ہوئی لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالمِ وجود میں آئیں ان میں اول نظم ہی کا رواج ہوا کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے۔ اسی لئے قدیم زمانہ میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلم بند ہوا کرتی تھیں سنسکرت میں عرفان حقیقی اور فلسفہ و حکمت کا اشراقی کام نظم کے ذریعہ ہی سے وابستہ تھا۔ زمانہ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا۔ سینکڑوں ہزاروں اشعار عرب یاد رکھتے تھے۔ دنیا میں عربوں کے سامنے کوئی قوم خلقی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اسی طرح فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لئے گئے اور شاعری کو بادشاہوں کی خلوت جلوت رزم بزم سے خاص تعلق رہا۔ شاعروں کی کافی طور سے عزت افزائی کی گئی اور انہیں ملک الشعرا کا خطاب دیا جانے لگا۔

مگر دکھنی زبان میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں نظم کی ابتدا نثر کے بعد ہوئی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریر کی ابتدا چونکہ ترجمہ سے ہوئی ہے اور نظم کے بہ نسبت نثر میں ترجمہ کرنا آسان اور سہل تھا اس لئے غالباً نظم کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ نثر سے ابتدا کی گئی۔

موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ دکن کے پہلے شاعر قرار پاتے ہیں۔ آپ کی شاعری کے متعلق آگے چل کر ہم

تفصیلی صراحت کریں گے۔

ایک اور امر بھی قابلِ اظہار ہے کہ دکھنی نظم میں کس صنفِ سخن سے ابتدا ہوئی۔ اس کے متعلق بھی گو تیقن کے ساتھ کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی مگر جہاں تک تحقیق کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکھنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلے بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے بعد رباعی، غزل، قصیدہ کا آغاز ہوا ہے۔

اردو کی ابتدا اور ارتقا کے لحاظ سے ہم حسب ذیل دور قرار دیتے ہیں:۔

پہلا دور	بہمنی اردو	سنہ ۷۴۷ھ	تا	سنہ ۹۰۰ھ
دوسرا دور	قطب شاہی و عادل شاہی اردو	سنہ ۹۰۱ھ	تا	سنہ ۱۱۰۰ھ
تیسرا دور	مغلیہ اردو	سنہ ۱۱۰۱ھ	تا	سنہ ۱۱۳۶ھ
چوتھا دور	سلطنت آصفیہ اور اردو	سنہ ۱۱۳۶ھ	تا	سنہ ۱۲۲۰ھ
پانچواں دور	” ”	سنہ ۱۲۲۰ھ	تا	سنہ ۱۳۰۱ھ
چھٹا دور	” ”	سنہ ۱۳۰۱ھ	تا	سنہ ۱۳۳۶ھ
ساتواں دور	” ”	سنہ ۱۳۳۶ھ	تا	سنہ ۱۳۷۰ھ

پہلا دور

۷۴۷ھ تا ۹۰۰ھ

بہمنی اُردو

ہم بیان کر چکے ہیں کہ علاء الدّین خلجی نے دکن کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا (۷۰۱ھ) اس کے بعد تیس سال سے زیادہ عرصہ تک جنوبی ہند شمالی ہند کے زیر فرمان رہا مگر محمد تغلق کے زمانہ میں امرائے دکن نے باہم اتفاق کر کے سلطان کے خلاف بغاوت برپا کر دی۔ دو سال کی جد و جہد کے بعد سلطانی لشکر کو ہزیمت ہوئی اور حسن خان المخاطب ظفر خان علاء الدین بہمن شاہ کے خطاب کے ساتھ دکن کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ تقریباً دو سو سال تک اس کے خاندان کے اٹھارہ شخص گلبرگہ اور بیدر میں حکمرانی کرتے رہے۔ مگر جب سلطنت میں ضعف آگیا تو مختلف صوبہ دار خود مختار ہو گئے اور اپنی جداگانہ سلطنت قائم کر لی اور ایک بہمنی سلطنت کے بجائے پانچ حکومتیں گولکنڈہ بیجاپور۔ احمد نگر۔ برار اور بیدر میں قائم ہو گئیں۔

سلطان علاء الدّین حسن اور اس کے کئی ایک جانشین نہ صرف علم دوست اور علم پرور تھے بلکہ خود بھی ذی علم تھے۔ ان کے زمانہ میں دکن علم و فن کا مرکز تھا۔ بیدر کا عظیم الشان کالج (مدرسہ محمود گاواں) جس کے کھنڈر آج تک اپنے بانی کا نام زندہ

رکھنے کے لئے موجود ہیں اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

عرب وعجم کے بڑے بڑے علماذی وقار اس خاندانی کے زمانہ حکمرانی میں دکن آئے تھے جن میں سے بعض یہ ہیں۔ علامہ تفتازانی کے شاگرد میر فیض اللہ انجو۔ محمود گاوزوانی۔ حسن گیلانی۔ ملا عبد الغنی۔ مفتی نجم الدین۔ شیخ آذری محمود گاواں۔ سید العلماء سلامت اللہ اوحدی۔ شمس الدین سامی۔ عبد الکریم ہمدانی۔ ملا نظیری وغیرہم[1]

بادشاہوں کی جود وسخا اور نوازش سے ہر مصنف و مولف سرفراز ہوتا تھا۔ دور دور کے اہل علم وفضل کو گراں بہا تحائف ارسال کرکے پیغام طلب جاتا تھا۔ خواجہ حافظ شیرازی بھی اس زمرہ میں شامل ہیں غرضکہ دکن کی علم وفن کی قدردانی خاص شہرت رکھتی تھی۔

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت یہاں عام طور سے دکھنی زبان کا رواج ہو چلا تھا اور روزمرہ بول چال میں یہی جدید زبان بولی جاتی تھی۔

سلاطین بہمنیہ نے اس زبان کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی اور اس کو سلطنت کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا[2]

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

[2] دکن کے مشہور مورخ فرشتہ نے اپنی تصنیف میں صاف طور پر ذکر کیا ہے کہ شاہی دفتروں میں "ہندی" زبان رائج تھی اور ہم نے اس امر کی صراحت کردی ہے کہ "ہندی" اسی زبان کا نام تھا جو مسلمانوں کے ساتھ آئی۔ اس کے علاوہ ہندی سے کسی اور دیسی زبان مرہٹی تلنگی یا کنڑی مراد نہیں لی جاسکتی۔ کیونکہ یہ زبانیں مختلف حصوں سے مخصوص تھیں اور ان کو عام طور سے سرکاری زبان قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس لئے حکمرانوں کو لازمی طور پر ایسی زبان اختیار کرنی پڑی جو مساوی طور پر سب باشندوں میں عام تھی۔

علمائے وقت نے اس کو کام میں لایا۔ تعلیم اور تبلیغ کا ذریعہ اسی زبان کو قرار دیا گیا۔ بزرگان دین اپنے مریدوں اور نومسلموں کے تزکیۂ نفس و مذہبی تعلیم و مسائل کو عام فہم بنانے کے لئے یہی زبان استعمال کرتے تھے اور اسی ضرورت سے تحریر میں بھی اس کو استعمال کرنا ضرور ہوا چنانچہ اس عہد کے جو نثر کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں وہ مذہبی تحریرات ہی ہیں۔

اس عہد کے چند مصنفین کا پتہ چلتا ہے ممکن ہے کہ آیندہ مزید تحقیقات اس میں اور اضافہ کر دے۔

حضرت سید محمد حسینی :- حضرت[1] سید محمد حسینی جو عام طور سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے مشہور ہیں ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے اور ۸۲۵ھ میں یہاں انتقال فرمایا۔

آپ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید اور خلیفہ تھے علم تصوف میں آپ کی متعدد تصانیف ہیں آپ کے مریدوں اور معتقدین کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ تبلیغ اور ہدایت کا سلسلہ جاری رہا کرتا۔ نماز ظہر کے بعد آپ طلبہ اور مریدوں کو علم تصوف حدیث اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے۔ اور پھر کلام اور فقہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جو لوگ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے ان کے لئے آپ دکھنی میں تقریر فرماتے اور انہیں کے لئے آپ نے اپنی تصانیف مرتب فرمائیں[3]۔

---

[1] بعض اصحاب شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو بھی شامل کرتے ہیں اور پہلا ناثر قرار دیتے ہیں۔ مگر چونکہ ہم نے ان کو دیکھا نہیں اور بعض وجوہ سے یہ رسائل ہنوز تحقیق طلب ہیں اس لئے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

[2] تذکرہ اولیائے دکن۔ [3] دیباچہ معراج العاشقین۔

آپ کے چند تصانیف کا پتہ چلتا ہے یعنی معراج العاشقین وہدایت نامہ اور رسالہ سہ بارہ۔ تینوں رسالے علم تصوف میں لکھے گئے ہیں افسوس ہے کہ ان رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم حاصل نہیں ہؤا مگر انہوں نے اپنی تصانیف کا سلسلہ گلبرگہ تشریف لانے کے بعد آغاز کیا ہے کیونکہ شمالی ہند کے قطع نظر دکن میں دکنی زبان کا رواج تھا عام وخاص اس زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ۸۱۵ھ و ۸۲۵ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جاسکتی ہیں۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"نبی کہے تحقیق خدا کے درمیان تے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیار کے اگر اس میں ستے یک پردہ اٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے سمجھو اور دیکھو یہ پردا۔ اندھیالے کے اوجیالے کے عارفان پہ ہے واصلان پر پردے نورانی۔ وے واصلان کا صفا پردا ہوتا ہے۔ محمد کا نور اے عزیزان اول ربوبیت کا پردہ سوائے تن جمالی جسم کے پردے کوانپڑے باج اس جمالی الوہیت کے پردے ممکن الوجہ د کون انپر سکے"

(معراج العاشقین)

سوال۔ ذاتی ایمان کونسا اور صفاتی ایمان کون۔

جواب۔ اکھنڈا حال ثابتی ہے۔ سو ذاتی ایمان وہ ہے ثابتی آتی اور جاتی ہے سو صفاتی ایمان۔

(رسالہ سہ بارہ)

معراج نامہ یا معراج العاشقین کا مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (بھارت) میں موجود ہے علاوہ ازیں تاج پریس کی جانب سے شائع بھی ہوگیا ہے۔ رسالہ

سرِ بارہ نواب عنایت جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔

خواجہ بندہ نواز کی نظم کے مختلف نمونے دستیاب ہوئے ہیں، جن کی یہاں صراحت کی جاتی ہے، آپ کا تخلص شہباز تھا۔

(۱) مختلف بیاضوں میں بعض بیماریوں کے نسخے اور بعض شعر آپ کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں :-

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھتا دسے — جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوی خودی اپنی خدا سات محمد — جب گھل گئی خودی تو خدا بن کوئی دسے

آنتوں بلبلہ آنتوں لوں — پنیں کے گھر جائے کون[1]

آنکھ کو بلبلہ دانت کوں لوں — حکیم کے گھر جادے کون

جتنا کاجل اتنا بول — اوس سے دونا گوند گھول
ذرا سی پھٹکڑی نمک لا تھوڑا — قلم جیسے جون تہ کی گھوڑا

سن تو سیانے میری بات — بولوں دارو ہیں کس دہات
جس کے منہ میں آدے باس — اس کی دارو سن مجھ پاس
جس کے منہ میں دکھتے دانت — ہلتے چلتے کٹے کٹے پات
وزن برابر سب کو تول — دارو جو دے یوں انبول
داتوں کارن مسی کر — خوبی کن تو دل میں دھر

---

[1] رسالہ النساء حیدرآباد ۱۳۴۰ھ مضمون سید تمکین کاظمی۔

زیرہ مرچیاں سنتوا سنوٹ کہتا اجلاے کر گھونٹ

نیسلا طوطہ دھنیا بھون اس میں ملا تو سیندالون

پان پلاس کے کاہنٹیاں آن ماپھل لوچن اور لوبان

جوں جوں لگا ئے پاوے سکہہ تجہ داتوں کا جاوے دکہہ[1]

(۲) مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اپنی تالیف "اردو کی ابتدائی نشو نما میں صوفیاء کرام کا کام" میں بعض نا ممکن نظمیں شائع فرمائی ہیں جن کو حضرت گیسو دراز سے منسوب کیا گیا ہے اس کے علاوہ آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج حیدر آباد کی مملوکہ بیاض[2] میں خواجہ صاحب کے نام سے حسب ذیل کلام درج ہے :-

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے

او پیو میرے جیو کا برمالیا ہے

اور معشوق بے مثال ہے نور نبی پایا

نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بہایا

اپسکوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا

---

[1] بیاض مملوکہ سید علی اکبر صاحب۔

[2] حیدر حسن صاحب کی یہ بیاض کسی بزرگ ابوالقاسم نصیر الدین کی ہے جو عالمگیر کے ساتھ ان کی فوج میں شامل تھے اور جہاں جہاں سے ان کو تصوف کا کلام ملا اسکو جمع کر لیا ہے یہ بیاض ۱۱۱۱ ہجری میں مرتب ہوئی ہے۔

کھڑے کھڑے پیو جیو ہیں اپس آپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھے پاوے
جنہہ دیکھے اوسی کوں اسے اور نہ بہاوے

کل شئے محیط ہے اسی کون پہچانے
جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت گم ہو رہے جیسی ہیں دیوانے

خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائی
جیو کا کہوں کتہ کھول کر دیا تکہ آپ دکھائی
دکھے سید محمد حسینی پیو سنکہ کہیا نہ جائی

دیگر

اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا   ذات تجلی ہوئیگی سلیس سپلو رنہ سیہرا

واحد اپنی آپ تھا ہیں آپ نجہایا
پر کتہ جلوے کارنے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دینے کر کاف نون بسایا

لولاک لما خلقت الافلاک خالق پالائے
فاضل افضل جتنے مرسل ساجد سجود ہو آئے
امت رحمت بخشش ہدایت تشریف پائے

مخفی ناؤں معشوق رکہ ظاہر شہبا نہ کلائے
عشق کے جیبنی چند ربند اپنی آپ دکھائے
الان کما کان پھر آپسیں آپ سمائے

دیگر

مشکل بازی عشق کی چھوٹے جیو کو انا ہو تو قبل ان تمو تو شاہد ہے معنا

اونچا مندر مہر عشق کا کوئی کیونکہ پاوے

چاروں میریاں جذبہ کرتو پے ہارتا اوے

جی سیس دیوے پانوں تل توبھی نا پاوے

دوئی دوئی تائی دور کر بیکٹ دا حد ہونا

چاروں کپڑے جسال کہ مجنوں ہو رہنا

پورا مفلس ہووے تو اسے کھیل جیت لانا

سو ہے عاشق شہباز ہے دوہوں جگ کہلارا

خواجہ نصیر الدین سائیاں نیت راکھے ہمارا

تسنکہ کھیل توں پند دعشق کے ہتسارا

(۳) چکی نامہ ۔ اس نظم میں بارہ بند ہیں، یہ مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے، ڈاکٹر سید محی الدین زور نے اپنی کتاب "تذکرہ اردو مخطوطات" میں اس کا تعارف کرایا ہے :-

دیکھو وا جب تن کی چکی پیو چاتر ہو کے سکی
سو کن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی کہے یا بسم اللہ اللہ ہو

الف اللہ اس کا دستا میانے محمد ہو کر بستا
پہنچی طلب یون کو دستا کہے یا بسم اللہ ہو ہو اللہ

دانے ہی سو چن چن لانا | شاید ہاتوں سے لے کر بہاو
شریعت سے چھلکی بہی | کہے یا بسم اللہ ہو ہو اللہ

الف اللہ اس کا بالوں | پیر مرشد صلک جبالو
پسو انا اس ہے جہانو | کہے بسم اللہ ہو ہو اللہ

لادم وجود باسن ہونا | اسی تو بہ ستی دہونا
ذات کی پانے سوآلی کو دہنا | کہے بسم اللہ ہو ہو اللہ

سید محمد اکبر حسینی:- خواجہ بندہ نواز کے فرزند سید محمد اکبر حسینی دہلی میں ۷۸۱ھ میں تولد ہوئے، بڑے عالم اور فاضل تھے، ۸۰۱ھ میں گلبرگہ آئے۔ ۸۱۰ھ میں باپ نے خلافت دی، مگر باپ کی زندگی میں ۸۲۳ھ میں انتقال ہوگیا۔ باپ نے خود غسل دیا، گلبرگہ میں دفن ہوا[۱]۔

آپ کو نثر اور نظم میں مہارت تھی، آپ کی ایک کتاب کا پتہ چلتا ہے جس میں نظم اور نثر دونوں موجود ہیں، یہ تصوف میں ہے، مولوی محمد باقی صاحب نے ایک تعارف کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے[۲]۔

نمونہ نظم اور نثر حسب ذیل ہے۔

"سنو اے سلمانوں طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے جیوں کا بھروسہ نہیں۔ موجب حکم حضرت علی کے عمل کرو۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] تذکرہ اولیا دکن عبد الجبار صفحہ ۹۹۶

[۲] مجلہ مکتبہ نمبر ا جلد ا اپریل ۱۹۲۰ء

عجلو بالصلوٰۃ قبل الفوت عجلو بالتوبۃ قبل الموت

یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سون آگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سون آگے۔ یعنی مرید ہوکر توبہ کرنا ہور کفر و ضلالت سوں آپس کو پاک کرنا۔ ایک کے تابع ہوکر خدا طلبی میں عاقبت کی راہ سنوارنا۔ اس باب میں حق سبحانہٗ تعالیٰ قرآن مجید میں کہا ہے اپنے حبیب کو خبر دیا ہے انا ارسلنٰک الخ ....

جس کوں پیر نہیں اسے دین نہیں جسے دین نہیں تو اسے بوج نہیں ہور جسے بوج نہیں اسے عشق نہیں ہور جسے عشق نہیں اسے صحبت نہیں ہور جسے صحبت نہیں اسے پیر نہیں۔ بے پیر ہو کر رہنا عین کفر ہے:

آپ کی نظم کا نمونہ یہ ہے:-

دھڑکہ زبان کوں اپنی پہلے پیر سوں بیان پہ
بولوں صفت خدا کی کر شکر میں زبان پہ
بے خدا ہے صفت اس اس کو نہیں نہایت
کرنے کو تس صفت تو نین مجھ زبان میں طاقت

بعد از ثنا خدا کی بھیجوں درود نبی پہ
بھی آل پہ .... اس کے اصحاب میں ....
بعد اس کے نام لے کہ نادر محی الدین کا
بولو بیاں سنو بو حاصل مراد دین کا

....

بے پیر جھاڑ بوٹے دارو جو لیا د ہا تو
ہرگز نہ کھائے اس کوں کر کھائے تو و دا در
بے پیر کے جو ہیں گے دارو جو کھا جیا کر
بے شک جیا تو جانو اس کو ہوا دو کافر
بے پیر ہیں گے دارو کھا کر اگر موا تو
ایماں سلب ہو تس پر مرتا ہے بے ایماں ہو
بے پیر کے جو ہنکا پانی طعام کھاوے
ہو گوشت سور کا اس کوں حرام پاوے

بے پیر جو ہوا تو نیں ہے درست اس پر — پڑنا نماز جنازہ تو ہوے گناہ اکبر
بالغ ہوا نہیں لگ نیں حکم اس پو جانو — بالغ ہوے کے بعد از ہو امر ہے سو مانو
بیٹے کوں باپ بولے بیٹا کہے پدر نئیں — ہونا مرید جلدی لے کر بجا امر نیں
بیٹے نے ماں سو کہنا اے مہربان مادر — ہونا مرید شتابی یک لحظہ نادرنگ کر

کوئی پیر پر فنا ہو کہنا ایس فنا ہو — پاوے مراد حق سوں جو کچھ طلب کرے سو
سو رگ ستی جو کہنا تو بو سخن عبس ہے — عاقل کے نیں اشارت انتاج بو سو بس ہے

اگرچہ یہ نظم اور نثر بہت صاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے زمانہ مابعد میں اس کے الفاظ شاید تبدیل ہو گئے ہوں

نظامی:- اسی دور کا ایک شاعر ہے۔ جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ) کے زمانہ میں موجود تھا۔ اس کے متعلق ہمیں بہت کم

لہ مجلہ مکتبہ نمبر ا شمار ا ماہنہ اپریل ۱۹۲۸ء۔

معلومات ہیں، صرف اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ سلطان کا درباری شاعر تھا، اس کی ایک مثنوی جو "کدم راؤ اور پدم راؤ" سے موسوم تھی ہم نے لطیف الدین ادریسی مرحوم تاجر کتب کے پاس دیکھی تھی۔ اور اسی زمانہ میں اس کے نوٹ اخذ کئے گئے تھے۔ ممکن ہے نواب سالار جنگ مرحوم کے مخطوطات میں موجود ہو۔

یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ جس کے ہیرو کدم راؤ اور پدم ہیں۔ افسوس ہے کہ پوری مثنوی کے مطالعہ کا موقع ہمیں نہیں ملا۔

اس مثنوی کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں موجود ہے۔ چنانچہ اس مثنوی کے چند صفحوں کے فوٹو ہیں، انجمن ترقی اردو پاکستان کے اخبار قومی زبان میں شائع ہوئے تھے۔

نظامی کو عہد بہمنیہ سے تعلق ہونے کا ثبوت حسب ذیل امور سے ملتا ہے :۔

الف۔ مثنوی میں اشعار ذیل موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بہمنی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنور	پرتیال میں سار کرتا ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا بہنگ	کنور شاہ کا شاہ احمد بہنگ

لقب شہ علی آل بہمن ولی ولی تھے بہت بدہ ندا کلی

ب۔ مثنوی میں مختلف عنوانات میں ایک عنوان حسب ذیل ہے :۔

"مدح سلطان علاؤ الدین بہمنی نور اللہ مرقدہٗ"

اس سے واضح ہے کہ علاء الدین بہمنی کا انتقال ہو چکا تھا اور اشعار ما قبل سے

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شہزادہ تھا۔

ج۔ زبان بھی نہایت قدیم ہے اس پر ابتدائی دکھنی کا بلا خوف اطلاق ہو سکتا ہے، اب تک قدیم سے قدیم جو بھی کلام دستیاب ہوا ہے اس سے بھی یہ نظم زیادہ ادق ہے۔

اب اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ یہ مثنوی کس سنہ میں لکھی گئی اس کے متعلق ہم کو مثنوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاء الدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے اور اس کا ولی عہد احمد تھا۔ خاندان بہمنی کے سلسلہ سے واضح ہوتا ہے کہ سوائے گیارھویں حکمران علاء الدین ہمایوں شاہ کے کوئی اور ایسا حکمران نہیں ہوا جس کا لقب علاء الدین ہو اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو۔ یہ احمد شاہ ثالث سنہ ۸۶۵ھ سے سنہ ۸۶۷ھ تک حکمران رہا ہے۔ اس لئے اس مثنوی کی تصنیف بھی اسی زمانہ میں قرار دینی چاہیئے۔

اگرچہ تاریخ فرشتہ میں احمد شاہ ثالث کا لقب نظام شاہ بہمنی لکھا ہے مگر جو سکے سنہ ۸۶۵ھ سے سنہ ۸۶۷ھ تک مضروب ہوئے ہیں ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک ہوا ہے۔

اس مثنوی کے اس عہد میں تصنیف ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شاعر بادشاہ کا مصاحب تھا اور اس کو دربار شاہی سے تعلق تھا اس لئے بہت ممکن ہے کہ شاعر نے اپنا تخلص بادشاہ کے لقب پر نظامی قرار دیا ہو

مثنوی حمد و نعت اور منقبت سے شروع ہوئی ہے اس کے بعد علاء الدین بہمنی کی مدح لکھی ہے۔ پھر اصل قصہ شروع ہوا ہے۔ حسب رواج قدیم اس میں عربی اور فارسی کے بجائے ہندی الفاظ زیادہ ہیں۔ اس کی زبان اس قدر مشکل ہے کہ اس کا سمجھنا دقت طلب

لہ اردوئے قدیم طبع ثانی صفحہ (۲۳) حاشیہ

ہے۔ بریں ہم اس مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی اپنے عہد کا باکمال شاعر تھا اور اپنے فن میں استادانہ مہارت رکھتا تھا۔ اس کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

حمد

گسائیں تھیں ایک دنہ جگ دوار — بردبرد نہ جگ تہیں دینہار
اکاس انچہ پاتال دھرتی تھیں — جہاں کچھ نہ کوئی تھا ہے تہیں

نعت

تہیں ایک ساچا گسائیں امر — سری ددی تیں جگ تو را دگر
بٹھایا امولک رتن نور دہر — کہ تی دیک بلکٹ کرن راج کر
امولک کلنت سیس سنسار کا — کدے کام نہ دھار کرتار کا
محمد جرم ادم بنیاد نور — دو بھی جگ سری دے پو ساد نور

مدح بادشاہ مرحوم:۔

بڑا شاہ و دشاہ جس شا جگ — دھین سیو تی جرم قسے پائے لک
نہیں شہ کیا شاہ رکھیں دہرن — گگن دل دہرت دل مسخر کرن
عطارد مسخر ہوا اسے قلم — مسخر کیا سور دے ہت علم
علم گار دکھن سوہ چل سرا چاؤ — طبل دھول برغون بدل تون بجاؤ
چمکنے لگی جب کتک ہبتر — چڑھاوا کیا دہرت آکاس پر
چمک بجلی تیون علم مجہ جیون — علم سنگ تون گرج گہن جیٹوتوں
شہنشہ بڑا الخ

کدم راؤ لکھیں دن دنہ آدہر — کہ رھن بات سن بات بک بت دھر

سینا تھاکی ناری دہری بہت جہند — سو ہیں آج دنیا تری جند بند
دھسی جہند جب ہیں دنیا جگ میں — نتی دیل بھئے تہن ھوی پر بارک ہیں
سجات ایک ناگن کجات ایک سانپ — اسنکت و تہی کھلیں لانب چانپ
جو کرنار مجکون کیا سوی داؤ — اسنکت کہ کیہوں دیکھ سکوں انباؤ

پدم راؤ بھیا جھسا کر دیں — کندل یہ راؤ بھا ہور سبر دین
کھیر اتیر موجہ چھیل رمیا تہااو مل — کمان ہو بر پانچہ کی پائے تل
اجا ببس باہر کیسی بکہ نبات — نہیون کوئی نبوی نہ ناکہ جاٹ
کہ توں ساج میرا گسائیں کدم — پدم راؤ تجہ پاؤ کیرا پدم
جہان توں رہے پاؤ ھول سر دیریں — ایس سار کی فکس تزای کردن

صدرالدین :- اس دور کے ایک اور شاعر صدرالدین ہیں، دراصل یہ ایک صوفی بزرگ تھے۔ حضرت بدرالدین چشتیؒ (متوفی ۸۳۱ھ) کے مرید اور خلیفہ تھے، اولاً ناسک میں قیام کیا اس کے بعد "بیری" میں سکونت اختیار کی ۸۷۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ اب بھی آپ کا مزار زیارت گاہ عام خاص ہے[1]۔

شاہ صدرالدین اپنے پیش رو اصحاب طریقت کے مطابق صاحب تصنیف تھے، چنانچہ ایک کتاب "کسب محویت" آپ کی تصنیف ہمدست ہوئی ہے، یہ تصوف میں ہے اور ۸۷۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے، اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[2]۔ اس کے

---

[1] اولیاء دکن عبدالجبار خاں حصہ اول صفحہ ۴۴۴۔

[2] تذکرہ اردو مخطوطات ڈاکٹر زور مخطوطہ نمبر ۱۔

علاوہ کئی تصانیف کا پتہ چلا ہے جو تصوف میں ہیں۔
"کسب محویت" میں روح، احدیت، محویت وغیرہ مسائل کو بیان کیا گیا ہے، نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

ناؤں لے اللہ محمد کا اول | کسب کا سب کو کہوں دو ہر محل
گوش جان سوں اب سنو صاحب یقین | کیا کہتا ہے نظم میں شہ صدرالدین
اولاً با نفس و دل قطب مثال | خواہش دانائی کا تو بوج حال
کامیاب کوں بیاں تے ہے راہ وصل | راہ الاتصال نو دا لفضل

صدرالدین تو کسب پر ثابت اچھے | صرف سون صفتوں کے تت ثابت اچھے

صدرالدین پل پل میں یوں بیکل ہوا | وصل بھی یک پل نجی میں حل ہوا

بس کر اے شہ صدرالدین راز کوں | دید میں دیدار پا آپس کوں کھوں

عبداللہ الحسینی:۔ اس دور کے ایک اور مصنف سید عبداللہ حسینی ہیں آپ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کے پوتے تھے۔ اپنے دادا کی طرح ارشاد اور ہدایت آپ کا مشغلہ تھا۔ احمد شاہ ثانی بہمنی (۸۳۵ھ تا ۸۶۲ھ) کے زمانہ میں موجود تھے۔ سید عبداللہ حسینی اپنے دادا کی طرح مقبول انام تھے۔ اپنے عہد کے اکابر صوفیا میں شمار ہے۔ آپ نے اپنے مریدوں کی ہدایت کے لئے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کی تصنیف "نشاط العشق" کا قدیم اردو (دکھنی) میں ترجمہ فرمایا تھا۔ اور اس کی شرح قلم بند کی تھی، بقول اسٹوارٹ (مصنف کیٹلاگ کتب خانہ

ٹیپو سلطان) اس کا ایک نفیس مخطوطہ کتب خانہ ٹیپو سلطان میں موجود تھا۔

افسوس ہے کہ یہ نایاب ہے، ہمیں یورپ میں دستیاب نہیں ہوئی، اور نہ دکن کے کسی کتب خانہ میں اس کا اب تک پتہ چلا ہے۔ اس سے اس کتاب کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی جا سکتی اور نہ نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

آذری :- حضرت سید محمد گیسو دراز کے بعد آذری کو دکھنی شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا چاہئے۔ تاریخ فرشتہ کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ آذری سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ) کے زمانہ میں ایران سے آکر بیدر دارالسلطنت بہمنی میں قیام کیا تھا اور سلطان نے اس کو ملک الشعرا بنایا تھا۔ آذری نے قصاید لکھے تھے اور سلطان نے سلطنت بہمنیہ کی تاریخ لکھنے کے لئے اس کو مامور کیا تھا۔ سلطان نے ایک محل بنایا تو آذری کے حسب ذیل شعر اس پر کندہ کئے گئے :-

حبذا قصر مشید کہ زفرط عظمت	آسمان سرۂ از پایۂ این درگاہ نیست
آسمان ہم نتوان گفت کہ ترک ادبست	قصر سلطان جہان احمد بہمن شاہ است

کہتے ہیں ایک مرتبہ سلطان کی نظران اشعار پر پڑی اور دریافت کیا کہ یہ شعر کس کے ہیں تو شہزادہ علاء الدین نے عرض کیا شیخ آذری کے طبعزاد ہیں۔ سلطان نے مسرت کا اظہار کیا۔ شہزادہ نے بادشاہ کو خوش دیکھ کر عرض کیا کہ آذری اپنے وطن کو جانا چاہتا ہے اگر اس کو اجازت دی جائے تو حج اکبر کا ثواب ہوگا۔ سلطان نے یہ سن کو حکم دیا کہ چالیس ہزار روپیہ آذری کو دے دیا جائے۔ جب اس قدر رقم آذری کے سامنے پیش ہوئی تو اس نے مسرور ہو کر کہا لا یحمل عطایا کم الا مطایا کم سلطان — یہ سن کر ہنسا اور بیس ہزار روپیہ اور دینے کا حکم دیا، اس کے ساتھ گراں بہا خلعت اور

پانچ غلام دے کر رخصت کیا، آذر ہر سال اپنی زندگی تک بہمنی نامہ کا تکملہ کرتا رہا۔ یہ بہمن نامہ دکھنی سلطان ہمایوں شاہ تک شیخ آذری کا لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد ملا نظیری اور ملا ساسی وغیرہ نے اس کا تکملہ کیا۔ بہمنی حکومت کے خاتمہ تک یہ کتاب مکمل ہوئی تھی۔

مصنف فرشتہ نے نہ صرف اس کو دیکھا تھا بلکہ اس سے استفادہ کیا تھا اور خصوصیت سے اس نے دکھنی کی صراحت کی ہے، چنانچہ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"القصہ بہمن نامہ دکھنی تا داستان سلطان ہمایوں شاہ بہمنیہ از شیخ آذری است وبعدہ ملا نظیری و ملا ساسی و دیگر شعرا تا انقراض دولت بہمنیہ ہر کدام کہ توفیق یافتہ اند داستان وحکایات شاہانِ دیگر را لاحق نمودہ در سلک نظم کشیدہ از ملحقات بہمنی نامہ شیخ آذری گردانیدہ اند"[1]

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ آذری نے بہمنی نامہ کو دکھنی میں لکھا تھا جو اب ناپید ہے۔

تبصرہ:۔ دور بہمنی کے یہی چند شعرا وغیرہ ہیں جن کا پتہ چلتا ہے، اس سے یہ امر پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتا ہے کہ اس دور میں دکھنی زبان، یا قدیم اردو بول چال سے گذر کر تحریر کی صورت میں آگئی تھی۔ نظم اور نثر دونوں اس زبان میں لکھے جاتے تھے، زیادہ تر تصوف کا رواج تھا، مگر ساتھ ساتھ افسانہ (عشقیہ) اور تاریخ کا موضوع بھی اختیار کیا گیا تھا۔ اگرچہ "بہمنی نامہ" ہمدست نہیں ہوا ہے، لیکن فرشتہ کی صراحت سے بخوبی واضح ہے کہ اس نے اس کو دیکھا ہے اور یہ

---

[1] تاریخ فرشتہ مطبوعہ صفحہ ۳۲۶ مقالہ سوم۔

کتاب دکھنی (قدیم اردو) میں قلم بند کی گئی تھی۔

جو نمونے نظم اور نثر کے ملتے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں ہندی کے الفاظ زیادہ ہیں، بحر اور قافیہ ردیف وغیرہ میں فارسی کا تتبع کیا جاتا تھا۔ اور اس زمانہ کی عام فہم زبان میں لکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ نظم میں عشقیہ داستان لکھنے کی ابتدا ہو چکی تھی، اور حقیقت کو افسانے کے طور پر لکھا جاتا تھا۔

دوسرا دور

سنہ ۹۰۰ھ تا سنہ ۱۱۰۰ھ

فصل اوّل

قطب شاہی اُردو

جب سلطنت بہمنی شکست ہو کر بیجاپور۔ گولکنڈہ اور احمد نگر وغیرہ میں سلطنتیں قائم ہو گئیں تو یہاں اردو کو اور زیادہ ترقی نصیب ہوئی کیونکہ سلاطین دکن کے محلوں میں ہندو رانیاں آئیں۔ والیٔ احمد نگر نظام شاہ اصلاً برہمن تھا۔ اسمٰعیل عادل شاہ کی ماں کوکنی تھی۔ سلاطین کی بے تعصبی سے ہندوؤں کو سلطنت کے عہدے بلا لحاظ مذہب عطا ہوتے تھے۔ انہیں حالات کے مدنظر شاہی دفتر بھی دکھنی زبان میں آ گیا تھا۔

قطب شاہی سلطنت کا بانی **سلطان قلی قطب شاہ** ہے جس نے سنہ ۹۱۶ھ میں خود مختار حکومت قائم کی اور گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا۔ اس کے بعد اس کے خاندان کے سات شخص حکمران ہوئے۔ سنہ ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب عالمگیر نے یہ سلطنت فتح کر کے مغلیہ قلمرو میں شامل کر لی۔

اس خاندان کے سلاطین کی فہرست حسب ذیل ہے :-

۱ - سلطان قلی	سنہ ۹۱۶ھ	سے	سنہ ۹۵۰ھ تک
۲ - جمشید قلی	سنہ ۹۵۰ھ	سے	سنہ ۹۵۷ھ تک
۳ - سبحان قلی	سنہ ۹۵۷ھ	سے	سنہ ۹۵۷ھ تک
۴ - ابراہیم قلی	سنہ ۹۵۷ھ	سے	سنہ ۹۸۸ھ تک
۵ - محمد قلی	سنہ ۹۸۸ھ	سے	سنہ ۱۰۲۰ھ تک
۶ - محمد قطب شاہ	سنہ ۱۰۲۰ھ	سے	سنہ ۱۰۳۵ھ تک
۷ - عبداللہ	سنہ ۱۰۳۵ھ	سے	سنہ ۱۰۸۳ھ تک
۸ - ابوالحسن	سنہ ۱۰۸۳ھ	سے	سنہ ۱۰۹۸ھ تک

یہ بادشاہ نہ صرف حکومت و جہانبانی میں شہرۂ آفاق ہو گزرے ہیں بلکہ علم و فن کے قدرداں اور خود بھی ذی علم تھے - نہ صرف شعر و سخن کی قدردانی کرتے تھے بلکہ خود بھی شعرگوئی کا کافی مذاق رکھتے تھے -

سلطان قلی کا زمانۂ حکومت سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے میدان جنگ میں بسر ہوا تاہم اس کا دارالسلطنت شعرا اور ادیبوں سے خالی نہیں تھا - ایک خاص محل "آتش خانہ" کے نام سے تعمیر ہوا جہاں شعرا اور ادیب جمع ہوتے اور سلطان ان کے کلام سے مستفید ہوتا تھا[1]

جمشید قلی کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی اس کے دربار کا ملک الشعرائ ملا محمد شریعت وقوعی تھا[2]

[1,2] - فرشتہ -

اس خاندان کا چوتھا حکمران ابراہیم قلی جہاں حکومت اور جہانبانی میں اپنا آپ نظیر تھا، وہاں علم و فن کے لحاظ سے بھی سرآمد روزگار تھا۔ بڑے بڑے علما اس کے دربار میں جمع تھے۔ گولکنڈہ علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مصنف تاریخ قطب شاہی نے جا بجا اس کی قدردانی علم و فن کی بڑی تعریف و توصیف کی ہے[1]۔

اس کے عہد میں دکھنی (قدیم اُردو) کو بھی خاصی ترقی ہوئی، کئی ایک نامور شعرا کا پتہ چلتا ہے جن میں سے فیروز، محمود اور وجہی مشہور و معروف ہیں۔

ابراہیم کے بعد اس کا فرزند سلطان محمد قلی تاج و تخت کا مالک بنا جس کا دورِ حکومت ترقی علم و فن کے لحاظ سے خاص طور سے مشہور ہے۔

سلطان کو فنونِ لطیفہ کا بہت شوق تھا۔ شعر و شاعری کا اس کو جو ذوق تھا اور نیز اس نے جو عمارتیں بنائیں اس سے بادشاہ کے ذوقِ لطیف کی کافی توثیق ہوتی ہے۔

اس کے عہد میں زبانِ اردو (دکھنی) کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ باکمال شاعروں نے مثنویاں لکھیں۔ وجہی، غواصی، احمد، خیالی وغیرہ اس کے درباری شعرا ہیں۔ سلطان خود بھی اردو کا زبردست شاعر تھا۔ اس کا کلیات ۱۰۲۵ھ میں مرتب ہوا ہے۔ جس کا ایک نسخہ اعلیٰحضرت حضور نظام کے شاہی کتب خانہ میں ہے۔ دوسرا ایک نسخہ جو کسی قدر ناقص ہے نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اسی مخطوطہ کو مرتب کر کے اب مجلس اردو مخطوطات نے شائع کر دیا ہے۔

سلطان قلی کا جانشین محمد قطب شاہ ہوا۔ اپنے پیشرو کی طرح اس کو بھی علم و فن اور شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی۔ خود بھی شاعر تھا ظل اللہ اس کا تخلص تھا۔ اس

---

[1] تاریخ قطب شاہی۔

کے زمانہ میں بھی اردو کو خاص ترقی ہوئی۔ غواصی۔ قطبی۔ ابن نشاطی۔ جنیدی وغیرہ اس دور کے نامور شعرا ہیں۔ ان کے علمی کارنامے موجود ہیں۔

اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اپنے باپ دادا کی طرح علم دوست اور علم پرور اور ارباب فضل و کمال کا قدردان تھا۔ نامی گرامی علمأ اور نامور شعرا اس کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ علامہ فہامی۔ مولانا نورالدفقی نوراللہ۔ قیصر وغیرہ فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ اور غواصی۔ ابن نشاطی۔ جنیدی طبعی۔ امین وغیرہ اردو کے مشہور شعرا ہیں۔ سلطان خود بھی شاعر تھا فارسی اور دکھنی میں اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ عبداللہ تخلص تھا۔ دیوان مرتب ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ سلطان عبداللہ کے بعد ابوالحسن سلطنت گولکنڈہ کا والی ہوا۔ اس کا تمام زمانہ لڑائی جھگڑوں میں گزرا اس پرآشوب زمانہ میں متعدد اردو مثنویاں لکھی گئیں اور شعرا نے غزل اور مرثیے لکھے بعض مشہور شعرا حسب ذیل ہیں:-

فائز۔ لطیف۔ نوری۔ شاہی۔ مرزا۔ غلام علی۔ سیوک۔ شغل وغیرہ۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے ۱۰۹۸ھ میں گولکنڈہ سلطنت دہلی میں شامل ہو گیا اور مغلیہ حکومت کا ایک صوبہ قرار پایا۔

قطب شاہی نظم

ذیل میں اس دور کے شعرا کی فہرست اور ان کی تصنیفات کی صراحت کی جاتی ہے:-

شمار	نام	تصنیفات	سنہ
۱	محمد قلی	کلیات	مرتبہ سنہ ۱۰۲۵ھ
۲	ظل آلہ		؟
۳	عبداللہ	کلیات	؟
۴	ابوالحسن	؟	؟
۵	فیروز	مثنوی (توصیف نامہ)	
۶	محمود	؟	؟
۷	وجہی	مثنوی قطب مشتری اور مراثی	سنہ ۱۰۱۸ھ
۸	خیالی	؟	؟
۹	غواصی	۱۔ مثنوی چندا لورک	قبل سنہ ۱۰۳۵ھ
		۲۔ سیف الملوک و بدیع الجمال	سنہ ۱۰۳۵ھ
		۳۔ طوطی نامہ	سنہ ۱۰۴۹ھ
		۴۔ کلیات	سنہ ۱۰۵۰ھ
		۵۔ مراثی	..
۱۰	احمد	مصیبت اہل بیت	؟
		لیلیٰ مجنوں	؟
۱۱	قطبی	تحفۃ النصائح	سنہ ۱۰۴۳ھ
۱۲	سلطان	دیوان	سنہ ۱۰۵۰ھ
۱۳	بلاقی	معراج نامہ	؟

۱۴	جنیدی	مثنوی ماہ پیکر	سنہ ۱۰۶۴ھ
۱۵	ابن نشاطی	پھول بن	سنہ ۱۰۶۶ھ
۱۶	طبعی	قصہ بہرام و گل اندام	سنہ ۱۰۸۱ھ
۱۷	اولیا	قصہ ابو شحمہ	سنہ ۱۰۹۰ھ
۱۸	خواص	قصہ حسینی	سنہ ۱۰۹۰ھ
۱۹	غلام علی	پدماوت	سنہ ۱۰۹۱ھ
۲۰	سیوک	جنگ نامہ	سنہ ۱۰۹۲ھ
۲۱	فائز	قصہ رضواں شاہ	سنہ ۱۰۹۴ھ
۲۲	لطیف	ظفر نامہ	سنہ ۱۰۹۵ھ
۲۳	فضل	محی الدین نامہ	؟
۲۴	نوری	مراثی	؟
۲۵	کاظم	مراثی	؟
۲۶	شاہی	مراثی	؟
۲۷	مرزا	مراثی	؟
۲۸	شاراجہ	تحفۃ النصائح	؟

اس زمانہ میں جو الفاظ بولے جاتے تھے وہ آج متروک ہیں ایسے بعض الفاظ درج کئے جاتے ہیں جو ان لوگوں کے کلام میں اکثر آتے ہیں :-

ہور بجائے اور ۔ سوں = سے	کان = کہاں	دسنے = نظر آنے
اجوں لگ = ابھی تک ۔ رخن = طرف	یاں = یہاں	پات = پتے

بہار = باہر	ہمنا = ہم کو	کوں = کو	سجن = معشوق
اس پو = اس پر	گگن = آسمان	بہوت = بہت	اتھا = تھا
تمن = تم کو	نین = آنکھ	کدھن = سمت جانب	جکوئی = جو کوئی
سمدر = سمندر	رسن = زبان	نیں = نہیں	منج = مجھ
وہ = وہ	بو = بہ	کنے = پاس	اہے = ہے

اگر بحیثیت مجموعی اس دور کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زیادہ تر مثنویوں کا رواج رہا، اور ان میں فرضی قصے منظوم ہوتے رہے۔ ان میں زیادہ تر فارسی کے ترجمے ہیں۔ لیکن ان ترجموں کو دکھنی شعرا نے بہت بڑی حد تک کمی و بیشی کر کے گویا اپنا لیا ہے، چند اچھی داستانیں بھی ہیں، مثنویوں کے ساتھ قصاید اور غزلیات، مرثیہ اور نوحہ بھی لکھتے رہے ہیں۔ مرثیوں کے متعلق ہم نے علیحدہ تفصیلی صراحت کی ہے۔

مثنویوں میں جو قصے منظوم ہوئے ہیں ان کا خاکہ مکمل ہے۔ تسلسل بیان قابل داد ہے۔ کردار نگاری، واقعہ نگاری اور وصف نگاری کے اچھے نمونے ان مثنویوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔

قصاید اپنی شوکت لفظی، طمطراق اور تخیل کی بلند پردازی کے لحاظ سے تعریف اور ستائش کے مستحق ہیں۔ مثنویوں کے مقابلہ میں ان کا ذخیرہ کم ہے، غزلیات میں تغزل ہے اور تصوف بھی، ان میں رنگینی اور تخیل کی بلندی، نازک خیالی کے ساتھ ساتھ اثر بھی پایا جاتا ہے۔ اگر زمانہ مابعد کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے تو صرف زبان کا فرق نظر آئے گا۔ خیالات اور تخیل وہی ہے جو زمانہ مابعد میں غزل کی جان بنے ہوئے تھے۔

نظم کے ساتھ نثر بھی اس زمانہ میں لکھی جاتی رہی اس میں تصوف اور اخلاق کے ساتھ داستان بھی لکھی گئی ہے "سب رس" اس دور کی نثر کا بہترین نمونہ ہے۔
اس تفصیل کے بعد ہم اب اس دور کے شعرا اور نثر نگاروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ:- محمد قلی قطب شاہ اردو کا اچھا شاعر ہو گذرا ہے۔اس کا کلیات جس کو اس کے بھتیجے محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا ہے۔ اعلیحضرت حضور نظام کے شاہی کتب خانہ میں موجود ہے۔ اور سالار جنگ کے کتب خانہ میں بھی اس کا نسخہ ہے۔ اب ڈاکٹر زور نے اس کو اپنے طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

اس کلیات کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے رسالہ اردو[1] میں کافی بحث کی ہے۔ مولوی صاحب کا یہ مضمون بہت دلچسپ ہے۔ اس سے پیشتر سلطان محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کی کیفیت اور ان کے کلام کے نمونے تذکرہ شعرائے دکن[2] مولفہ مولوی عبدالجبار خان صاحب ملکاپوری مطبوعہ ۱۳۲۹ھ میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کریم الدین کے طبقات الشعرا میں بھی سلطان محمد قلی کی شاعری کا ذکر ہے مگر نمونہ کلام نہیں دیا گیا ہے۔

کلیات محمد قلی میں سارے اصناف سخن۔ مثنویاں۔ قصیدے۔ مرثیے۔ غزل ترجیع بند اور رباعیات سب کچھ شامل ہیں۔اس کا تخلص قطب شاہ اور معانی تھا۔ جو کلیات شائع ہوا ہے اس میں بہت سا کلام نہیں ہے۔

سلطان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ایک فطرتی شاعر

---

[1] رسالہ اردو جلد ۲ نمبرہ بابت ۱۳۴۰ھ   [2] صفحہ ۱۲۱۔

تھا۔ اور ہر موضوع پر نہایت کامیاب طبع آزمائی کرتا تھا۔ آج کل کے عشقیہ کلام سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ اس کا دیوان بھی وہی گل و بلبل شاہد و ساقی کی پرانی داستان کا دفتر ہے۔ البتہ اس زمانہ کا لحاظ کرتے۔ اس کی زبان وہ نہیں ہے جو داغ و ذوق کی زبان ہے۔

مثنویاں متعدد عنوانوں پر لکھی ہیں، کسی میں پھلوں کا ذکر ہے تو کسی میں سبز ترکاریوں کا بیان کسی میں شکاری پرندوں کا ذکر ہے تو کسی میں رسم و رواج تیوہاروں اور شاہی محلوں کا بیان ہے۔ عید، نوروز، بسنت، مرگ، موسم برسات وغیرہ پر بیسیوں نظمیں ہیں۔

کلام میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی آمیزش بھی کافی ہے، فارسی کے برخلاف اس نے ہندی کے اسلوب بیان کو اختیار کیا ہے۔

ذیل میں اس کے ہر قسم کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

باغ محمد شاہی کی تعریف میں قصیدہ

محمد ناوں تھے بستا محمد کا اے بن سارا
سو طوباں سوں سہاتا ہے جنت نمنے چمن سارا

دسے فانوس کے درمیانے تھے جوں جوت دیپو یکا
سو تیوں دنسا دو الاں میں تھے میویاں کا بدن سارا

پھبے دم عیسوی انم چمن میں گل لگانے تیں
ہجے نہالاں کے جلوے تیں شاطا ہو یون سارا

مٹر کسے باغ کوں دیکھت کھلے منج باغ کے غنچے
سو اس غنچے کے باساں تھے لگیا جگ مگمگن مارا

چمن سے پھول کھلتے دیکھے سکیاں کا مکہ یاد آیا
سہاتا تھا محمد پھل نمن ان کا نیں سارا

دسے نارنگ کلی جنبا پہوان ڈپات میں تس کے
بھنور تل دیکھ اس جاگا ہوا حیران من سارا

سو خوشے دالکھ لاکھاں کے ثریا سلسلا ہے جیوں
سہے اس راکھ منڈوا سو جیسا سبز کہن سارا

اناراں میں سہے دانے سو جیوں یاقوت تیلیاں
ہر ایک پھل اس اناراں پہ سہے سکے نمن سارا

کھجوراں کے دسیں چھونکے کہ جیوں مرجان کے پنجے
پیاریاں لعل خوشے جوں دسیں بن ہور بن سارا

دسیں ناریل کے پھل یوں نمرو مرتباناں جیوں
ہور اس کے تاج کوں کہتا ہے پیا لا کر دکہن سارا

دسیں جاموں کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم
نظر لاگے تو ہمیریاں کوں لکھیا ہے جتن سارا

صفت کسنے کوں سوسن بھی کھلیا ہے دس زباں اپنے
دکہن سب سیریاں کے تیں کھلیا نرگس تین سارا

چمن آواز سن بلبل اپس میں آپ الاپیں ہیں
ہو تس آواز سوں ہوراں کریں قصاں اپن سارا

مثنوی (سالگرہ)

نبی کی دعا تھے برس گانٹھ پایا
خوشیاں کی خبر کے دمامے بجایا

پیا ہوں میں حضرت کے ہنت آب کوثر
تو شاہاں اوپر مجھ کلس کر بتایا

مرا قطب تارا ہے تاریاں میں نجل
تو مجھ پر فلک رنگ کا چتر چھایا

سورج چندر پی تال ہو کر بجیں تب
منڈل ہو فلک ٹھٹھایاں بجایا

کرے مشتری رقص مجھ بزم میں نت
برس گانٹھ میں زہرہ کلیاں گایا

مرا گلستان تازہ اس تے بتھا سے
مجھ اس باغ تھے میوہ ہر دم کھلایا

دلے دشمناں کو سو یک جا ملا کر
سو اپسند کے پاتراں کرنا چاہا

خدایا معافی کی امید ہے لیا
کہ جیوں سانت کی ہوئیاں تے جگ سب اکھایا

خدا کی رضا سوں برس گانٹھ آیا
سہی شکر کہ توں برس گانٹھ پایا

---

[1] از رسالہ اردو جلد ۱ حصہ ۵

[2] محبوب الزمن صفحہ ۷۵۲۔

"بسنت" کے متعلق کئی نظمیں ہیں، ایک کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیا را | تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
نپھل کندن کے تاراں انگ جھونا | بندی ہوں چھند بند سوں کو سنگارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں | کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
شفق رنگ جھینے میں تارے مگٹ جوں | سورج کرنا نمن زرنار تارا
پیا پگ پر ملا کر لیائی پیاری | بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا
جوبن کے حوضخانے رنگ مدن بھر | سورو مار دم چرکیاں لائے دھارا
بھیگی چولی میں بھیٹن نس نشانی | عجب سورج میں ہے کیوں نس کوں ٹھارا
بسنت ونت جھد سو کندن گال اوپر | پھولایا آگ کیسر کی بہارا
نبی صدقے بسنت کھیلیں قطب شاہ | رنگیلا ہور رہیا تر لوک سارا

"مرگ" موسم برسات کے آغاز پر کئی نظمیں ہیں ایک ملاحظہ ہو:۔

مرگ جھینے کوں ملائے ملکاں مل گگناں میں | سمد موتیاں کے جو برسائے سو بھرے انگنا میں
دھرت بند چیر جواہر چولی رنگ باج کر انگ پر | یہ بہوٹیاں لعلاں سوں اترے ہیں پناں میں
کوکے چوندھر بھتے میوراں ہرے بن چو طرفاں دیکھ | پنکھی رنگا رنگی نغمیں کریں مست ہے چمناں میں
ہرے صحرا میں ہوے لالی گلالاں نہجے بن میں | شبنمی تیل سوں شمعاں جوں زمرد لگناں میں
موہنیاں تانے طراوت سوں رنگ انگ تنگ کی ڈوری | چھونے بند چھند سوں ٹکیاں جو بنالے جوبناں میں
امرت دھات سنجل سات ہے ظلمات میں بھیٹن | یا نچل دو بیدلاں سیام ہے جوبن کے کھناں میں
دیکھ عجب دو نین بچ ٹہے حیراں ہو کہے یوں | جو رہے کیوں لگن ابر سوں کنجک کنساں میں
کرنے نظارے ہوا کے پیاں سے مست سہیلیاں | پینگ ملہار جھونر گائے سو تن تن سمناں میں

نہ ہوے مشکیں بھنوراں و بسو وطن گرا ہیں پھل میں — نہ بل آ جھے ہیں تلاں و سماں بچے تو ساں ہیں
سر نھے پگ لاک تو مسکل ہوز اپنے مٹے سکیاں — من ہرن بیچ بعد ایال گھنگرو ہو بچاں میں

خوش نبی ہو رعلی کے صدقے غزل ہرگ کی کہیں
سو قطب نوا سوں جم تمے کہ جوں سو بیچ کرناں ہیں

سلطان کے کلیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دیوان میں، جو غزلیں ہیں ردیف وار ہیں، اس کے غزلوں کی تعداد (۲۱۲) ہے اور جملہ اشعار (۲۲۵۴) ہوتے ہیں۔

نزاکت حسن دو دولت ہے منگے جا ہی کرن سکنا — نوا یوں نو جوانی سوں سکل شاہی کرن سکنا

مجنوں سو میرا نام ہے وحشی تھوں بچ سوں رام ہیں — اس کو الکہ مجھ دام ہیں یک بیچ میں گل بامیا

میرے بت کوں پوچھے میارے تیاں — سبھی رالاں کہو اس کا جواب

وفا منگتے ہمیں بے عقل شہر حسن میں اب — وفا کا پاس نہیں اس شہر میں کسیلے بہ بدمست

خال ہند و کا کر مجھ کیا ہے بت پرست — سب خیلاں اپنے سکت کرتا ہے میرا خیال بہت

غیر جب لیو سے تمن نام ہوتے میرا دہن تلخ — شکر و شہد پلا دیں تو نجاوے دو سخن تلخ

زاہد کی باتاں مکر کیاں جے سے پلا ساقی — کہ ایک دو پیالے پیکر جوں سوار نیہ کا سمند

سمند ناز کا گر دستہ کم نہ — کہ انکھیاں دیکھتے سو ہوئے قرار

دیا استاد منج تعلیم کچھ ہور — ہمیں کچھ دیکھ کر باندھے ہیں زنار
درد جانے حکیم خوب دانا — ہمارا درد کیا لوجھیں گے اغیار

معانی آس تیں کیا پوچھیں اے مجو　　　تمہاری بزم میں کرتا ہے شمع بات مجاز

قطب دل کے صحیفے پر اول ترا لکھیا صورت　　　کیا منج پر کرم آخر دیا سوں دو ادل نقاش

دیکھے نہیں کوئی نیں تج توں سب نیں تھے ہے چھپا
تیرے سو نیکے حسن کا دستار ہے سنسار نقش

جہاں توں واں ہوں میں پیارے منج کیا کام ہے کس سوں
نہ بت خانہ کا منج پروانہ مسجد کا خبر منج کوں
جنت ہور دوزخ ہور اعراف کچ نیں ہے میرے لیکھے
جدھر توں واں مرا جنت جدھر نیں واں سقر منجکوں
جنت کوں ہور دوزخ کوں سو مسجد بت خانہ کیا
کسے نا جانوں میں معلوم نیں کوئی تج بغیر منجکوں

خواجہ حافظ کی غزل کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔
یوسف گم سو پھر آگا اب بہ کنعاں غم نہ کھا
گھر ترا امید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا
اے ہیا تیہ دکھ دکھیا سو خوب ہوگا حال تج
من کا چنتا ہویگا پھر آکر جاناں غم نہ کھا
جم بہار عمر تج ہے پھر کر آگا باغ میں
چتر پھل کا کھلک رنگیں مرغ خوشخواں غم نہ کھا

ہاں تو نا امید نا ہو کوئی نہ جانے سرِ غیب
کیا اچھیگا پردہ او جھل کھیل تیلبیاں غم نہ کھا

او جنگل میں شوق سوں اب کبھو خاطر نہ کھ قدم
تج اگر بولیں چیبن کانٹے مغیلاں غم نہ کھا

قطب شہ اس کنج فکر و خلوت دینی منے
تا اچھے درت دعا و درس قرآں غم نہ کھا[1]

غزل

رکھا ایک ہے پر ٹیک کدھن لاکد چمن ہے ۔۔۔ لکہ جوت ہے ہر ٹہار تے ٹیک رتن ہے

سمدد رہے ایک ہو ندیاں ہیں سو ہزاراں ۔۔۔ یا تاں سد کمہ وڑاں میں دلے ٹیک رسن ہے

کس ٹھار ہیں دستا نہیں سب ٹھار ہے بھرپور ۔۔۔ بجھیں کو سکت کاں اسے ٹیک نین ہے

مج عشق گوری آگ کا یک چنگی ہے سورج ۔۔۔ اس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے

اس کے سو پرت پنت میں چل سیں سوں قطبا
تجکوں سوں مددگار حسین ہور حسن ہے

گر جا ہے میگ سر تے تازہ ہوا ہے بستان ۔۔۔ پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں

اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں خنداں کن ۔۔۔ چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں

ازنو نہال پھولاں ہے جام خوشے سو بادہ ۔۔۔ نرگس اپس پلک سوں جھاڑو کیے شبستاں

مکھ نور پر دسے یوں رچ خط عنبریں رہ ۔۔۔ جوں سور اچھے باول ریحاں سوں گلستاں

---

[1] یہ کلام کلیات قطب شاہ مطبوعہ سے لیا گیا ہے۔

بے ہوش میرے دل کوں مٹھے ابدھر چلائے — گلزار ہے عجب ادو و لعل شکرستاں
ابدھر مج عشق کے گدا کوں اورنگ شاہی دیتا — سب عاشقاں منج انگھیے ہیں طفل جوں دبستاں

روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ
بھرے ہیں ہر طرف تھوں جم شوق کے خمستاں

اب مست اچھے دایم ہمیں مست اچھنے کا ہنگام ہے
ساقی صراحی نقل ہور پیالے سو ہمنا کام ہے
عاشق ازل تھے ہیں ہمیں سرمست ازل تے ہیں ہمیں
نا آج کل تھے ہیں ہمیں زاہد کو نیں یہ نام ہے
روزہ بدے عید آنے ہیں ٹک شیر خورماں کھانے ہیں
صوفی چلے میخانہ میں تسبیح ہات اب جام ہے
منگتا ہے بدمستاں کنے مد باج نیں سکتا رہے
مے خانہ کے کوچے منے تو متقی بدنام ہے
ساقی پیالا منج پلا پیالا پینے ہوتا ولا
اس ہو کوں تو لیا کر ملا جس پو تھے مج آرام ہے
قطبا نبی کے آدھار تھے رحمت ہے نت کرتا تھے
تو تج غزل کے پیار تھے بلبل نو انعام ہے

آج شہ جیں چلیا شرق نگر تھے شتاب — ڈھال فلک کی اچا و شہ عالی جناب
باند خنجر کرن کی زرین خرنگ باندھ لے — صبح کے وقت اٹیا پیک دو پیالی شراب
چیرک فلک فیل مست سوں بکہہ لال کر — گرم ہو چلنے لگیا دن لے کتک بے حساب

نوحہ

دو جگ اماماں دکھ تے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن رون کی لکڑیاں جال کر کرتی ہیں خواری وائے وائے
آسمان جیچ جیسا لا ہوا سورج آگن والا ہوا
چندر سو جل کالا ہوا ہے دکھ اپاری وائے وائے
یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پہ کھینچے خنجر
کافر کئے کیسے تہر یو زخم کاری وائے وائے
قطبا کو ہے اللہ مدد و ستنا ہے اس دل میں خدا
تو بیخ مرد حید رولد یہ یاں کوں زاری وائے وائے[1]

تبصرہ:- سلطان کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ اس نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، مرثیہ وغیرہ اس کے تخیل کے بہترین نمونہ ہیں۔ خیالات میں بلندی ہے۔ تشبیہ اور استعارے نادر اور اچھوتے ہیں۔ کلام میں اثر ہے۔ اس نے واقعات کی مرقعہ نگاری اور وصف نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ مناظر قدرت کی جو عکاسی کی ہے وہ لاجواب ہے۔ رسم و رواج، عید، نوروز، بسنت، برگ وغیرہ پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں منظر کشی اور تخیل کی بلندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کی غزلیں تغزل سے مملو ہیں۔ عشق اور عاشقی کی رمدار کو نہایت عریاں الفاظ میں پیش کیا ہے۔ وہ اس امر کو بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنے دردِ دل کا اظہار اشعار میں کیا ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس میں

[1] صرف نوحہ رسالہ اردو سے لیا گیا ہے۔ باقی کلام کلیات قطب شاہ

سادگی صفائی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ اس کے کلام میں لوچ ہے، شگفتگی ہے، کلام پختہ ہے۔

یوں تو ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے اشعار ملتے ہیں مگر خصوصیت سے محمد قلی کا کلام تصوف سے مملو ہے۔ اس نے خواجہ حافظ کے کلام کے طرز پر اپنی غزلوں میں تصوف اور عرفان کے مضمون باندھے ہیں۔ خواجہ صاحب کی بعض فارسی غزلوں کا دکھنی غزلوں میں کامیاب ترجمہ کیا ہے۔

سلطان محمد قلی میں کئی باتیں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ ایک عاشق مزاج شخص تھا نوجوانی سے عیش و عشرت کی زندگی میسر آئی۔ اس میں قوت مشاہدہ، طبیعت کی پرزونی اور تخیل کی بلندی فطری طور پر ودیعت ہوئی تھی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس کی شاعری کمال عروج پر پہنچ گئی۔ اور پھر کلام کی سادگی اور شیرینی اور حلاوت نے اس کو مقبول بنا دیا۔ ایک طرف وہ عشق اور عاشقی کے مضامین نہایت عریاں طور پر بیان کرتا ہے تو دوسری طرف حمد و نعت، منقبت کی ترجمانی میں جو کمال دکھایا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس کی معاملہ بندی دیکھنے کے بعد خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ ایسا رند مشرب اور بے باک شاعر عقیدت سے مملو مذہبی جوش سے لبریز مذہبی نظمیں لکھ سکے گا۔ بہر حال یہ دعویٰ بالکل صحیح ہوگا کہ محمد قلی اردو کا ایک زبردست اور بلند پایہ شاعر تھا۔

ظل اللہ: سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا داماد اور جانشین سلطان محمد بھی شاعر تھا۔ ظل اللہ اس کا تخلص تھا۔ ۱۰۳۵ھ میں اس کا انتقال ہوا ہے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان میں مثنویاں،

قصائد، غزلیات سب کچھ شامل تھے۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت تک ظل اللہ کا کلیات ہمدست نہیں ہوا ہے۔ عبدالجبار خاں نے اپنے تذکرۂ شعرا میں جو نمونہ کلام دیا ہے وہ دراصل سلطان محمد قلی کا ہی کلام ہے، اسی وجہ سے دکن میں اردو کی سابقہ اشاعتوں میں ظل اللہ کے نام سے جو کلام پیش کیا گیا اس کو اب خارج کر دیا گیا ہے۔ البتہ ظل اللہ نے اپنے خسر کے کلام کے متعلق جو خیالات نظم میں ظاہر کیئے ہیں ان کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

سو کچھ شاعری بیچ شہ دھر کمال — بچن کہہ کے موتیاں نمن صدف ڈھال

کہے نیں کئیں شعر میں وصف ایس — جو رچہ شعر کے فن میں دنیا سریں

جو بھی کوئی اچھے شاعر اس دھات دو — تو ہن وصف ایس کے شریے ساتے دو

رہیا جائے نا شاعراں من منیں — بنا کے وصف شعر کے فن منیں

جو خاصا ہے یہ شاعراں کا ہر ٹیک — نہ ایں بن کہے وصف نبیاں کینک

مگر شاہ کہے بیت پچاس ہزار — دسے وصف ایس سون کہن بہت عار

دنا شعر کہہ بیت میں ٹیک بات — کہے نیں لکھیں اپنے وصف سات

جو مقطع میں ہر ٹیک ایس شعر کے — لئے بن سو حضرت علی ناؤں اپنے

نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام — بغیر از علی کا مئے باج نام[۱]

عبداللہ قطب شاہ: سلطان محمد قطب شاہ کا فرزند اور جانشین سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا۔ یہ عبداللہ تخلص

[۱] سلطان محمد قلی قطب شاہ مولفہ ڈاکٹر زور صفحہ ۱۴۸۔

کرتا تھا۔ ۱۰۲۳ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۰۸۳ھ میں انتقال ہوا۔ گولکنڈہ میں مدفون ہے۔

سلطان عبداللہ اپنے نانا سلطان محمد قلی کے نقش قدم پر گامزن تھا۔ اسی کی طرح شاعری موسیقی کا قدردان تھا۔ شاعروں اور موسیقی دانوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ سلطان کی طبیعت رنگین تھی، عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ صاحب علم بھی تھا۔ میر قطب الدین (جو مولانا نعمت اللہ کے رشتہ دار تھے) جیسے صاحب ذوق بزرگ نے اس کو تعلیم دی تھی۔ علم دوست تھا اور علماء و فضلاء اور شعرا کی قدردانی میں ممتاز تھا۔ اس کے دربار میں عرب اور عجم کے علماء اور اہلِ فن جمع رہتے تھے۔ برہان قاطع جیسی مشہور لغت اسی کے عہد میں تالیف ہوئی ہے۔

سلطان کو فارسی اور اردو (دکھنی) شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، دونوں لسانوں کے دیوان مرتب کیے تھے۔ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس کے کلیات کا ایک مخطوطہ موجود ہے۔

ہر صنفِ سخن میں اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ، مثنوی، غزل، مرثیہ، اس کی یادگار ہیں۔ سلطان کے کلام میں لفظی شان و شوکت، زبان کی سلاست خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سلطان محمد قلی سے اس کی زبان زیادہ صاف ہو گئی ہے۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:

لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمد کا	آفاق صفا پایا دن دین محمد کا
یو عید ہمن ساجے نصرت کے بجن باجے	ہے جگ کے نبی راجے دن دین محمد کا
گلشن میں شریعت کے پھل پھلیے طریقت کے	پر حل سوں حقیقت کے دن دین محمد کا

روشن ہوئے اسماناں جھمکاٹے رتن کھاناں　　خط لیوا سئے مسلماناں دن دین محمدؐ کا

جو بارہ اماماں ہیں لکھو ان پہ سلاماں ہیں　　ہم ان کے غلاماں ہیں دن دین محمدؐ کا

(لاکھ) صدقے نبی عبداللہ شہ کوں ہے مدد اللہ

پنج تن ہیں گوا یا اللہ دن دین محمدؐ کا

منجے نوروز تھے اگلا صفا تج لکھ جیدا دیتا

(ہے زیادہ)

ہوا جیسا جو منگتا تھا سو ویسا تج خدا دیتا

تراوت پھول کی ڈالی نمن کھل کھل کمسکانی سے تھے

خوشی پاجیو کا بلبل سو غم کوں سب ودا دیتا

(وداع)

بغیر ساقی بغیر پیالا بغیر پرت بغیر پیالے

دنیا کچ نہیں کہ منج قلقل صراحی کا صدا دیتا

حمل کا برج مج دل ہے کہ تیرے عشق کا سورج

کیا جیوں آکے منزل سو منجے لکھ فائدا دیتا

انند ہور ذوق منج تیری طرف تھے ہے کہ اتنیوں

فلک ایرال تھے ہاتف لیسے ہو منج ندا دیتا

محبت ہور وفا تیرے کوں دیکھیا بارہا اتھا

اس پہ منج اس ازانتہا تا ابتدا دیتا

(حوصلہ)

ادایاں سب کی تو دیکھیا ولیکن یو ادا تیرا

عجب کچ ہے خدا تج کوں عجب کچ یو ادا ہو دیتا

منجے نوروز ہور شبرات ہر دن ہر رین ہے کہ

(رات ہے)

دو تیرا زلف ہور چہرہ گواہی آسدا دیتا

مسیحا اس زمانے کا کہاؤں تو عجب کیا ہے
کہ حق منج عمر کی بیلا ابدلگ خوش بدا دیتا
جمعر ہوا اس اماماں کا رہیا ہے چھانو منج سر پر
امت کوں جس اماماں کا امامت اقتدا دیتا
نبی کے صدقے عبداللہ سدا توں شکر کر اس کا
جکوئی تج کوں نوازیا ہور شاہی کا بدا دیتا

تو پیاری عشق بھی تیرا ہے پیارا — لگیا ہے بھوت تج سوں دل ہمارا
سکھی آل کہ تل تل ذوق کر لیں — دنیا میں کوئی نیں آیا دوبارا
سکھی تجھ بھی سمج توں دل میں اپنے — کتا منت کرے عاشق بچارا
اچھتے ہیں (نکلتے) نجھل یاقوت کے کھان — جہاں توں پان کھاتی تھی غرارا
نین بو کھی (صاف) سوں پہنتا اس پہ پھول نپے (کان) — کہ یک دنتی ہتی کا ہے کنبھارا
تجے چاند ہور تارے سوں غرض کیا — تو آپیچ چاند ہے (ایک دانت ہاتھی) آپیچ تارا
نبی کے صدقے عبداللہ کا دل
سکھی ہے تل ترا اس کوں بچارا

بسنت آیا پھل بار پھول لالا — سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا
چمن میں تے پھلیا ہے (پھٹا) پھول رنگ رنگ (لالہ) — پیٹ نازک الکیں (ایک سے ایک) تھے ایک آلا (اعلیٰ)
گلابی ہور ماوی ہور اُجلا — ہریا ہور لال پیلا ہور کالا
لڑاں جھاڑاں کی پڑیاں میانے بھرتیا — جھڑی پکڑے ہیں پانی کا جوالا

ہو امد پیہنے کا آیا ہے بہار ے　　　تو مد پیہنے کو من کرتا اُلالا

سنے لیا نے تیرے جو بناں کوں　　　سنا منج تھے سنے تھے ہیں اتالا

زلف نے تیری تاراں سینی بن کر　　　سٹے من میں پہ و یو جھین جالا

نبی کے صدقے عبد اللہ تج کوں

لیا سکھ عشق کا چھاتی سوں لالا

دل کی انکھاں میں جلکوئی تج عشق کا انجن کیا

غیب تھے پاگنج دو سب تج کوں بیچن کیا

مکھ تجے درپن میں تل تل دیکھنے عادت ہے کر

نین کوں میں عین تج دیدار کا درپن کیا

رات ساری زلف تیرا یاد سوں مل ایک ہو

خوش حکومت منج اپہ منگنا بتوں اپنا من کیا

منج لکھیں لے سر دیتیرا چھانویوں دینا ہے آج

جیوں ہما اقبال کا منج گھر میں آ مسکن کیا

عاشقاں ہیں کئی دوئی کا نانو لیوے نہ بتوں

تج سوں مل جامن ایس کوں ایک دل یک تن کیا

شاہ عبد اللہ نبی صدقے تری توفیق تھے

خضر مو گھٹ کوں نام امرت کا دنجن کیا

بدن دل کشا عشرت محل مطبوع اوتارا ہوا　　　جو تی زمین کی پیٹ جیوں مشتری تارا ہوا

ہر طاق یاں خوش طرح کا دنیا دریچا فرح کا
عاجز ہوا اس کی شرح کا حیراں سنسارا ہوا

انکھیاں سوں چندر سور کئے یکہ آسماناں دو رکے
عاشق ہیں اس کے نور کے کیا خوب یو ٹہارا ہوا

دیون صفا دیوار سوں لک نقش تہانے ٹہار سو
خوش ٹہاں یاں عطار سو فردوس کا بارا ہوا

نازک اچنبا بے بدل الکھس ہریا ایسا محل
باندیا نہ کوئی آخر اول جمشید یا دارا ہوا

جیوں کھیل تازا بن منے جیوں پوتلی یو جن سنے
تیوں آج اس دکھن منے یو محل اتم سارا ہوا

صدقے نبی کے یا اماں اس محل میانے ہر زماں
جم عبداللہ شہ ترکماں ہو گی گہسارا ہوا

اے پری پیکر ترا مکہ آفتاب
دیکھتا ہوں تو اُہے نا منج میں تاب

یاد ایسا نا دکھاتا ہے ہنوز
دیکھ تری زلف کا دو پیچ و تاب

میں تجے بلقیس کوں تو کیا عجب
ساچ ہے بلقیس کا تج کوں خطاب

قند مو نابات گلتا ہے اچھوں
شے نہ کوئی تجے ہے لب کا جواب

تجہ بہشتی حور کوں دیکھیا ہے جن
جم حرام اس پہ ہے دوزخ کا عذاب

شاہ عبداللہ نبی صدقے تجے
خوب دیاں میں کیا ہے انتخاب

گفتم کہ اے پری توں ہے فتنہ زمانا
گفتا کہ راست گفتی اے گھن بہرے سیانا

گفتم کہ در جہاں بہ لیلی جو آئی ہے توں
گفتا کہ من چو مجنوں پائی ہوں تجہ دوانا

گفتم کہ خال و زلفت کیا ہے سو لال منج کوں
گفتا کہ زلف دام است یو خال ہے سو دانا

گفتم کہ در ہوایت پھرتا ہوں ذرہ جوں میں
گفتا کہ در دل تو کی ہوں ازل تجے خانا

گفتم کہ خانۂ تو کاں ہے نشاں دے منج ۔ گفتا کہ ذرہ یہ ورسو رج ہوں میں توانا
گفتم کہ ور دہانت امرت کا ہے چشمہ ۔ گفتا کہ خضر ہو توں اس چشمے پاس دھانا
گفتم کہ کیست ایں جا تیرا پران پیارا
گفتا کہ شاہ عبداللہ ہے مرا پرایا

اول امید میری دل میں ہے یہی ہر صات ۔ جو نت رفیق ہو توفیق اچھی منج سات
وہ جا امید یہی ہے جو تندرستی سوں ۔ منج اس جہان میں خدا دیوے بیشمار حیات

آج رہی بخت جوانی سعادت کی رات ۔ چاند سوں میری ملا غم تہی منج دے نجات
روپ میرے لال کا آئے نہ تحریر میں ۔ چاند عطارد اگر ہو ویں قلم ہور دوات
اس کے قدان کے ستم کرنے سرد کون خجل ۔ باد اڑاتا پھرے چمنی چمن پات پات
صدقے نبی کے میرے دل میں رہیا ہے مدام ۔ جیو ہو شاہ عبداللہ خسرو عالی صفات

کام مردان کے نکو جان تو اے خام عبث ۔ کہ جکوئی مرد ہیں کرنے نہیں وہ کام عبث
ہوش کا گوش نہیں تیز جیسے سننے کون ۔ غیب کے اس کے کہیں سننے میں الہام عبث[1]

مرثیہ

علی ہور فاطمہ کرتے ہیں دونو آج زاری ہی
حسن کا ہور حسین کا دولہ لے آیا جگت یو خواری ہی
حسین جب چلے لڑنے سران ہیں پر لگے پڑنے
شہیدان ہر طرف چڑنے لگیا بو دو کہ پیاری ہی

---

[1] دیوان عبداللہ کتب خانہ سالار جنگ ۔

وصیت یو کئے جاتے نکو رو تم آپ بہاتے
نہیں تو پھر کو نیں انی اجل اٹی ہماری بہی

یتماں کو سنبھالو ہو غیر بھی میں سکھالو ہو
بہوت میراں سول ہاپو ہودہ ہیں یادگاری بہی

پڑیگا غم تمن پر جب میرا غم یاد کرنا تب
یو دو کہ یاد آوے گا ہر کبہ ہیں اشکباری بہی

سوتے یو غم حرم سارا مسلم ہو نرا دہا ڑا
سو ماری کل گلا نعرا اکہر کر بیقراری بہی

شہر بانو کہے اگر اے سپہ سالار کے سردار
منجے غربت منے بہا کر نجا و چھوڑ باری بہی

منجے کے جاتے یوں حال تمن بعد زمیرا کیا حال
کرو مت غم منے پایمال یو درس تماری بہی

علی اکبر کٹے ہیں جانوں سو پیاسا ہیں جو بالے لاتوں
زخم کھا کر آئے پھر اب تہانوں بہی ہے مشک ساری بہی

دیکھو طفلاں منگے پانی نہ کر تو دو جہر بانی
ستم سوں تیر مارنے کٹے ادنا بکاری بہی

- - - - - - - - - - -

حسین پانی پی اے تیر یدان تیر برساتے
سو پانی پینے نہیں پائے لگے لکہ لہو کی دہاری بہی

بغیر از ظلم بیدادی نہ تھی اس وقت کچھ شادی
ہوئی قاسم کی دامادی دیکھو تقدیر باری بہی

صو دبدیاں نوبت بونند کرو خوشیاں سات پیوندکر
حرم کون لے چلے بند کر پڑیا جگ سب اندیاری بہی

عروس آکر پکڑ من چلے تو شوہو جب جہو جن
نشانی کچھ دیو منج کن سو پیاد منبل تہاری بہی

حسین کا وقت جب دانیا شمر نے آ گلا کاتیا
حرم کا دیک بینا پیا تبا دنیا اور اپکاری بہی

ننگے پاؤں چلے آئے سو پاداں کون چھلے آئے
اگن دیکہیں چلے آئے نکتے دو ستداری بہی

کہنت کنی بیلنے پیش آئیا مت کچھ نہ اندیشہ
اپن مارایا اپے تیغنہ تو پایا گرفتاری بہی

یزید دیکھا حسین کا سر پر آیا مٹ سون بہر بہر
سو دیکھو لعنتی کافر کیا کفر اختیاری بہی

کرو اے دوستاں ماتم تو اب ہے بہت کرنا غم
مدد ہو نیگے امام ہر دم کی ہے امیدداری بہی

حسین کا دوکہ دل میں آن لگا یک جیت سوں ماتم وہاں
کرے قطب عبداللہ سلطان دہ کنو سون تہر باری بہی[1]

---

[1] بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم ۔

تاناشاہ:- گولکنڈہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تاناشاہ بھی شاعر تھا۔ اس کا تقریباً تمام زمانہ لڑائی جھگڑوں میں بسر ہوا۔ اس لئے غالباً اپنے پیشرو سلاطین کی طرح اس نے اپنا کوئی دیوان نہیں چھوڑا۔ اب تک اس کا صرف ایک شعر تذکرہ نویسوں کو معلوم تھا مگر اب اس کا بھی کچھ کلام ہمدست ہو گیا ہے، جس کو محمد خلیل اللہ شطاری ایمنی نے اپنی کتاب بحر محیط میں درج کیا ہے:۔

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کو مری انجمن میں آ

کب لگ رہے گا جیوں لب تصویر بے سخن
اے شوق خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ

چاہتا ہوں وصف قد میں کرد ل فکر شعر کی
اے معنیٔ بلند شتابی سوں من میں آ

اے جان بوالحسن توں اچھے خوش لنک سے
بند قبا کوں کھول کے صحن چمن میں آ

نظم کا نمونہ یہ ہے:۔

تجھ مکھ کوں کوئی چندر کتے   کوئی سورتیں انور کتے
کوئی حسن کا بندر کتے   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

تو جہ لب کوں کوئی شکر کتے   کوئی شہد سوں بوتر کتے
کوئی خضر جان پرور کتے   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

کوئی جیو کی پیاری کہتے کوئی سون اچھن ناری کہتے
ناریاں میں کوئی ناری کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

تجہ جگ کوں کوئی گیجن کہتے کوئی ساحر پُرفن کہتے
کوئی حقہ ر نجن کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

جوبن کوں تجہ کوئی گج کہتے یادو سنیناں سچ کہتے
یامدھ بھرے پنکج کہتے کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

اس نظم کا ایک شعر جو بعض تذکروں میں سلطان ابوالحسن کے نام سے ہم دست ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس کو مصنف بحر محیط نے نقل نہیں کیا ہے

ملنا تمن کا غیر سوں کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہتے
کس کس کا منہ موندوں سخن کوئی کچھ کہتے کوئی کچھ کہتے

ایک اور شعر جس کو مولف گلشن ہند نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے :-

کس در کہوں کاں جاؤں میں مجہ دل پہ کٹھن بچھڑات
ایک بات ہوں گے سجن یہاں جیوں بادہ بات ہے

صفحات گزشتہ سے سلاطین قطب شاہی کے کلام کا اندازہ ہو گیا ہوگا اب اسی دور کے دوسرے شعرا کا کلام پیش کیا جاتا ہے جس سے اس دور کی ترقی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

(۱) فیروز

اس دور کا ایک بلند پایہ شاعر فیروز ہے۔ وجہی جو اس عہد کا دوسرا زبردست شاعر ہے اس کی تعریف کرتا اور استادانہ

مہارت کا معترف ہے، چنانچہ اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں فیروز کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:-

کہ فیروز آ خواب میں رات کوں | دعا دے کے چومے مرے ہات کوں
کہیا ہے توں جو شعر ایسا سرس | کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس
تو یوں کر کہ خصلت یو تج آئے تا | کہ تو خوش اچھے ہور کے بھائے تا
توں ایسی طرز دل تے پنجا نوی | کہ دیکھے کریں سب تری بہ دوی

دوسری جگہ لکھتا ہے:-

کہ فیروز محمود اچھے جو آج | تو اس شعر کوں بہوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونو کے اس کام میں | وہ گیا ہیں کنے بول چھوں نام میں

وجہی جیسے مغرور اور بلند پایہ شاعر کا فیروز کو استاد سمجھنا اور یہ خیال ظاہر کرنا کہ خواب میں آکر اس نے اس کے کلام کی داد دی، اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ دراصل فیروز اپنے عہد کا بہت بڑا استاد سخن ہوگا۔ وجہی کی طرح اس عہد کے دوسرے شاعر ابن نشاطی نے اپنی مثنوی میں فیروز کا ذکر اس شعر میں کیا ہے:-

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا کچ مجے داد

اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فیروز کے بہت سارے شاگرد تھے، اور وہ اپنے تلامذہ کی بڑی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔ اور اس کی تعریف گویا کمال فن کی دلیل ہوتی تھی۔

افسوس ہے کہ ہم کو فیروز کا نام نہیں معلوم اور نہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے کب انتقال کیا، مگر وجہی کی قطب مشتری سے جو ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی ظاہر ہوتا ہے وہ اس زمانہ (۱۰۱۸ھ) میں بقید حیات نہیں تھا۔

اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ فیروز سلطان ابراہیم قطب شاہ (۹۵۵ھ تا ۹۸۸ھ) کے زمانہ کا مشہور شاعر تھا۔

فیروز کی ایک مثنوی "توصیف نامہ" ہمدست ہوئی ہے جس کا ایک ناکمل مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے۔[1]

"توصیف نامہ" میں حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات درج ہیں۔ اس میں فیروز نے اپنے مرشد مخدوم جی کی تعریف و ستائش کی ہے۔

مخدوم جی، بیدر کے مشہور صوفی اور صاحب حال بزرگ شیخ محمد ملتانی کے بڑے فرزند تھے۔ مصنف تذکرہ اولیاء دکن کے الفاظ میں آپ عالم فاضل ولی کامل تھے۔ جامع کمالات انسانی و فضائل روحانی میں اس وقت آپ کا کوئی نظیر نہیں تھا۔

فیروز نے "توصیف نامہ" میں صراحت کی ہے کہ اس نے خواب میں حضرت محبوب سبحانی سیدنا عبدالقادر جیلانی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ ہو بہو مخدوم جی کے ہم شبیہ ہیں۔ اس لئے اس نے ان کو ہر جگہ "محی الدین ثانی" کے نام سے یاد کیا ہے۔

"توصیف نامہ" کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

آغاز:-

تہیں قطب اقطاب جگ پیر ہے — تہیں غوث اعظم جہانگیر ہے
تہیں چاند بافی ولی تارے ہیں — توں سلطان سر دار سبالے ہیں

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ (۴۴۴) نمبر (۱۱۰)

مخدوم جی کی مدح کے اشعار:۔

بڑا ہیم مخدوم جی جیونا   کے مے صرف وحدت سدا پیونا
مرا پیر مخدوم جی جگ منے   منگوں نعمتاں میں سدا اس کنے
کریں منجہ اپر پیار اے پیو جگ   کہ تجہ پیار تھے ہوے مند ہیر جگ
پیا جیو تھے تو ہمن باس ہے   تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے
دہی پھول جس پھول کی باس توں   دہی جیو جس جیو کی آس توں
سو توں روک ہے دین کا باردار   جو تجہ چھانو تل جگ ہے پکڑیا قرار

اچھو منجہ اپر چھانو تیرا اجرم
کہ آدھار میرا سو تیرا کرم

ولایت سوں توں جب اچایا علم   علم تجہ تل ہیں ولی تب حشم
محی الدین توں دین تجہ تھے جیا   توں اسلام کوں نور سر نقش دیا
تمہیں نور دیدہ نبی کا یقین   تمہیں عین دستا علی کا یقین
دسیں تجہ منی سب پیادت کے سین   کہ دادا حسن تج نانا حسین

علی بعد برحق امام ولی
نبی کا نواسا حسن بن علی

تو سلطان سلاطین رعیت محی   تو حاکم کہ جگ پر حکومت تجے
ولی جاد کر پاؤ آپ سر لئے   قدم راکھے تجہ کھاندا دے
نگہ شیخ صنعا ہوا پارکھا   دکھیا دین کھویا کافرسار کا

بھولیا دیک نرسا کہ یک پرستنی — لگی لنگ پوجن لگیا بھوتنی
شراب پیوے ترا آن لے جالیا — چراخین کہ دوزخ اپس کھالیا
فرشتے تجہ آزماتے اپنے جب — پران جل پری تھی سزا پائے تب
تہیں عبدالقادر سو قادر دیسے — کہ قادر کہ قدرت میں نادر دیسے
نظر تدن کرے تو ہوا جیوا تھے — دنیدین جو تجہ ناؤں لے سرتوں پنی
رب اپنے سو عاشق ولی سب سدا — تو معشوق عاشق تو سوں رب سدا
بزرگی تجے سب ولیاں میں ہے — ولی جس موہی وہی تج سو ہے

---

(۲) محمود اس دور کا ایک دوسرا مشہور شاعر اور استادِ سخن محمود تھا۔ ابن نشاطی کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ سید محمود ان کا نام تھا چنانچہ پھولبن میں جہاں فیروز کا ذکر ہے اس کے ساتھ ہی محمود کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:۔

رہے ہے سدحسین جو تیں سید محمود — کتے پانی کوں پانی دند دھ کو دودھ

افسوس ہے اب تک محمود کی کوئی تصنیف دستیاب نہیں ہوئی۔ ممکن ہے آئندہ تحقیقات میں کوئی نظم مل جائے۔

(۳) خیالی ملا خیالی کے متعلق بھی ہمیں معلومات نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ اس عہد کے شاعر تھے، اور فنِ شاعری میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔

ابنِ نشاطی نے جن شعرا کے زندہ نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کیا ہے ان میں ایک ملا خیالی بھی ہیں چنانچہ کہتا ہے:۔

اچھے تو دیکھتا ملا خیالی — یو میں برنیا ہوں سو صاحب کمالی

گولکنڈہ میں ملا خیالی کی مسجد کے آثار اب تک باقی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک مشہور بزرگ تھے ۔

(۴) وجہی وجہی اس عہد کا بلند پایہ شاعر اور نثار ہے ۔ ابراہیم قطب شاہ کے زمانہ سے اس کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے، اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں بھی وہ زندہ تھا ۔

وجہی کو دربارِ شاہی میں بڑی عزت اور رفعت حاصل تھی ۔ اس کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا ۔ اس کے کلام سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ دکن کا ممتاز شاعر تھا ۔ اس کا اسلوب بیان فطری ہے ۔ وہ کوئی تکلف نہیں کرتا ۔ اس کی مثنوی اس کے اعلیٰ خیالات کی بہترین ترجمان ہے ۔

وجہی بڑا خوش قسمت شخص ہے کہ اس کی نظم و نثر دونوں کے نمونے موجود ہیں ۔ نظم کی حیثیت سے مثنوی **قطب مشتری** اور نثر کے لحاظ سے **سب رس** دکن کے بہترین شہ پارے ہیں ۔

مثنوی قطب مشتری کی تصنیف ۱۰۱۸ھ میں ہوئی ہے ۔ اس میں ایک اچھے قصہ کو منظوم کیا گیا ہے ۔

اس قصہ کا ہیرو محمد قلی ہے ۔ وہ اس زمانہ میں تو ولی عہد تھا اور جب اس مثنوی کی تکمیل ہوئی ہے تو وہ تخت و تاج کا مالک بن چکا تھا ۔ اس سے بھی وجہی کی ممتاز شخصیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

اس مثنوی کا اسلوبِ بیان نہایت پاکیزہ اور اس کی زبان بہت صاف ہے اور اس سے اس زمانہ کی طرزِ معاشرت، تمدن اور تہذیب کا کافی اندازہ ہوتا ہے ۔

وجہی کی یہ مثنوی قطب مشتری نایاب ہے۔ اس کا صرف ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے۔ اس کی پوری تفصیل ہماری تالیف "یورپ[1] میں دکھنی مخطوطات" میں کی گئی ہے۔

وجہی کی نثر سب رس کے نام سے مشہور ہے، جو ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے اس کے متعلق مزید وضاحت آگے درج ہوگی۔

وجہی کے کلام کا نمونہ درج ہے:۔

مثنوی

توں اول توں آخر توں قادر اہے	توں مالک توں باطن توں ظاہر اہے
تو محصی توں میدی توں واحد سچا	توں تواب توں رب توں ماجد سچا
شہنشہ مجالس کیے ایک رات	وزیران کے فرزند تے سب سنگات
ہر یک خوبصورت ہر ایک خوش لقا	سو ہر ایک دلکش ہر ایک دلربا
صہابت کے کاماں میں جم جم ہے جیہ	شجاعت کے کاماں میں رستم ہے جیہ
ندیم ہوا مطرب سگھڑ فہم دار	اتھے شاہ سوں مل کر یو سب ایک ٹھار
صراحی پیالے لے ہاتاں منے	ندیماں تے مشغول باتاں منے
لگے مطرباں گانے یوں ساز سوں	کہ دھرتی ہے مست آواز سوں
جو مطرب دو صحرا میں اس دھات گائے	تو پھران کوں اس شوق تے حال آئے
جو گادیں یو شہ کوں کاتے اتھے	سو ناگان یہ ناگاں جاتے اتھے

---

[1] یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۲۷ تا ۳۷

ناریاں لطافت ہیں جو چکہ آئیں   تو ربتیاں کو خوش کر گھڑی میں ہنسائیں
شراب ہور صراحی نقل ہور جام   ہوئے مست مجلس کے لگاں تمام

جو ہوئی رات آدھی پچھی دو پہر   خبردار یاراں ہوئے بے خبر
بسر گئے ندیماں طرز بات کا   گنوائے خبر مطرباں ذات کا
نہ ملتے نہ خوبی جھگڑتے کہیں   یکس کے اپر ایک پڑتے کہیں
لگے مست ہو سٹنے مستی سنگات   یکس کے سو پاواں اُپر ایک ہات
سو یوں کچ وہ یاراں ہوئے بے خبر   کہ پانی پتے تھے شراب کر
یکس کرن بلا ایک ازمائتوں سوں   گلے لگتے تھے مست ہو چھانوں سوں
بجاؤ جو کہیں تو اٹھیں گائے کر   سٹے مطرباں ہوش خوش پائے کر

چھپی رات اجالا ہوا دیس کا   لگیا جاگ کرن سیو پریس کا
شفق صبح کا نیں ہے آسمان میں   کہ لالے کھلے ستبلستان میں
جو آیا جھلکتا سورج واٹ کر   اندھارا جو تھا سو گیا نھاٹ کر
سورج یوں ہے رنگ آسمانی منے   کہ کھلیا کمل پھول پانی منے

ابراہیم قطب شاہ مجلس سنگار   کتی ہستے ہو ہوپ عشرت اتار
بجتیاں خوب خوش شکل نقیاں سندریاں   سو کیتا تک حور کو پچھے انگلیاں

نگر میں جو آیا قطب شاہ نول   لگنی بجنے چندھر خوشیاں کے طبل
شہر میں سو عید آج لوگاں کئے   کہری گر انند کا جو کاکان کیے
لگے حال احوال سب پوچھنے   جو شہ دیکھے تھے سو کہنے لگے[۱]

۱۔ مثنوی قطب مشتری

غزل

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا
تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا

کھانا برہ کیتی ہوں میں، پانی انجھو پیتی ہوں میں
تج نے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا

ہر دم توں یاد آتا منجے، اب عیش نئیں بھاتا منجے
برہ حالہ سنتا نا منجے تج باج تل تل رے پیا

تو جیو میرا میں سو دل، تج سات رہنا کیوں نہ مل
دن رات میں میں ایک تل بن تج تے غافل رے پیا[1]

نوحہ

بنا جوا دل ہوا ہے غم کا	عرش گگن ہور دھرت ہلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا الٰہی	کہ یا حسین پر ادھی سمایا
بنیاں ولیاں کے انجو انسوں بکھرے	یہ غم حسین کا جنم دھرلایا
یہ کیا بلا تھا یہ کیا جفا تھا	مگر قضا تھا سو حق دکھایا
محب دلاں کوں اجل کا ساتی	پیالے غم کے سو بہر پلایا
تمارے یہ جی کوں یا اماماں	نہیں تمن بن یہ اس کوں سایا[2]

(۵) غواصی اس عہد کا دوسرا مشہور شاعر غواصی ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے زمانہ میں اس کی شاعری چمکی اور سلطان عبداللہ کے عہد میں اس کو شاہی تقرب حاصل ہوا

۱؎ مثنوی قطب مشتری   ۲؎ بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم

اور بڑی عزت اور شوکت حاصل ہوئی۔ شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجاپور روانہ ہو گیا۔

اس کی دو مثنویاں مشہور ہیں۔ پہلی سیف الملوک و بدیع الجمال اور دوسری طوطی نامہ۔ مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال کی تصنیف ۱۰۳۵ھ میں ہوتی ہے اس کو اس نے اسی نام کے فارسی قصہ سے دکھنی نظم میں منظوم کیا ہے۔ دوسری مثنوی طوطی نامہ ضیاء الدین نخشی کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے یہ مثنوی ۱۰۴۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

غواصی نے غزل اور مرثیے بھی لکھے ہیں چنانچہ اس کا کلیات بھی دستیاب ہو گیا ہے اس کی ایک اور مثنوی دستیاب ہوئی ہے جو چندا اور لورک ہے۔ یہ بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے اس کی تصنیف ۱۰۳۵ھ کے پہلے ہوئی ہو گی۔

پہلی مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غواصی کس طرح مغرور ہے۔ اظہار خود ستائی کے ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنے ہم پایہ نہیں خیال کرتا اگرچہ وہ کسی خاص شاعر کا نام تو نہیں لیتا مگر کہتا ہے کہ شاعری کا تمام انحصار اسی کی ایک ذات واحد سے وابستہ ہے۔ دوسری مثنوی سے پیری کی فروتنی اور انکساری ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے دنیا دار ہونے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

اس کے کلام میں ہندی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کلام سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ بیان کی دلکشی اور قادر الکلامی اس کی مثنویوں کے خاص خط و خال ہیں۔

دونوں مثنویوں کے متعدد نسخے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ انجمن ترقی اردو اور آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج کے پاس بھی اس کے نسخے پائے جاتے ہیں اور اب یہ دونوں مثنویاں شائع ہو گئی ہیں۔ ان مثنویوں کی تفصیلات ہماری دوسری تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات[۱]" میں موجود ہے۔

[۱] صفحہ ۳۸ تا ۴۷

افسوس ہے کہ وجہی کی طرح غواصی کا سنہ انتقال بھی معلوم نہیں ہوتا مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۰۶۰ھ کے پہلے اس کا انتقال ہو چکا تھا۔

غواصی کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

(۱) سیف الملک و بدیع الجمال۔

حمد

الٰہی جگت کا اَکھی سو تون | کرن ہار جم بادشاہی سو تون
تیرے حکم تل نو کہ آسمان کے | رعیت ملک تیری فرمان کے

کہ حضرت سلیمان کے وقت پر | اتھا مصر میں راج یک بخت ور
نول عاصم اس راج کا نیک ناؤں | شہاں میں اتھا اس شرف تہانوں تہانوں
او دانا و عادل جوان مرد تھا | مسلمان خدا ترس بادرد تھا
بندا اس کے گھر کا سو اقبال تھا | بسا سو اُسے کوٹھڑیاں مال تھا

ہوئے جمع جنگی سپاہیاں تمام | قوی ہور خونخوار امیراں تمام
یک یک جان یک کوہ یا برج جیوں | لے ہاتاں میں فتنے بھرے گرز جیوں
غضب ناک ہو جیوں انگے نل ہوے | کلیجے پہاڑاں کے پھوٹ جل ہوے
سلح پوش پولاد کے کوٹ جیوں | پُر آشوب سمدور کی لوٹ جیوں
او نا لے ہو آفت بھرے عزم سوں | کھڑے آ کے میدان میں رزم سوں
بھیا بایہ جیوں قہر کا شور سات | شلطت کی اگن سلگ اٹھی زور سات

کئے قصد لڑنے کو دو دھیر تھے ۔۔۔ زمانہ ہوا تل اوپر سیر تھے
اوٹھیا غل جدھر کا ادھر مار مار ۔۔۔ قیامت زمیں پر ہوا آشکار
جھلک دیک بجلیاں سی تروار کی ۔۔۔ اوڑی فاختے سخت سنیسار کی
سٹے دھرت پر لیل منڈیاں کاٹ کاٹ ۔۔۔ سو کس کو سمجھتا نہ تھا باٹ گھاٹ
جو دریا لہو کا ابلنے لگیا ۔۔۔ گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگیا

کہ سلطان عبداللہ انصاف کر ۔۔۔ میرے جوہراں پر تے دل صاف کر
دیوے داد میرا بہوت ماں پاؤں ۔۔۔ اپس دوستی تا گہ یہاں پاؤں
کہ یو شاہ میرا خریدار ہو وے ۔۔۔ تو تازہ میرا طبع گلزار ہو وے
کہ غمگین ہوں میں سخت سنیسار تے ۔۔۔ دہروں دغدغے لا کہ اس آزار تے

اگرچہ ہوں شہ کے بندیاں میں حقیر ۔۔۔ ولے شعر کے فن میں ہوں بے نظیر
کہ موں کھول یوں میں کہوں کیا اپیں ۔۔۔ گدا ہے دسے یوں نشرا ہیں نا جبیں
بہر حال یوں نظم الہام سوں ۔۔۔ کیا میں تول شاہ کے نام سوں
برس یک ہزار اور پنچ تیس میں ۔۔۔ کیا نظم یو ختم دن تیس میں[1]

---

[1] سیف الملوک و بدیع الجمال

طوطی نامہ

رتن خاص دریائے لولاک کا ۔۔۔ جھلک لامکاں نور افلاک کا
محمد نبی سید المرسلین ۔۔۔ سدا روشن اوس تے ہے دنیا و دیں

مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں ۔۔۔ ثریا کے تارک پر اس کا ہے چھاؤں

کہیں قدسیاں صاحب صدر ہے[1]   کہ ہر شب سہتے ہے جیوں کے شب قدر ہے

سنیا ہوں جو تھا کوئی یک لشکری   اسے ایک عورت تھی جیوں شہ پری
کہ اس نار کا چہرہ واں چاند تھا   دل اس لشکری نے اسوں باند تھا
رنگ گن میں بے مثل ناری تھی وہ   وفا ہور ست ہیں کہ ساری تھی وہ
ولے اوسپاہی نہ ملنے پہ جبا   اپچھے اس کی رک دیکھ میں جابجا
دیوانہ ہو گھر میں تے نکلے نہ بہار   گذرنے لگی مفلسی بے شمار

سنیا تھا جو سوداگر ایک بے نظیر   انھا اس کنے ایک داداں کنیر
وفادار خوش فام شیریں کلام   ہنر غیب کی تھا سمج میں تمام
کہے گھر کی سب دیدبانی دہی   دیوے نیک دہار کی نشانی دہی
بجیوں ایک دن او سوداگر نام دار   چلیا کرنے سوداگری ایک ٹھار
گئی دیس لی پیک بابا نہ آن   تھی جان اس کی عورت لگی تلملاں
جوان اس کی باڑی میں تھا ایک خوب   لگائی جھپا عشق اسے دیک خوب[1]

غزل

پیا بن پیالہ پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا
کتے ہیں پیا بن صبوری کرو   کیا جائے جانا کیا جائے نا
سجن میرا یو مجھ سوں بیدل ہوا   ہر یک تل مجھے یوں کہتا جائے نا

---

[1] طوطی نامہ

سینے میں میرے داغ دے کر گیا — کہ ذرہ بو دل میں دہا جلائے نا
مجھے تیر سینے پہ کاری لگی — جگہ پھوٹ سارا اٹھا جلائے نا
غواصی نہ دے توں دیوانے کو بند — دیوانے کوں پند دیا جائے نا

غواصی کا کلیات بھی اب دستیاب ہو گیا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے[1]۔ اس میں قصائد، غزلیات وغیرہ ہیں۔ ہم نے تفصیل کے ساتھ اس پر ایک مضمون بھی قلمبند کیا ہے[2]۔ غواصی کے دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل گو شاعر تھا قصائد کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:-

نکہ خواجہ ذوق پہ ہے نت ٹھار من ٹھار آج
یعنی ہوا ہے ہر طرف ابر گھر یار آج
نادر بہارستان کا زرگر ہزاروں صنع سوں
کیتا جرت گلزار کی جھاڑاں کوں خوش سنگار آج
کسوت ہرے کر وہر نیسے شبنم کی موتیاں میں ہو غرق
دیتی ہے جلوہ ہر گھڑی جیوں گنبد دوار آج
صحرا ہوا دریا نور کا موجاں پہ موجاں مار کر
بخشے جند رہو وہ سور کوں سکہ ہور صفا اپار آج
عالم معطر ہوئے کہ کیوں رات دن مہکائے نا
کھولیا بول ہر پھول نے صد ناقہ تاتار آج

---

[1] نمبر (۱۰۳۷) دیوان اردو۔ [2] رسالہ سب رس حیدرآباد ۲۷ جمادی الثانی ۱۳۶۷ھ

عارف ہو بیج اخلاص کا دل کی زمیں میں پولے
جو جھاڑ تخم مقصود کا دو جگ میں لیا دے بار آج

گلزار تری عشق کا کملائے کبھو نا بتو کدھن
انکھیاں نے اپنی جیبل بدل برسا انجھو کی دھار آج

مجرا تری تن کا جو توں منگتا ہے ذران اچھے
روشن ہو دیوے کی غن دکھلا ترے جھلکار آج

ملک ابد کی خسروی پاکہ جو تیرا ہے عزم
توفیق کی تیزی پہ چڑھ ہمت کی لے تلوار آج

بارا اماماں کا محب سچل اگر توں ہوئے تو
ثابت رکہ اپنی صدق ہور ایمان ٹھار ٹھار آج

سلطان عبداللہ جو شیر خدا کا شبر ہے
مشہور اس کی داب کا دو جگ میں ...... آج

ایک اور قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں :-

ہر صبا باد صبا کا ہات میں جاروب لے
جھاڑ مالی سوں جا جھاڑ بن تیرا دربار گل

شاد تیری باد سوں جیکو رہے اس دنیا میں آج
سب ہے گھر اس کا گل انگن گل ہور دروا دیوار گل

خسرواں ہیں آج کے توں سب پنچم کا چاند گر

تج پہ نانہ یان کی اچھالیں گنبد وہ او کل

دیکھ کر بلند اقبال تیرے رستم رستاں کی سیار

تج دندیاں پہ آج باندے ہیں کمر تروار کل

......

زمرد فیروزی منگیں تج شاہ عبداللہ کون

وہ سوری فتح کا کہ ھر گھڑی ہر بار کل

تج مدن بھی کی چیتر چھتر پتی کے دور میں

کیوں نہ لیاوے باد ہری طبع کا گلزار کل

تازہ و تر، خرم و خنداں ا ننکے چھاوں میں،

آج سداوے شہ کدتوں شاہاں میں ہے اونار کل

اب غزلوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

عشق کی آگ میں جل کر راک ہونا ۔ عشقبازی میں چاک چاک ہونا

خاک ہونا تو سچ ہے آخر کو ۔ خاک نا ہوئے لک پیچ خاک ہونا

اس بجن کی وصال کے خاطر ۔ آرزو دل میں لاک لاک ہونا

دل کے آنکھیاں میں لانے نیں سر ۔ اس کی پلکاں منج تلاک ہونا

ہے غواصی تو عاشقانہ غزل ۔ یو غزل سنے دردناک ہونا

زمانے آج کے از ما کہ جاں ناں دیکھنا ہو توں

کہیں گفتار ہے تو کہیں رفتار نہیں تو نہیں

کسی کی تج کوں مستی ہور ہشیاری سوں کیا نسبت
تو اپنی ٹھار اچہ ہشیار کو ہشیاری نہیں تو نہیں
اگر کچ عشق ہے تجھ میں تو سر دیوانگی کر دے
برھیا بے سرو پا پھر سر و دستار نہیں تو نہیں
بجہ ہے قطب جہاں دکن کے شاہاں میں شریف اے دل
منجے اس کا پیار کافی ہے کس کا پیار نہیں تو نہیں

جس تل میں جا یو دل میرا تج گال پر کا تل ہوا
اس تل کی دولت تھے منجے حاصل صفا تلتل ہوا
دلدار یک دل کا منجے ملتا نہیں گر آج لگ
وہ دل ہوا تھا سو توں لیا تج سات مل یک دل ہوا
تیرا فراقی ہے جسکی تلتل اسے تلنی بدل،
گرم انجواں سو تیل ہور برھا سو جیوں پائل ہوا

پلا مدمست لے ساقی منج عادت ہے پینے کا
ہمیں سر خوش ندہ یک دیر تھے کر نگار نگ سینے کا
مرا جیو یو ہے اس جیو کی جیوں سیوں بسروں کیوں
کدہیں بسروں تو مرجاؤں پنا دوں ذوق جینے کا

ہیں جو مجنوں کے نمتی آپس بیابانی کیا عشق میں دانا ہے جب لوگاں میں نادانی کیا

عاشق کوں اس ہوا میں مدرنگ لال ہونا　　معشوق خوب عالی صاحب جمال ہونا
ہنج تیں کے چمن میں لے تازگی سے دل نے　　نازاں سکے پھل کی وہ نازک ڈال ہونا

ہے ترا زلف اے سمن اندام وام　　دیکھتا تجھ کوں تو ہوتا رام رام
سر لیا شوریدگی بلبل کے سار　　رُخ ترا بس خوب اے گلفام فام

زمانے آج کی مجنوں ہوا پیدا　　ہوا مشہور غواصی دکھن میں

اے دل آرام بیں جدھر جاوں　　دل کو تج پاس دھر جاوں

جو منجہ لگ آکے وہ صاحب جمال جاتی ہے　　تو لاک جنس کی غمزیاں سوں جال جاتی ہے
وہ دل سوں خوب میرا مدعا سمجھ کہہ ہی　　نہ سمجھی تیوں تج ستم آج ٹال جاتی ہے

خدا جو سب تے بڑا ہے ہور اس کی ذات بڑی
دیا ہے دولت ازل سے تیرے سنگات بڑی

مثنوی "چندا و لورک" کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :-

کہوں حمد میں پاک رحمان کا　　کہ او حسن زیب ہے ایمان کا
ثنا حمد اس کوں سرا وار ہے　　کہ وو جگ کوں پیدا کرنہار ہے

یہ تھی ایک حکایت عجب خوب تر　　رسالہ مرا خوب شہد و شکر
کہ یک شہر کا ایک تھا بادشاہ　　جہاں گیر عالم ہیں تھا شہنشاہ

بڑا مہربان عدل او شہریار — نیکو نام اوس کا سو پایا کنور
وزیراں سکتے خوب حسن کمال — بلبلاں ہزاراں سو تھے محل حالی
اوسیں کی ولایت بہوت بیشتر تھی — تنیں خلق داھان کی دنیادار تھی
اتھی اوس کی بیٹی تھی صاحب جمال — اتھا نام اوس کا سو چندا کمال

یو سن بات لورک کہا شاباسی — پکڑ ہات میرا کرم توں کرے
توں چندا ہیں لورک ہوں تو کر ذرا — بلار ور کہوں تجہ اوپر جیو میرا
کہی دونوں مل اختیاری یو کہت — لئے مال ہور ریاں تے نکلی اودیت
لے چندا کوں چوری سے باہر ہوا — سو او غلغل جگ میں ظاہر ہوا

غواصی یو کرتا کرم کی نظر — دعا حق سوں منگتا ہے میرے حق اوپر
بڑے فہم داراں میں کم فہم ہوں — کیا ہوں یو نادانگی سوں تمام
کرم کی نظر رکھ کم و بیش سوں — کہ پرورش اوس دل دجاں سوں لیا
ہزاراں درود اور ہزاراں سلام — بحق محمد علیہ السلام

غواصی شاعری میں اپنا کسی کو بد مقابل نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے آپ کو فنِ شعر میں بہت بلند مرتبہ خیال کرتا ہے۔ غواصی کے کلام کو دیکھنے سے اس کے کہنہ مشق شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ دو مثنویوں کے علاوہ کلیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا پرگو شاعر تھا۔ مثنوی سیف الملوک جس کے دو ہزار سے زیادہ شعر ہیں صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں تمام

۱؎ کتب خانۂ آصفیہ مثنوی نمبر ۵۲۳

کیا ہے۔ سراپا نگاری میں غواصی نے جو کمال دکھایا ہے وہ اس کے قادر الکلامی پر بخوبی دال ہے۔ غواصی کے کلام میں اس وقت کے رواج کے مطابق ہندی کے الفاظ زیادہ ہیں کلام سادہ ہے، تصنع سے پاک ہے، مبالغہ زیادہ نہیں ہے۔ اس کا بیان دل کش اور شاندار ہے۔

قصائد میں طمطراق اور زور بیان موجود ہے۔ لیکن زمانہ مابعد کے قصائد کی طرح بادشاہ کے اوصاف میں ہاتھی، گھوڑے، تلوار وغیرہ کی تعریف نہیں ہے۔

غواصی کی غزلوں کی تعداد کئی سو تک پہنچی ہے۔ ان میں تغزل بھی ہے اور اخلاقی مضمون بھی، سلطان قلی کی طرح اس نے بھی حافظ کی غزلوں کا دکنی غزلوں میں ترجمہ کیا ہے اس کے یہاں ہمیں مسلسل غزلوں کا کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ وہ غزلوں میں بھی اپنے بادشاہ کی مدح کرتا ہے، معشوق کی تعریف کرتا ہے، عشق و محبت کی داستان سناتا ہے۔ ساتھ ساتھ تصوف کے مضامین سے بھی اس کی غزلیں مملو ہیں۔ تخیل کی جولانی، خیالات کی پرواز، انداز بیان کی ندرت بھی پائی جاتی ہے۔

بہر حال غواصی کے کلام کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کا بڑا شاعر تھا بلکہ اُردو زبان کے شعرا کی صف اول میں اس کو جگہ دی جا سکتی ہے۔

غواصی کے مرثیوں کا تذکرہ دوسری جگہ کیا گیا ہے۔

(۶) احمد احمد بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ اس کی پیدائش اور وفات کے سنین سے ہم واقف نہیں ہیں۔ اس دور کے ایک مشہور شاعر ابن نشاطی اس کو استاد سخن کہتا ہے اور اس کے کلام کا معترف اور مداح ہے۔

احمد کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے ایک تو "لیلیٰ مجنوں" ہے اور دوسری "مصیبت اہل بیت"

اول الذکر مثنوی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ایما سے لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی ہماری نظر سے نہیں گذری۔ مؤلف "پنجاب میں اردو" نے اس کا ذکر کیا ہے اور نمونہ کلام[1] دیا ہے۔ دوسری مثنوی ہماری نظر سے گذری ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں لکھا گیا تھا[2]۔

(۱) مثنوی لیلیٰ مجنوں

اسس اللہ کے ناؤں سوں سب جگت | جو دانی دیا ونت اسس کی صفت
سراہنا سب اللہ کوں جسم قرار | جو جگ دہنی ہور پروردگار

محمد قلی قطب شاہ شاہاں | جسے چرن سیوک شاہانہ جواں

جو منج بخت کوں فتح یاور ہوا | سو منج بخت کا سیوک انبر ہوا
جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر | منج غم کی بندگی تھے آزاد کر
دیتے امر علی کی یہ باغ لاؤں | جو بالوں اسے ست امریت ناؤں
جو میں شہ کا امر سر پہ لیتا | نرت باغ لانے شتابی کیتا
جو احمد کرے اس دہر بن سنگار | سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

مجنوں کا باپ جنگل میں جاکر مجنوں کو تفہیم کرتا ہے۔

کیا پوت کا سکہ دکھن آس سو | رہیا پوت کے دکہ سوں نراس سو
تری آگ تھے جیو میرا جلے | تری آہ تھے مرم ہور تن جلے

---

[1] پنجاب میں اردو، صفحہ (۱۷۱) طبع اول [2] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ (۵۷ تا ۷۹)

کیستا توں جلے ہور جالے منجے — ہنسیا کیا گلے ہور گالے منجے
جو توں ہے پیا تیں ہنج کوں — ہنسوں کیوں جو روتے دیکھتیں کوں
میرا جیو ہے توں میں کر لاٹ لے — جلے جیو جس کا سو کیوں نا جلے
رکھیا آس جو توں بسا دے محل — نچا نیا کہ توں یوں جگا دے جنگل
جو گھر چھوڑ جنگل بسانے لگیا — سو تج تھے جنگل ہور جنگل بھی جلیا

نہیں باج حکمت پکچ اس کا کھیا — نہ بن مصلحت کچ لیا ہور دیا
بھو نیک مراداں نہ ہوئے مرحمت — سو اس ہیں اچھنیں خبر ہو مصلحت
کس پر سو نعمت بلا ہو بھرے — کس کوں بلا دے سو نعمت کرے
نہ اس تھے بلا دیک نہ آس ہو رہے — نہ نعمت کوں بھل کر ستی دہات کرے

میری خاک ہیر تھے جو اپجے نہال — دغا کے لگے پھل پھل ڈال ڈال

جو روشن کرے رات کوں آہ سوں — سو ہوئے روشن دین کی راہ کوں

سنئے کی چھوری ہوئے توں کیا ہوا — نہیں پیٹ میں مار لینا روا[۱]

---

(۲) مثنوی مصیبت اہل بیت

سنو قصہ مصطفےٰ کا جو ہے سرور انبیا — جن کے واسطے پیدا ہوا دونوں عالم دین دنیا
حق کا ناؤں ہے عرش اوپر رحمۃ للعالمین — اول ان کو پیدا کر بعد از کیا دنیا دین

---

[۱] اورنٹیل کالج میگزین لاہور نومبر ۱۹۲۵ء مضمون محمود شیرانی

دیکھ یاراں معصوماں پہ وقت کیا آپڑیا　　　پر دیس جلنے طفلاں او پر کیا مشکل اگیریا
دو تو فرزند مسلم کے اُٹھے چھپکر قاضی پاس　　　دو کر قاضی کا پر یا گر سوں پکڑ اپنی جیو کی پاس
کوٹوالیا نے لائے پکڑ کر عبداللہ کوں دے خبر　　　بھیجیا ان کوں بندیخلنے کہیا رکھو قید کر

پھر خوش ہو علی اکبر کافراں پر جا پڑے　　　ذکر دہ کر سب پڑیاں تیر تفنگ سوں آڑے
پیادے ہور سواریاں را مار تو تے یکبار تمام　　　تو زخمی کر علی شہ کوں کیتے کافر اپنا کام
مارا یا نیزا ابن نمیر نے علی شہ کوں اس وقت　　　پچھیں منقل ابن مرت زخم کیتا آسخت
اس زخم سوں علی اکبر تیرے سینے کپڑ پڑے　　　یک جوان پر فوجاں جمع کر سنگل کافر آئیٹے

قطبی (۷) قطبی کے متعلق بھی ہمیں معلومات بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب "اردو شہ پارے" میں اس کی کتاب 'تحفہ' کا ذکر کیا ہے جو خواجہ نصیر الدین کے مرید شیخ یوسف کی کتاب 'تحفۃ النصائح' کا دکھنی ترجمہ ۱۰۴۰ھ[۲] میں کیا تھا اور تذکرہ اردو مخطوطات میں تحفۃ النصائح کے مترجم کا نام رازی لکھا ہے۔[۳]

مؤلف اردوئے قدیم نے ملا قطبی کو عبداللہ قطب شاہ کا معاصر اور تحفۃ النصائح کا مترجم قرار دے کر کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔[۴] اس سے معلوم ہوتا ہے "تحفہ" کے نام سے دو اشخاص نے کتابیں لکھی ہیں۔ ایک تو ملا قطبی جس کے کلام کا نمونہ مؤلف اردوئے قدیم نے پیش کیا ہے اور دوسرا رازی جس کا ذکر "تذکرہ اردو مخطوطات" میں ہے۔ دونوں اصحاب نے جو وضاحت اپنی کتابوں میں کی ہے ان میں سے اکثر باتیں مشترک ہیں۔

---

[۱] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۷۵ تا ۷۹ [۲] اردو شہ پارے صفحہ ۱۰۶
[۳] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۳۵ [۴] اردوئے قدیم صفحہ ۶۷

ہم نے "دکن میں اردو" کی تیسری اشاعت میں رازی کی جس کتاب کا تذکرہ کیا ہے وہ ڈاکٹر زور کی تحقیقات کے لحاظ سے بیجاپور کا شاعر ہے۔ چونکہ اس کے متعلق مزید معلومات نہیں ہیں اس لئے سرِدست اس کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

قطبی کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :-

بولوں صفت میں بے گنت	اُس خالقِ جن و بشر
ندھار کر اسمان رکھیا	سورج ستارے ہور چندر
بندی جدرگی عرش کوں	پنکھے اڑے یک پائیتے
جوں پیچ برساں چار سو	انپڑے بزاں پائے دگر

مؤلف اردوئے قدیم قطبی اور رازی کو ایک ہی شخص قرار دیتے ہیں کیونکہ دونوں تخلص اس مثنوی میں موجود ہیں، چنانچہ :-

نازش جہان میں میں کیتا	کیتا برائی کے جو بھی
قطبی دھریا امید یو	لایا ہوں سب صاحب نظر

بنرباں میں سب کم تر بندہ	رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکنی زباں	شہ کی رضا سے سیس دھر

تاریخ تصنیف کے اشعار :-

ہجرت تھے دس سو سال ہور	چالیس پر بھی پانچ اتھے
تب یہ مرتب سب ہوا	تحفہ سو دکنی نامور[1]

[1] اردوئے قدیم صفحہ ۶۷، ۶۸

اسی طرح قطبی تخلص کے اشعار ہیں، چنانچہ اردوئے قدیم میں ان کو حسب ذیل لکھا گیا ہے:۔

نازش جہاں میں ہیں کیتا　　کیتا برائی کے جو بھی

قطبی دھریا امید یو　　لایا ہوں سب صاحب نظر

دفتر دیوان و مال کے مخطوط میں شعر اس طرح ہے:۔

نازش جہاں میں ہیں کیتا کیتا برائی کے بھی

قطبی دھریا امید یو لایا ہوں سب صاحب نظر

میں قطبی اور رازی کو ایک ہی شاعر تصور کرتا ہوں اور ان کا نام غالباً قطب الدین تھا جیسا کہ ایک شعر میں صراحت ہے۔ انھوں نے اپنے مرشد شاہ ابوالحسن کے حکم سے ۱۰۴۴ھ میں خواجہ یوسف کی کتاب تحفۃ النصائح کا دکنی ترجمہ تحفہ کے نام سے کیا۔ یہ شاہ ابوالحسن بیدری ہیں جو بیجاپور میں تشریف لے گئے تھے۔ تحفہ میں ۱۵ باب ہیں۔ پورے ترجمہ کے بعد آخری باب میں رازی یا قطبی نے اپنے تخلص اور اپنے مرشد وغیرہ کی صراحت کی ہے۔ کسی قدر نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ہوئے جو بالغ آدمی حق بوجنا ہے فرض اس

ایک سچ بیشک ہے خدا اس باج بھی نہیں کوئی مگر

بن یوں ہو دونوں حضرت خدا مانند شباہت نا دھرے

ہرگز جنیا نہیں اور کسی ناماں ہے اس کوں نا پدر

عورت نہ ان پانی دھرے حاجت کدھیں نا س کھری

جیسا ہے ویسا نت سدا نند نہ اوس غفلت بسر

تحفہ اصل اسے فارسی سب ترجمہ دکھنی کیا
صاحب سو دیا ابن کے شہ ابوالحسن فرمائے پہ
بناپاں سب کمترا ہے رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکھنی زباں شہ کی رضائے سیس پر
بندہ تو سب پڑعیب ہے جیوں شاہ بخشے عیب توں
بندہ نوازی شاہ سوں او عیب ہووے سب ہنر
ہجرت تھے دس سو سال ہور چالیس پر بھی چار تھے
تب اسے مرتب سب ہوا تحفہ دکھنی نامور[1]

اس سے واضح ہے کہ یہ کتاب ۱۰۴۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

(۸) **سلطان**:- سلطان بھی اسی دور کا شاعر ہے، دیگر شعرا کی طرح ہم اس کے نام سے واقف نہیں ہیں۔ سلطان میراں شاہ معروف کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اسی دور کے ایک شاعر افضل نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

میراں شاہ معروف او دستگیر   کہ دل میرا کہ پاک روشن ضمیر
دیئے دست پنجہ بھرے سات میں   دیئے منج کو سلطان کے ہاتھ میں

(محی الدین نامہ)

سلطان ایک صوفی بزرگ تھے، ان کے کلام میں پختگی ہے، تنوع ہے، زبان پر قدرت ہے۔ ان کا کلیات کتب خانہ آصفیہ اور ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ

---

[1] مخطوطہ زفرہ بودن رسالہ۔

میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

اوس پاک عشق بانہ کوں جب تہہ کا اثر ہوا
تب نور ذات جوشش ہوا نہ گنج بر ہوا
تس نور ذات نام رکھیا احمد وصفات
سو وصف کی زبان ستی کن کا اچھر ہوا

اشعار کہ نانوں سمجھ سلطان بن مجھ نظم کوں
ہر حرف میں بار یک تر ہے معنی اسرار عشق

مجھ غزل سن تو تجھ یک سلطان رچھیا ہو کہا
نظم ہیرا سن کہے سب شعر گویا ہے لذیذ

تس ذات کی رے بحر تے قابل ہو جب تے گل ہوا
تب صفت سوں موجاں ایل تس بحر میں یک کل ہوا
میخانہ میں تجہ زلف کے تسبیح اکہ کل بری
مے خوار تھا اول اتیا اوس کی سبب زاہد ہوا
تج حسن احسن روزتے بولیا کہ میں مشہود ہوں
اوس روز تے دیا کہ ایمان میرا جب شاہد ہوا
میں عبد توں سلطان ہونہ نیکی سدا کرنہ ہم تھا
منج جب دیکھیا توں میں نہیں تب جا کہ توں واحد ہوا

تج حسن کا جہان تے تبن میں مہر ہوا
میرا رے دل سو تج کیں تو یاں تج گھر ہوا

حسن زیبا ہے ہر جاگہ دلے بینا نظر ہونا
دسے گا حسن ہر جاگہ دلے دیکھن بصر ہونا
نہیں ہر ٹھار ریکھنگی مگر کہ عشق عاشق ہے
دلے بینا منی اپنی اول بنہ کا اثر ہونا

اے دل نہ ہو توں غافل اب ہوش دار باد
عشقِ خدا لے دے کر ناکر بچپار باد

علما تمام مل کر پڑھتے ہیں کئی کتاباں
پر نیکہ علم مجھ کوں تجہ اب وہ کا سفر بس

توں فنا ہو یا فنا ہے، یا بقا ہو توں بقا ہے
یا خدا ہو توں خدا ہے زاں مقام آزاد باش

---

(۹) **بلاقی** سید بلاقی نام اور بلاقی تخلص، یہ بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ جہاں تک معلومات ہیں ان کو شاہی تقرب حاصل نہیں تھا۔ مذہبی آدمی تھے، ان کی ایک تصنیف معراج نامہ دستیاب ہوا ہے جو یورپ[۱] اور حیدرآباد[۲] کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں کئی نسخے ہیں۔

---

[۱] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۲۶ طبع اول

[۲] ملاحظہ ہو تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۲۷

معراج کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ۱۰۸۰ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ پندرہ سو سے زیادہ شعر ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :-

اول نام اللہ سو بولوں احد ثنا و صفت اس کی ہے بے عدد
ثنا اس پرنت منزاوار ہے کہ نہار قدرت ہیں کرنار ہے
کیا چاند سورج ستارے فلک زمیں، آسماں، حور، جن و ملک

کہ پہلے سما کے سو دربان کوں کہا کھول بیگی سو دروازہ توں
سو دربان بولا کہ توں کون ہے کہ آیا ادھی رات کیا کام ہے
کہا ہیں جبرئیل کچھ کام تھا گیا تھا زمیں پہ جو فرمان تھا
کہ دربان بولا وجا کون ہے کہ محبوب حق کا نبی خاص ہے
کہا مرحبا بیگی در کھول کر تجھے دیکھنے ہیں کھڑا منتظر
کہ اپڑاں پہلے طبق کے ملک دیکھے نور کا واں پڑا سب جھلک
کہ صلوات بولے دیکھے سلام دیئے جواب ان کو علیک السلام

بلاقی نے اس معراج نامہ کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے چنانچہ اس کی صراحت موجود ہے :-

بتی سوں امت سب کوں ساچی ہو صادق سات کلمہ نبی کا کہو
کہ معراج نامہ کے سنیو خبر حکایت جو بولا ہوں ہیں مختصر
کیا فارسی کو سو دکھنی غزل کہ ہر عام ہور خاص سمجھیں سگل

جو سید بلاقی نبی کا غلام	قصہ یو کھیاں ہیں لطف سوں تمام
ہزاروں درود اور ہزاروں سلام	بحقِ محمد علیہ السلام[1]

(۱۰) **جنیدی** :- اس کا نام احمد تھا اور ماہ پیکر ۱۰۶۴ھ میں لکھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ اس نے شاعری ترک کر کے برہان پور میں اقامت اختیار کر لی تھی۔

ڈاکٹر زور کی رائے میں وہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر تھا اور علی اکبر اس کا نام تھا[2]۔

اس کی مثنوی کے دو نسخے کلکتہ میں ہیں۔ ایک امپیریل لائبریری میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں۔

کلام کا نمونہ پیش ہے جو پروفیسر محفوظ الحق کے مضمون سے اخذ کیا گیا ہے، کیونکہ مثنوی ہماری نظر سے نہیں گزری۔

کہ احمد جنیدی پہ کر لیں کرم	وشرسے ناؤں لب پر محمد جرم
رکھیا ماہ پیکر سو اس نیک نام	الٰہی توں کر اس نظم کوں تمام
کہ ملک باغ میں گال گل لالہ وو	کہ تل باغباں ہے واں رکھوال ہو

سنیا صاف انبوٹ تے ہے نار کا
کہ جاگا ہے مقبول پتہ کار کا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات [2] اردو شہ پارے [3] محفوظ الحق

یا انار کسی دال ہے نار او | وہ جوبن کلیاں نار اس تھار او
کہ تیہ باغ میں پھل وہ اوتار ہے | کہ یا حسن کیاں نارنگیاں بار ہے

اناراں سکے جھاڑاں کلیاں بار تھے | کہ لالی میں یاقوت سکے سار تھے
کہ آئے بتھے جھاڑاں کو انار بار | رسیلے نکالے تھے جوبن کے سار
سو چولی نمن بات ان کے اوپر | رکھے تھے چھپا کر سو ان کے بہتر

یا ایہا الذین آمنو! آیات ہے | یہی حکم حق کا سو دل سات ہے
کیا ہے سو فرقان میں یو حکم | کہ ان میں ازواجکم واولادکم
خدا کا امر بھی اسی وارث ہے | کہ یوم لا ینفع مال سو آیات ہے

(۱۱) ابنِ نشاطی

اس[1] دور کا ایک اور مشہور شاعر ابنِ نشاطی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کا اصلی نام اور سنہ پیدائش و وفات سب کچھ پردۂ اخفا میں ہے۔

مصنفینِ یورپ نے ابنِ نشاطی کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ہے اور مشرقی تذکرے بھی ساکت ہیں۔ خود اس کی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا معزز عہدے دار تھا۔ نثر نویسی میں مشہور۔ پھول بن کی مثنوی لکھنے سے پہلے شعر گوئی کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ وہ غزل گو شاعر تھا۔ وہ مثنوی ہی سے اپنی شہرت کا طالب ہے۔ وہ اپنے ہمعصر شاعروں سے اپنے کلام کی داد نہیں چاہتا بلکہ اپنے پیش رو شعرا فیروز، محمود، احمد اور شوقی[2] کے کمال کا معترف ہے۔

---

[1] طبقات الشعرا [2] شوقی کا ذکر دورِ عادل شاہی میں بیان کیا گیا ہے۔

اب تک اس کی تصنیفات سے صرف مثنوی پھول بن کا پتہ چلا ہے جو ایک فارسی قصہ "بساتین" کا ترجمہ ہے۔ اس کی تصنیف سنہ ۱۰۶۶ھ میں ہوئی ہے۔ ابنِ نشاطی نے صراحت کی ہے کہ اس کو تین ماہ کی مدت میں پورا کیا ہے۔ اس کے سترہ سو شعر ہیں۔ بقول بعض سنہ ۱۰۶۰ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے۔

مثنوی پھول بن میں لفظی و معنوی ضائع و بدائع کا استعمال بہت ہوا ہے۔ ساری کی ساری مثنوی مرصع ہے۔ جیسا کہ خود مصنف نے بیان کیا ہے علم معانی کے اصول کے موافق انتالیس قسم کی خوبیاں پیدا کی گئی ہیں۔ مناظرِ قدرت اور مختلف واقعات کے جو منظر پیش کئے ہیں اور رزم و بزم کے جو حالات بیان کئے ہیں وہ ابنِ نشاطی کے قادر الکلامی کے شاہد ہیں۔ مثنوی کی زبان اور اس کا اندازِ بیان، اس کی سادگی بھی قابلِ تعریف ہے۔ بقول آغا حیدر حسن پروفیسر نظام کالج نصرتی کی مثنوی گلشنِ عشق قصے کے تسلسل اور بلند خیالی میں تو اس سے بڑھ جاتی ہے لیکن سلاست اور روانی میں اس کو نہیں پہنچتی[1]۔

کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اس مثنوی کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو سنہ ۱۱۹۳ھ میں لکھا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو اور حیدر حسن صاحب کے پاس بھی اس کے نسخے موجود ہیں۔ یورپ میں اس کے تین نسخے[2] ہیں۔ اب یہ مثنوی مجلس ادارہ مخطوطات کی جانب سے شائع ہو گئی ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

اول میں حمد رب العالمین کا	دل و جان سوں کہوں جاں آفریں کا
خداوندا تجھے ہے جم خدائی	ہمیشہ تجھ کوں ساجی کبریائی

[1] رسالہ تحفہ

[2] دیکھو یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۸۰ تا ۹۰)

محمد پیشوا توں سروراں کا | ہے عمر خیل سب پیغمبراں کا
کروں تعریف میں اس تاجور کا | سمجھتا ہے جنے قیمت گہر کا
شہنشاں کا شاہ عبد اللہ غازی | اچھو جم جم حق سوں اس کے پیش بازی

بسا تیں جو حکایت فارسی ہے | محبت دیکھنے کی آرسی ہے

مرا تھا باپ سوداگر ختن کا | نہ تھا پروا اسے کچ مال و دھن کا
بڑا تھا بہوت سب سوداگراں میں | اتھا مشہور سالم بندراں میں
ہو کر مشہور تھا سوداگری سوں | کتے تھے کار رواں سالار اس سوں
پڑے تھے اس کنے جہراں کے انبار | دیگاں سوں تھے روپیے ہور دینار

اتھی اس ٹھار یک زاہد کوں بیٹھی | فرشتہ خوی تس عابد کوں بیٹھی
چتر چنچل سر ک کنٹل سہانی | نہ اس کوں کوئی تھا عورتاں میں ثانی
چندر آدھا کہوں میں کیوں پیشانی | چندر آدھا نہیں ویسا نورانی
بھنواں کے کیوں کہوں محراب تھے کر | کہاں دو نوں محراباں کے اوپر
نین کوں نرگساں کہنا ہے نا ساز | چمن کے نرگساں میں کالی ہے دو ناز
کہوں رخسار کوں کیوں اس کے لالا | ہر ایک لالے کے درمیانی ہے کالا
بھی سرتے پاؤں لگ اس موہنی کا | کہ تھا تیوں کیا صنعت کر تی سکوں گا

یکایک دو طرف فتنہ اٹھیا جاگ | اتھی دو دھرتی جھگڑے کی سلگ آگ
ملے ہر حال آ کر اجسد تھا دم | ہوے دو دھرتے ٹٹ پیٹ بلا دو

سلح پوشاں کی یوں دستی تھی فوجاں — لگیا قہر کے دریا پو موجاں
دلیراں کے دسے یوں تن پہ جوشن — غضب کی آگ جیوں کہتی ہیں روشن
دلیر سیوں دلیراں ہات ہیں ہات — ملائے گرز ہور شمشیر کے سات
لگے سٹنے سراں پر دوا سر کان — کنگوریاں پر پیش جیوں چور سر کان
ٹھناٹھن دیکھ ہور سن کر کھناکھن — لئے داتاں ہیں انگلی مردھرت کھن
لگیا تیراں سوں ہور بہالیاں سوں آکام — کٹے چھاتیاں کی سب ٹیاں کوں پیغام
بتے تیراں سہے سینی کے سپران — جھجر ہو کر ہے سینے کے سپران
ہوا ایسا شغاشغ ہور فشافش — زمانہ کہا یہ ہو کر کیا غش
دریا ہو کر ابلنے کوں لگیاں خون — اجل بچوا کہ جا بیٹھی پھرامول

ہوا اس ٹھار پر عالم تیا ٹھار
چلیا دیکھ ہو کہ عزرائیل[1] بے زار

ابن نشاطی کی صرف ایک مثنوی دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی غزلیات، قصائد نا پید ہیں۔ اس مثنوی میں ایک غزل موجود ہے جو حسب ذیل ہے:-

رہے تازہ چمن پیوستہ میرا — شگفتہ ہے سدا گلدستہ میرا
لطافت میں ہے جیوں خوباں کی ابرو — ہر یک مصرع جو ہے برجستہ میرا
دیا ہے جگ کوں نُقل یک طرف تے — ہے یو بازچہ دو رستہ میرا
بہوت خون جگر کہا کر ہوا گل — کلی نتی جو تھا دل بستہ میرا

کرم سوں حق کے پایا آج راحت
فلک سوں تھا جو خاطر خستہ میرا

---

[1] پھول بن۔

ابن نشاطی کی مثنوی پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ بلند پایہ ہے ۔ اور اس زمانہ کی بہترین نظموں میں اس کا شمار کرنا چاہیئے ۔ ابن نشاطی نے اپنی مثنوی میں جو کردار کا نمونہ پیش کیا ہے قابل قدر ہے ۔ زبان کے لحاظ سے یہ بہت صاف ہے ۔ اس کے اسلوب بیان میں ندرت اور جدّت پائی جاتی ہے ۔ اور کلام میں درد اور اثر موجود ہے ۔ ابن نشاطی نے پھول کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے ۔ بہرحال گولکنڈہ کے شعرا کی صفِ اول میں اس کو جگہ دینی چاہیئے ۔

(۱۲) **طبعی :** طبعی، سلطان عبداللہ قطب شاہ کے آخر دور کا شاعر ہے ۔ اس عہد کے دوسرے شعرا کی طرح ہم اس کے پورے حالات سے باخبر نہیں ہیں ۔ اس کی مثنوی سے جو امور ظاہر ہوتے ہیں ان سے پایا جاتا ہے وہ خاص دکھنی شاعر تھا ۔ وہ نہ صرف شاعر بلکہ بلند پایہ مصنف بھی تھا ۔ اس کی مثنوی اس کی سلیقہ مندی اور اعلیٰ قابلیت کی بین شاہد ہے ۔ وہ اپنی شاعری کی خوبیوں کا خود معترف ہے ۔ اور اپنے معترضین پر سخت سے سخت چوٹیں کرتا ہے ۔ مگر اس کے ساتھ اپنے پیش رو شعرا کی تعریف بھی کرتا ہے ۔ اور ان کے کلام کا قائل ہے ۔ اور داد دیتا ہے ۔

طبعی سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا درباری شاعر ہے ۔ وہ جگہ جگہ اپنے بادشاہ کی تعریف کرتا ہے ۔ اس کو شاہ راجو حسینی سے بھی عقیدت ہے بلکہ ممکن ہے ان کا مرید بھی ہو ۔

اس کی ایک مثنوی قصہ بہرام و گل اندام ہے جس میں ایران کے بادشاہ

بہرام گور کا قصہ منظوم کیا گیا ہے اس کی تصنیف ۱۰۸۱ھ میں ہوئی ہے۔

طبعی کی مثنوی اس کے کہنہ مشق شاعر ہونے پر دال ہے قصہ کی ترتیب تسلسل اور طرز بیان کی جدت قابل ستایش ہے۔

یہ مثنوی نایاب ہے اس کے نسخے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ برٹش میوزیم لندن میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔[1]

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

الٰہی یو طبعی ترا داس ہے
دے ایمان اس کو تیرا آس ہے

محمد نبی توں خدا کا رسول
یو پیغمبران باغ تھے توں سو پھول

شہ بوالحسن سچ توں شاہ دکن
تجے شاہ راجہ مدد بوالحسن

دیا ہے خدا بادشاہی تجھے
سہاتا ہے ظل الٰہی تجھے

شہنشاہ توں آج دن سو ہے
ترے پرتے شاہاں بلا دور ہے

ملاحت میں جیوں سورچندر ہے توں
صلابت منے جیوں سکندر ہے توں

روایت کیا راوی نیک نام
بھوت خلکہ سوں یو حکایت تمام

اتھا روم کے شہر میں بادشاہ
کہ مردانے ویسے بھوت تھے ہور سپاہ

وہ شاہ بھوت مقبول عاقل اتھا
سخی ہور فاضل او کامل اتھا

سوا لاک تھے اس کو ترکی غلام
جو الماس تھا نیک ان کا تمام

جو حبشی غلاماں سوا لاک تھے
او نیلم کے جیوں حسن میں پاک تھے

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۹۰ تا ۹۹۔

اگرچہ او شاہ جہانگیر تھا ۔ نہیں ہے کہ فرزند دلگیر تھا

ہوں شاہ بہرام خوشحال ہو ۔ کہ جوں پھول لالی نمن لال ہو
پریاں کے ہور باپ کے پاؤں جا ۔ گل اندام کوں لاکو فدیاں پو پا

غزل

تیرے ہات میں شاہ جم جام اچھو ۔ ہمیشہ بغل میں دلارام اچھو
جگت کے شہاں میں توں اچھ نیک نام ۔ کہ دشمن تیرا ہے سو بدنام اچھو
چندر سور کے جام ستے آسماں ۔ تجلے غسل کرنے کوں حمام اچھو
اچھو سب سلامت عزیزاں تجے ۔ جہاں لگ عدد میں سو کم نام اچھو

اچھے لگ گگن ہور زمین پہ قرار
تیرے ایک پو قربان بہرام اچھو

(۱۱) **اولیا** : اولیا[1] بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ سلطان ابوالحسن تاناشاہ آخری بادشاہ گولکنڈہ کے دربار سے اس کو تعلق تھا۔
قصہ ابوشحمہ کے نام سے اس نے ایک مثنوی سنہ ۱۰۹۰ھ میں مرتب کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس[2] میں بھی ہے۔ اس میں حضرت عمر کے فرزند ابوشحمہ کے متعلق ایک قصہ درج ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

عمر کو ان جو اس وقت فرزند ایک ۔ خدا نے دیا تھا او دلبند ایک
انھا حسن میں جوں او آفتاب ۔ کہ روشن ہوا اس تے یو ماہتاب

---

[1] مثنوی بہرام و گل اندام۔ [2] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۶

عجیب خوبصورت اور دل دار تھا | عمر کا جو اس پر بڑا پیار تھا
ابو شحمہ سر نانوں اس کا رکھے | دنیاں میں نہیں کوئی ویسا رکھے

صحابی جتے تھے سو دلگیر ہو | عمر کوں کہے غم ستی تقصیر ہو
کہ شحمہ کوں بخشو تمیں پیار کر | دگر نیں تو ہنا سٹو مار کر
کہ شحمہ بدل سب کوں مار دشمن | اس مشکل ستے بہار کا پر وتمن
اصحابیاں کوں سمجھا کو بولے عمر | شریعت کے باتاں کوں کھولے عمر

اصحابی جتے تھے اپن ٹھار ٹھار
بھے رونے لگے سب وہاں زار زار

ہمارے خاندانی کتب خانوں میں بھی اس کے بعض نسخے ہیں۔

(۱۴) **خواص**: خواص بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ غالباً خواص علی اس کا نام تھا۔ شاہی تقرب حاصل نہیں تھا۔ یہ درویش منش تھا۔ صوفی شاہ قادری سے بیعت حاصل تھی، ان سے خلافت بھی پائی تھی۔[۱]

اس کی ایک مثنوی انڈیا آفس[۲] میں موجود ہے جو قصہ حسینی سے موسوم ہے۔ اور سنہ ۱۰۶۰ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق ایک فرضی قصہ لکھا ہے، مگر آخر پر شہادت کے حالات مذکور ہیں۔

کلام کا نمونہ درج ہے:-

توں سبحان ہے پاک پروردگار | سدا ایک ہے توں اسے برقرار

---

[۱] یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۲ - [۲] یورپ میں دکنی مخطوطات ۱۰۷ تا ۱۱۷

اگر چاہے دولت دنیا دا کون — سو کرنا یزید کوں نکاح آج قول
وگر چاہے صورت حسن دار توں — نکاح کر توں قاسم بن عباس کوں
اگر چاہے توں حق نے رحمت کرے — بہی دنیا ہو رہ عقبیٰ اپنے سر پرے
سو کرنا نکاح توں حسن جان کون — بولیا یو ہمارا سو سچ ماں توں لی

اٹھا غلغل تب او تکبیر کا — اتھا شیر بالک حسین شبر کا
پریا جا غنم پر سو او تہر ہو — چسلیا مارتا زہر پر زہر ہو
لگیا تو رسنے سبے ضرب بے شمار — منہ طباں نٹ غنیم کہاں پٹے ٹھار

کیا سب وندیاں تیرات تل اپر
ماریا چہار صد سوار جنگی بشتر[۱]

---

(۱۵) **غلام علی:** غلام علی بھی تانا شاہ کے دور کا شاعر ہے وہ اپنے نام ہی کو تخلص کے بجائے استعمال کرتا تھا۔ غزل نما نظموں کی اس کو کافی مشق تھی۔ اس کی ایک مثنوی پدماوت نام انڈیا آفس کے کتب خانہ[۲] میں ہے، یہ مثنوی ۱۰۹۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ پدماوت کا قصہ مشہور ہے جو مختلف زبانوں میں منتقل ہوا ہے۔ اس کی پوری تفصیل ہماری تالیف یورپ میں دکھنی مخطوطات[۳] سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

کہ ہے سب جگت منے سات دیپ — سنگل دیپ اس میں کا ہے ایک دیپ

---

۱ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۱۔
۲، ۳ " " " " ۱۱۸ تا ۱۴۰۔

کہ او دیب میں ہے سنگل پدمنی — نہ چنت نہ ہستن نہیں سنکنی
سنگل دیپ کے نار کا بات ہے — سنو میں کہوں گا او کس دہات ہے
اتھا ایک راجا سو بہو کن گنبیر — سنگل دیپ کے ملک میں بے نظیر

غلام علی جس سوں دل لائے — بچھڑنے سوں بہتر جو جیو جائے
کتے خون دل سوں سو دل لاڑنا — تو یک تل منے توڑ کر جاوڑنا
جناور کے جلنے سے دک پائے — تو انسان خاطر نہ غم کھائے

چلیا اوڑ کے سات دریا گزر — تماشے جو دیکھا ہر یک ٹھار ٹھار
بنگالے میں یک خوش باغ تھا — جو جنت کی دل رشک سوں داغ تھا
اترو ان لگیا سیر کرنے کتیں — جو میوے کے جھار ال پو پڑنے کتیں
دہاں کی قدیمی جو رانوی اتھی — ہیرامن کوں دیک آئی ملنے وتی
دیکھے جوں یو ہے بھونت شیریں کلام — ہوی بھونت خوشحال راتوں تمام

منگا کر ہیرامن کوں پوچھیا یو بات — کہیا ہیر سب ٹھار اچ سات
کہیا میں یو مطلب کتیں پائیا — نجومیاں کہے سو بجا آئیا
ہوا دل کوں تحقیق یو بات سب — جو بولیا اتھا پیر جس دہای تب

غلام علی نیں دنیا میں دفا — کدہیں ہے خوشی ہور کدہیں ہے جفا
کہ جوں کاندکا ہے چہ نا زندگی — تو ہرگز نہیں کس کوں پائندگی
دنیا کا لیوے کام کوئی سرا دیر — پھرے او کتے کے منن دربدر

دودن کا سو جینا نہ کر پائمال	توں ہٹ حرص کوں جو ہے خوشحال[1]

(۱۶) سیوک: سیوک[2] کو بھی اسی عہد سے تعلق ہے اس کے متعلق بھی ہمیں کچھ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ اس کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ یہ شیعہ مذہب کا پیرو تھا۔ اور اسی دور کے ایک دوسرے شاعر لطیف سے اس کی چشمک بھی۔ جنگ نامہ، ایک مثنوی اس کی تصنیف ہے، اس میں ایک فرضی داستان منظوم کی گئی ہے جس کے ہیرو محمد بن حنیفہ ہیں۔ اس کی تصنیف ۱۰۹۲ھ میں ہوئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ ڈاکٹر بلی کے خیال میں یہ مثنوی ابوالقاسم مرزا کی مصنفہ ہے۔

نمونہ کلام پیش ہے:۔

حنف شاہ کھڑے باند لشکر کی صف	کھڑے باند کر شاہ فرزند نجف
ادھی دین یزیدی آ نکے بادل	نکے بادل ٹہار پر تہمادل
حنف شاہ اوٹھائے تہ نگاں سگل	سو بھائیاں عزیزاں برادر سگل
سو لشکر میں لشکر ملائی کیا	بشر میں بشر کھل بلائی کیا
اوٹھیا ہاں کہ ہنکار چو ر بیب تے	اوٹھیا شور چودہر تے جو د آ فنے
لگے مار پیٹ واداں کھیل	حنف شاہ کے مومن سوداں سگل
سو اتنے میں طوغان موغان آئے	نرک داک پر و دس ہزاراں اد لائے

یو جنگ عظیما کیا سر بسر	نہی تاریخ نہ دہماں جان خیر البشر

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔
[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۴۔

یوسیوک تو ہجری کرے سال تھی	ہزار یک نو دو کے ایرال تھی[1]

(۱۷) **فائز:** فائز گولکنڈہ کا شاعر ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ دوسرے شعرا کی طرح شاعری اس کا پیشہ نہیں تھا بلکہ شوقیہ مشقِ سخن پیدا کرلی تھی۔ سنہ ۱۰۹۴ ھ میں اس نے ایک مثنوی رضوان شاہ و روح افزا نام تصنیف کی ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ یورپ[2] میں بھی اس کا نسخہ پایا جاتا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

اول نام حق کا لے بولوں سخن	بندہ ہوں اس کی توحید کہو لوں سخن
ہے اللہ معبود برحق قدیم	کہ رحمٰن بھی خلق پر ہو رحیم

ولے شاہ کا دیکھ دیدار میں	پلک زد منے ہوئی گرفتار میں
مرے دل منے سوز پیدا ہوا	درد عشق کا دین ہویدا ہوا
بوباد باراں مرا جیو سب	مرے دل میں ہو کلاٹ بیٹھا عجب
میں باتاں منے گڑبڑانے لگی	مری جیب بھی لٹ پٹانے لگی
مرے موں پہ کی لالی شتابی گئی	مری بھوک بھو بچ شتابی گئی
پھرے چاند ہر نس مرے آس پاس	کرے نور مکہ سوں مرے اقتباس
وجاہت منے جو کون جوڑا نہیں	مرا حسن دنیا میں تھورا بہیں
ولے جب جو دیکھی ہوں شہ کا جمال	مرا حسن لیسری ہوا نیں مجہ میں جمال
بغیر وصل دل نا پکڑے قرار	کرے نیں ہوں یو بات کیں آشکار

---

[1] تاریخ ادب اردو انگریزی۔

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات

تجھے جان محرم کہی ہوں یو راز　　　قصہ بول شہ کا توں نا آکو باز

(۱۸) **لطیف**[۱]: غلام علی خاں لطیف سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ہوا ہے، اور امرائے قزلباش سے تعلق تھا۔ شاعری تفنن کی خاطر کر لیا کرتا تھا۔ اپنی امارت اور شرافت کے ساتھ اپنے حیدرآبادی ہونے پر اظہار فخر کرتا ہے۔ بڑا پرگو شاعر تھا۔ عرف ایک سال کی مدت میں پانچ ہزار پانچ سو شعر کی مثنوی لکھ دی۔ مرثیہ بھی کہا کرتا۔

اس کی مثنوی "ظفر نامہ" ۱۰۹۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے، اس میں بھی جنگنامے کی طرح محمد بن حنفیہ کے متعلق ایک فرضی داستان ہے جس کی تفصیل اور اختلاف وغیرہ ہماری تالیف موسومہ یورپ میں دکھنی مخطوطات[۲] سے معلوم ہو سکتی ہے۔

یورپ میں اس مثنوی کا ایک نسخہ ہے۔ کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

کروں ابتدا بسم اللہ تے　　　مدد منگ تے بسم اللہ تے

کہ اول کروں نعت اللہ کا　　　جنے دیا سو الا اللہ کا

کہ فی الجملہ کر بولتا ہوں عیاں　　　مرتب کیا ہور کہاں سو بیاں

تھا جب دور سلطان شہ بوالحسن　　　شہر حیدرآباد ان کا وطن

کیا تب ظفر نامہ کا میں بنا　　　مرتب کئے لک سونا چیپ رہیا

سنہ یک ہزار و نود و پانچ پر　　　بنا کر مرتب کیا یو اچھر

---

[۱]، [۲]، [۳] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۴، ۱۵۵ تا ۱۷۴۔

ترلیاس فردنیلو ازاد ہوں — ولے زادۂ حیدرآباد ہوں
ہوں سلطان عبداللہ کے دور کا — شجاع ہور سخا ہوں بڑے طور کا
جب کفار کا صف نمودار ہوا — تب اسلام کا تیز تر دار ہوا
اودھر تے فرنگی و زنگی کدھنک — خبردار ہوسک کر ساز جنگ
سگل ٹوپیاں پیں ہو دامری — بنداسپ تراں تیں سری پاکھری
فرنگی سو باجا کیئے دیانت کا — بجاتے جیوں دجال کم ذات کا
دمامہ سو جوں فیل کہ کوہ زیتوں — نفیری سو جوں جھنڈ کہ سو زیتوں
نشاناں سو جوں دھو تران کے مثال — کھڑے کھول صف بند ہو کالا بھول
کیتے ان میں دستے بکھے جوں دھو تزی — کتے ان میں شیطان کے بکھے پرزری

محمد حنیفہ تے صف عفدری — نشاناں کھڑے کھول کر حیدری
طبل حیدری یوں تو بجنے لگیا — کہ جوں جگ پو بادل گرجنے لگیا
یو سن کر عدانب حصار دمشق — لرزنے لگیا چھوڑ جھگڑی کا عشق

جنگل گھاٹ سب لہو ستے بھر گیا — اچنبا عجب کام سشہ کر گیا
خارج کی جب لہو کی ندی چلی — کہ پاتال لگ سو دھرتے ہلی
لہو میں سو گھوڑا لگیا تیر نے — چلے کرنا فرنا اچا سیر نے
یکایک تو آسمان پر سے صدا — دیا غیب ستے سو ہاتف صدا[1]

(۱۹) **افضل**[2] :- افضل بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ گولکنڈہ کے فتح ہو کر سلطنت مغلیہ

---

[1] ظفر نامہ۔ [2] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۷۵ تا ۱۷۷

میں شامل ہو جانے کے بعد بھی یہ حیدرآباد میں موجود تھا۔ میراں شاہ معروف سے بیعت اور خلافت حاصل تھی۔ ان کی ایک مثنوی محی الدین نامہ کا پتہ چلتا ہے جو یورپ کے کتب خانوں[1] میں موجود ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے۔ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

میراں شاہ معروف اور دستگیر	کیئے دل میرا پاک روشن ضمیر
ہے افضل خلیفہ معروف شاہ	لیویں ناؤں اس کا تو جائے گناہ
میراں شاہ معروف اکمل ولی	سو جد ان کے عبد القادر ولی

کہ ایک دیس چلے شاہ بغداد کن	چلے جا کیئے بہار اپنا وطن
خبر ہوئی اوسی شہر میں ٹھار ٹہار	آیا قطب عالم ہو ایوں ہنگار
کیئے تاکیدے شیخ ثنائی پیر	نکو شہر میں دیو آسنے فقیر
بلا بھیج لوگاں جمع سب کرے	کہ سلطان کیسا ہے دیکھیں بیٹھے
چلے شیخ ثنا محی الدین کن	کہرے آجماعت سوں سب انجمن

---

(۲۰) **میاں نوری:** نوری کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں ہیں بقول میر حسن سید شجاع الدین نام تھا، نانا شاہ کے وزیر سید مظفر کے بچوں کو تعلیم دیا کرتا، لوگوں نے حسد سے ان پر تہمت لگائی اور گولکنڈہ سے وہ نکالا گیا:-

نوری اپنے دل کی کسی سے نہ کہہ سکتا
حاصل بھلا اب اس سے ڈانٹے جو تھا سو تھا[2]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۷ - [2] میر حسن -

مت ہو سر گرداں ہر بچن سو بسو | بہر از سر گشتہ مت پھر کو بکو
حق کے جانب کوں لیا ڈ پاک رُو | ہر چہ داری صرف کن در راہِ او

لن تنالوا البر حتی تنفقوا

مت ہوا آشفتہ فسوقِ ہجر سوں | رکھ امید فیض حق کے بذل سوں
نامور ہو جگ میں جود و منزل سوں | مت ہو نا امید حق کے فضل سوں

حق کہا مصحف منے لا تقنطوا

سختی دوراں سین کچھ مت فکر کر | ترک المنکار ایا حق بکر کر
نام حق کا روز و شب توں ذکر کر | اس کے نعمت کے اوپر توں شکر کر

بوجہ نکتہ واشکروا لا تکفروا

آفتِ دوراں سنے کر صبر جاں | صبر سوں پاویگا توں مقصود جاں
سن حدیثِ صبر مفتاح الجناں | کھول کر بھی دیکھ توں اندر قراں

صابری کے تاں حق ہے فصبروا

مت ہو جن ہم کا پیالا پیا | ادنی سودائی جنوں سودا کیا
سیس اپنا کاٹ دلبر کو دیا | ادنی دلبر اپنے کوں دل پر لیا

نی ملا توں مری پیاسوں ہو مہو[1]

(۲۱) **راجو:** حضرت سید شاہ راجو ابو الحسن تانا شاہ کے مرشد بھی شاعر تھے۔ راجو تخلص فرماتے تھے۔ ۱۰۹۳ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ بیرون فتح دروازہ (حیدرآباد) آپ کا مزار ہے۔[2] آپ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز کی اولاد سے تھے۔ آپ کی ایک مثنوی کا جو تحفۃ النصائح کے نام سے موسوم ہے پتہ چلتا ہے قطبی کی اسی نام کی مثنوی سے یہ جداگانہ ہے۔

---

[1] بیاض مملوکہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔ [2] تاریخ خورشید جاہی و تذکرۂ اولیا

قطب شاہی نثر

نثر اردو کی ابتدا کی بحث گزر چکی ہے اور بہمنی نثر کے نمونے بھی پیش ہو چکے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں تصریح کی ہے کہ محمد شاہ کے عہد ۱۱۴۵ھ میں ایک بزرگ تھے جن کا تخلص فضلی تھا۔ انہوں نے مجلس نام ایک کتاب لکھی تھی۔ غالباً یہی اردو کی پہلی تصنیف ہوگی۔ پھر آگے چل کر مولانا نے لکھا ہے کہ:

"بہر حال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی زبان اردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات غزلیں، عاشقانہ اور مدحیہ قصیدے ہوتے تھے اور ان سے غرض امراد اہلِ دول سے انعام کا تھا، نثر کے حال پر کسی کو توجہ نہ تھی۔ ۱۲۱۳ھ میں میر عطا حسین خاں نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھا تھا ادھر یہ حال تھا کہ چچا بچا لڑکا شعرا کے جلسوں اور امرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ ادھر دانائے فرنگ نے کلکتہ میں اس کی پرورش کی جانب توجہ کی۔ چنانچہ ۱۲۱۴ھ سے ۱۲۲۲ھ تک باغ اردو، آرائشِ محفل، قواعد اردو (جان گلکرسٹ) ترجمہ اخلاق محسنی، پریم ساگر لکھی گئیں، اسی زمانہ یعنی ۱۲۲۲ھ میں مولانا شاہ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ نے قرآن شریف کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد مولانا اسمٰعیل نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے اردو میں لکھے"[1]

---

[1] آبِ حیات۔

مولانا نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ اس وقت کی معلومات کے لحاظ سے لکھا تھا جس طرح ولی کے بہت پہلے شاعری کا وجود اور بیسیوں مثنویاں کلیات اور دیوان دستیاب ہو کر مولانا کی تحقیق کو غلط ثابت کر چکے ہیں اسی طرح دو صدی پہلے کی نثر کا پتہ چل چکا ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ سلاطین قطب شاہ علم دہنر کی ترویج میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے جس کے باعث علوم کی بیشمار کتابیں ان کے عہد میں مرتب ہوئیں اور اردو نثر و نظم کو کافی ترقی و وسعت حاصل ہوئی چنانچہ عہد قطب شاہی کی نثر کی کتابوں کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

میراں جی حسن خدا نما: سلطان عبداللہ کے عہد میں شاہی ملازم تھے، اور سرکاری کام پر بیجاپور روانہ کئے گئے، یہاں حضرت امین الدین اعلیٰ سے بیعت حاصل کی فیض باطنی پایا۔ کہتے ہیں صرف ایک صحبت میں آپ نے کئی مدارج طے کر لئے، مرشد نے اپنی خلافت دی۔ بیجاپور سے حیدرآباد آ کر مسند مشیخیت پر بیٹھے اور خلق اللہ کی ہدایت میں مشغول ہوئے۔ ۱۰۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ مستعد پورہ کاروان ساہوان حیدرآباد میں آپ کا مزار ہے۔ اور زیارت گاہ عام و خاص ہے۔[1]

آپ نے دکھنی یا اردو زبان میں کئی رسالے لکھے تھے۔ جن میں شرح تمہید ہمدانی یا شرح شرح تمہید کا بھی تذکرہ ہے۔ آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ ایک نظم چکی نامہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[2] شرح تمہید ہمدانی

---

[1] تذکرہ اولیاء دکن حصہ دوم، صفحہ ۹۰۰ [2] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۹۴۔

ایک تصوف کی کتاب ہے جو امام غزالی کے بھائی شیخ احمد کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔
میراں جی حسن خدانما کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"اللہ بڑا صاحب ہے۔ اس کوں بہوت سرانا ہوت نوازنا اس کی خدائی
نھے دونو عالم پیدا کرنے میں عقل کی انکھیاں حیران ہیں"

"اے عزیزاں، اے بات نہیں سنیاں، بادشاہاں گھوڑا مستعد کئے
باج نہیں سوار ہوتے، ہور گھوڑے ہیں کچ گھوڑے اچھے تو بھی
قبول کرتے۔ یعنی پیر کے عشق میں نہ پہنچتا ہوئے باج خدا کے عشق
میں ناآسک سی ہور دیکہ نا سکسی۔ اگر عشق خالق نداری بارے عشق
مخلوقے مہیا کن۔ اس کا معنا خدا کی پچھانت کا بل نہیں تو اول اپنی
پچھانت کر، سو اے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نوار نہارا
ہے، ہور اس کا اجالا جالنہارا ہے۔ یعنی دوست سو نواز نہایا
ہور خوبیاں دینہارا، و لے اس کا محبت اسے وگداتا ہے، یعنی معشوق
کا محبت عاشق کو گالتا ہے۔ اس کے فراق میں اے مقام ایسا ہے،
جو عاشق معشوق باج جی نہ سکے۔ باج دیکھے معشوق کا صورت عاشق
کہاں انکھیاں کون جالتا ہے، ہور اپنا رنگ کرتا ہے"[1]

مولانا عبداللہ: مولانا عبداللہ کے متعلق ہمیں کچھ معلومات حاصل نہیں
ہیں، ان کی ایک کتاب احکام الصلوٰۃ دست یاب
ہوئی ہے۔ یہ ایک رسالہ جو چھوٹی تقطیع پر خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ اس کو

---

[1] رسالہ اردو، ماہ اپریل ۱۹۲۸ء۔

مولانا عبداللہ نے ۱۰۳۲ھ میں مرتب کیا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نماز کے متعلقات بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ اس کو مختصر فقہ حنفی کہنا زیادہ صحیح معلوم ہے۔ مصنف نے اس کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

"اول کلمہ طیب۔ پہلا کلمہ بولتا ہوں میں، پاکی کا کا بھگی پاکی ایمان کی کفرتی۔ شرکتی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ نہیں کوئی معبود برحق اِلَّا اللہ مگر اللہ تعالیٰ معبود برحق ہے محمد رسول اللہ محمد رسول خدا کے برحق ہیں۔ دوم کلمہ شہادت دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں اس خدائے تعالیٰ کی ایک پنی پہ اشہد اور گواہی دیتا ہوں میں ان لا اِلٰہ کہ نہیں کوئی معبود برحق۔"

بات کرنے سوں نماز جاتا ہے، نماز میں آدمیاں کی مثال دعا منگے نماز جاتا ہے ہی واہ کینے سوں نماز جاتا ہے درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے رونے سوں یا دنیا کی سبب سوں نماز جاتا ہے نماز میں کسی موت کی خبر سن کر قالو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن بولتی سوں نماز جاتا ہے۔ خبر سن کر نماز جاتا ہے نماز میں سبحان اللہ بولتی سوں نماز جاتا ہے مصحف دیکھ کر پڑھنے سوں نماز جاتا ہے، نماز میں قہقہہ ہنسے سوں نماز جاتا ہے۔"

روح قبض ہوا سی وقت اسکیاں انکھیاں موجیا ہور پاؤں

دراز کرنا ہور ہات دراز کرنا ہور دونوں پہلو کی طرف ولیکن سینے
پہ نا رکھنا ہور اسی کی ٹھوڑی ہور سر کوں ملا کر بندنا سے تبر نخدال
بولتے ہیں یو سب سنت ہے، ہور مرنی نتے اول اس کی سر کوں
قطب کے طرف کرنا سلانا ہور مرے بعد ازاں سی غسل دینا اس طریق سوں"
ایک اور کتاب مفتاح الخیرات نام ہے جس کے مصنف کا نام یا سنہ
تالیف معلوم نہ ہو سکا مگر گمان غالب ہے کہ یہ بھی اسی دور کی لکھی ہوئی ہے۔
اس کتاب میں بھی یائے معروف و یائے مجہول کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور نہ
تذکیر و تانیث کا ۔ نمونہ درج ہے :۔

"ایمان کی احکمان کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھاننا
تمام مسلمان، یہ فرض ہے کہ سب کوں اس کی پچھان نی پھٹکار ہے
ہور آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار ہوئیگا - اگر تجھے پوچھیں کہ
ایمان کیا ہے بول تو ایمان اقرار کرنا ہے زبان کے تئیں ہور استوار
کرنا ہے دل میں خدائے تعالیٰ ایک ہے مقر اس یک خدا خارج
دوسرا نہیں ہے ہور جو کچھ کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
خدائے تعالیٰ کے نزدیک ہتیں لے کر آئے ہیں سو حق ہے راست
ہے ہور فرشتے ہور آدمیاں پریاں یو سب خدا تعالیٰ پیدا کیا ۔ اگر
تجھے پوچھیں ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے ۔ بعضی بولتے ہیں
کہ ایمان غیر مخلوق ہے اور بعضی بولتے ہیں مخلوق ہے ۔ درو دش یہ
ہے اول ایمان اقرار کرنا ہور استوار رکھنا یو فعل بندے کا ہے ۔"

وجہی :

قطب شاہی دور کی نثر کی زبردست کتاب سب رس ہے جس کو ملا وجہی نے تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب کے تین نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔

ملا وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کے عہد سنہ ۱۰۴۵ھ میں اس کو مرتب کیا ہے جس کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے یہ تصوف کی ایک بہترین کتاب ہے جس کو فرضی قصہ کے طور پر لکھا ہے۔ مگر جا بجا مختلف عنوانات مثلاً ذکر لا الہ۔ معراج۔ عشق مذمت طمع۔ اطاعت مادر و پدر۔ صبر و شکر عنوانات پر کافی بحث کی ہے۔ انسانی جذبات کی حقیقت اور کش مکش کو جس خوبی سے فسانہ کی صورت میں پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ عقل، دل، عشق، حسن، وفا، مہر، غمزہ، ناز، نظر، خیال، عاقبت، ہمت، دیدار وغیرہ نام دئے ہیں۔ بہرحال یہ کتاب نہ صرف تصوف کے لحاظ سے قابل تعریف ہے، بلکہ ادبی حیثیت سے بھی نایاب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول تھی کیونکہ ایک صدی سے زیادہ تک اس کے نسخے مرتب ہوتے رہے ہیں۔

میری نظر سے جو تین نسخے گزرے ہیں ان میں سے ایک جو سنہ ۱۲۱۴ھ کی لکھی ہوئی ہے مولوی آغا حیدر حسن صاحب کے پاس ہے اور دو کتب خانہ آصفیہ میں ہیں ایک سنہ ۱۲۹۵ھ کی لکھی ہوئی ہے دوسری نا مکمل ہے جو اس سے قدیم ہے۔
حال میں رسالہ اردو میں مولوی عبدالحق صاحب نے اس کے متعلق ایک دلچسپ مضمون شائع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب معز کے پاس دو نسخے ہیں جو سنہ ۱۱۷۱ھ و ۱۱۷۷ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ رسالہ اردو میں جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں مولوی عبدالحق صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ باوجود مکمل دو نسخے پیش نظر

ہونے کے تاریخ تصنیف معلوم نہیں ہوسکتی۔ حالانکہ خاتمہ کے کچھ پہلے جس کا نمونہ مولوی صاحب نے بھی دیا ہے سنہ تصنیف موجود ہے۔ چنانچہ مطبوعہ سب رس میں مولانا نے اس کی صراحت فرمادی ہے۔

کتاب کی عبارت مقفیٰ ہے مختلف مقامات سے نمونہ پیش ہے :۔

تمام مصحف کا معنا الحمد للہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم ہور تمام بسم اللہ کا بسم اللہ کی نقطی میں رکھیا ہے کریم سمجھ دیکھ خاطر آنا ل حدیث میں یوں آئی ہے کہ العلم نقطۃ وکثرہا جہال یعنی علم ایک نقطہ ہے جاہلاں نے اسے بڈھائے۔"

"سلطان عبد اللہ ظل اللہ عالم پناہ صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ دشمن پرور ثانی سکندر، عاشق صاحب نظر دل کی خبرتی یا خبر، صورت میں یوسف تی اگلی ادم نے بہوش بہر نکلے۔ حکمت میں فلاطون شاگرد، سخاوت میں حاتم کا کھوسے پر دار، شجاعت میں رستم گرد، عالی ہمت غازی مرد۔"

"عشق خدا کون بھید یا تو اس کی خاطر آسمان زمین ہو یدا کیا عشق خدا کون بھید یا۔ تو اپنا حبیب کر محمد کوں پیدا کیا اگر محمد نا ہوتا تو آسمان زمین نا ہوتا اگر محمد نا ہوتا تو ماہ پیر دیں نا ہوتا اگر محمد نا ہوتا تو دنیا ہور دین نا ہوتا۔ صاحب طٰہٰ و یٰسین صاحب رحمۃ للعالمین جس کے نور تے عالم نے پایا روشنی لولاک لما خلقت الافلاک کا دھنی۔"

"آغاز داستان زبان ہندوستان۔ نقل ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کا ناؤں عقل دین و دنیا کا کام اسنے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرا کیں نہیں ہلتا اس حکم پر چلتا اس کی فرمودی پر چلی ہر دو جہاں میں ہوی عقلی دنیا میں خوب کنوائی۔ چار لوکاں میں عزت پائی۔ جان رہی کھری وہاں قبول پڑی نہ آفت دیکھی نہ زلزلا۔ اپنی بھلے تو عالم بھلا کیسے کون برا بولنا یو وسواس ہے۔ بھلائی برائی سب اپنے پاس ہے۔ اپے چل نہیں جانتی دوسریاں پر برا مانتے اول اپنی خبر میں اپی رہنا پچھیں دوسرے کوں برا کہنا جنی آپس کون پچھانا انے سب جاتیا جدہر ڈھلنا ہے ادہر عقل کے اجالی میں چلتا ہے۔"

"اس فرزنداں میں کا بڑا فرزند سو یو کتاب لائق مستند ہر باب اپنے وقت کا لقمان افلاطون اپنے وقت کا خسرو فرہاد مجنوں اپنے وقت کا خاقانی، انوری، سعدی اپنے وقت کا ظہیر سلیمان اپنے وقت کا ہر بات کا ہادی۔"

"صحبت اس کی سب کو بھاوے بات اس کی جوں شکر جوں نبات جو لکن دنیا تو لکن اسے حیات پاوے جس وقت تھا یک ہزار چہل و پنج اس وقت ظہور پکڑیا۔ پوچھا گنج جو کوئی صاحب سخن اچھیکا جو کوئی صاحب فن اچھیکا اسے یو سخن اثر کریگا مست بے خبر کریگا۔"

"تیوں بادشاہ ہور بادشاہ کے دستاں بادشاہ کے عزیزاں

بادشاہ کے خویشاں قرابتیاں بادشاہ کے پیاریاں پیارے ماننے
منگہاڑے بادشاہ کے خدمت گاراں دولت خواہاں دعاگویاں
امیدواراں سب اپنی مراد کوان پہ دانوکوں غیب کی نعمتاں بہ
ورزق فراخ اچھو ہمیشہ بعیش وعشرت اچھو دائم بدولت اچھو
عافیت بخیر اچھو ایمان سلامت اچھو۔ آمین یارب العالمین "
یہ کتاب اب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہو گئی ہے۔

میراں یعقوب : اس دور کے ایک اور مصنف میراں یعقوب ہیں جنہوں نے شمائل الاتقیا تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب تصوف میں برہان الدین اولیا اورنگ آبادی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ اسی نام سے میراں یعقوب نے کیا ہے۔ جو ۱۰۸۰ھ میں مرتب ہوا ہے۔ یکم ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ کا لکھا ہوا نسخہ میری نظر سے گزرا ہے[1]۔

کتاب ضخیم ہے۔ نفس مضمون کے پہلے ایک طویل فہرست ان کتابوں کی دی گئی ہے جس سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے جن میں تفسیر کی پندرہ، حدیث کی نو، فقہ کی بیس اور دیگر کتابوں کے سو سے زیادہ نام درج ہیں۔

یہ کتاب جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تصوف میں لکھی گئی ہے۔ اس کو چار قسم اور نوے بیان میں تقسیم کیا گیا ہے۔ توبہ۔ عمل حمیدہ۔ ہدایت وارشاد، معجزہ وکرامت حکمت بیعت۔ در حکم مرید۔ آداب مرید۔ حکم نماز۔ علماء نیک استقامت وغیرہ عنوانات قائم کئے ہیں۔ مختلف مقامات سے نمونہ پیش ہے :۔

---

[1] کتب خانہ آصفیہ۔

"اپنی حیات کے وقت منجے اشارت کئے تھی جوں شمائل الاتقیاء کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوی تا ہر کسی کوں سمجھا جاوی اس وقت منجے بیا ہیں نا کہ یک ہزار ستر پر اٹھون سال کوں رحلت کیے بران ان کے بھانجے عارف حق رسیدی عارفوریکی نور دیدی مصطفیٰ کی کلیجی ہور مرتضیٰ کے نین شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زماں سنے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا جی کچھ مشکل آتا تھا سو پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا جب خدا کی توفیق سوں کتاب تمام ہوا ہور حضرت شاہ کی حضور ہور محقق کامل موحد واصل شریعت کے موافق بابا ابراہیم خلیل کے اس کی لے کر مطالع فرما کر خوش کیے"۔

"حمد و ثنا و اصفیا کی کناں ہور خصلتاں کی نمن بیحد و بی پایاں ہور سرانا ہور بکھانا ادبیا ہور انبیا کیاں نیکیاں ہور اس کے صفتاں کے بہانت بے گنست ہور بے انت اس پاک ذات کوں واجب ہور سزاوار ہے ......"

"شیخ احمد عربی فرماتے ہیں کہ پیر خدا بخش ہو مردانہ ہونا جو خدا باج کیسے چیز طرف موں نہ پھلاوی ہور سب موجودات کوں معدوم کر جیانے یعنی جیکچھ چیز اد تو عالم ہی سو سمجھ کر پوچھ ہور بہوت اونچی ہمت کا ہونا جو دین ہور دنیا کے تمام قرب ہور مراداں اگر اوسے دیوی تو اس طرف رجی نا کرے تو مازاغ البصر و ماطغیٰ کے

صفت پادی ہور ہمیشہ ظاہر کا تجرید ہور باطن کا تفرید اچھی ہور بہوت بار بردار اچھی جو خدا کے بندی ابہتی بچک کر کناری نا ہویں اگر کسی مرید تھی کچھ سہو ہور خطا ہو کراوی تو عفو کری ہور نصیحت "
معجزہ اور کرامت کے ذکر میں اس طرح بیان کیا ہے :-

" ہور ولیاں کوں کرامت ہے کہ ابنو پورا علم دھرتے ہیں ولے مغلوب ہور بجذو میں جیکچھ اینو تھی ظاہر ہوتا ہے سوا سے کرامت کہتے ہیں اما معونت اوہی جو بعضے دیوانے جو پورا علم و معرفت نہیں دہرتے ہیں انو تھی کچھ خرق عادت یعنی کدھن نہیں ہوتا ہے سو چیز ظاہر ہوتا ہے ہور استدراج اسے کہتے ہیں جو بعضے بے ایمان لوگاں کچھ سحر ہور منتر ہور اس وزان کے چیز اظاہر کرتے ہیں۔

یو تمام اسرار ہور ان عالم جبروت کیے کہاں — سمج سکتے ہے لوگاں نا سونکے
یو سمجھنا راز دیروز ہے کار خاصوں کا — جنو پائی ہے حق کرم تے مربی اللہو کیے

عابد شاہ : یہ بھی اس دور کے ایک شاعر ہیں۔ صوفی تھے، شاہ راجو حسینی کے مرید تھے ممکن ہے خلیفہ بھی ہوں، گلزار السالکین کے نام سے ایک رسالہ قلم بند کیا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔[1]
گلزار السالکین سے واضح ہے کہ شاہ راجو اس تصنیف کے وقت بقید حیات تھے۔ چونکہ شاہ راجو کا انتقال سنہ ۱۰۹۲ ہجری میں ہوا، اس لئے یہ کتاب اس کے پہلے تصنیف ہوئی ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۳۱۳۔

"اول ثنا صفت کرنا اللہ تعالیٰ کا کہ قادر ہے تمام چیز اوپر قدرت رکھتا ہے، اور ہر شے میں حاضر اور ناظر ہے، جیسا کہ شکر مٹھائی اور پھول میں باس اسی طرح سب میں صنعت گری رکھتا ہے:

وحدہ لاشریک لا ہوتے ہے جیسا کہ وہ ایک ہو مانند کسی دوجا شریک نہیں ہے ہور وہ شریک سب کا ہے ہور سب میں ملیا ہے جیسا کہ پھول میں بو ملی ہے، پس اس بو کی صورت معلوم میں نہیں آتی جیسا کہ عالم میں دلیل ہے:"

سلطان: اس شاعر کے نظم کا نمونہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کی ایک نثر کی کتاب بھی دستیاب ہوئی جو "درالاسرار" سے موسوم ہے، اور تصوف میں لکھی گئی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہے[1]۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق یعنی او سلطان اپنی ذات کے دریا میں چھپا راز گنج رکھیا تھا بقا کے موتیاں سوں بھر کر ہو کر اس حال میں یاک آپس گنج طرف نظر کیا ہور اس موتیاں کا اجالا دیک کر عاشق ہوا۔ ہور مصلحت تجویز میں آیا جو راز کے موتی چھپا کر رکھنا خوب نہیں بلکہ عشق کے بازار میں ظاہر کرنا بھلا ہے:"

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۲۶۸۔

دوسری فصل

عادل شاہی اردو

سلطنت عادل شاہی کا بانی یوسف عادل شاہ بہمنی حکومت کی جانب سے بیجاپور کا صوبہ دار تھا۔ سلطنت بہمنیہ کے زوال پر دیگر صوبہ داروں کی طرح اس نے بھی ۸۹۵ھ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت تقریباً دوسو سال تک عادل شاہی نام سے بیجاپور میں قائم رہی۔ اور نو بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے سلطنت کی۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱ - یوسف عادل شاہ	۸۹۵ھ تا ۹۱۶ھ
۲ - اسمٰعیل عادل شاہ	۹۱۶ھ تا ۹۴۱ھ
۳ - ملو عادل شاہ	۹۴۱ھ تا ۹۴۱ھ
۴ - ابراہیم عادل شاہ	۹۴۱ھ تا ۹۶۵ھ
۵ - علی عادل شاہ	۹۶۵ھ تا ۹۸۸ھ
۶ - ابراہیم عادل شاہ ثانی	۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ
۷ - محمد عادل شاہ	۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۷ھ

۸ - علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ
۹ - سکندر عادل شاہ ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷ھ

یوسف عادل شاہ اپنے زمانہ کا نامور بادشاہ ہو گزرا ہے۔ اپنی قابلیت کے بل بوتے پر ترقی کرتے ہوئے صوبہ داری کے عہدے پر فائز ہوا اور پھر اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔ یہ نہ صرف فارسی کا بلند پایہ شاعر تھا بلکہ موسیقی سے بھی واقف تھا۔ علماء و فضلا اور اہل فن کا بڑا قدردان تھا، دور دور سے علماء اور شعرا دربار میں بلائے جاتے اور گراں بہا تحائف سے ان کو سرفراز کیا جاتا۔

یوسف عادل شاہ کو عیش و نشاط کی محفلوں میں کسی نہ کسی جذبہ سے متاثر ہوکر فی البدیہہ شعر کہنے کی کافی مشق تھی۔ چونکہ اس نے شیعیت کو حکومت کا مذہب قرار دیا تھا اس لئے سلطنت کے بڑے بڑے عہدے باہر سے آئے ہوئے ایرانی اور عراقی اصحاب کے تفویض کئے گئے تھے۔ ان اصحاب کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لئے اس کے عہد میں اردو کی ترقی ناممکن تھی۔ تاہم اس زمانہ کے تاریخی شعر اور قطعے دستیاب ہوتے ہیں۔ اور ایک مصنف شاہ میراں جی کا بھی پتہ چلتا ہے جس سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں یہاں عام طور سے دکھنی کا رواج ہو چکا تھا

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند اسمٰعیل مالک تاج و تخت ہوا۔ اس کو بھی اپنے باپ کی طرح شاعری اور موسیقی میں کافی مہارت تھی۔ وفائی اس کا تخلص تھا۔ مورخین بیجاپور مثلاً فرشتہ، نور اللہ، زبیری وغیرہ نے اس کے علم و فضل اور قدردانی اہلِ کمال کی بڑی تعریف کی ہے۔ مگر اس کو بھی اردو سے شغف نہیں تھا۔ چونکہ اس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو بالکل ایرانی تھا۔ اس کے لئے بھی

اس کی رغبت فارسی کی جانب تھی۔

ملو عادل شاہ کے چند ماہ کی حکومت کے بعد ابراہیم اول حکمراں ہوا۔ یہ بھی اپنے باپ داوا کی طرح ارباب کمال کا قدر دان اور اہل ہنر کا مربی اور سرپرست تھا شیعیت کو ترک کر کے اس نے سنی مذہب اختیار کیا تھا۔ اس وجہ سے ایرانی اثر کم ہوگیا اور دکھنیوں کو عروج حاصل ہوا۔ اس تغیر کے باعث اردو کو خاص ترقی ہوئی اور اس کی جڑیں اس قدر مضبوط ہوگئیں کہ اس کے جانشین علی کی انتہائی کوششوں کے باوجود فارسی کا رواج پھر نہ ہو سکا۔ اس زمانہ کا کوئی اردو گو شاعر معلوم نہیں ہے۔ البتہ شاہ برہان الدین جانم کے چند اردو تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

ابراہیم کے بعد علی عادل شاہ اول اس کا جانشین ہوا۔ اگرچہ یہ بھی علم وفن کا قدردان تھا مگر اپنے پیش رو کی طرح اردو کا مربی نہیں تھا۔ بلکہ فارسی کی طرف اس کی توجہ مبذول تھی۔ اس کو مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ سفر کے موقع پر بھی چار سو صندوقیں کتابوں سے بھری ساتھ رہا کرتیں۔

یہ وہی علی عادل شاہ ہے جس کی ملکہ چاند بی بی نے اپنی بہادری اور دلاوری کے کارنامے تاریخ دکن میں دائمی طور پر بڑی درخشانی کے ساتھ یادگار چھوڑے ہیں۔

علی کے قتل ہونے پر اس کا بھتیجا ابراہیم ثانی اورنگ حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ اس کا دور حکومت ترقی علم وہنر کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔ اس نے علم کی ترویج میں جو جو کوششیں کیں وہ تاریخ سے کبھی محو نہیں ہو سکتیں۔

ابوالقاسم فرشتہ۔ نورالدین ظہوری۔ ملا ملک قمی۔ عبدالرشید البتگی وغیرہ سب اسی کے درباری اہلِ علم ہیں۔ ان کی تصنیفات آج تک موجود اور مشہور ہیں[1]

ابراہیم کو شاعری۔ خوشنویسی اور موسیقی میں کافی مہارت تھی۔ شاعری اور موسیقی کے ایک کارنامہ نورس سے اس کا نام آج تک زندہ ہے۔ زبان اردو پر اس کا بڑا احسان ہے۔ شاہی دفتر جو علی کے زمانہ میں فارسی ہو گیا تھا پھر سے اردو کر دیا گیا[2]

سلطان نے شعرا اردو کو دل کھول کر عطیے دئے اور ان کے کمال کی کافی قدردانی کی۔ عبدل۔ آتشی۔ مقیمی۔ امین وغیرہ وہ مایۂ ناز شعرا ہیں جن کے اردو کارنامے آج بھی موجود ہیں۔

ابراہیم کے انتقال پر محمد اس کا جانشین ہوا۔ اس کو علمی قدردانی گویا ورثتاً عطا ہوئی تھی۔ یہ بادشاہ بھی علم و فن کا حامی اور شعرائ و علماء کا مربی تھا۔ ہر مضمون اور ہر زبان کی تعلیم کے لئے اس نے کالج قائم کئے اور طلبہ کو روزینے مقرر کئے تھے۔ ہر روز کئی گھنٹہ تک علماء اور شعرائ کی مجلسیں منعقد ہوا کرتیں۔

آتشی نے خمسہ نظامی کا جواب اسی کے عہد میں تصنیف کیا۔ ظہوری کے قابل فرزند ملا ظہور نے محمد نامہ لکھا۔ اس کے علاوہ دوسرے ارباب علم نے بیسیوں کتابیں لکھیں۔

اسی کی ملکہ خدیجہ سلطان شہربانو تھی جس کی سرپرستی سے ملک خوشنود

---

[1]، [2] تاریخ فرشتہ۔

اور رستمی کے کارنامے منظرِ عام پر آئے۔ غرضیکہ اس زمانہ میں بھی اردو کو خوب عروج ہوا۔ نعیمی، دولت شاہ، ابن صنعتی، رستمی۔ ملک خوشنود۔ شوقی وغیرہ اسی عہد کے باکمال شعرائے اردو ہیں۔

محمد کے بعد علی ثانی حکمران ہوا۔ سلطان کی علمی قدردانی کی وجہ سے بڑے بڑے علماء وقت بیجاپور میں جمع ہو گئے تھے۔ اور گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا تھا ہر طرف شعر و سخن کے تذکرے اور مشاعرے کی مجلسیں ہوتیں۔ سلطان کو چونکہ اردو شاعری کا ذوق تھا اور خود بھی شاعر تھا اس لئے ہر طرف اردو شاعری کا بول بالا تھا۔ سلطان کا تخلص شاہی تھا۔

اس کے زمانہ کے شعرا کی فہرست بہت طویل ہے۔ بعض تو وہی ہیں جنہوں نے محمد عادل شاہ کے زمانہ میں شہرت حاصل کر لی تھی اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے خاص اسی عہد میں نام کمایا۔ مثلاً نصرتی جو ملک الشعرا تھا۔ ملک۔ ہاشمی۔ ایاغی مرزا قادر وغیرہ سب اسی دور میں مشہور ہوئے۔

علی کے بعد سکندر جانشین ہوا مگر شروع سے آخر تک مصیبتوں میں مبتلا رہا اول تو نظم و نسق پر اپنا کوئی اثر قائم نہ کر سکا۔ پھر مغلوں نے حملے شروع کر دیئے۔ آخر ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور سلطنت مغلیہ میں شامل ہو کر عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ایسے مصائب کے زمانہ میں بھی بیجاپور شاعروں اور ادیبوں سے خالی نہیں رہا۔ سیوا۔ مومن۔ معظم نے اپنے کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔

غرضیکہ جس زمانہ میں گولکنڈہ میں قطب شاہی علم لہرا رہا تھا، اور علم و فن کی قدردانی ہو رہی تھی اسی زمانہ میں عادل شاہی حکومت بھی علم و فن کی سرپرستی

میں کوئی کمی نہیں کر رہی تھی۔ اچھے اچھے ارباب علم و فن عادل شاہی حکمرانوں کے دامنِ دولت سے وابستہ اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ ان کے دربار میں شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا جمع رہتا اور ان کا آستانہ اہل علم و فن کا ملجا و ماویٰ ہو گیا تھا۔

اس دور کے جن دکھنی شعراء کا پتہ چلتا ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

شمار	نام	تصنیف	سنہ
۱	ابراہیم عادل شاہ ثانی	نورس	۱۰۰۵ھ
۲	علی عادل شاہ ثانی شاہی	کلیات	قبل ۱۰۸۰ھ
۳	شاہ میران جی	خوش نامہ	قبل ۹۰۲ھ
۴	شاہ برہان الدین جانم	وصیت الہادی وغیرہ	قبل ۹۹۰ھ
۵	عبدل	ابراہیم نامہ	۱۰۱۲ھ
۶	آتشی	ــ	ــ
۷	مقیمی	چندربدن و مہیار	۱۰۵۰ھ
۸	امین	بہرام و حسن بانو	۱۰۵۰ھ
۹	شوقی	فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ	تقریباً ۱۰۵۰ھ
۱۰	صنعتی	نجات نامہ، گلدستہ، بے نظیر	تقریباً ۱۰۵۵ھ

۱۱	ملک خوشنود	ہشت بہشت	سنہ ۱۰۵۶ ہجری
۱۲	رستمی	خاور نامہ	سنہ ۱۰۵۹ ہجری
۱۳	دولت	تلمیکہ بہرام وحسن بانو	سنہ ۱۰۶۰ ہجری
۱۴	نصرتی	گلشنِ عشق	سنہ ۱۰۶۸ ہجری
		علی نامہ	سنہ ۱۰۷۶ ہجری
		تاریخ اسکندری	سنہ ۱۰۸۳ ہجری
۱۵	شاہ ملک	شریعت نامہ	سنہ ۱۰۷۷ ہجری
۱۶	شاہ امین الدین اعلیٰ	محبت نامہ	سنہ ۱۰۸۰ ہجری
		رموز السالکین وغیرہ	
۱۷	ہاشمی	یوسف زلیخا	سنہ ۱۰۹۹ ہجری
		کلیات	
۱۸	ایاغی	نجات نامہ	تقریباً سنہ ۱۰۸۰ ہجری
۱۹	شغلی	پند نامہ	" سنہ ۱۰۸۰ ہجری
۲۰	سیوا	روضۃ الشہدا	
۲۱	علی	پند دل بند	
۲۲	کریم	مدح شاہ میراں جی	
۲۳	مرتضیٰ	وصل نامہ	
۲۴	حسین	دیوان	
۲۵	مختار	معراج نامہ	سنہ ۱۰۹۴ ہجری

۲۶	قدرتی	قصص انبیا	تقریباً ۱۰۹۵ھ
۲۷	مومن	اسرارِ عشق	۱۰۹۳ھ
۲۸	قادر	معجزہ خاتون جنت	
		نظیر	
۲۹	شاہ من عرف	شجرۃ الاتقیا	
۳۰	معظم	گنج مخفی	

ابراہیم عادل شاہ :

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے کہ اس دور کا چھٹا حکمران سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) نہ صرف دکھنی شعر و سخن کا دلدادہ تھا بلکہ خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کا تخلص ابراہیم تھا۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی غزل، قصیدے اس نے لکھے تھے مگر اب سب ناپید ہیں۔ البتہ اس کی تصنیف نورس موجود ہے۔

اس کتاب میں گیت لکھے گئے ہیں جو مختلف راگ اور راگنیوں میں گائے جا سکتے ہیں۔ اس کی تصنیف ۹۹۵ھ کے بعد اور ۱۰۱۵ھ کے پہلے ہوئی ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ ۱۰۰۵ھ میں یہ مرتب ہوئی ہے۔

ایک زمانہ دراز تک یہ کتاب ناپید تھی، اب اس کے کئی نسخوں[1] کا پتہ چلا ہے

---

[1] حسب ذیل مقامات پر یہ نسخے موجود ہیں:۔ (۱) عجائب خانہ حیدرآباد۔ (۲) کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر۔ (۳) کتب خانہ دفتر دیوانی و مال سرکار نظام۔ (۴) کتب خانہ آغا حیدر حسن پروفیسر نظام کالج حیدرآباد۔

اس کتاب پر ہم نے تفصیل سے مضمون لکھا ہے[1] - کلام کا نمونہ یہاں پیش ہے :-

ابتدا

نورس سور جگ جوتی ان سود کنی

یوسست سرستی ماتا ابراہیم پرساد سنی ددنی

ابراہیم سب سندری دیکھا یو لچھن ہے کہاں

جات چاند سلطان نانوبی ملکے جہاں

کمت دسے جیو خسرد مدینا — کبھی خلیت دھر مو تیوں خونا

جوں دیپک ییں دسے نگینا — مشک عنبر چھپائی انگستا

سبوی ردبز چل ندا لقعد آئینا

سید محمد پتی پیرا — جیوں رتن ییں اتم ہیرا

محل محل صدر سنواسے — اس نمونے بہشت اپارے

انند ہوتا ہے سدا بہارے — ارتی لیائی انبر بھر تارے

کدم کستوری جو اچندن لائے — بادل کان سے ہر رنگ میں برسائے

شمالی عنبر بنیاں پھرائے — شربت گھول امرت پلائے

بادل دمامے بجلیاں بجادے — باجی خالو آشتابی تے باوے

---

[1] ہمارا یہ مضمون رسالہ معارف بابت جون ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اور مقالات ہاشمی میں شامل ہے۔

سہلا نورس کلیاں بدہا وے   ابراہیم گر گنی گا دے

شاہی: علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کا تخلص شاہی تھا۔ یہ نصرتی کا نہ صرف مربی اور سرپرست تھا بلکہ نصرتی نے اس کی شاگردی بھی کی ہے۔ اس کے عہد کے نامور شعرا کا ذکر ہو چکا ہے۔ سلطان کے شوق کا نتیجہ تھا کہ بیجاپور میں گھر گھر شاعری کا چرچا ہو گیا تھا۔

شاہی نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا کلام اب سے پہلے بالکلیہ نایاب تھا۔ اب اس کے کلیات کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا ہے[1]۔

شاہی کے قصیدے جہاں ادق اور مشکل بحروں میں ہیں تو وہاں اس نے آسان اور سہل بحریں بھی استعمال کی ہیں۔ ان قصیدوں سے اگر شاہانہ طمطراق رعب و داب کا اظہار ہوتا ہے تو اس کی مثنویاں واقعہ نویسی اور مرقع نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس کی غزلیں رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفریں تخیل کی بلند پروازی کو ظاہر کرتی ہیں۔ صفائی اور سادگی اس کے کلام کے گویا لوازم ہیں۔

شاہی کے کلام کی تعریف اور اس کے اردو شاعری کے انہماک کے متعلق بیجاپور کے سب مورخ ہم زبان ہیں، اور اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شاہی کے کلام کو مرتب کرنے کا کام اس کے صاحب ذوق مصاحب شاہ

---

[1] اس کلیات کا یہ نسخہ دفتر دیوانی و مال حکومت حیدرآباد کے کتب خانہ میں ہے۔ اس پر ہم نے تفصیل سے ایک مضمون لکھا ہے جو رسالہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوا ہے (جلد ۱۴ نمبر ۵) اور یہ مضمون ہماری کتاب مقالات ہاشمی میں شامل ہے۔

ابوالمعالی کے ذمہ تھا۔ بہت ممکن ہے کہ دستیاب شدہ کلیات وہی ہو۔
ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :۔

قصیدہ سے

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل
عقل معلم اپن قصہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے عقل ہمہ کا لہے
عقل کا جاسوس ہو مکہ پہ اچھے یو کرن
عقل کا موتی نگر مغز کے طبلے بہتر
خوب دسا وے جھلک و سنگ در عدن
عقل کسوٹی ہوئی طبع کے کستے بدل
بوجھ رکھیا ہے صراف فلک کیر اپیو کنجن

خاک کی پتلی بنا روح سنے تن میں بھرا
چال چلا کر اول آپ سکھایا کہن
آب و آتش ملا خاک و ہوا نے کلا
چار عناصر لگا دیہ ستوا دیا ہمن
دو دھیر یں جو تمام سجدہ کریں صبح و شام
نیک نشانیاں نشانیاں چاند سورج ہور گگن
نور کا جھلکاٹ سے حور پری لک سنوار
سات طبق سر کے بوہ رکھیا تو دامن

شاہی عاشق اتا بول مناجات کچ
تاکہ کرم تج پہ ہوئے بہر حسین و حسن
کار جہاں کے سگل فکر تے بہار ہی اچھے
سائیں کرے لوبہ جب وہ رہیو جاوے محن
آہ و افسوس کے تیج تے دمحفوظ دہر
سایہ کرم کا دکھا ذوق سوں رکھے تج بدن
سائیں سچا ہے تھمیں سیوا تجے ہے سہی
جیتے جہاں کے شہاں ذکر یں تج مرن

علی داد محل اور اس کے باغ اور حوض کے متعلق ایک قصیدہ ہے۔
اس کے بعض شعر یہ ہیں :۔

کسوا ایا اٹھواں سمدر بہر یا جب نیر سوں حوض
مزا واداس کے آتیگے ہے یو علی داو محل
پایا یو اچھے اس قصر کا پاتال تلک
طاق کسرئی ہوئے معراج اُسے نہ کسا اگل

بھرے ہیں باغ کے تختے گلاں ہر جنس کے تے
خصوصاً رینو بخانس ہیں یو دساوے خجل
دسے نزہت کے یو کونے جتے ناریل کے گھر
میٹھے کئی نیر جیشمے تے بھریا ہے منجل
نارنگی رنگ کا ہوس دہر لگیا باغ بینے
رنگلے تن کوں سراسر دیکھ ہوئے رنگ رس ہیں سگل

خاتمہ

دکھانے طبع کی قوت شاہی اس بحر منے
بندھیا ہر بیت میں کئی لفظ یو صنعت کے نول
جان ہور دل سئے اجابات دعا منگتا ہے
تا اچھے امن میں سکھ چین تے یو خلق سگل
جو لگوں نور سوں دن کر اچھے ہور چاند دگگن
جو لگوں زہرہ ہے زاہر اچھے ہور پر زحل
مشتری سعد ہے جو لگوں دعطارد ہے دبیر
جو لگوں پانچو منے اکاس پہ دستا ہے منگل

جو لگوں رات دن و پھر گھڑی جشن منے
بجو انند سوں اس گھر میں سدا تال منڈل

مثنوی

کلیات میں بہتر (۷۲) شعر کی ایک مثنوی خبر نامہ کے عنوان سے ہے
اس کے بعض شعر یہ ہیں:-

اول حق کی توحید سوں کر سخن — پچھیں خوش ادا سوں بیاں کر بچن
تجھے ہے سزاوار حمد و ثنا — ترے حکم سوں ہے تھنا ہور بڑا

- - - - - - - - - - - - - - - -

انا ایک قصہ سنو جنگ کا — کہ وہ جنگ تھا دین کے ننگ کا
اتھا ایک خیبر کا قلعہ بکل — بڑے پہر کلاں پر اکل تھے اٹل

- - - - - - - - - - - - - - - -

سلح ظاہری و باطنی سوں سنوار — عنایت کیئے شاہ کوں ذوالفقار
روانا ہوے جنگ کے لئے نامدار — وہ شاہ ولایت ادھک کام گار
چلے شہ وہیں کفر کوں توڑنے — ادجاسٹ پتھر کے تاں پھوڑنے

- - - - - - - - - - - - - - - -

جو مرحب نے دیکھا برادر رکنیں — کہیا وہ گیا تو لڑوں گاج ہیں
زرہ باندھ دوہری بندھا وہ فرنگ — دکھیا دل میں جب شہ سوں کرنے پلنگ
لیا ہات بھالا جو تھا تیں من — شتابی سوں آکر کھڑا بیچ رن
جو دیکھا نظر بھر شہنشہ کا مول — وہ بولیا سخن یو الیس بوج سوں
کہ سپنے میں دیکھیا ہوں میں رات شیر — کیا پھاڑ نیچے سوں الیس کوں زیر
وہی شیر دستا ہے مج آج یو — غصے سوں کرے گا کمہ دہر کوں دو

شہنشہ نے مرحب کوں بگی بلک	نہ دشمن کر مٹے جیس نے پا نلک
یہودی جتے تھے ہوئے سرنگوں	غنیمت لگی بات حد سوں فزوں
فتح کر قلعے کوں شہنشاہ سور	پھرے بیگہ لشکر پیمبر حضور
پیمبر خبر سنکہ خوش حال دل	ہوئے نو آنگے آ علی شہ سوں مل

ترا یاد دن رات شاہی کا کاج
ترے فیض سوں ہے اسے تخت و تاج

غزلیات

نمونہ غزل :-

سارے جہاں کے پار کہی پر کہوں رتن کیونکر کہو
یاقوت ہور مرجان ہیں کہہ ہی رتن برتر کہو
بولے جہاں کے پار کہی ہمنا نہ آدے بولنا
تمنا سہاتا بولنا اے شاہ بحر و بر کہو
بولیا ہوں ٹٹ ہیں نکر ہتنے بودو رتن کا فرق کر
گر کچ اچھے انصاف تو اس بول کوں خوشتر کہو
مرجان ہیں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے
جس ذات ہیں صافی اچھے اس ذات کوں بہتر کہو
یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل
سنکر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

منظفر علی شاہ کے ہات کا اچک تیر لاگیا نشان کے پلک

ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشان تج ہات کا

تج بال کالے دیکھ کر بادل پھریں حیران ہو
تج پہال ہور پلک کنے کیا چاند ہور کیا سورج ہے

تج نین کی نرمی کنے سنگتے ہیں موتی آبرو
یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کی حمد رہے

تج گال پر رنگ کا نشان دستا ہے مج اس بات کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

جس دن تے نمن سات لگیا من رہا ہمارا
اس دن تے پرت کا ہوا مج تن ہیں پکارا

ریختی :۔ سلطان کے کلام میں ریختی بھی ہے :۔
مج نین کے نگر میں لالن وطن کئے جب
تب انجمن کے لوگاں خلوت اسے کہتے ہیں
گل ہور گلاب میانے نہیں کچ فرق ازل تے
یوں پیوں سوں مل رہی ہوں الفت اسے کہتے ہیں

دون دون رسن کری ہیں شاہی کانانوں لینے
پھر پھر دہ نانانوں لینا راحت اسے کہتے ہیں

نمونہ خمسہ

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات
میں نیہ بندی توں کیتا گھات
دل مرا اپنے سات کیا
مج برہے میں دن رات کیا
دل داری کا نا بات کیا
سب بسرا اسکہ ہے ہات کیا
کئے مج سوں ایسی دہات کیا
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات
میں نیہ بندی توں کیتا گھات
پیو مورت دیکھو سپنے میں
جب جاگو تب رہوں سپنے میں
لا دیپک برہا اپنے میں
تن جاتے جھک جھک جپنے میں
آرام اچھے مج کھپنے میں
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات
میں نیہ بندی توں کیتا گھات
تج یاد کر تل ملتی ہوں
لہو تیل منے دل تلتی ہوں

تن موم بتی ہو جلتی ہوں
اس جلنے سوں نا ٹلتی ہوں
سب آپیں برہ میں گلتی ہوں
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں تیہ بندی توں کینا گھات

کوئی آؤ سنو رے میرا حال
پیو کیسا مج سوں جو کو تال
میں جگ تے نت اٹھ انجو ڈھال
کل پیتی آنسو موتی مال
مج یک یک پل ہے لک لک سال
کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں تیہ بندی توں کینا گھات

رباعی

سب دیس گیا ہے دھن تے لڑتے لڑتے   کھٹ رات گئی ہے پانوں پڑتے پڑتے
کیا نیکہ بدن کا افریخ لگتا ہے مجھے   رہے پاؤں سرے پرت کے جڑتے جڑتے

شاہی کے کلام کا مختصر نمونہ پیش ہو چکا ہے، اس سے واضح ہے کہ قصیدہ مثنوی، غزل وغیرہ اصناف سخن میں اس کو پوری مہارت حاصل تھی۔ اس کے قصیدے اپنے زور کلام اور طمطراق اور تشبیہ و استعارہ کے لحاظ سے کافی بلند ہیں۔ مثنوی میں اس نے واقعہ نگاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ شاہی کی غزلیں حقیقت نگاری کی جھلک پیش کرتی ہیں، کیونکہ شاہی محل سراؤں اور ایوان میں خوبی اور رعنائی

کے مجسم پیکروں کی کوئی کمی نہیں تھی، رخساروں کی گل گونی، اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آٹھوں پہر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا۔ اس طرح حقیقت نگاری کے ساتھ رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی تخیل کی بلند پروازی کو ظاہر کرتی ہیں۔

سلطان نے دولت کے دامن میں آنکھ کھولی، ہوش آیا تو عیش و نشاط کا چرچا سنا اور جوان ہوا تو ساغر و جام کا دور دیکھا۔ اس لحاظ سے کلام میں رنگینی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے مملو ہونا ناگزیر تھا۔ بلحاظ فن اس کے کلام کو جانچا جائے تو بلا شبہ اس کا کلام بہت بلندی پر نظر آتا ہے۔

سلاطین بیجاپور کے کلام کے بعد اب ہم اس دور کے شعرا کا کلام پیش کرتے ہیں۔ جن کی ابتدا یوسف عادل شاہ کے زمانہ سے ہوتی ہے۔

شاہ میراں جی شمس العشاق:

حضرت شمس العشاق ان اولیاء اللہ سے ہیں جن کا فیض صدہا مخلوق خدا کی ہدایت کا باعث ہوا ہے۔ شہر پناہ بیجاپور کے باہر آپ نے اقامت اختیار کی تھی آپ حضرت خواجہ کمال الدین بیابانی کے مرید تھے۔[1]

۲۵ رشوال ۹۰۲ھ کو آپ کا انتقال ہوا۔ آج تک عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ شاہ حسین ذوقی نے شمس العشاق سے آپ کی تاریخ وفات نکالی تھی۔[2]

اکثر صوفیا کرام نے اپنے مریدوں اور خلق اللہ کی ہدایت کے لئے وعظ و نصیحت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی قائم رکھا تھا تاکہ ہر طرح مخلوق خدا

---

[1] روضۃ الاولیاء بیجاپور۔

[2] رسالہ اردو۔

کی خدمت ہو سکے۔ دکن کے صوفیا نے اپنی تصانیف میں اکثر و بیشتر وہ زبان استعمال کی ہے جو یہاں عام طور پر بولی جاتی تھی۔ حضرت شمس العشاق بھی ایسے ہی بزرگ تھے۔ آپ کے مریدوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ آپ کی متعدد تصانیف کا پتہ چلا ہے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں۔ خوش نامہ۔ خوش نغز۔ شرح مرغوب القلب[1]۔ اول الذکر دونوں نظم ہیں اور آخر الذکر نثر میں ہے۔ نظم کی دونوں کتابیں تصوف میں ہیں۔ اس کے مخطوطات انجمن ترقی اردو میں محفوظ ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

(۱) خوش نامہ:-

صنعت کر دل میں اللہ کیری جے پوری پورن پور
نادر قدرت انگیکار دل نیرے نادور
نا اس روپ نا اس دیکھ نا اس ٹھاں مکاں
نرگنا گنو نا کرو اکس مکھ کر دل بکھان

بیرہ ھی جی پرم لگاوے نور نشانی عین
مزہ کی سدھ لکھاوے جہاں دیس نا دین
علوی نہیں جی چھڑی اکارا سو مکھ مری جوں بات
سفلی کھیل کھلاوے دائم اپنے فعلوں سات
فعل سہادا پنھ اللہ کا جس راہ گئے رسول
کر مکھ پنھ بچھانوں سو ہے جیہ جیون کا مول

---

[1] رسالہ اردو۔

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور
یہ خوسش خوشیاں اللہ کیرا نور اعلیٰ نور
کھنڈبا خوسش خوش نامہ تحت ہوا تمام
خوش سب کوئی دایم قایم جیتا خود ہن عوام[۱]

خوش نغز:-
جے ہماری ارادت کی ان کا یہ احکام
نماز تسبیح نیتاں ذکر اللہ یک نام
اس پر جیتا ہے عدق سن اذنا اچھے لاب
دین دنیا دیدار بہشتاں پاوے بےحساب

خوش پوچھے کے کہو میرانجی عالم اچھے کیتے
پیر کہیں سن جیتے تن اچھیں عالم تیتے[۲]

برہان الدین جانم: برہان[۳] الدین جانم حضرت شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ ہیں۔ علوم ظاہری اور باطنی کو اپنے والد سے حاصل کیا۔ ۹۹۰ھ میں انتقال ہوا اور اپنے والد کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

ان کے متعدد تصنیفات دکھنی زبان میں ہیں جن میں سے اکثر منظوم ہیں۔ ان کا موضوع تصوف و سلوک ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

---

[۱،۲] ازرسالہ اردو اپریل ۱۹۲۷ء
[۳] روضۃ الاولیا بیجاپور

(۱) وصیت الہادی :-

سکنا قادر قدرۃ سون سمجھے تجہ کوں کڈی کیا

جس کوں لہ لمے دلبرے راہ کہیا بھیدی من بسیا

یہ روپ پرگٹ آپ چھپایا کوئی نہ پایا انت

پایا موہ ہیں سب جگ باندھیا کوں کہ سوجھے سنت

امر خدا کا لیاؤ بچانوں ہتی ہتی منکہ ہونا

مقام شیطانی جس کو کہنا دل نفی سارا ہونا

چلنے کا تو نیم نہ ہوے یہ تو شاپھو کٹ کھایا

اس دھات عمر خرچ کینا آخر پھر پچتایا[1]

۲- سک سہیلا :-

گن آدم کا نہ دھات چڑھے رے کیوں کہنا انسان

صورت پر اعتبار نہ راکھیں جیسے ہیں حیوان

بلکہ ان تھی گمراہ کر لیوں قرآن ہیں فرمان

لوکاں یہ منت کچ الادھی جن بوجھہ بختو لادھی

۳- منفعت الایمان :-

اللہ واحد سرجنہار	دو جگ وجنار جیا ایار
سگل عالم کیا ظہور	اپنے باطن کیرے ظہور

---

[1] رسالہ ماہ دو جولائی ۱۹۲۷ء

کوئی کہیں سب عشق تمام — عشق کی آنکھیں کیا ہے نہام
عشق لیا ہے سب پھر یاس — عشق تھی سکلا بھوگ بلاس
بعض اکھیں اپنی بوجھ — معلوم نہیں کچھ اس کی سوجھ
ایک جمع سب پکڑیا بار — جو نکے بیج تھی نکلیا جھاڑ
کانٹا چھانٹا پھل اور پھول — شاخ برگ سب دیکھ اصول[1]

ان تصنیفات کے علاوہ آپ کا کلام جو "حقیقت" کے عنوان سے لکھا گیا ہے دستیاب ہوا ہے۔ ایک نظم یہاں درج کی جاتی ہے:-

نہیں مجھ سیں پتہ لگائے من لیتاری
اللہ مجھے عاشق اپنا توں کیتاری

اب چھوڑ نین کہوں مت جاوے رے
مجھ برہ جلی کوں مت ترساوے رے
یو جانے توں میری من بھاوے رے

یو تو شام سلونا توں میرا رے
نہ چلی تجھ پر منتر ٹونا رے
جو کوئی چاہئے سو فانی ہونا رے

یو تو برہ اگن سب دل لائی رے
تن فانوس کر یوں دکھلائی رے
لہو تیل دیا دیپک جلائی رے

---

[1] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء

آہے جانم جیہ جانے فانی رہے   جان کی آج ہے جہانی رہے[1]

ان کتابوں کے علاوہ نکتہ واحد، نسیم الکلام، رموز الواصلین، بشارت الذکر جنت البقاء، ارشاد نامہ وغیرہ ان کے دوسری کتابیں ہیں۔ آپ کی بعض تصانیف کتب خانہ آصفیہ اور کلیہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ اور ایک دو کتابیں ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

عبدل: اس عہد کا ایک شاعر "عبدل" ہے۔ افسوس ہے گولکنڈہ کے بعض شعرا کی طرح بیجاپور کے اس شاعر کے نام سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ بقول بعض "عبد الغنی" اس کا نام تھا[2] اور تخلص عبدل۔

عبدل ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں تھا۔ اور اپنے آپ کو سلطان کا شاگرد کہتا ہے۔ اس زمانہ میں عام طور سے یہ دستور تھا کہ شاہی استاد خود کو شاگرد کے لقب سے موسوم کرتے تھے۔

عبدل کی ایک مثنوی دستیاب ہوئی ہے جو ابراہیم نامہ سے موسوم ہے اور سنہ ۱۰۱۲ھ میں قلم بند ہوئی ہے۔ ابراہیم نامہ ابراہیم عادل شاہ کی لائق ہے، اور خود اس کے حکم سے تیار ہوئی ہے۔ چنانچہ عبدل بیان کرتا ہے کہ اس کو بادشاہ نے یاد فرمایا اور حکم دیا کہ کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس کا جواب نہ ہو۔ اس نے عرض کیا کہ اس کو صرف ہندی (دکھنی) زبان آتی ہے۔ عرب اور عجم کی کسی زبان سے واقف نہیں تو سلطان نے حکم دیا اس زبان میں لکھی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں

---

[1] از بیاض آقا حیدر حسن صاحب۔ [2] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۲۶۸

یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ اس کے تقریباً سات سو پچاس شعر ہیں۔ اس میں حمد و نعت منقبت کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مدح ہے۔ اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔

نفس مضمون کے بعض عنوان حسب ذیل ہیں:۔

تعریف سخاوت بادشاہ، شہر بیجاپور، دربار بادشاہ، نورس محل، مجلس بادشاہ، شکار، ہیبت لشکر، تعریف فیلان شاہی، سلحدار بادشاہ، تعریف اسپاں، تعریف باغ، تعریف بہار، میزبانی، سالگرہ وغیرہ۔

اگرچہ یہ مثنوی ابراہیم عادل شاہ کی پوری سوانح عمری نہیں ہے۔ لیکن اس میں سلطان کی خانگی زندگی کے حالات ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس طرح ادبی اور لسانی اہمیت کے ساتھ تاریخی لحاظ سے بھی قابل قدر ہے۔ ابراہیم نامہ کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

حمد:۔

الٰہی زبان گنج توں کھول منجہ — امولک بہا کہہ جکو جیہ بول منجہ
کہوں باسم اول تو اللہ لائے — گلے موکھ کھلے جیب پکڑے ادسے

اونہی شاد استاد کر سو نظم — بلایا جو عبدل کوں سر ہاتھ دھر
نوی بات مضمون کر اک کتاب — نہ کو تکر گوندھیا ہے تس کا جواب
نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشان — اگر کچھ رہے تو بچن شعر جان
سو یوں بچن سن شاہ استاد کاں — پوچھیا جگت گرد شعر کہہ کس زباں
زباں ہندوی مجہ سوں ہور دہلوی — نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

کہیا شاہ استاد عبدل سو یوں — توں ہر اک زبان کر شعر بات کوں

نعت

گوسائیں ایکٹ نفانہ ہور کچھ موجود — بنایا تمہ سوں لگ جگ وجود
جو گنج مخفی سو پرکٹ دکھائے — عشق آرسی میم مشکل بھرائے
احمد دو ہر میم احمد کہیا — حرف چار ل بھید بھار و دیا

نفس مضمون کی ابتدا

کروں ابتدا اس شہ براہیم نام — کہ جس صفت عالم بھریا ہے تمام
سرگ مرت پاتال ہر یک دھرا — دعیبا روپ سرور ہو عالم بھرا

پڑی سانجھ دریا میں جب اسکو — صبح آئی مانگی سو شہ پائے پر
توں شہ رنزلہ عالم سورج روپ دان — جیوں منجہ چرن تن ہوئی روشن جہان
دسے تج شہ روپ نا ناپ بھائے — سورج آن بھیوں کمنا سو جیب پاننے جائے
وہ جی چاند ہور بھی نہیں روپ کہ — بدھا گگن دوگھڑی لومن نن دھر

شہر بیجاپور کی تعریف

سنوں اب صفت شہ رہن تخت نہاڈل — بدیاپور ان کہ ہی بھی اس کا ٹاؤں
کہ دھن اس زمیں نہاؤ تھے بخت بھر — بسیا ہیں جس کی بدیا پور نگر
دلیکن جتا کچھ زمیں کا مدد ہان — سو اوس شہر کا چوک اک ... میان
کریا اوس شہر کا چھبی ایک جسان — دس روپ ست کھن گگن ہور نشان

سورج تاس زرین تا تکیا سو بائے | کرن دور لا باندہ دستانوں مائے
کونداں کھلا جیوں رکھیا تہر بھر | بھری چاند پورن سو روپی کی دھر
تنارے کنت زد شو من کہوں کی ہار | رکھیا مو تنگی لائی کو شن سو تھار
کیا ادس شہر دور خندق نشان | رکھیا پل پلا تیسر پر آسمان

جون بازار چاروں طرف شہر تھار | بدیا باغ ہیں ہو چمن طرف چار
کلا وتت کلا روپ کسوت سو یوں | سو رباد بدیا بھری چھار جیوں
یو معمور بستار شہر تھار تھار | ہر ایک دھات بر روپ ہر ایک بازار
نکل شاہ کسوت سوں کر دو نگار | دسے اس شہر میں سو ھو یوں نکار
سمند شہر دولت سورج شاہ بھر | دسے چہاند گرناں سوں ہر ایک دھر

تعریف نورس محل :-

سنو اب عفت شاہ محل رہن تھاؤں | دھریا ناؤں نورس محل تس جو ناؤں
دلے محل نورس دھریا ناؤں یوں | پھریا رنگ نورس نت اندر روپ جیوں
ادسی محل پو شاہ عالم نو مائی | کہ جیوں چاند پر سور پھیا ہے آئی
دلے محل نورس ہوا یوں اٹھان | دسے گگن آگن ہور اس نشان
گگن سات سیڑھی جو رل جوڑ کر | فلک محل نورس کی ایک کمن اوپر
دلے گگن آگر چھپی تس منجہ نار | رہے طاق بندھیا ہو بر تھار تھار

نوروز کا جشن :-

سو یوں کھیل کر شاہ نوروز آ | برس گانٹھ کر مزدانی گنا

کہوں مزبانی برس گانٹھ شاہ — جو ہر برس کہ مز باجی نو ماہ
نہ ایسا سنیا شہ کو دیکھیا کہ ہر — جو ہر برس نو ماہ اندکہر
ہوا شاہ فرمان عالم اوپر — ہر ایک ملک ہر دیپ ہر شہر گھر

تعریف لب:-

کوئی مکھ ادھر پہ سو لعلی دھری — رکھی آرسی بیچ کنول پنکھڑی
کیا اوکھیلیا پھول جا سوں بسائی — رکھیا خورش کا فور پہ آن لائی

تعریف پستان:-

کوئی آکھڑیاں، دسو تو جو بنیاں — حسن حوض جیوں کنول دو لگیاں
کیا زیب سینا صدر عشق کا — رکھی پھول دو ڈھک نو ہر مشک کا

خاتمہ کتاب:-

تو عبدالکبنی صفت کدنشہ بیاں — رہی ہے سو بھر کہ زمیں آسماں
سو شہ صفت بھر رہا دبل رنگ ہے — رہے چھائی تہ لوک کی سنگ ہے

- -

نہ یو پھول گدھیں جاہں کھلا ستے سر — رہیں باغ عالم میں نت باس بھر
بچن پھول گوندیوں ابراہیم نام — کیا سیس پہ برس بارہ تمام

سنہ ۱۰۱۲ ہجری

خدایا تو عبدل بچن پھول کر

پھنور عارفاں چت سو مقبول کر[1]

---

[1] از کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو

آتشی: حکیم سید آتشی نام اور آتشی تخلص اس دور کا زبردست شاعر تھا۔ فارسی کے ساتھ اردو (دکھنی) میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تاریخوں سے اس کے بلند پایہ شاعر ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم کو اس کا کوئی اردو کلام دستیاب نہیں ہوا۔ مولف اردو شہ پارے کی کوشش بھی ناکام رہی[1]۔

مقیمی: مرزا محمد مقیم مقیمی اسی دور کا دوسرا مشہور فارسی گو شاعر ہے۔ فارسی کے ساتھ دکھنی میں بھی شعر کہے ہیں۔ اور ایک مثنوی چندر بدن و مہیار اس کی یادگار کے طور پر اب تک موجود ہے۔ ۱۰۵۰ھ اس مثنوی کا سن تصنیف ہے۔ جو قصہ اس میں منظوم کیا گیا ہے وہ بظاہر ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر بقول نواب سرامین جنگ بہادر اس قصہ کی اصلیت ہے اور اب تک علاقہ مدراس کے ایک قصبہ میں ان دونوں عاشق و معشوق کی قبر موجود اور زیارت گاہ عام ہے۔ مہیار کا اصلی نام محی الدین تھا۔

مولف تزک آصفیہ نے بھی اس کی صداقت کے متعلق صراحت کی ہے[2]۔ اور اس کو ابراہیم عادل شاہ کے عہد کا واقعہ بیان کیا ہے۔

اس مثنوی کے نسخے یورپ میں موجود ہیں۔ ہم نے اپنی تالیف[3] میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

چونکہ مقیمی ایرانی شخص تھا اور اس کی زبان فارسی تھی اس لئے دکھنی شاعری میں اس نے کوئی نام پیدا نہیں کیا۔ اس کی یہ مثنوی بھی شاعری کے لحاظ سے کوئی

---

[1] اردو شہ پارے صفحہ (۱۵۷، ۳)

[2] تزک آصفیہ صفحہ ۱۵۲ و ۱۵۳۔

[3] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

بلند پایہ مثنوی نہیں ہے۔

اسپرنگر نے جو صراحت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک اور مثنوی بھی تھی جس کا نام سوم ہار تھا اس کے دو سو پچاس شعر تھے۔

مولف آرود شہ پارے[1] نے بھی تفصیل سے اس کے حالات بیان کیے ہیں بعض اصحاب مصنف چندر بدن و مہیار کو عالمگیری عہد کا شاعر تصور کرتے ہیں مگر ہم نے ابھی اوپر جو امور واضح کیے ہیں ان کی بنا پر یہ خیال درست نہیں ہے۔

مقیمی کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

خدا کون سزاوار کبر ومنی	اوتا وہے قدرت کا صاحب دھنی
جو بول کیا آدم یک اروا ج کوں	بسالیا ہے طوفان نتے تو نوح کوں
کیا نار گلزار رب الجلیل	کہ نمرود کے ہات بانچیا خلیل
سُنا ہوں کہ یک شہر سندر پٹن	اتھا راج وہاں ایک ہندو برن
اتھا بہوت گیراں ہیں یک وس کہنا	برس وس کوں وہاں شہر بسیر لینا
کرے راج پوجا سو اس دیو کا	تماشا عجب وسے سیو کا
کہ راجوں ہیں او راج جگ راج تھا	کہ گو ہر و ہرن ہار اپنا اتھا

کہا جا اوسے اسے دیو انے بشر	کہاں سوں تو آیا چلیا ہے کدھر
اونے جواب پھر کہہ دیا شاہ کوں	توں جب چل پکڑ اپنی بات کوں
تون عاشق ہوا ہے سو کس حور کا	ہوا مبتلا کہہ توں کس نور کا
تیرا من لگیا ہے سو کہہ ندل منجے	جو معشوق تیرا میلا اوں تجے

---

[1] صفحہ ۳۷ تا ۳۹۔

نزدیک جا کو یو لیا کہ سن اسے پری
منجے تجہ لطافت دیوانہ کری
دیوانہ ہوں تیرا دبولنے کے تئیں
اپس تے تکو دور جانے کے تئیں
سو تجہ بن منجے کوئی ہونا نہیں
کہ بن جل مچھے کا سو جنیا نہیں
کتا ہوں تجے بیں کہ اسے گن بھری
توں کرنا اپنا تجہ مری دلبری
سون یون کہا دب سون توڑ کر اوسنے
دہریا سس اس کے قدم پر ادنے
گلا اس سنا کر اماٹی بول یوں
سمجھ کچ اپس کوں اے بیدل توں
ہندو میں کہاں اور ترک توں کہاں
کہاں رام سیتا مورک توں کہاں

ہوا جوں عمل قبر کا سب تمام
اوٹھیا دفن کر نیکوں شہ نیک نام
نیکا جل قبر میں رو تا روں اوسے
دفن کر دیناں تے بسار دں اوسے
جو دیکھے جنازہ ہیں جھبار کو بی
اوہے حفت ملکر اوسے نار سون
کفن بیچ آکر او چندر بدن
گلے لگ سوتی ہے سو جوں ایک تن[1]

امین: بیجاپور اور گولکنڈہ میں متعدد شعرا ایسے ہو گزرے ہیں جن کا تخلص امین تھا۔ زمانہ مابعد میں بھی متعدد شعرا کا تخلص امین تھا۔ بیجاپور کے اس امین کو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد سے تعلق ہے۔ اس کی مثنوی بہرام وحسن بانو ہے۔ مثنوی سے امین کے ذاتی حالات کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صوفی مشرب فقیر آدمی تھا۔ شاہی دربار سے اس کو تعلق نہیں تھا۔

اس کی اس مثنوی بہرام وحسن بانو کا ایک نسخہ یورپ میں موجود ہے[2]۔ مولف

---

[1] مثنوی چندر بدن و مہیار۔

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۱۷

اردو شہ پارےؔ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر مولف اردوئے قدیمؔ کی رائے میں یہ مثنوی گجرات کے شاعر امین کی تصنیف ہے۔

واضح ہو کہ اس مثنوی کو امین نے مکمل نہیں کیا ہے بلکہ دولت نے اس کی تکمیل کی ہے۔

امین کی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھا شاعر تھا اور شعر گوئی میں اس کو خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے :۔

الٰہی جگت کا کرن ہار توں — غریباں نباں کا ادھار توں

کیا حمد اور نعت کون مختصر — نہیں ہیں کیا طول یو سر بسر

یکایک میرے دل پہ آیا خیال — قضا یک کہوں میں مقیمی مثال

زباں پر بچن خوب آتا چلا — یو مضمون خوش تر بناتا چلا

زبان پر ہے جس کے موتی آبدار — اسی کے بچن کا ہے اکثر وقار

سہیلیاں جو تھیاں تیں اس کے سنگات — انوں نے نکالے یہ اس وقت بات

سنا شہر فارس کا ہے بادشاہ — ہے خوبی منے خوب جیوں مہر و ماہ

کہتے ہیں بہوت خوبصورت ہے او — فرنگ چین کی خوب تورت ہے او

اگرچہ دبی آدمی زاد ہے — چندا اس کے انکھیں سو بی نہات ہے

لے آیا اسے دیو عاشق ہو کر — رکھا ہے لیا کر اپس ٹھار پر

کبوتر ہوا اسکوں جیو دیکھ آئیں

ہو بچھوں اپنے گھر کوں اپ سب صد آئیں

۱؎ صفحہ ۲۹۔ ۲؎ صفحہ ۲۸۔

وہ حسن شاہ داں سیتے آیا بہار	دیکھت شہ کی خوبی گیاں سدھ بسار
ترت سیتی ملکہ یوں کینی عرض	کہوں تم کوں ہم ساتھ کیا ہے غرض
جو کیڑے ہمارے رکھیں ہے چھپا	جو کچ دل میں ہوئے سو دیو تم بتا
انوں ساتھ تب شہ اوٹھا بول کر	چھپے راز دل کے سبھی کھول کر
تمارے جو ہے ساتھ بانو حسن	اسنے دل میں میرے کیا ہے وطن
میرا جیو اسن پہ ہوا ہے فدا	خدا اس سیں مجکوں نہ راکھے جدا[1]

شوقی: حسن شوقی کا ذکر مولف اردو شہ پارے نے گولکنڈہ کے شعرا میں کیا ہے۔ مگر اس کو دکن کے تین مختلف درباروں یعنی قطب شاہی عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں سے تعلق تھا چونکہ زیادہ تر زمانہ اس کا بیجاپور میں گذرا ہے اس لئے ہم اس کو بیجاپوری شعرا میں شامل کرتے ہیں۔

شوقی کی شہرت اس کی زندگی میں کافی طور پر ہو چکی تھی ابن نشاطی نے اپنی مثنوی پھول بن میں اس کی تعریف کی ہے اور اس کے زندہ نہ رہنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

اس کی دو مثنویاں اور چند غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جو انجمن ترقی اردو[2] میں محفوظ ہیں۔ ان دو مثنویوں میں سے ایک مثنوی میں اس مشہور لڑائی کا ذکر ہے جو شاہان دکن اور والی بیجانگر میں ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوقی کو اس زمانہ میں نظام شاہی سلطنت سے تعلق تھا اس بنا پر اس فتح کا سہرا اسی سلطنت

---

[1] مثنوی بہرام وحسن بانو۔ [2] رسالہ اردو۔

کے سربانہ تھا ہے۔ حالانکہ دیگر سلطنتوں کا بھی اس فتح مندی میں خاصہ حصہ تھا۔
دوسری مثنوی میزبانی نامہ ہے۔ اس مثنوی کا موضوع سلطان محمد عادل شاہ والی
بیجاپور کی شادی ہے۔ سلطان نے اپنی یہ شادی اپنے وزیر مصطفےٰ خاں کی لڑکی
سے رچائی تھی۔ اول الذکر مثنوی سے لڑائی کے حالات تفصیلی طور پر معلوم ہوتے
ہیں دوسری مثنوی سے معاشرتی حالات کا اچھا اظہار ہوتا ہے۔ عیش و عشرت کے
جملہ لوازمات پر نہایت استادانہ طریقہ سے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

۱۔ فتح نامہ نظام شاہ :۔

الٰہی کرم کا کرنہار توں ۔۔۔ ہے اول و آخر رہنہار توں
سو قادر ہے قائم تو پروردگار ۔۔۔ توں قادر ہے دائم اپیں برقرار

اپس میں اپیں دوست سب مل ہوے ۔۔۔ محبت سوں اخلاص یک دل ہوے
نزاع دل میں کا دور کیتے نفاق ۔۔۔ اپس میں اپیں مل کئے اتفاق
یو سب مل کے ایسا کئے یک بنا ۔۔۔ جو اس کفر کو مار کرنا فنا
کئے بہاگ سوگند و عہد استوار ۔۔۔ یو غازی غسنا پر ہوئے برقرار
نکو ڈر بلاتے جو شب درمیان ۔۔۔ دیکھن کیا چرخ پھیرے ہے آسمان

ڈوبے آفتاب زریں سو غرقاب میں ۔۔۔ گئی حور زنگی کرے خواب میں
حبش نے مہوان چیر سر پر لیا ۔۔۔ نزک دیکھ پر نار سر تل کیا
حبش تے جو پرگٹ ہوا چاند روپ ۔۔۔ حبش نے جتنے ترک جینی مرد بیپ
بیٹھا ناگ کالا اڈیا راج ہنس ۔۔۔ اوٹھی سیام سندر سو تاراج اونس

پڑیا پھول پر جب ہنور پنکھ پسار — چھپا ترک زنگی کھڑا آشکار

ہوا گرم تر معز نب راۓ کا — سنا جب بو آواز کو نالے کا

کریں رام اچھتے ترک زور کیا — سمندر اچھے حوض کوں شور کیا[1]

۲۔ میزبانی نامہ :۔

سدا وار پر تجھ منگل گنہ گنہ ہیں — منگل گز گزین جیوں بدل گز گزین
ہستی مست پر پیلیاں مست ہے — زبردست پوکیا زبردست ہے
سدا وار پر تجھ طبل باجتے — طبل باجتے ہور صندل کا بجتے
بہت دیس تے شہ کی گھر کاج ہے — شہر گشت کی رات سو آج ہے
شہر گشت کا ساز و ساماں ہوا — نفیر باں ترائے وماماں ہوا[2]

۳۔ غزل :۔

دلبر سلونی نین پہ کھینچی ہے سو کا خوبنر
خطاط جیوں مار یار قم چھند دن ثلث کے صاد پر
یا چاک دوات ہے سیم کی کیکی سو بھر سیاہی رکھے
سو کا قلم جیوں ولتے کاتب گیا اس ہیں بسر
یا نین موتی وھال ہیں سو کا سوتا گا نیل کا
موتی پرو کر کھینچتے تو رہیا ہے ٹوٹ کر[3]

---

[1] [2] [3] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۹ء۔

صنعتی: صنعتی کا نام ابراہیم[1] تھا۔ محمد عادل شاہ کے دربار سے اس کو توسل تھا صنعتی محمد عادل کے درباری شعرا میں بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ اس کی دو مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو قصہ بے نظیر جو تمیم انصاری کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اور دوسری مثنوی گلدستہ ہے۔ اول الذکر مثنوی کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے۔ اور مجلس اردو مخطوطات کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔ دوسری مثنوی کے متعلق رسالہ سب رس میں سید نجیب اشرف صاحب ندوی پروفیسر اسمٰعیل کالج نے روشنی ڈالی ہے[2]۔ اول الذکر مثنوی سنہ ۱۰۵۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

قصہ بے نظیر (تمیم انصاری) کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ اس میں سادگی ہے، لطافت ہے، جذبات کی روانی ہے۔ صنعتی کا کلام نہایت پاکیزہ ہے۔ برجستہ تشبیہوں سے آراستہ ہے۔

کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

ثنا بول اول توں سبحان کا — جو خلاق ہے جن و انسان کا
بشر کوں اپس قدرت پاک سوں — بنایا اگن جل یوں خاک سوں

نبی کریم شفیع امین — رسولِ خدا رحمت العالمین
کہ جس سر پہ لولاک کا تاج ہے — سو اس کوں عرش آپی محتاج ہے

محمد سنہ داد گردین پناد — کہ ہر دم محمد جسے دست گاہ

---

[1] اردو شہ پارے۔
[2] رسالہ سب رس ماہ فروری سنہ ۱۹۴۰ء

براہیم کے بعد از ہوا نام دار — ملکت ہیں محمد شہ کام گار
دکھن کا توں سب خسرو تاج دار — بخشے تاج داراں انتے باج دار

ہزار ایک پر سال پنجاہ و پنج — ہوئے تب ہوا پر جواہر یو گنج

کتیک رات دن یوں گئے جب گذر — دسیا باغ صحرا میں ایک سبز تر
ہر یک جھاڑ سو سبز جوں نوں بہار — ہر یک شاخ طوبیٰ نمن بار دار
درختاں جو پاناں سوں باندھے نقاب — دکھی زمیں رو کدی آفتاب
سو رگ بن جو تھی دھوپ کوں باٹ تنگ — انتا عرش نے فرش لگ سبز رنگ
سو لالے کے یاقوت جیسے چمن — سو نیلم نمن سب یو نقشے کے بن
دسیں نرگس اس یوں چمن خوب کے — جو جھلکے نین خوب محبوب کے

انتا شکر اس دیو کا بھانت بھانت — کدالیاں سی نک ہور نیشاں سے دانت
کتیک خرس صورت کتیک فیل سے — کتیک جوں سیاہی کتیک نیل سے
سکل بوم سے شوم دیدار کے — سکل نحس صورت زحل سار کے

ہر یک ہات میں کہکشاں سی کماں — ہر یک پاس محمد ستی تیر داں
لیئے تھے کتیک بیچ تے جھاڑ اکھاڑ — لیئے تھے کتیک سیس اوپر پہاڑ

دسیں جل ہو بادے تے اس دھات موج — کر خجل کی جیوں جگ میں غمزیاں کی فوج
دسیں پنج سنبل کی لالے میں یوں — عروساں کے رخسار پر زلف جوں
ہر یک پات پر بوند برسانت کے — ہر یک شاخ پر مرغ کئی بھانت کے

بجتے مرغ واں کے خوش آواز تھے
فرشتیاں سوں تسبیح میں ہمراز تھے

بچن آیتیں ہر مرغ کے سینے سنے صاف
صفائی میں نقشوں پر ان کی لاف

پری آپڑی دیو پر یوں شتاب
کہ دیوان پہ پڑتا ہے جوں آ شہاب

دہیں سب پریاں پر دیواں میں یوں
ستارے رین ماند تالے میں جیوں

سو کئی دیو ہر یک پری پے دو رنگ
کریں قتل یک شمع جوں کئی پتنگ

پریاں جو شش میں آ ہلنے لگیاں
سو دیوان کو سارے کھندنے لگیاں

لگیاں جب پریاں اس طرح مارنے
تو عاجز ہوا دیو کے سردارنے

ملک خوشنود: ملک خوشنود دراصل شاہان گولکنڈہ کا غلام تھا۔ خدیجہ سلطان شہر بانو کے ساتھ بیجاپور آیا اور اپنی قابلیت کی بنا پر جلد ترقی کرکے اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لیا۔ حتیٰ کہ بیجاپور کے شاہی سفیر کی حیثیت سے گولکنڈہ آیا۔ یہاں بھی اس کی بڑی عزت ہوئی اور اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرکے روانہ ہوا۔

خوشنود کی تصنیفات سے اس وقت تک صرف ایک مثنوی ہشت بہشت دستیاب ہوئی ہے۔ اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک اور مثنوی یوسف زلیخا بھی تھی جو سلطان محمد عادل شاہ کے حسب خواہش لکھی گئی تھی۔

مثنوی ہشت بہشت امیر خسرو کے اسی نام کی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ مگر یہ ترجمہ پورا ترجمہ نہیں ہے۔ اگرچہ اس مثنوی کا انداز بیان پیچیدہ ہے اور اس عہد کی دوسری مثنویوں خاور نامہ بہرام و حسن بانو کی طرح آسان نہیں ہے مگر پھر بھی

اس سے خوشنود کے بلند پایہ شاعر ہونے پر کافی ثبوت ملتا ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے[1]۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

سراؤں تجھ جو توں ہے پاک معبود — ہوا سب خلق و عالم تجھ سوں موجود
سنواریا کھن اوپر توں چاند تارے — کیا پیدا عرش کرسی چمارے

محمد مصطفےٰ محبوب رب کا — کہے سارے نبی توں تاج سب کا

اتھا او روز شنبہ کا نورانی — ابیں خشکیں کیا عنبر فشانی
دکھایا طالع اپنی شاہ یک روز — کیا اس روز میں بہرام نوروز
کیا مشکیں عمارت میں نول شاہ — کہ جوں نادر اچنبا برج میں ماہ
ابیں سورج کیا کسوت زین کا — دیا ترتیب سب ساقی سیں کا
سکے ہندی نہیں رومی پری کا — کمر جوں بال نازک استری کا
دعا اول کئے او تین یاران — جو اپنے ملک کے تھے تاجداراں
جداں لگیا مات دن ہے مرغ ماہی — تداں لگ کر توں جگ میں بادشاہی
جداں لگیا ہے دھرت ہور سور کا نور — اچھو تج شاہ کا یو ملک معمور
ہمیں تینو مسافر ہیں غریباں — جہاں کے فیض سوں ہیں بے نصیباں
بہت برساں کے پھرتے ہیں اداسی — ریاضت کی گلی میں کہاں پھانسی
ہمیں دیکھے تماشا سب نگہ کا — عجائب ہور غرائب بحر و بر کا
نہیں ہمنا کون بہاتا شہر گوشہ — طمع کا نیں ہمارے پاس توشہ

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۱۔

خدا کا ہے بہت ہمنا پو سایا | جو شہ کے شہر کے نزدیک لایا
ادل آیا بو زنگی جوں سیاہی | ڈرے جنگل کے سارے مرغ و ماہی

بچن بانا درورق سب زرنگاری | ملک خوشنود کا ہے یادگاری

رستمی : کمال خان[1] رستمی اس عہد کا ایک بلند پایہ شاعر ہے۔ اور سلطان محمد عادل شاہ کا دربار کا شاعر تھا اس کے اجداد کئی پشت سے بیجاپور کے نمک خوار اور شاہی خطاطی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

اس کا باپ اسمٰعیل خان تھا جس کو خطاط خان کا خطاب سرفراز ہوا تھا۔ یہ خطاب بھی اس کا آبائی خطاب تھا۔

رستمی اپنے زمانہ کا نامور ادیب اور باکمال شاعر تھا۔ فارسی اور دکھنی نظموں میں اس کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ بیسیوں قصائد اور غزلیات نظم کئے تھے۔ مگر افسوس اب سب ناپید ہیں۔ ایک مثنوی خاور نامہ موجود ہے۔ یہ مثنوی اس کی اعلیٰ قابلیت اور لیاقت کی بین دلیل ہے۔ جو بیس ہزار شعر کی طویل مثنوی کا صرف ڈیڑھ سال کے عرصہ میں تیار کر دینا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

اگرچہ یہ مثنوی ایک فرضی داستان ابن حسام کے فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے مگر جس خوبی سے رستمی نے اس کو نظم کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ یہ مثنوی نہ صرف رزمیہ ہونے کے لحاظ سے قابل تعریف ہے بلکہ اس کی اور بھی متعدد خوبیاں ہیں، اس مثنوی کا تسلسل بیان اچھا ہے۔ زبان کے لحاظ سے نہایت

[1] طبقات الشعرا میں اس کو رستمی تخلص لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

صاف اور سادہ ہے۔ اکثر اشعار ایسے ہیں جن کی نثر نہیں ہو سکتی۔ رزم کا نقشہ بہت قابلیت سے کھینچتا ہے۔ اسی طرح بزم کے حالات بھی نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں۔

یہ مثنوی ۱۰۵۹ھ میں محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو عرف بڑے صاحب کے ایماء سے لکھی گئی ہے مگر یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ گو یہ مثنوی ملکہ کے حکم سے لکھی گئی ہے لیکن اس میں نہ بادشاہ کی تعریف ہے اور نہ ملکہ کی مدح سرائی، حالانکہ یہ امر دکھنی شاعروں کا گویا خاصہ رہا ہے کہ وہ اپنی تصنیف میں ضرور بادشاہ کی مدح کرتے ہیں۔

اس مثنوی کا ایک نسخہ جو باتصویر ہے انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔ ہم نے اپنی تالیف[1] میں نہایت تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ رستمی کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

اول جب کیا یو کتاب ابتدا ۔۔۔ بند یا بات میں نقش نام خدا
جو صاحب ہے او عقل ہو جان کا ۔۔۔ کیا دین بخشش او ایمان کا

کیا ترجمہ دکھنی ہور دلپذیر ۔۔۔ بولیا معجزہ یو کمال خان دبیر
خلق کہتی ہے مجھ کمال خان دبیر ۔۔۔ تخلص سو ہے رستمی بے نظیر

جو مسجد میں اقصا کی بیت الحرام ۔۔۔ رسول قریشی علیہ السلام

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ (۲۲۲ تا ۲۵۲) اس کے علاوہ رسالہ معارف میں بھی اس پر ہمارا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔

مبارک وقت کوں جو یک نامدار — جو بیٹھے تھے مسجد میں اس وقت شاد
زبان کھول یاراں اپس میں اپنے — تھورا بہت ہر یک لگے بولنے
بولیا ایک جوان مالکِ نامدار — نہ ہوویسے دنیا میں یہی دھر اسوار
بولیا سعد وقاص مجہ سار کا — نہیں کوئی مجلس میں مجہ کار کا

چلیا جنگ تے شاہ دلدل سوار — اچایا او دلدل نشانِ غبار
کیا ایک حملہ او لشکر اوپر — سواراں چلے اپس گرد کر
گھوڑیاں کے نعل تے زمین چاک ہوئی — اپیتے بی نرزمی میں سب خاک ہوئی
نفیریاں کی نالے کی آسمان میں — اتنے گرد لشکر نے میدان میں
سواراں کی پانوں کے بی آواز تھے — زمین میں کی مردمی اتنی داز تھے
گرد میں جوں بجلی چمکتی تھی تیغ — جوں بجلی ویسے ابر میں بے دریغ
ہوئے ہور زخمی پڑے سنے کھنچے — جو چلنے کوں واں بات نہیں تھے کتے

اٹھے گرد مرداں جو گینی شتاب — ہوا کالا اس ٹھار کوں آفتاب
ہوا واں جگا جاگ تیغ و تبر — ہو نیں ہوش رہی کاں میں یک دگر
نیزے کیاں سنیاں کیاں خوں بخاک — زرہ تن پہ مرداں کے سب چاک چاک
نیزے کیاں سنتیاں سینہ چہ نہاں — پہانڈیاں کیاں خماں بی گلو گیر تہاں
کھولیاں واں سنیاں بی بند زرہ — واں پیکاں کھولیاں پی بند گرہ
تھا لہو پیتا پنیا زمین کے اوپر — سواراں کے پانو تھالے تن یک دگر
بہی یک طرف تے لشکرِ خاوراں — برستے تھے شمشیر دگر نہ گراں

بھی یک طرف تے کوئی خبردار نیں ‌ ‌ ‌ ‌ کہ لشکر گئے جھگڑ کرنے دھین

او یوں یو نکر قصد جولاں کیا ‌ ‌ ‌ ‌ کمان زو کیا سور میدان لیا
کسی تہ یاراں دو نوں مل کو سخت ‌ ‌ ‌ ‌ ہوا کالا خورشید کا روے بخت
بہت نیر بیر سے انو بر سپر ‌ ‌ ‌ ‌ تو یوے گا سیراں کو دان آئے پر
خالی کئے تر کش زتیر خدنگ ‌ ‌ ‌ ‌ نیزے لیکرا و کھولے بازو جنگ
گئے نیزے لیکرا و چنداں ستیز ‌ ‌ ‌ ‌ ہوئے تیری ہاماں ہیں سر زیر

ہر یک طرف کشتی سوں کشتی لگی ‌ ‌ ‌ ‌ نہیں کوئی لڑنے تے اس میں بیگی
سر نیزہ سینیاں سوں گستاخ رہو ‌ ‌ ‌ ‌ ہوئے بہوت سینے میں سوراخ جو
ہوا مردیاں ستے دریا سارا سیاہ ‌ ‌ ‌ ‌ جو کشتی کوں جانے نہیں اُبری راہ
تن مردیاں سوں جیا گا سارا بھریا ‌ ‌ ‌ ‌ لہو کی جانو وستی تھا سب دریا

سوار رعد کے اپس تے میدان میں ‌ ‌ ‌ ‌ ہوئے دیکھ حیران وہاں سب جنین
آخر کوں ابو المحجن نام دار ‌ ‌ ‌ ‌ کیا سر اپے رعد کے تیغ باز
سپر لیایا سر پہ او جنگی سوار ‌ ‌ ‌ ‌ دو ٹکڑے ہوا او سر جوں خیار
سپر کاٹ کر تیغ اتری ملار ‌ ‌ ‌ ‌ کاتی زرک پولاد سر ایک بار
چلیا رعد کے سر تے بہی لال خون ‌ ‌ ‌ ‌ ہوا زرک پولاد سوں سر نگون
مار یا گرم ہو غصے سوں پہلوان ‌ ‌ ‌ ‌ کاٹیا زین ہور سب تمام گستوان
اسے سر تے بہی پانو لگ دو کیا ‌ ‌ ‌ ‌ اس تیغ زین سوں باندیا

تمام شہر خاور مسلمان ہوے — تمام یک بیک آفرین خوان ہوے
آئی شہ کی عورت لے عورتاں سنگات — او جیدر کیتنے آئی یو لئے کون بات
اتھی سیمتن ہور او نوش لب — رخ و زلف و مرتی اتھی جوں لعل و شب
او تھی خوب رو یاں کے دل کا بہار — او خاور زمین کی اتھی لالہ زار
پری سرو قد تھی پری زاد نام — جو ایس مکہ تھی خوباں کوں خوبی تمام

آیا تھا زمین پر بی جوں شاہ رنگ — زمین ہور زماں کوں لیا یا تہا پی تنگ
سفیدی بی پچی تھی مکہ پر نقاب — پرند سپر پہنیا تھا آفتاب
زمین پر عنبر کا منڈپ تھا تمام — سما کوں سپر اپردہ تھا مشک فام
زمین پر تو سنبل تھا نیں تھا سمن — کیا تھا بی سو سمن کا کسوت چمن
گیا تھا محل کی بہنر شاہ چیں — صباحی کا تھا مرغ بھی خواب میں
زمیں ہور زماں میں پی کا حل بہر یا — انگار جا کر جگ میں دھواں بہر رہیا
بجتنے مرغ ماہی کوں تھا بہوت خواب — زمیں کوں و زنگ آسماں یا تیتاب

کیا دل سوں او بھی شب خوں کریں — لہو سوں تمام دشت چہچہل کریں
ہر یک ملک تھے لشکری لیا یا ہوں — او سات بھی جھگڑا اس لا یا ہوں
لیا چن کر لشکر او پنجاہ ہزار — کتنے تھے سواران جیاد کار زار
شبخوں کی نیت سے او آسٹے بہار — علی کے او لشکر پر بیکنے گذار
اتھی رات کالی او ظلمات سی — نہیں تھا اجیت زہرہ ہور مشتری
جو اس رات میں مالک رزم خواہ — طلا نہ او پر تھا لے کر سپاہ

اتھے سات اس مرد جنگی ہزار
طلاوہ کون نکلیا تھا او نام دار

نگہ کو کرہ دیکھا زمیں گشت میں
سپہ آتا سو وہ دیکھا اُن دشت میں

انیں جانیا لیایا شبخون سپاہ
ہوا ایکطرف چھوڑ لشکر کی راہ

کیایا نگ لشکر میں او بھی بلند
کہ ہشیار اچھو سب جتنیں روز مند

جو لیایا ہے خاور نیں اپنا سپاہ
تن لیو شمشیر ہور باہندو زراہ

گیا خاوراں بہوت کوشش کرہ
لیئو تیغ ہور نیزہ جو کوشش کرو

نکہ چھوڑو ایکس کوں جانے کوں بہار
مگر سر پہ اس کے تیں تیں تلاز

سنے گا جو یو حیدر نام دار
اونا چھوڑسے جیتا بھی یک سوار

نکل آیا اس ٹہار یک اژدہا
جو ابلیس اس بیتے منہوے رہا

اتھا شکل ناخوش کالا جو مکہ نار
ہوسے اس کی دم تھے جنگل پرغبار

اتھے سات سر سا تو تینی اسے صور
انو سات مکتاں سنے دستے تھے دور

ہر یک سر اتھا اژدہا سٹے تژدم
دھن اک سو کیہ لیا تھا او ہم

اتھا سر تھے او دم تلک گز ہزار
او چوڑا اتھا گزپے ٹپائے مار

ساتو سر تھے او اک سینتنے لکتا
او ساتو دوزخ کی جانو ور کھولنا

جوں او سانپ حیدر کے نزدیک آیا
مارہا خنجر اس کوں پہن کاٹیا

کیا اس وقت یک نعرہ وش اژدہا
نجے پی آنال ہیں بخہو دل کیا

توں آیا ہے پھاندی ہیں میری آنال
میرے دم تھے جانے نیا سنے مجال

کہیا یو نج ہور دم تھے دمنی لگیا
علی کوں انیں کھنچ لینے لگیا

مار بار دیگر سپہدار کرد   اسپے تیغ براں تھے
مار یا تیغ یک اژدہا کے اپر   ہوا ٹکڑے دو اژدہا سر بسر
بہت لرزیا ہو پیچ کھایا او مار   مار باز خم دس اسے نام دار

سواراں کا شمشیر جوں برق ہو   جھکنے لگے آگ میں غرق ہو
کیے جھگڑے کا کرنا بھی دہاں   نقریاں تھے گو ہو رہی سب جہاں
اول آیا بھکڑے کے میدان کوں   دلیراں کوں دکھلایا جھگڑے کا موں
سرافراز ابوالمحجن گرد تھا   جو اس کے ہنگے شیر نر خرد تھا

کئے یوں وہاں آواز شیران جنگ   اٹھے پانی بھی بھار بھی او سنگ
سنئے حیدر آیا ہے لشکر زاب   سپاہ اس طرف انے کرنا شتاب
تمام ردے دریا بھی لشکر بھڑیا   آرایش ہر یک طرف دوسری کیا

- - - - - - - - - -

کہاں ہے جو صلصال کا ہے سپاہ   او آیا بیاری طہماسس شاہ
ہر یک ملک تھے رزم ساز گر   کیے جھگڑے کا دبی ساز کرد
ابوالمحجن گرد کوں بولے راہ   یکٹا نانوں تو رخنا ہے بر سپاہ
توں ہور سعد وقاص دمرد دوست   توں جا بر لب دریا سعد داں باست
من پکڑ دجا کر گذرگاہ آب   جو دشمن ادھر کوں نہ آوے شتاب
اگر آگا لشکر دریا تھے بردل   ساحل کا جنگل ہو کا دریائے غول
دیا جواب اوپیں کر قمریاں بزم   بچھے توں کہے گا بیاباں بزم
جو بر لیا گا دشمن اگر جل عقاب   تو ناں دیکھوں انے زدریائے آب

- - - - - - - - - -

انو ودمی تر کش اپر لیاٹے دست — کماں زہ کیئے اور کھولے او دست
جواناں سپر سوں سپر یا فتند — او بیکاں سوں بال بشگافتند
ہلے داں سے حیدر نے پے چھوڑ جاٹے — فلک کوں انو لیاٹے رسدم زپاٹے
سو دامن اب سب پر سیاہ — ہندسے چمن ایراں جلنے کی راہ
جوں سر بال جھگڑے سوں جا کر ملیا — ہوے ناموربہوت سو داں دکھیا

- -

سواراں سے لیو تھے و بولاد نعل — دو نکہ بیں ہوئے پتھرے سب داں کے لعل
وہی کرد مالک لے گرز گران — جو رستم اتھا او بی نا زندراں
کھرے یک ہیں ماریا دو سو سوار — انو کوں کیا بیت ادا یک بار

سبجنے مرغ ماہی کوں تھا بہوت خواب — زمیں کوں درنگ آسماں باشتاب

پکاریا کہ اے ناموربہت مراں — بولو ناانو اپنا بنام آوراں
بولو اول آخر بی اپنا تمام — کئے آئے ہیں اس ملک میں کیا ہے کام
کہاں جاتے ہیں ہور کہاں آئے ہیں — کیا جھگڑے پر ہیں یا خوشی لیاٹے ہیں
ہمیں بی کمر باندھ آئے ہیں یان — نشانی تمارا جو پاتے ہیں یہاں
اگر جھگڑے کوں آئیں ہیں تو کہو — دگر صلح سوں آئے ہیں تو کہو
دیا جواب بھی یوں اسے سعد شبر — برے دل کا ڈرنا ہے دیکہ کر دلبر
دلاور نہ ڈرتا ہے دیکہ مرد جنگ — جو ڈرتا ہے دیکہ چھانو اپنی پلنگ
برانہیں اندیشہ ہمیں دل نہیں — کہ خوب باہیں برسے جہیں ہمیں
کسی کی برائی سوں ہمیں کام نہیں — اس انگے بھی کچھ بولنا نام نیں

اگر ماتی ہودی گا تن زیر خاک | میرا نا چیناہی مجھ کیا ہے باک
نبی کی جہ ہجرت تھی کیتا خیال | ہزار پہ پچاس اور نو کی تھی سال
کیا رستمی اس دفت یو کتاب | بند بابات کی گوہران بے حساب

خاورنامہ دکھنی کیتا ہوں نام
ہوا خاوران پر قصہ سب تمام

رستمی کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو یہ بخوبی واضح ہوتا ہے وہ دکھنی زبان کا بلند پایہ شاعر اور استادِ سخن تھا، اس کی پر گوئی اور قادر الکلامی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے چوبیس ہزار شعر کی مثنوی صرف ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں لکھ دی۔ یہ نہ صرف اردو زبان کی پہلی ضخیم مثنوی ہے بلکہ رزمیہ مثنوی بھی ہے۔ اس قدر ضخیم ہونے کے باوجود اس کا تسلسل بیان بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا رستمی کے کلام میں صفائی و سادگی ہے۔ اشعار صاف ہیں، اس کی تشبیہ قابل داد ہے۔ واقعہ نگاری کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی بلند پایہ ہے، جنگلوں کے حالات، مقابلہ کی روئداد، شب خوں حملہ کی صراحت جس صفائی اور چابکدستی سے کی گئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رستمی اپنے زمانہ کا نامور شاعر تھا اور دکنی شعرا کے صفِ اول میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

اگر اس کے قصائد اور غزلیات دستیاب ہو جاتے تو اس کے کلام کے جوہر اور درخشاں ہو جاتے۔

دولت: دولت اسی عہد کا شاعر ہے۔ دیگر شعرا کی طرح ہم اس کے بھی تفصیلی حالات سے باخبر نہیں ہیں۔

اس نے امین کی ناتمام مثنوی بہرام و حسن بانو کی تکمیل کی ہے۔ جس کے متعلق امین کے حالات میں صراحت کی گئی ہے۔

کیا فرش زریں سو ہر ٹھار پہ
بنائے محل سارے گلزار پہ

بچھے قالیاں بیچ ایوان کے
دھرے تکیہ بغلی بڑے شان کے

بہوت بہانت سوں سالے مسند کیا
جواہر کے راسوں سے زینت کیا

کیا آب پاشی وہاں ہر زماں
صبح شام چھڑکا ہوے بے گمان

تھے چھتیس باجے اسی ہٹھار پہ
بجاں ہار موجود تھے کار گر

پہ یاں ہر طرف لگیاں ناچنے
یو باجے چھتیسوں لگے باجنے

ہوئی رقص بازی مکان و مکان
خبر یو ہوئی ہر ملک درمیاں

طعاماں سو اقسام تیار کر
کھلانے لگے سب کوں تکرار کر

کھڑے سر بہ اکار ہو مستعد
ہر یک کام پہ دل سوں ہو کر بجد

ضیافت بڑے شان میں اک کیا
تواضع میں دل ہاتھ سب کا لیا

ہوئے شاد شاداں سو مہمان سگل
خوشیاں سب کے دل پہ سوایاں اہل[1]

نصرتی: بیجاپور کا یہ دوسرا نامور اور ذی مرتبہ شاعر ہے۔ محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا۔ اس کا باپ شاہی سلحدار تھا۔ بقول شفیق[2] کرناٹک کا باشندہ ہے۔ اس کی پیدائش کے سنہ سے ہم واقف نہیں ہیں لیا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ [2] نصرتی کا نام کہ قدیم دکھنی تذکروں کے سوا طبقات الشعراء میں بھی ہے۔
[3] چمنستان الشعراء۔

عالمگیر نے جب بیجاپور فتح کیا تھا (سنہ ۱۰۹۷ھ) اس وقت یہ زندہ تھا۔ مگر جدید تحقیقات سے سنہ ۱۰۸۵ھ میں انتقال ہوا ہے۔

بعض یوروپین مصنفین نے اس کو ہندو تسلیم کیا ہے لیکن یہ امر بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اس کی تفصیلی تردید ہم نے اپنی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں کر دی ہے۔[۲]

نصرتی کے باپ کو اعلیٰ سوسائٹی میں بڑی عزت حاصل تھی۔ اس کو سلطنت کا خیرخواہ اور جان نثار شمار کیا جاتا تھا۔ نصرتی کی تعلیم اور تربیت شاہی محل میں ولی عہد سلطنت علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی۔ جب علی عادل شاہ بادشاہ ہوا تو نصرتی نہ صرف شاہی مصاحبوں میں داخل ہوا بلکہ ملک الشعراء کا مرتبہ بھی عطا کیا گیا۔ وہ ہر وقت بادشاہ کے ساتھ اس کے رزم و بزم میں شریک رہا کرتا۔ نصرتی نے بادشاہ کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔

بیجاپور کے سارے مورخوں نے اس کی تعریف و توصیف میں ہم زبانی کی ہے۔

نصرتی کی تین تصنیفوں کا پتہ چلا ہے۔ پہلی گلشنِ عشق ہے جس کی تصنیف سنہ ۱۰۶۸ھ میں ہوئی ہے۔ اس میں کنور منوہر اور مدمالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ دوسری مثنوی علی نامہ ہے۔ اس کی تصنیف سنہ ۱۰۷۶ھ میں عمل میں آئی ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کی سوانح مرقوم ہے اور قصائد بھی شامل ہیں۔ یورپ اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ جن کی تفصیل ہماری دوسری تالیف سے ہو سکتی ہے۔[۳]

---

[۱] ریاض حسنی تذکرہ فتوت۔ [۲]، [۳] ملاحظہ ہو یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۵۷

تیسری کتاب تاریخ اسکندری ہے جس کی تصنیف ۱۰۸۳ھ میں ہوئی ہے اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے رسالہ اردو[1] میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

نصرتی کی مثنویاں اور قصائد کے دیکھنے سے اس کی قادرالکلامی کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے۔گلشن عشق میں انسانی جذبات اور خیالات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔اس کے کلام کی رنگینی اور تشبیہ اور استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔

علی نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔رزمیہ مثنویوں کا جو معیار مقرر ہے اس سے بھی بلند مرتبہ رکھتی ہے۔اور پھر اچھی ہونے کے لحاظ سے اس کو خاورنامہ پر فوقیت دینی ضروری ہے۔تاریخی حالات کے اعتبار سے یہ نظم نہایت مستند ہے۔ادبی نقطۂ نظر سے بھی بہت بلند پایہ ہے۔نصرتی نے اس میں جس طرح کی واقعہ نگاری کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔شہر بیجاپور کے حالات اور اہل شہر کی معاشرت پر نصرتی نے علی نامہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

نصرتی کے قصائد اپنے تسلسل بیان، واقعہ نگاری اور شوکت لفظی کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں اور پھر خیالات کی جدت اور تشبیہ اور استعارات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی زور بیان سے بھی خالی نہیں۔

ہم نے گلشن عشق اور علی نامہ پر اپنی تالیف "یورپ میں دکنی مخطوطات"[2] میں نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

---

[1] بابت جولائی ۱۹۳۲ء۔

[2] صفحہ ۲۵۷ تا ۲۰۳

گلشنِ عشق کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی موجود ہے اور علی نامہ دفتر دیوانی ومال سرکار نظام کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ انجمن ترقی اردو، آغا حیدر حسن صاحب اور نواب سالار جنگ بہادر وغیرہم کے پاس ان دونوں کتابوں کے متعدد نسخے ہیں۔ مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے نصرتی اور اس کے کلام کے متعلق ایک مستقل کتاب میں روشنی ڈالی ہے۔

مولف گلِ رعنا (حکیم عبدالحی صاحب) نے نصرتی کی ایک تصنیف[1] کا ذکر کیا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے۔ نصرتی کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے

صفت اس کے قدرت کی اول سراؤں	دھریا جس نے یو گلشنِ عشق ناؤں

زہی نام در سید المرسلین	کہ آخر ہے وہی شافع المذنبین

میرے طبع کی نبس نا نزی کیتین	یوں سون کر بہار بازی کیتیں
ہر اک داستان بوستان	ہر یک بیت ہر یک محل جانشیں
معانی کی صورت کی ہے آرسی	کہیا شعر دکھن جون فارسی
فصاحت میں گر فارسی خوش کلام	دھرے فخر ہندی بچن پہ مدام
دگر شعر ہندی کی بعضی ہنر	تس کیتیں ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصہ کوں پا	کہیا شعر ایسا دو تو فن ملا

دیویں داد سن فارسی شعر دان
جو ہندی سنے یے کیئیں دل سوں تان

---

[1] گلِ رعنا۔

اودھر سات نھی ما کے مدمالتی — ایدھر ما کے سنگات چنپاوتی
بہوت دن کوں جس وقت بچھڑے ملے — یکس یک لگائے چنکل کو گلے
انوکیاں سکیاں چونکہ سو سات تھیں — اپنو کے کنے بی اسی دھات تھیاں
دونو دھیر بی بیاں جو تھیاں مختصر — بزرگی سو بیٹیاں دو جا صدر پہ
دونو دھیر کیاں خوش سہیلیاں تمام — گھڑیاں خدمتی دھر اپس کا مقام
یو چنپاوتی ہور مدمالتی — بھٹیاں مل کے نا فرق دھر یک رتی

- - - - - - - - - - - - - - - -

اودھی واں تھے تس سات کرنچ بات — چلے کیلنے چپ سوں پکڑ ہٹ میں ہات
سہیلی جو کوئی سات آنے منگی — پھرائی اودسے نیں لیجانے منگی
گیاں مل کے دونو بکیلیاں گوں — تماشے سوں پھرتیاں چمن در چمن
بکٹ ٹھار خاطر میں لیا یک طرف — بھٹیاں مل کے دونو اوک دھر مشرف
تب ان پاکے فرصت یو کرنے لگی — لگی بولنے یوں کہ اے دھن یہی
جو بیٹی کا درشن ہوا سو ہمن — یو سب فیض بخشش ہے تیرے چرن
نہ ہوتا تو تج پگ تھے یو فیض اگر — دو کان پھر کے پڑتی ہمارے نظر
ہمن سر ترا یوں ہے آپ کا آج — جو ہوئی تجہ انگے بات کرنے کی لاج
یو سن بات مدمالتی وہ عجب — کہی عذر خواہی بنی کیسا سبب
کہ میرے سوالاں کوں دیوے یو پیچ و تاب — اجوں لگ یہی دیتی ہے ہو کر نیچ جواب

- - - - - - - - - - - - - - - -

کسے دکھ یو کہنا نہ دیکھی دوا — لگی من میں جل نیچ ہو لا دوا
بکٹ نت رہوں غم سے گر سر نگار — نہ کوئی بات لیوے میرے دل کا بار

ٹلے وار نو ہر کیوں سہیلیاں کے سات — پڑے بن بجر سل ہو سینے پہ رات

زر بینا اگن تن پہ سارے لگیں — گلاں سیج کے سب انگارے لگیں

[illegible] منج اوپر زہر کا ہوا باغ — دیوے ہر ستارہ میرے دل پہ داغ

اچھے تس تو دوزخ تے کالی کٹھن — دسے دن تو روز قیامت کا دن

مرے سر ٹلے یوں کٹھن ماہ دسالی — خدا بن کہوں کس سو منج دل کا حال

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھائے — نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگ آئے

دسے دیس تو نت اندھاری مجھے — رین کال دوزخ تے بھاری مجھے

انکھیاں کھولتا ہوں تو یک تل نہ بھائے — و گر موندتا ہوں تو یو خوف آئے

کہ مست پھر پڑے خواب و ندی سوں سنگ — سٹے بھر کے خرمن میں من کے اننگ

پڑیا آہ ماہی نمن مجھ رہنا — گنوانا زبان ہور نہ چک موندنا

او ساساں نہ کچھ مکھ سنتے بھا سکوں — نہ چک تے انجھو بھار بھی لا سکوں

بکٹ نت رہوں غم سوں کر سر نلار — نہ کوئی بانٹ لیوے میرے دل کا بار

زرا بن اگن تن پہ سارے لگیں — گلاں سیج کے مجھ انگارے لگیں

ٹلے دن تو ہر کیوں سہیلیاں سنگات — پڑے بن بجر سل ہو سینے پہ رات

چندر مجھ اوپر زہر کا ہوا باغ — دیوے ہر ستارا میرے دل پہ داغ

اوک سوز لگا مجھ نینا پڑے — اسی گھات کے باج تپ نا پڑے

اچھے تس تو دوزخ تے کالی کٹھن — دسے دن تو روز قیامت کا دن

میرے سر ٹلیں یوں کٹھن ماہ و سال — خدا بن کہوں کس سوں مجھ دل حال

کرناچار اچھے اودریا کے بدل   سو ہنس کھیل گپتا سکیاں ہیں سگل

دونوں شاہزادے دونو ماہ رو   خوشی سوں رضا لے چلے ملک نو
مرتب کرہ نہار بالا رتن   کیا ہے دو یوں نظم پڑی کہن
جو منہر کنور عاشق بخت در   چندر بیس صاحب وفا خوش بیر

دو نوں شاہزادیاں کی دل دہر او چاٹ   دیکھیں درشن ماباپ ہور راج پاٹ
جو کنچن نگر ہیں دہر مراج نہ   کیا تھا چندر سیں کا کاج کر
جو منہر کنور صاحب اشتیاق   ادل سور بل سات کر اتفاق
رضا ملک دہر اپنے جانے منگے   بنیاں کوں سنگات لے چلنے لگے
تھا راج کوئی ون جو خوش باغ باغ   یو سن بات ہو کر نپٹ داغ داغ
قبیلے سوں کئے دیس دلگیر ہو   پھر اس بات برباج تدبیر ہو
جہازاں کرا مستعد بے شمار   دہرا سا دو ساماں دریا کنار

تلک راج رانی بڑے شوق سوں   کنور سات ملنے چلے شوق سوں

محبت سوں چھاتی لگا تیں چکل   بچھڑ تیں کی جھال دل سوں ادبل

کہا اس کی تاریخ یو ہجرتی   مبارک یو ہے بدیہ نصرتی
۱۰۶۸

کیا ہوں یو قصہ جو خوش بھا دل سوں   علی شاہ عادل گیری ناؤ سوں
تلک جگ ہیں مقبول اچھو مدام   بحق محمد علیہ السلام

علی نامہ :- دکھنیوں اور مغلوں کا ایک معرکہ اور آغازِ جنگ کے قبل تیاری :-

اسی رات ارسطوئے دوراں کیے یہاں — دکھن کے سب اعیان تھے مہاں

سنوارے تھے کئی انجمن دل نشیں — نشیمن میں ہر مدح راحت گزیں

ہر یک ناموَرے دلیراں کی صفت — اتھا یک گمٹ میں ہو بیٹھے یک طرف

نہ تھی بن کھرک کچ گمٹ کوں رواج — نہ بازی کی مذکوری جانبازی باج

تلک یوں کہے آکے جاسوس بھید — جو دھرتا ہے یوں دشمن بد امید

بد اندیش کے دل کا جب بھید پائے — سبی شیر مرداں نے غصہ میں آئے

کریں تیغ سوں پیش دستی ہمیں — اوتارین اودن سر تے مستی ہمیں

دلیراں اوٹھے بولتے دین دین — کہے تہالداراں کہ ہے زین زین

گھڑی بھر میں ہو مستعد بے درنگ — سلح باند سب راوتاں ہور ترنگ

خود بکتراں کوٹی سو جوشن بندے — کتے چار آئینہ روشن بندے

زرہ وغلہ پہنے کنگ پہل قد — قباباں دکچیاں تو تفیاں بے عذر

ہوئی فوج جوں مستعد جس گھڑی — دماماں پہ چوند ہرتے لکڑی پڑی

کتا ہوں اتا فوج دہلی کی بات — چلی تھی دکن دل پہ کس دہات سات

کہ جس فوج کوں دیکھتے ہیں سبھے — دے نا گے انتہا ہور اد پچ

ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل — تھا جس میں سردار اصحاب خیل

سراسر گرہ بہار سارا دسے — تو یک فوجدار اس میں دارا دسے

یک یک ملک کے نام آور جواں — دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں

مغولاں کتنے ملک و کئی شہر کے ۔۔۔ کتنے ہند و کئی ماوراالنہر کے

سب اس وبھات فوجاں خوش آراستہ ۔۔۔ چلیاں تھیاں عروساں ہو نو خواستہ

ہر ایک مرد کا شوق تازہ ہوا ۔۔۔ لٹا پٹ بدل ذوق تازہ ہوا

عجب فوج رنگیں دل افروز تھی ۔۔۔ ولے سخت خونریز جاں سوز تھی

غنیماں کے بھیجاں کوں کھانے شتاب ۔۔۔ خوش آنے لگیاں ہوں ہیں گہرگاں کے آب

کماناں رکھیاں دل کشا کش منیں ۔۔۔ او بلنے لگے تیر ترکش منیں

پھوکیا تیز یوں سخت بھالیاں میں رنگ ۔۔۔ کہ پھکتا ہے جوں باد لیکر ہو حلک

بھڑکتے ترنگاں ہو آگاں دسے ۔۔۔ سواراں ہو کے رن کے باگاں دسے

نکلتے ہیں جوں باگ نخچیر کوں ۔۔۔ نکل یوں جھرائے دونوں ویر سوں

رکت بھوئیں پہ بڑ بڑ کے پامال ہو ۔۔۔ لڑنت کا ہنگامہ رہیا لال ہو

ہزاراں ترنگاران کا ملک تل بجا ۔۔۔ زمیں کی دہک ستے فلک ہل بجا

زباں لہو کی پیاسی بکھرک کے اپار ۔۔۔ نکل آئی جوں میاں کے لب تے بہار

ہر یک لکھ سنے آواز سسی بار بار ۔۔۔ کیا جیبھ نے دشمن کے ہوٹاں ہیں ٹھار

شرانگیز باتاں نے شر شور اوٹھیا ۔۔۔ کڑاکر زنبوریاں ستے برز ور اوٹھیا

جو یک دم چھوٹی ٹوپ ہر فرد فرد ۔۔۔ وجایا دھواں بادہو آگ کی گرد

دمے نس میں تردار جھلکتی جتی ۔۔۔ پکڑ گرد ہیں اڑ رہی ہے تتی

دھواں جس نظر میں جو بھٹا دسیا ۔۔۔ زمیں پر فلک آ کے بھٹا دسیا

کماناں کی رن جب کشا کش ہوئی ۔۔۔ ہوا بہر کے تیراں سو ترکش ہوئی

چھوٹی صفت تے یوں تیر یک مٹ دلیر — اوٹے کھیت تے جوں ہزاراں بلبر
ہوالال گیتی پکڑ بیسہ اوج — کھلے تو کر ٹولاں کی نکلی ہے موج
لگیا تیر ہر تن پہ جب باسے بال — و سبا لہوا و چھلتے فوارے کا جال

- - - - - - - - - - - - - - - -

دم تیغ تے یوں اٹھے شعلہ جاگ — لگے جا کے سورج کے کپڑیاں کوں آگ
کریں قیمہ تن کوں تیر بے کماں — گئے کوفتہ سر کوں گنڈ یو گراں
کیا جب کٹارہیاں سینیاں کوں ریش — دلاں بھانج چھوڑے جو خنجر کیبش
بھرا ہوے سب لہو کے شربت میں حل — مریا یہ پیا ہو کہ سینیاں میں دل
ہر یک تیر ایک مار ضحاک تھا — کرے مغز خواری تو دل چاک تھا
تنپا شب جو برچھیاں موٹھیاں تے لہو لہال — دیاں کئی سواراں کوں اٹھیاں سولہاں

قصائد

دی ہے زمستان نو گزی دو نگا اچاد ہندکار آج
سردار ہو باد خزان ٹھنڈ کا رچیا ہے بہار آج
اپیا ہوا کا فوج لیل شبنم کی گولیاں چھانٹتا
ڈر سوں اگن ہون چھانپے ڈر رہی ہے بہار ٹھار آج
او آگ کوئی مالیے تو دم اٹھنی تھی ہو سب تن زبان
ویسی بی سرکش سر نواپیلی دسے سمد ہار آج
بے شک وطن اس جاگ تھے مت جاتی اگن ہوئے نشاں
گر دل ہیں اپنے عاشقاں دیتے منزا اس کو ٹھار آج

حوض یک ہوا کا یوں دسے مشرق سے مغرب لگ بھر یا
کانپے فلک جوں بڑبڑا ابھٹے تو تس کے بہار آج

- -

شبنم جو اچلا چہاچ سا آشیر سے جل میں پڑیا
ہر بائیں ہوتی ہے دُبیں بنڈی جم تیر سب یکبار آج

- -

سلطان عالم بخش او شاہنشۂ عادل علی
رہیں یو جہاں پرور اوک نہ دھار کوں آدھار آج
جس مہربان کے فیض تے تب نو بہاراں دسیں
جس کی عنایت سے اوک عالم دسے گلزار آج

جب تے جھلک دیکھیا اوک سورج تری تروار کا
تب تے لگیا تھر کانپنے ہو پر عرق یک بار کا
کوئی بند جو تیری کھرک کی پانی تے دریا میں پڑے
کہا جو تس اوک یک تیر ہوئے تختہ الھنڈ یک گار کا
کس میں تو طالع کے تدی جم تے اوک جم جم دسے
جس میں تو عالمگیر ہو آیا سکندر سار کا

- -

اے شاہ عادل تو علی صاحب ہے سب سنسار کا
کھا یہ جن جگ تمی نہیں سو کوئی نج سار کا

یک سال او باغی سیوا جگ میں شطنت پیدا کیا
ہے طفل مکتب مکر میں شیطان جس مکار کا
کوئی کھیل اس مکار نے کھیلیا نہ کچھ بازی کے بن
گویا فلک کجکول ہے سا دیا اِسی عیار کا

قصیدہ میں لڑائی کا سما

کھڑ کاں کھناکن سو زدھر سوراں کے یوں بجنے لگے
زہرا کا زہرہ گل رہیا آوازہ سُن جھنکار کا
کھڑکان کھڑکان لگ اوکٹ جنذہر تے یوں چنگیاں اوڈیاں
جیوں آگ کیاں بجلیاں چمک برسیا بدل انگار کا
گرزاں سوں تھے یہاں یوں کینتے پراگندہ دس
گویہن کے بوں اگتے پھر پھیٹنا ہے خفا نار کا
لاگی تبر کے ضرب سوں نفراخ اجل کے ہات کی
جم کی ہتھی تے کم نہ تھا دھبکا گرز کی مار کا
ہر گھٹ میں دل کا دھاک سوں لوہے تھے رکھٹ کی کچھ ہو
ہر رگِ گل تے تھا عیاں خوارہ لہو کے دھار کا
مرنیاں سے لہو کے بحر تے دھرتی پو جب بھرتی ہو رہیا
جتنیاں لپٹ پڑنے لگیا ڈونگر پو ڈونگر ہار کا

جب شہ چڑے گھوڑے اپر یوں فتح گرٹا ایسا کئے
تب ملک میں شاہاں کے ہوا نت درد اس گفتار کا

کہنا ہے دھن اس مائی کوں ہے جس کوں ایسا شہ خلف
سو اد بڑے صاحب ہیں جم پاکر کرم کرتار کا

جس ظفر کی نعمت نے جم پائی گئی ہے سب زمیں
تو آب دریا میں اثر ہے تس کی کہار کا

- - - - - - - - - - - - - - - -

اے نصرتی مشغول ہو شہ کی دعا کے دور میں
کافی ہے دو جگ میں تجے تل فیض تس آثار کا

ہے آسماں یارب تلک دھرتی کے سر پر سایہ بال
تا ثم تلک یوں چھترا چھو شہ جگ کے پالن ہار کا

کہیں رکھ دار چینی کے دھریں سو پوست میں لذت
رکھے سو مغز میں خوشبو کہیں تو بن ہے صندل کا

کیتے رکھ جام دجامن ہو رہیں ہور توت تیندو کے
بھلا وا کیئں ہے مزرا ہے کیئں ماپھل دیبنڈل کا

زنگار رنگ کے گلاں خوشبو معطر جگ کر یہا رہے
دس آدے رائے چنپا جہاں کہنہ پھول پاڑل کا

- - - - - - - - - - - - - - - -

صفا پانی کے چشمیاں میں ہے یو چھانوں پر سیانی
سواد انکھیاں کوں جوں دیوے درس چشم نکمل کا

فلک ستفائے خضری ہو پلاتے نیر سوں جگ کوں
سورج کے جام سوں بھرتا ہے نت داں مشک بادل کا

چلیں باد صبا نے خوش صفا پانی پہ موجاں یوں
کہ جیوں محبوب کے مکھ پر ڈھلک زلفِ مسلسل کا

نصرتی کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

چندر بدن کہیا تو کہی موں سنبال بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول

دونوں بھی تجھ نکیوں تو سکے تجکوں کیا کہنا
کہی اس بہشت حسن کوں حرم جگ اُدجال بول

بولیا نشاں ہے عشق کی رادت کا قد ترا
بولی کہ فوج فتنہ ادچانے کی ڈھال بول

بولیا رہنے منگے تیرے سس پھول کن ہلال
بولی کہ بادلی میں ہے گی تجھ سے تال بول

بولیا کہ تجھ فراق تھے کے عاشقاں خراب
بولی مرے وصل منے کیا تجھ ہے حال بول

بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام
بولی نباں سکے بت تھے تو ٹے تو جلال بول

لے نصرتی کا کلام "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے لیا گیا ہے اور دیگر مخطوطات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

بولیا کہ لٹی دنوں تھے تری بندگی میں ہوں
بولی کہ خیر یو بچ کیتک ماہ و سال بول

مغرور بے خبر ہے مدن سوں مدن کی بالی — عالم کے جیو لینے لوچن میں ہے سوالی
اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی ہے فن میں — دینے کو وصل کا پھل لینے کو جیو آتا لی
برہی کے تن میں غم سوں جلتا ہوں شمع تنتے — دکھلا ضیا و دس کا اے خاور جمالی[1]

کرتا ہے ماہ نو کوں سپہ دن کر آفتاب
تو آرسی کو ہات پکڑ اور کر آفتاب
کر نیا نہ ہوے گر جتے کار پا کلیاں فوباں
تج حسن کے ہوا میں جھلک ہر پر آفتاب
اینگ کرے زینگوں ترپ آدمی کے تج
جہاں کی نیال جچک چو دھری تس پر آفتاب
تج حسن کا جھلک جو ہری زنگب اریر
ہر جا ملہ دیال کی جتی دفتر آفتاب[2]

شاہ ملک: شاہ ملک[3] اسی دور کا شاعر ہے۔ اکثر دکھنی شعرا کے حالات خود ان شعرا کی تصانیف سے معلوم ہوتے ہیں مگر شاہ ملک کی

---

[1] انتخاب رسالہ اردو بابت اکتوبر ۱۹۳۳ء سے کیا گیا ہے۔
[2] از بیاض جملو کہ مولوی مرتضےٰ مرحوم۔
[3] اردوے قدیم۔

مثنوی اپنے مصنف کے حالات بہم پہنچاتے ہیں رہبری نہیں کرتی۔
اس کی مثنوی کا نام "شریعت نامہ" ہے۔ "احکام الصلوٰۃ" بھی اس کا دوسرا نام ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۷۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے[1]۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

الہٰی دے توفیق انساں کوں	جو بندگی کریں تیری دل جاں سوں
توں پیدا کیا محض بندگی کتیں	سوا دچھوڑ پکڑے ہیں گندگی کتیں

نو ادکاں ایمان کے دوا ہیں	ولی عین ایمان سو یو ہیں
جو اقرار ادل زبان سوں کرے	بھی تصدیق دل میں یو کر دھرے
خدا ایک دوجا شریک نیں اسے	ہے بےمثل اس کی صفت نیں کسے

سو یو شین الف ہے و میم لام کاف	ترض کوں سو دکھنی میں یو لیا ہے صاف

سن یک ہزار ہور ستر یو سات	کہا ہوں اسی سال میں یو حکات

شاہ امین الدین اعلیٰ: شاہ امین الدین اعلیٰ[2] کا شمار بیجاپور کے مشہور و معروف بزرگوں میں ہے۔ آپ شاہ برہان الدین جانم کے فرزند ہیں۔ آپ کی ولایت اور کرامات کا ذکر مورخین بیجاپور نے کیا ہے۔
شاہ صاحب فطری شاعر تھے۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں جن میں سے بعض مثنویاں ہیں اور چند قصائد۔ ایک قصیدہ اپنے باپ کی تعریف میں لکھا ہے دوسرا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۷۔ [2] روضۃ الاولیا بیجاپور

قصیدہ ایک عشقیہ نظم ہے جس کو محبت نامہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثنویوں میں سے رموز السالکین اور نظم وجود خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شاہ صاحب کے چند رسالے نثر میں بھی ہیں ان میں سے بعض کلیہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں اور بعض انجمن ترقی اردو اور بعض ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں۔

ان کی شاعری میں روانی اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ قیود شاعری سے آزاد ہیں۔ اسلوب بیان بھی اچھا ہے۔

سنہ ۱۰۸۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ بیجاپور میں مدفون ہیں۔

قمرین ہیں تیرے ساحر ہوے ہموں کوں
گمراہ کر بھلائے قوسِ قزح بھوں کوں

بچوں بھریاں زلف تج موجوں ڈبے بحر موں
ہر لہو پڑ کرشمہ عشاق کے دیکھن کوں

راہ صراط پل جوں سر مانگ جو چھپی ہے
کا ہے کشاں سما پر محب بلاونے کوں

سیما عرش علامت کرسی ملک سہلائے
روشن شمع منور پروانے جانے کوں

دنداں مثال بجلیاں رخشاں کلام کرتیں
زہرہ دہرے نہ دیدہ خوبیں تجھاونے کوں

چاہ زنخ کا تیرا مانند حوض کوثر
مقتول ہیں جو تیرے انکانے غسل کوں[1]

اللہ پاک منزہ ذات	اسول صفتاں قائم سات
علم ارادت قدرت بار	سنتا دیکھتا بولنہار

ادنیٰ عاشق اعلیٰ بوج	یہ دو مقصود الکھوں تج
عاشق ادنیٰ جوں پتنگ	اعلیٰ موم بتی کا رنگ
جوں پتنگا دیکھ پڑ تا نا	آپ جل کر ہوئے فنا
ولے ولایت جوں پتنگ	موم بتی یہ نبوت رنگ
یہ سب بوجھے اس کا موز	بوجھے مجلس شب اور روز

حق کی راہ میں یکڑ یقیں	کیوں نا اس کوں ہووے ایں
تمت اسس تہی کیا تمام	حق تہی بولیا حق کلام[2]

شاہ صاحب کی مختلف نظمیں حقیقت کے نام سے ہیں بعض کا نمونہ پیش ہے:-

اے سبحان دے توں مجھے گیان
میں دیکھو تجکوں پہچان
کرتوں ہدایت کی جو نظر
مجھ پہ نہ رکھ زرا بسر
دسنا اچھے توں مجھے سربسر

---

[1] محبت نامہ (از رسالہ اردو ۲۹ جلد ۲۹) [2] رمز السالکین (رسالہ اردو)

تن من میرا ہے تجھ پر فدا
ہردم مل رہوں تجھ سوں سدا
نا رکہ مجھ کون تجھ سوں جدا

نہ دن علی کوں تیرا ہے آس
میں ہوں پیارے تیری داس
ہردم مل رہوں میں شہ کے پاس

دیگر

دیکھو شاہ بہروپ صورت جمال
نہ مل روپ معشوق ذاتِ کمال
وصلوں خود فراموش لذتوں وصال

بیکچوں جگو نہ بے شبہ نمود کہنے نہ آوے بیان
لامثال مثل نہ نشان دیکھو نور فشان
ذاتِ وحدت کنج لامکاں پرگھٹ سب نہاں ماں

سب سوں بن سب آپ اپہیان دیکھو آپ پچھان
برہان مکمل صورت عیاں اسنے قایم قرب مکان
آگے شاہ امین دین روپ بہر پیدا انیں ندہان

دیگر

پیا رے پیو پایا ہیں پیو سون
او محیط دستا ہے پیو سون
عرفت ربی علی بولے جیو سون

پیو کون بوجھیا ہیں ہو فانی
پیا دستا ہے وجہ اللہ کے مانی
پیو محیط کل شئی سمانی

دفی انفسکم او کہا وی
نحن اقرب نزدیک پاوی
دہی یاد جی اپیس گنوا وی

اسے بات ہیں دیکھے کوج ہیں
تا سنیری کس کے بوج ہیں
علی یوج دیکھ چھپا ہے توج ہیں[1]

ہاشمی: سید میراں نام اور ہاشمی تخلص تھا۔ یہ شاعر مادرزاد اندھا تھا۔ علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھا۔ مصنف بساتین السلاطین نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ ریختی نظم کا بھی یہی موجد ہے۔ اس کی چند مثنویوں اور بعض مرثیوں وغیرہ کا پتہ چلتا ہے، ایک مثنوی یوسف زلیخا کے نام سے موسوم

---

[1] بیاض مملوکہ آغا حیدر حسن صاحب۔

ہے جو ۱۰۹۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ غزلوں کا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔
یوسف زلیخا کا ایک نسخہ آقا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ایک اور نسخہ جو میں نے دیکھا ہے سید ابراہیم بداللہی صاحب کا مملوکہ تھا۔ ہمارے خاندانی کتب خانہ میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں ایک نسخہ موجود ہے

ثنا حمد اِس کوں سزاوار ہے ۔۔۔ سگل عشق کا جس کو بستار ہے

سکت کس میں ہے جو کرے ہر بسر ۔۔۔ اب تو یا شمی مت اجازت کر

مرے شعر کرے بادشاہاں پسند ۔۔۔ پسند کر کر دار اکیں جو سب ہو شمشد

میرے شعر میں دے شجاعت کا بل ۔۔۔ جو خوش ہوئے سن کر دلیراں سگل

دیک عشق ہر شی منی تو میں لگن نامہ لکن
سن عشق باذاں سوں سگل لاؤ کر جو اک بارہ کا

لطیفی

جانا سو اسے مسافر رہنے کی بھی کچھ خبر ہے
آیا انا کدہر سوں جانا سو کہو کدہر ہے
دن بھی رہا ہے تھوڑا آئی ہمیں بندہ جہد کے
ہمیشہ تہ جگہ ہے نس پہ رہیں بھی بے خطر ہے

بھر کر ندی چلی ہے طارد بھی بھاگ گئے ہیں
چھایا آ یہاں نس پر ان کے کہل گذر رہے
گھر میں تن جہری رہو کھوٹی تفر تمہاری
رہنے کوں بھی تمہارے جانے سو یک جھپر ہے
گھر میں میں ہوں اکیلی اور کوئی بڑا ہمنا نہیں
تو رہو کتی یوں میرے دل میں خودی کا شر ہے
جگ شعر ہاشمی کا بھرا پس سوچہ ہوئے رہو
ایسیاں کے کرنے خدمت لئے کچھ مجھے آجر ہے

اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا
مجھے بدنام کیا کرتے کہیں میں جاؤں گی چھوڑ دو
رضا گر مجھ کو دیتے ہو کروں گی گھر میں جادارد
اگر مجھ ہووے گی فرصت صبح بھر آؤں گی چھوڑ دو

سچ مان اے سنگاتی تجھ سنے بچھڑ رہی ہوں
ان پانی سب تجے ہوں سونا حمام بولو
مجھ تن نگر کو قابض برہے سنے آگیا ہے
بھرتی ہوں جوں مسافر نئی مجھ مقام بولو

لہ از بیاض ملک محترمی حضرت مولوی خلیل اللہ صاحب۔

سجن آویں تو پڑتے سے نکل کر بہار بیٹھوں گی
بہانا کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
اد نو یہاں آ دکیتیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
اٹھلتی ہور مٹھلتی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی[1]

ایاغی: محمد امین[2] نام اور ایاغی تخلص تھا، اس دور کا شاعر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایاغی مذہب کا سختی سے پابند تھا، وہ راگ سننے، گیت گانے شطرنج کھیلنے کو گناہِ عظیم خیال کرتا ہے، اپنے دور کے بادشاہ علی عادل شاہ کے عدل اور انصاف کی تعریف کرتا ہے، اور اپنے اس دور میں ہونے پر خدا کا شکر کرتا ہے۔

ایاغی کی ایک مثنوی "نجات نامہ" ہے۔ اس میں شریعت کی پابندی کے متعلق پند و نصائح بیان کئے گئے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

نام اور تخلص کی صراحت:۔

ایاغی کدہر تو چلیا باٹ چھوڑ　　　سر شتے کو پند ان کے تو یوں نہ توڑ

محمد امین و ایاغی اوپر　　　الٰہی کرم کی نظر کر نظر

اگر راستی سو کیا عدل یہاں　　　تجہ اس نے بڑی بادشاہی ہے دہاں
کروں ہر گھڑی شکر پروردگار　　　کہ اس دور میں ہیں علی شہر یار

---

[1] اردو شہ پارے۔
[2] احوال سلاطین بیجا پور۔

رہے شاہ عادل زہے بادشاہ — کہ سنت کو جوں فرض کرتا ادا
کہ ہیں ترک ہرگز کیے نیں نماز — کہ حق سات دھرتا ہے راز و نیاز
شب و روز ہے دین پر استوار — تو خوشنود ہے اوس پہ پروردگار
الٰہی اچھے جب تلک آسمان — شہنشاہ عادل کوں رکھ دو جہان

شغلی: اس کے نام کی ہم کو خبر نہیں ہے۔ مولانا باقر آگاہ کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس دور کا شاعر تھا[1]۔ اس کی ایک مثنوی جو "پند نامہ" سے موسوم ہے۔ حبیب گنج (ضلع علی گڈھ جو حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی جاگیر ہے) کے کتب خانہ میں موجود ہے[2]۔ پند نامہ کے صرف ایک سو پانچ شعر ہیں اس کو کسی فارسی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

کہ یک دن محمد علیہ السلام — ہے اصحاب بیٹھے مدینہ تمام
تہاں یک شخص آنبی کوں سلام — کیا ہور کہلا گیا یوں کلام
جو میں آئیا ہوں تمن قوم کن — کہ شہر ین تے نصیحت سکن
سو یو بات سن کر نبی یوں کہے — تیرا بول مقصود جہاں تلک رہے
تو تب دین ادا اصحاب کیتا سلام — نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام
جو میرا ارادہ ہے یوں دل سے — جو طاعت کر دل رب کی تل نئے
جو کرتا اچھو بندگی میں سدا — کدھی بھی نہ طاعت سوں ٹھو دل جدا
کیا بات و اصحاب اس دہات جب — سو سن کر نبی یوں کہے بات تب
جو اول ہو کے پاک وضو توں ساز — جماعت سوں پنج وقت کرنوں نماز

---

[1] دیباچہ گلزار عشق

[2] کتب خانہ آصفیہ میں بھی نسخہ ہے

اگر یو امر رب کا سر پر لیا — گویا کہ شب و روز طاعت کیا

تو طاعت عبادت کیا گر سدا — تجھے غضب نا کچھ کرے گا خدا

سو یو بات سن کر کیا دین سلام — نبی سوں ہوا پھر الوں ہم کلام

جو ہیں آب کوثر کا پیتا رہوں — عمر ہو ابد لگ ہیں جیتا رہوں

کہئے یوں محمد علیہ السلام — دے پیاسے کوں پانی بھوکے کوں طعام

تو تب آب کوثر کا ہوے گا عطا — عمر ہو جئے گا سدا بے خطا

بھی بعد از نبی نے دیے یوں جواب — کہ واللہ اعلم بالصواب

سو یو پند نامہ سنے تو ثواب — سبے اتنا جو ہوئے نگوتی عذاب

اگر کوئی دیکھے اسے بھر نظر — تو گویا نبی کوں او دیکھا بشر

اگر کوئی اس کوں پڑے گا تمام — کہ دوزخ کی ہے آنچ اس کو حرام

اگر کوئی اس پہ کرے گا عمل — سوا و ہوے گا خاص بندہ اصل

سو اس وجہ تھی فارسی میں کتاب — سو شغلی دکھنی سال کینا شتاب

سبب کیا جو کوئی معنی فارسی — پنانا سو پاوے کیا آرسی[1]

شغلی کا کچھ کلام ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے[2]

تجہ حسن کا دیپک جنے دیکھیا سو پروانا ہوا
تیرے ادھر کا مئے جنے چاکھیا سو دیوانا ہوا

---

[1] رسالہ جامعہ بابت ماہ اگست ۱۹۳۶ء

[2] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۲۴

سیبوا : سیبوا[1] بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ اس کے متعلق بھی ہمیں تفصیلی معلومات نہیں ہیں۔ بقول اسٹوارٹ (مصنف کیٹلاگ ٹیپو سلطان)، اس نے فارسی روضۃ الشہدا کا دکھنی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھا[2]۔

یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری اس لئے کلام کا نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کبھی اس کا کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے۔

علی : اس دور کا ایک شاعر علی ہے جس کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات ہمیں نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثنوی "پند دل بند"[3] کا پتہ چلا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خدا کو حاصل کرنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے یعنی سکتی، علم اور عمل۔ اور علم کی توضیح میں اس نے ایک قصہ شیطان کے متعلق نظم کر دیا ہے کلام کا نمونہ یہ ہے :-

کہوں یک نصیحت عجب خوب تر	بھلی پند سوں جیو کے کان دھر
بھلے کوں بھلی پند بھاتی رہے	بھلائی منیں دل بھلاتی رہے۔

کریم : اس عہد کا ایک شاعر کریم ہے، اس کے متعلق کوئی معلومات نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ میراں جی کا مرید تھا۔

---

[1] طبقات الشعرا۔ [2] اسٹوارٹ

[3] اس کتاب کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے تذکرہ مخطوطات۔ نمبر ۲۲

اپنے مرشد کی مدح میں ایک نظم کہی ہے۔ جس کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[1]۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

ارے طالب ہونا طلب خدا
جے حق تے آیا یہی ندا

جب مدح کوں تن کا سنگ ہوا | کھل اژدن اس کے ڈنگ ہوا
جب گیان ترنگیں لنگ ہوا | یہاں یاد بسر یک رنگ ہوا
او شاہد دلبر تنگ ہوا | ارے طالب ہونا طلب خدا
جے حق تے آیا یہی ندا

پیر شہ میراں جی آن ملے | منج پر مول اپنے لائے گلے
سب تن من جیو کے پھول کھلے | اس خوش بوئی سول جیول بھلے
یوں سب میں دیکھے دیلے دیلے | سب رخ کربیا پیہہ ملے
ارے طالب ہونا طلب خدا
جے حق تے آیا یہی ندا

مرتضیٰ: اس کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں ہیں، ایک طویل مثنوی جو "وصل نامہ" سے موسوم ہے کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[2]۔ اس مثنوی میں وحدت الوجود کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔
بیجاپور میں دو صوفی بزرگ شاہ مرتضیٰ قادری اور شاہ مرتضیٰ الحسینی گزرے ہیں۔

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۱۰۹ . [2] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۲۱۰

دونوں کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ یہ مثنوی ان دونوں میں سے کسی کی نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے شاعر کی ہے جو "سلطان" کا مرید تھا۔ کلام کا نمونہ:۔

ادل توں اتھا گنجِ مخفی کے بیچ	لیا صفت ساتوں اپس بیچ کھیچ
کیریوں رہا بے خودی کے اندر	سمندر کی سیپیاں میں ہے جوں گہر

حسینی: اس دور کے ایک شاعر شاہ حسین نام اور حسینی تخلص کرتے تھے۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ غزل گو شاعر تھے۔ ان کا ایک مختصر دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

ہوا تھا شوق مجکوں طبع تیری آزمانے کا
نہیں ثانی ترا جگ میں توں نادر ہے زمانے کا
جہاں کے عاقل و دانا ہیں عاجز تجھ فراست سیتی
کسے طاقت صنم تجسیں میں تیرے بار پانے کا

حسینی حشر کا کچھ خوف مت کر	امین الدین ہے تیرا مددگار
نگاہِ جسم کا یو ہے طلب گار	اچھے کیوں نا اسے لذاتِ دیدار

تمہارے دید کا لذت ہمارے آنسوں پوچھو
ہور اپنے حسن کی خوبی تم نار سوں پوچھو
ادھر پہ دھر ادھرا میٹھے بدن پر سے جو تم موہن
دھڑی مسی کی کیوں لگی لب ممتاز سوں پوچھو

بیبنے سے کہیچ کو سینہ لگائے شوق سوں پیارے

اور راحت ہور خوش جی کو کچھ اس جانباز سوں پوچھو

عیسیٰ منتظر بیٹھا ہے کب سوں چاند سوں مکھ کا

اگر ہو دل منے پیا ملے تو پھر کیوں راز سوں پوچھو[1]

مختار: اسی دور کا شاعر ہے۔ دوسرے شعرا کی طرح ہم اس کے نام سے واقفت نہیں ہیں اس کی ایک مثنوی جو "معراج نامہ" سے موسوم ہے ہمدست ہوئی ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۹۷ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

کہوں حمد اول اوس راج کا	نبی کوں دیا تاج معراج کا
خلائق ساری کیا ہے ظہور	دلے سب تے اول نبی کا ظہور

یہ معراج نامہ تقریباً تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ نہایت تفصیل کے ساتھ اس نے معراج کے حالات، آسمانوں کی سیر، جنت اور دوزخ وغیرہ کا حال لکھا ہے۔ اپنے مرشد عبدالصمد کی مدح کی ہے۔ سید محمد حسین گیسو دراز اور سید محی الدین عبدالقادر جیلانی کی ستائش کرتا ہے۔ مزید نمونہ یہ ہے :۔

تخلص کی وضاحت :۔

محمد ہو مختار کوں کر خدا	تو ایمان اس کوں اچھے گا سدا

---

[1] کتب خانہ آصفیہ نمبر دواوین ۱۴۸۷۔ [2] کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اس معراج نامہ کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔

تاریخ تصنیف کی صراحت:۔

یہ معراج نامہ ہوا ہے تمام	سلام علی روح خیر الانام
سنہ تھا یہ ہجرت کا اس دن قرار	تھے گزرے نو چار پر ایک ہزار

قدرتی: اس دور کا ایک اور شاعر قدرتی ہے۔ جدید تذکرہ نویسوں نے اب تک اس کا حال قلم بند نہیں کیا ہے۔

افسوس ہے کہ ہم قدرتی کے تفصیلی حالات سے بے خبر ہیں۔ اس کی ضخیم مثنوی جو دس ہزار شعر سے زیادہ پر مشتمل ہے، اس کی قادر الکلامی کی شاہد ہے۔

یہ مثنوی "قصص الانبیا" سے موسوم ہے۔ اور ۱۳۹۱ عنوانات کے تحت لکھی گئی ہے، حمد و نعت و منقبت کے بعد آدم علیہ السلام سے آغاز ہو کر آنحضرت صلعم کے حالات تک بیان ہوا ہے۔ دس ہزار شعر سے زیادہ ہیں مگر ہمارا دستیاب شدہ نسخہ جو کتب خانہ آصفیہ میں ہے ناقص ہے جبش کی ہجرت تک کا بیان اس میں آیا ہے، ممکن ہے پوری مثنوی کے اور چند سو یا چند ہزار شعر ہوں۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آنحضرت صلعم کا پورا حال قلم بند کیا تھا یا نہیں، اکیس انبیا کا تذکرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے قدرتی نے اس کو کسی فارسی کتاب سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ یہ اس کی ذاتی تصنیف ہے، جس کو اس نے تفسیروں وغیرہ سے اخذ کیا ہے۔ قدرتی کی کوئی عشقیہ مثنوی دستیاب نہیں ہوئی، اس سے واضح ہے وہ مذہبی شخص تھا۔ اپنے کمال فن کو عشقیہ مثنوی کی صورت میں پیش کرنے کی بجائے قصص الانبیا کی صورت میں جس کو وہ صحیح تصور کرتا تھا پیش کیا ہے۔

جس قدر دکھنی مثنویاں اب تک دستیاب ہوئی ہیں ان میں سب سے ضخیم مثنوی رستمی کی خاورنامہ تھی۔ اب یہ دوسری مثنوی ہے جو دس ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔

قدرتی کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

کہ الحمدللہ و پروردگار	کیا جگ ایس نورتے آشکار
سرادوں اول ہیں جو سبحان کوں	جب کوئی جو دیا ہے سو سلطان کوں
خلیفہ ہے اس کا نبی مصطفیٰ	کیا جس کیتو لیسل ہور والضحیٰ

قصہ یو جو کہتا ہوں ایوب کا	اتھا نسل اولاد یعقوب کا
اتھی مال ان کی یہودا نسل	یمن شاہ کی ودا تھی دراصل
نبیاں بیچ صابر وایوب تھے	نظر پاک صورت منے خوب تھے
انھے دو تونگر بہوت مال وار	بھو کیا کوں کھانا کھلاتے بچار
جو کپڑے نہ تھے پین تے تن اوپر	نیلکیا تیں دکپڑے تپا دے اگر
بلاتے دانگی اسی دھانت تھے	جو کرتے اپے خیر خیرات تھے
کتے ہیں جو اس وہات سبحان او	مسلّط کیا ان پر شیطان جو

زلیخا کا قصہ یوسفؑ کو غلام بنا کر دکھنا۔

قبولی زلیخا جو خدمت کتیں	اسی پرورش خوب کرتی ہوں میں
و دل جان قبولی محبت بدل	و خوش حال ہوں لیل جو کھلتا کنول
زلیخا رکھے اس کوں سبال تے	دجیو کر کو اسی کوں لگے پال تے

جو یوسف اول سو انخا بال کا ۔۔۔ دنیو خبر سترا اٹھا سال کا
خدا کا جیکیچ علم بوجھا اتھا ۔۔۔ جیکیچ سال کا جاب سو جھا اتھا
اس واسطہ جم زلیخا کا دل ۔۔۔ اچھے جو بلی خوش حال جیوں پھول کھل
اسے عشق دن بدن مزید اہوا ۔۔۔ دسودا عشق کا سو پیدا ہوا

بی بی خدیجہ کے عقد کا حال :-

نہیں مسخرانی یو ہے جان توں ۔۔۔ قبولی ہوں میں اپنی ایمان سون
سو جتنے تمارے اچھینگے جو خویش ۔۔۔ بلا کرہ جمع کر توں سارے قریش
سو میرا چچا ورقہ نوفل کتیں ۔۔۔ بلا لیا ی قول میری منزل کتین
محمد کوں ہاں تم بلا لیائے کر ۔۔۔ کرد خواستداری میری آئے کر
نہیں مرد منج کوں کوئی محمدؐ بغیر ۔۔۔ اس باج منکن نہیں کار خیر
بوطالب سنے ہے خدیجہ نے بات ۔۔۔ سو خوش حال ہو کرا پی وھاند حات
بلا بیج سیارے اکابر کتیں ۔۔۔ صنادید سارے قریشؐ جو دین
بلائے ورقہ نوفل کتیں ایک بار ۔۔۔ جو آئے ہے سب مل خدیجہ کے نہار
پلاتے ورقہ نوفل کتیں تب شراب ۔۔۔ وبجھیاں پو سارا جو جسکے گلاب

فرعون کا ڈوبنا :-

دو فرعون ڈبنے لگیا ایک بار ۔۔۔ کہیا تب جو موسیٰ کو یوں کہ پکار
نکوتوں ڈبا منج مسلمات ہیں ۔۔۔ جو ہوتا ہوں لیا تا ہوں ایمان میں
اسی سات جبرئیل آئے دہاں ۔۔۔ بچلک لکھا سو دیکھائے دہاں

دنو بہ کہا تو ہوا کچ نہ فرق ‏ ‏ ‏ ‏ ہوا دب دلشکر سنی آپ غرق
دجبرئیل آئے میکائیل سات ‏ ‏ ‏ ‏ جو رے گئے ہزاراں فرشتے سنگات
سو کافر کے لشکر کتیں گھیر مار ‏ ‏ ‏ ‏ ڈبائے ندی میں یہی ایک بار
دموسیٰ دیکھے علیہ السلام ‏ ‏ ‏ ‏ ہوا غرق فرعون لشکر تمام
کہے اپنے لوگاں سنتے ایک بار ‏ ‏ ‏ ‏ چلو جا بن کافر ڈبیا ہے جو خوار

مصنف کے تخلص کے چند شعر:-

کہیا قدرتی قصہ دکھنی کلام ‏ ‏ ‏ ‏ ابراہیم نبی پر درود و سلام

کہیا قدرتی خوب تازہ کلام ‏ ‏ ‏ ‏ کہ برصدق یوسف علیہ السلام

کہیا قدرتی قصہ ایوب کا ‏ ‏ ‏ ‏ سنے کوئی بندہ جو محبوب تھا

مومن: میاں عبدالمومن نام مومن تخلص مدراس کا باشندہ تھا "اسرار عشق" نام ایک مثنوی بانی فرقہ مہدویہ سید محمد جونپوری کے حالات میں تصنیف کی ہے۔ خاصی ضخیم مثنوی ہے ۱۰۹۲ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔[1] اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی اچھی قابلیت تھی اور شاعری کا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ نمونہ کلام پیش ہے:-

عجب دی شب کہ منجن سیم کر حل ‏ ‏ ‏ ‏ عروس بدر سر تھا نور کی جھل
منجن خانی تھی مشرق کی نکل ابھار ‏ ‏ ‏ ‏ بیٹھی آ تخت پر نیلم کی اظہار

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد۔

کہ تا جا حجلہ مغرب منی چل — سورج کی شو سوں دی جلوا لکی کل
پرت کی رہنت ہیں بھی خوب لاکی — عروس آ پیں ہو جانا شو کی جا کی

ولایت کی جلالت کا سیج راز — ہوا ہر سور تھا سیج آتش انداز

اکن سوں کھیلتے تھی سخت شیراں — بھنز پر پیر نکلتی تھے دلیراں
لے سید محمد سوں سیرن بھاک — کیسی ہر تنہ تھی صورت حراک
کھویلتے تھی اکن ہیں تیر بازی — دکھاتی تھی فلک کو تیغ بازی
سمندا ہ کا بلی ہر ہر سچی تھی — کبھی نکری کی بھلیاں کی بچی تھی
یوں ہور برق لدی اگ کوں ناڈ — جلالت کا دکھا دہی سور کی بھاڑ
اری نوں ازل سوں شاد کا جام — کیا تیری طلب کا خوش سرانجام
انا کر رقص اکت تا نہ بنا نا — تنن نا تن نا تن تننا نا

قادر: شاہ عبدالقادر نام اور قادر تخلص تھا۔ عام طور سے قادر لنگا کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید[۱] اور خلیفہ تھے۔ حیدرآباد کے قادر سے جن کا ذکر میر حسن اور راسیر نگر نے کیا ہے ان کی شخصیت علیحدہ ہے۔

قادر کے شاگرد بھی سکندر عادل شاہ کے زمانہ میں صاحب تصنیف ہو چکے تھے۔ قادر کا کلام خاص طور سے قابل غور ہے کہ انہوں نے غزل میں عام رواج

۱؎ اسرار عشق قلمی۔ ۲؎ روضۃ الاولیا بیجاپور

کے خلاف اخلاقی مضامین بیان کئے ہیں۔ حسب رواج تصوف کے مسائل کو حقیقت کے عنوان سے لکھا ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے :-

شاہ امین علی پیا مجھے سنبھال بہوت ناتواں ہے میرا حال

شاہ امین علی پیا مجھے جیلا
تیرے محبت کا مے مجھے پلا
میرے دل کے چمن کا توں پھول کھلا

شاہ امین علی پیا مجھے تیری آس
حسب محبوب رہے تیری چرن پاس
تو سائیں میرا میں تیری داس

بوسے قادر میں تیرا کمین بندا
نس دن لاگیا ہے مجھے تیرا دھندا
میں تیرا چکور توں میرا چندا[1]

نکر کس پر زبردستی نہ کس کا دل دوکھانا ہے
یتی کیا مال پرستی خداکوں موں دیکھانا ہے
تکبر کے جو مسند پہ غروری کا جو تکیہ دہر
رہا کیا بیڑ غفلت کر تجھے دنیا تھے جانا ہے
نکر مردم آزاری تجھے مرنا ہے سوں سارے
عذاباں قبر ہے بہاری تجھے بھی وہاں سمانا ہے

---

[1] بیاض مملوکہ آغا حیدر حسن صاحب۔

کفن سے کھول مکہ تیرا لگا کر لیا ہے تربت سیں
کریں سب مل دفن تجکوں دنیا کا کیا بہانا ہے
اجل جس وقت آوے تو مریگا کن عذابوں سیں
اندھارے گور میں تجکوں لجا کر بھی سولانا ہے
پوچھے منکر نکیر تجکوں نہ نکلے جواب تجہ مکہ سیں
اوسے دہشت کے ڈرنے سیں زباں تب لٹے پتانا ہے
خدا قاضی بجہ ہوے گا محمد پیشوا ہو کر
تیری نیکی بدی دونوں ترازو میں تولانا ہے
ہو جاوے خاک گل ور گل ہے ماتی سوں ہاتی مل
نکو لیوے نام کوئی یک تل کہیں آخر زمانا ہے
قبر میں رکہ تجھے جیوں کول چلے سب چھوڑ کر گھر کوں
کہ یارب تم نکو چھوڑو جو یو بے کس بے زبانا ہے
یوے قادر گناہوں کی خجالت سوں
کہ بھی تجکوں خجل صورت اوٹھانا ہے[1]

قادر کی ایک مثنوی "معجزہ خاتون جنت" بھی ہے۔ اس کے تقریباً سوا دو سو شعر ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو میں اس کا نسخہ موجود ہے[2]۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

روایت ہے یہ حضرت عباس سوں لکھے ہیں کتابوں میں اخلاص سوں

---

[1] از بیاض مملوکہ حضرت مولوی خلیل اللہ صاحب۔ [2] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۲۲۱۔

لکھے ہیں عربی سوں سے در کتاب
کئے ترجمہ فارسی در جواب

کہا فارسی کا بھی دکھنی کلام
جو معلوم ہوتا اگر خاص و عام

روایت کہتا ہوں سنو اے عزیز
سنیو دل کے کانوں سے تم باتمیز

صحیح یو روایت بوقتِ رسول
دل و جان سوں بات کرنا قبول

عرب تھا عبداللہ نام دار
تھا بہوت تجار و مالدار

یو دنیا کی نعمت سے مکاجی
تھا دشمنی سب کا او سرک سی

ابوجہل کا اوس کا بھائی اتھا
نکر تونگر ہیں بر جائے تھا

کرے دشمنی او نبی سوں سدا
یو مرک ازل سوں کہا تھا خدا

یو کر منی منگے اپنی دختر کا بھاؤ
لگا بہوت بنت رسول کر بنکو جاؤ

شروع مہربانی کہا سر بسر
ہوا غل غلالوں شہر در شہر

بلانے لگے سب عرب کو تمام
بولانے لیکا سب عرب خاص و عام

بولایا جنی دوست اور خویش تھے
و ہم قوم دل بند دل ریش تھے

کیا دل میں تجویز او بد اسیر
او لیانا محمد کی بیٹی کو گھر

ہمیں ہیں تونگر او تو ہیں فقیر
بولا مہربانی کو کرنا حقیر

شاہ من عرف: شاہ من عرف بھی حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید ہیں - غالباً خلافت نہیں تھی ۔ آغا حیدر حسن صاحب کی بیاض سے آپ کا جو کلام ملا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے :-

بوجھنا مشکل پڑیا بوجھنا پیو کا وہ صاحب ہے سب جیو کا

واجب ممکن ہے بوہنکارا
ممتنع عارف ودیو نرمکارا
روح شاہد ہے وہ پرکارا

شاہد مشہود کر توں ایک انکارا
نور نرنجن ہے وہ سبنے کا را
گنج مخفی سوں ہے اس کا اظہارا

جلال جمال کر توں ایک ٹھارا
نور جلال گنج سوں ہے تنبارا
اس کی آنکے دیکھو پیو کا دیدارا

شاہ من عرف عاجز بندہ گنہ گارا
مرشد امین علی گناہ بخشن ہارا
پیر باداشاہ اوتارے مجھے پیلی پارا

دیگر

ذات احد کی پاک ہے ادسے کوئی دیکھ پچھانے
پیو سوں کوں دیکھ کر ہوسے نوسے دیوانے

جلی ظاہر قلبی دل ہیں روحی سوں کر دپچھانا
سری سوں سکر باسے کر خفی ہیں ایسے چھپانا

لارب ولا عبد ہے فنا فی الشیخ ہوجانا

سب پر شاہد نور ہے وہی نور نورانا
ذات کے صفت جمال ہے اس کا وہی ٹھکانا
جلال جمال ایک نکتا کہ اس میں بھید کوں پانا

مرشد امین علی سرمست پیر بادا شاہ حسنی
جلال جمال دکھائے کر کھولے ذات کی نشانی
شاہ من غریب مرید تیرا عاجز کیانی

مُعظّم: سکندر عادل شاہ کے زمانہ کا شاعر ہے۔ اس کے نام اور حالات کی ہمیں خبر نہیں۔ تصانیف سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ یہ اسی دور کا شاعر ہے۔ قادر کی شاگردی کی تھی اور حضرت امین الدین اعلیٰ کا معتقد ہے۔ اور ان کی مدح کی ہے۔

اس کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے یعنی شجرۃ الاتقیا اور گنجِ مخفی۔ ان کو سرسری طور پر ایک کتب فروش کے پاس دیکھا گیا تھا۔ نمونہ کلام پیش ہے:۔

الٰہی توں قادر ہے صاحب غنی ۔۔۔ تو رازق مطلق ہے سمرت دھنی
تیرا نام قہار سزادار ہے ۔۔۔ تیرے نام کا سب کو آدھار ہے

بجیوں تو شہنشاہ دیکھ پہچانے ۔۔۔ سلطان سکندر جانیے

اب جا توں بیجاپور ۔۔۔ ہے پورہ وہاں سٹرپور

وہاں ابن علی ہے پیر ہے روشن دیکھ ضمیر
ہے پیرا تیرا تو قادر او حاضر ہے اور ناظر

یو مکتوب معظم سکتے دیکھ غارت جبکہ کر دھکے
خود قادر پیار کیا ہے مجھ روا اپنے آپ دیا ہے
میں عاجز اور میں مظلوم او صاحب حی القیوم
مجھ رالکھا ناؤں معظم
اور اپنا کیلا محرم[1]

الٰہی نہیں قادر ذوالجلال تو صاحب جمیل یحیب الجمال
سمیع بصیر علیم حکیم توں خالق تو رازق رؤف الرحیم

معظم نے تب ایک سجدہ کیا
میراں کے نعلین پر سر لیا[2]

---

[1] نجرۃ الاقتباد۔ [2] گنج مخفی۔

عادلِ شاہی نثر

گولکنڈہ کی طرح بیجاپور میں بھی دکھنی نثر میں کتابیں مرتب ہوئی ہیں۔ مگر چونکہ عام طور سے نظم کا رواج تھا اس لئے نثر کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔ ایک دو تصانیف کا پتہ چلتا ہے۔

شاہ برہان الدّین جانم: شاہ برہان الدین جانم کی نظم کا نمونہ پیش کر دیا گیا ہے۔ آپ نے بعض رسالے نثر میں بھی مرتب فرمائے ہیں، ایک کا نام "معرفت القلوب" اور دوسرے کا نام "ہشت مسائل" ہے، یہ دونوں رسالے تصوّف میں ہیں اور اس کے مخطوطات آغا حیدر حسن صاحب کے پاس موجود ہیں۔ عبارت کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"بسم اللہ ناؤں اللہ کا الرحمٰن مہربان الرحیم،
بخشنہارا اور بخشنا ہمارا۔ سرانا فواند ناخدا کون بہوت کر اور پرورش کرنہارا تمام عالم کون:۔
- جان اے سالک پچھانت کرنا شریعت کا ہور حقیقت کا ہور طریقت کا ہور معرفت کا اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پاتے کے بدل عالماں کوں ہور عاشقاں کوں ہور واصلاں کوں اب تو سب کوں تسلّی دکھلاتا ہے، ہور دل کوں ان پر کر راحت پاتے ہیں"۔[1]

---

[1] "معرفت القلوب" مخطوطہ مملوکہ آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج حیدرآباد

"ہشت مسائل" کا نمونہ یہ ہے:-

"پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کوں معراج ہوا تب محمد رسول اللہ علیہ السلام نے سوال کئے کہ سات طبق آسمان ہور سات طبق زمین کیا قدیم ہے یا جدید ہے۔

جواب خدا کہیا اے حبیب من این ہمہ جدید آفریدہ شد۔ سوال تو کچھ نہ تھا تو کیا تھا۔ جواب نجہ سوں میں تھا۔"

امین الدین اعلیٰ: شاہ امین الدین اعلیٰ بن حضرت برہان الدین جانم رحمۃ اللہ کے فرزند اور جانشین تھے۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح صاحبِ ارشاد اور ہدایت تھے۔ آپ کی بے شمار کتابیں ہیں۔

شاہ صاحب کی نظم کا نمونہ پیش کیا جا چکا ہے۔ آپ نے نثر میں بھی چند رسالے لکھے ہیں۔ ایک کا نام "رسالہ گفتار شاہ امین" ہے۔ اور دوسرے کا نام "گنجِ مخفی" ہے۔ ان کا موضوع بھی تصوف ہے۔

انجمن ترقی اردو وغیرہ کے کتب خانہ میں اس کے مخطوطات موجود ہیں عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کرنے چاہا تو اول اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سواس سے اپس دیکھیا اس سے شاہد کہتے ہیں۔ یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔

ذات نے اپس کوں دیکھیا اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو

اسے شاہد کہتے ہیں۔

یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"[1]

اسی عہد کے دو اور رسالوں کا پتہ چلا ہے جو نثر میں ہیں۔ لیکن ان کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ مگر مخطوطہ کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اسی زمانہ کی تالیف ہیں۔ نمونہ عبارت حسب ذیل ہے :-

"اے عارف خدا تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے کل شئی محیطٌ و فی انفسکم افلا تبصرون ....

اس واسطے ضرور ہوا کہ کچھ معرفت حق کا بولنا جوں آپکوں سچا کیا تبنوں قال علیہ السلام تکلم الناس علی قدر عقولہم۔ یعنی آدمی بات کرتا ہے اپنی عقل موافق ....

جو کوئی پیر کامل سون یہ دیکھے عن اوس کا متاع ہے۔ نہیں ہے۔ اے عارف ہر ایک انسان کوں پانچ وجود ہیں۔ ہر ایک وجود باری تعالیٰ کا ہے۔ ہر ایک وجود کی شرطاں اور لوازمات ہیں۔"[2]

دوسرے رسالہ کو ارشاد نامہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ شاہ برہان الدین جانم کی ایک تصنیف اس نام سے موسوم ہے مگر وہ منظوم ہے۔ چونکہ یہ نثر ہے اس لئے نہیں معلوم شاہ صاحب ہی کی تصنیف ہے یا اور کسی کی۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

---

[1] رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۸ء۔ [2] یہ نسخہ میرے چچا عبداللہ صاحب کا مملوکہ ہے۔

"بسم اللہ نام اللہ کا..........

اللہ محمد کے راز رموز کے باتاں کسی نامحرم کے آگے نا بولنا بولینگے تو کافر ہوینگے۔ سو دیوانے ہوینگی تو انو کوں بولکر دیوانے نا کرنا۔ ہور اپی سناکر کافر نا ہونا یو شرط اس زبان سوں ذکر کرنا اللہ اللہ"

خاتمہ عبارت

"اے بار خدایا امانت کو مجھ پر آستی تا کہ تیری احد ذات میں فنا ہوئی الف کا لا نفی الا اثبات ذات تعلق صفات بخش لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"[1]

---

[1] یہ رسالہ بھی میرے چچا مولوی عبداللہ صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔

تیسری فصل

نظام شاہی اُردو

گولکنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنتوں کی اُردو کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب ہم احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ نظام شاہی حکومت کا بانی ملک احمد بحری ہے جو ملک نائب بحری کا فرزند تھا۔ ملک احمد بحری نے جو نظام الملک سے ملقب تھا سب سے پہلے سنہ ۸۹۵ھ[1] میں بہمنی حکومت سے انحراف کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس خاندان کے حسب ذیل بادشاہ یکے بعد دیگرے سنہ ۱۰۴۳ھ تک حکومت کرتے رہے:۔

۱۔ احمد نظام شاہ	سنہ ۸۹۵ھ	سے	سنہ ۹۱۴ھ
۲۔ برہان نظام شاہ	سنہ ۹۱۴ھ	سے	سنہ ۹۶۱ھ
۳۔ حسین نظام شاہ	سنہ ۹۶۱ھ	سے	سنہ ۹۷۲ھ
۴۔ مرتضیٰ نظام شاہ	سنہ ۹۷۲ھ	سے	سنہ ۹۹۶ھ
۵۔ میراں حسین	سنہ ۹۹۶ھ	سے	سنہ ۹۹۶ھ
۶۔ برہان ثانی	سنہ ۹۹۶ھ	سے	سنہ ۱۰۰۳ھ

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۹۶ مقالہ سوم۔

۷۔ ابراہیم نظام شاہ	سنہ ۱۰۰۳ء	سے	سنہ ۱۰۰۳ء
۸۔ بہادر نظام شاہ	سنہ ۱۰۰۳ھ	سے	سنہ ۱۰۰۹ھ
۹۔ مرتضیٰ ثانی	سنہ ۱۰۰۹ھ	سے	سنہ ۱۰۰۹ء
۱۰۔ برہان ثالث	سنہ ۱۰۰۹ء	سے	سنہ ۱۰۴۳ء

ملک احمد کی عمدہ سیرت اور بہترین اخلاق کی مصنف تاریخ فرشتہ نے بڑی تعریف کی ہے۔ اور بیان کرتا ہے کہ خصال حمیدہ بے شمار ہیں۔ صفحات گزشتہ میں اس امر کی صراحت ہو چکی ہے کہ بہمنی عہد حکومت سے دکن میں دکھنی زبان کا رواج ہو چلا تھا، عام طور سے دکھنی بولی جاتی تھی اور تصنیف و تالیف کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔

ملک احمد کے زمانہ کے ایک شاعر شرقؔ سے ہم واقف ہیں جس کی مثنوی ہمدست ہوئی ہے۔

ملک احمد کے مرنے پر اس کا فرزند برہان نظام شاہ مسند نشین ہوا، اور طویل عرصہ تک حکمرانی کرتا رہا۔ اس کے زمانہ میں احمد نگر میں علم و فن کی بڑی ترویج ہوئی۔ شاہ طاہر یزدی اسمٰعیلی نے ایران سے آکر اس کو امامیہ مذہب میں منسلک کر لیا۔ شاہ طاہر ہفتہ میں دو دن جامع مسجد میں درس دینے لگے۔ تمام علماء شہر جمع ہوتے تھے۔ بہت بڑی مجلس منعقد ہوتی۔ خود سلطان برہان نظام شاہ اس مجلس میں شریک ہوتا تھا۔ یہ خود صاحب ذوق اور ذی علم تھا۔ مجلس مناظرہ میں خود حصہ لیا کرتا۔[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۱۲ مقالہ سوم

برہان نظام شاہ نے جامع مسجد کے سامنے ایک عالی الشان مدرسہ بھی تعمیر کیا تھا۔ اور اس کے اخراجات کے لئے ایک بڑی جاگیر وقف کر دی تھی[1]۔ کئی علماء باہر سے آکر مقیم ہو گئے جن میں شیخ احمد نجفی، ملا پیر محمد، ملک احمد تبریزی، اسمٰعیل صفوی، خواجہ معین الدین صاعدی، شاہ حسن انجو، شاہ جعفر جو شاہ طاہر کے بھائی تھے۔ ملا شاہ محمد نیشاپوری، ملا علی استر آبادی، ملا رستم جرجانی۔ ملا علی مازندرانی۔ ملا عزیز اللہ گیلانی۔ ملا محمد امامی استر آبادی وغیرہ مشہور ہیں۔ جن کی وجہ سے بقول فرشتہ احمد نگر گلستانِ ارم بن گیا تھا[2]۔

برہان نظام شاہ کا جانشین اس کا فرزند حسین نظام شاہ ہوا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح ذی علم اور علم دوست بادشاہ تھا۔ ملا طاہر جو ایران واپس چلے گئے تھے۔ وہ دوبارہ واپس آئے۔

سلطنت نظام شاہی کے حدود مغلیہ حکومت کے حدود سے ملے ہوئے تھے۔ اس لئے سلاطین مغلیہ نے دکن کی مہم میں سب سے پہلے اسی سلطنت کو آماجگاہ بنایا۔ اور پے در پے حملے کرتے رہے۔ نظام شاہی سلطنت کی دو شخصیتیں اس لئے خصوصیت سے مشہور ہیں کہ انھوں نے سلطنت مغلیہ کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور عرصہ دراز تک اپنی چھوٹی سلطنت کے باوجود مغلیہ شہنشاہیت کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ان دو شخصیتوں میں سے ایک چاند بی بی یا چاند سلطانہ ہے جس نے اکبر کے شہزادوں کا بڑی مردانگی اور شجاعت سے مقابلہ کیا جس کی شجاعت اور دلیری کے کئی واقعات تاریخ دکن میں درخشاں ہیں۔ بالآخر جب

---

[1] [2] تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶ مقالہ سوم۔

۱۰۰۹ھ میں احمد نگر پر مغلیہ قبضہ ہو گیا تو نظام شاہیوں نے دوسرے مقام کو اپنا مستقر بنا لیا۔ نظام شاہی حکومت کی دوسری مشہور شخصیت ملک عنبری ہے جس نے "کھرکی"[1] آباد کر کے اس کو مستقر حکومت قرار دیا تھا۔ اور عرصہ تک حکومت مغلیہ کا بہادری اور دلیری سے مقابلہ کرتا رہا، اور اپنے مرنے تک مدافعت میں کامیاب رہا۔ شاہ جہان کے زمانہ میں اس کے سپہ سالار مہابت خاں نے ۱۰۴۳ھ میں "کھرکی" فتح کر کے نظام شاہی حکومت کا خاتمہ کیا۔[2]

اگرچہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کو بھی اپنی ہمسایہ حکومتوں سے جنگ و جدل کرتے مقابلہ اور مدافعت میں ایک زمانہ بسر ہوا مگر نظام شاہی حکومت کو جس طرح مغلیہ شہنشاہیت سے سب سے پہلے نبرد آزمائی کرنی پڑی اور عرصہ دراز تک شہنشاہیت سے مقابلہ رہا اس سے دونوں حکومتیں بڑی حد تک بچی رہیں اسی جنگ و جدل کی زیادہ مصروفیت کی وجہ سے نظام شاہی حکومت میں علم و فن اور شعر و سخن کی وہ گرم بازاری نہ ہو سکی جو قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں میں ہوئی۔ تاہم چند شعرا کے نام دستیاب ہوئے ہیں جن کو احمد نگر سے تعلق تھا۔ اور نظام شاہی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت نے بھی دکھنی زبان کی ترقی میں حصہ لیا۔ اور ان کے عہد کی تصانیف موجود ہیں۔ جن کی صراحت کی جاتی ہے:۔

اشرف: اس حکومت کا پہلا شاعر جس کا کلام دستیاب ہوا ہے وہ اشرف

---

[1] کھرکی زمانہ مابعد اورنگ آباد سے موسوم ہو کر عالمگیر اورنگ زیب کا پایہ تخت بنا۔ [2] تاریخ فرشتہ۔

ہے۔ شیخ اشرف نام اور اشرف تخلص تھا۔ ملک احمد نظام الملک کے زمانہ میں موجود تھا۔ اور اسی کے عہد میں اس کی مثنوی "نوسرہار" ۹۰۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

اشرف کے متعلق ہمیں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ صرف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ شیخ ضیاءؔ (ضیاء الدین) کا مرید اور معتقد تھا۔ شاہ ضیاء الدین بیابانی سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان قندھاری (متوفی ۹۴۶ھ) کے بھانجے تھے۔ نوسرہار میں دکھنی مثنویوں کی طرح بادشاہ کی مدح نہیں ہے۔ بلکہ حمد و نعت وغیرہ کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کے مصائب اور حالاتِ کربلا منظوم کئے ہیں۔ واقعات کربلا کے متعلق یہ دکھنی زبان کی پہلی کتاب ہے۔ یہ مثنوی نو باب پر منقسم ہے، تیسرے باب سے امام حسین کے حالات شروع ہوتے ہیں۔ پہلا باب حمد و نعت میں ہے۔ دوسرا باب سببِ تالیفِ کتاب کا ہے۔

اشرف کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:-

اللہ واحد حق سبحان	جن یہ سرجیا بھوئیں آسمان
چندر سورج تارے روکھ	بادل بجلی مینہ اچوک
دوزخ جنت عرش و فلک	لوح قلم ہم حور ملک
نبی محمد حق رسول	کیتا جن یہ فقر قبول
دونوں جگ امر و میر	جس کوں چاروں یار وزیر
بوبکر صدیق ایک سرا	عمر خطاب ہم دوسرا
اسے دو بزرگ پیر آزاد	عثمان علی دوئے داماد
دوئے نواسے ان مل جانوں	حسن و حسین جن کا نانوں

علی کے اے ودے فرزند　　بی بی فاطمہ کے دلبند
اللہ کبرے سنوائیے　　پیغمبر کے پیارے

ناماں کیتا بول سنوار　　جانو موتیوں کیرا ہار
سونے کی جیوں کھونٹی گھڑ　　مانک موتی ہیرے جڑ
ایک ایک بول یہ مانک مول　　سیم ترازو سین بھیں تول
بند پروے سوتے تار　　بچیں ہوا نوسر ہار

مثنوی کا نام اس کی تاریخ تصنیف اور تخلص کے اشعار ملاحظہ ہوں :-
ہجرت نبی نو سو نو　　کہیا اشرف نوسر لیو

نوسر ہار اس دھریا ناوں　　جائے دیکھ تو اب ہر ٹھاؤں

اے نو باباں نوسر ہار　　قیمت اس کی لاکھ ہزار
باراں جیوں کی تاریخ سال　　بعد از ہجرت نبی سال
نو سو ہوسے اگلے نو　　یہ دکھ لکھیا اشرف تو
نانو دھریا اس نوسر ہار　　لیکن یہ سب دکھ کا بہار

اس مثنوی کا ایک مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ا
ڈاکٹر زور نے ادارہ کے مخطوطات کی فہرست میں تفصیلی صراحت کی ہے۔
" واحد باری" بھی اس کی تصنیف ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے :

ا۔ تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۱۱۷

واحسد باری ہوئی تمام | دنیا میں رہے اشرفؔ کا نام

آفتابی: سلطان حسین نظام شاہ کے عہد کا ایک شاعر ہے۔ اس نے شاہ نامہ کی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ حسین نظام شاہ کے جنگ کے واقعات درج ہیں۔ اور بادشاہ کی مدح بھی کی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً (۳۷۰) ہے۔ شاعر اپنے آپ کو امامیہ مذہب سے وابستہ کرتا ہے۔ اور سلطنت کا مذہب بھی یہی ہونے کی صراحت کی ہے۔

مثنوی کا ایک نسخہ پونہ کی دکن گلشن میں موجود ہے[1]۔ افسوس ہے کہ ہم کو نمونہ کلام ہمدست نہ ہو سکا۔

شوقی: حسن شوقی کا تذکرہ ہم نے بیجاپور کے شعراء میں کر دیا ہے۔ اس کو دکن کی تین سلطنتوں سے تعلق رہا۔ اس نے اپنے نظام شاہی تعلق کے زمانہ میں "فتح نامہ نظام شاہ" مثنوی لکھی تھی۔ جس میں بیجانگر کی جنگ اور فتح کا تذکرہ ہے۔ اس میں اس نے فتح کا سہرا حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے۔

کلام کا نمونہ بیجاپور کے تذکرہ میں پیش ہو چکا ہے۔

---

[1] مکتوب پروفیسر عبداللہ چغتائی موسومہ راقم۔

چوتھی فصل

بریدشاہی اُردو

بہمنی سلطنت کے ضعف کی وجہ سے جہاں دیگر صوبہ دار خود مختاری کا ڈنکا بجانے لگے وہاں خاص شہر بیدر میں بھی جوکہ بہمنی حکومت کا دارالسلطنت تھا خاندان بریدشاہی نے اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور ایک عرصہ تک خود مختارانہ حکمرانی کرتے رہے۔

اگرچہ ہم صراحت کے ساتھ یہاں کی اردو یا دکھنی کا نمونہ پیش نہیں کرسکتے تاہم ایک شاعر اور اس کی تصنیف کو روشناس کرایا جاتا ہے:۔

قریشی: امیر برید کے زمانہ کا شاعر ہے۔ ۱۰۲۲ھ میں ایک مثنوی "بھوگ بل" کے نام سے لکھی ہے۔ جس کا نسخہ کلکتہ کی امپیریل لائبریری میں موجود ہے[1]۔

اس مثنوی میں جنسی امور کو بیان کیا گیا ہے۔ اور کوک شاستر کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ کلام کا نمونہ دستیاب نہ ہو سکا۔

---

[1] مکتوب پروفیسر محفوظ الحق ایم۔ اے۔ موسومہ راقم۔

پانچویں فصل

دکن میں مرثیوں کی ابتدا

عرب کی شاعری میں مرثیے کو خاص درجہ حاصل رہا ہے۔ عربی مراثی اپنے سوز وگداز اور اپنی قوتِ تاثر کے باعث دلوں میں ولولہ جوش اور انتقام کی آگ روشن کر دیتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے بعد زمانہ اسلام میں مراثی کو مزید ترقی حاصل ہوئی اور کئی مرثیے اپنی فصاحت و بلاغت اور سوز و گداز کے باعث مشہور ہیں۔

فارسی میں بھی مرثیوں کا رواج تھا اور ان پر عربی مراثی کے اسلوب بیان کا بہت کافی اثر ہوا۔ چنانچہ محقق طوسی کے زمانہ میں شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق پُر درد فارسی مرثیے لکھے گئے۔

شمالی ہند میں ہمایوں کے دوبارہ واپس آنے کے پیشتر مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور نہ تھا۔[1] مگر اس کے کم و بیش نصف صدی پہلے دکن میں ان کا رواج ہو چلا تھا۔ دکن کی خود مختار سلطنتوں میں جو علم و فن کی ترقی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتی تھیں، مجالسِ میلاد اور مجالسِ عزا کا بھی خاص دستور پڑ گیا

[1] داستان اردو۔

تھا۔ اس قسم کی مجالس کا آغاز بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت میں ہوا مگر اس کے ساتھ ہی قطب شاہوں اور نظام شاہوں نے بھی اس کو رواج دیا تھا۔

جس طرح دہلی میں دکھنی شہزادوں اور امیروں کی بدولت اردو شاعری کا رواج ہوا اسی طرح انہی دکنیوں کی وجہ سے وہاں مجالسِ عزا کا دستور پڑا۔[1]

دکن میں ابتداءً فارسی شعرا کا کلام خصوصاً محتشم کاشی کے بند ان مجالس میں پڑھے جاتے تھے۔ مگر چونکہ دکھنی زبان عام طور سے مروج تھی، اور فارسی گو بار جست ہو چکی تھی اس لحاظ سے مرثیوں کا دکھنی زبان میں لکھا جانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایک خاص گروہ مرثیہ گویوں کا پیدا ہو گیا اور کثرت سے مرثیے لکھے گئے۔ خاص مرثیہ گویوں کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

اس امر کا صحیح پتہ لگانا دشوار ہے کہ اولاً دکھنی مرثیے کہاں لکھے گئے۔ کیونکہ عادل شاہی اور قطب شاہی دونوں سلطنتوں کے بانی امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ اور اپنی اپنی سلطنتوں کا مذہب شیعیت قرار دیا تھا۔ نظام شاہی سلطنت کا دوسرا بادشاہ اسمٰعیل شیعہ ہو چکا تھا۔ رعایا کے خیالات اور اعتقادات میں یکسانیت پیدا کرنے کا خیال تینوں سلطنتوں کو تھا۔ تاریخوں سے اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ بیجاپور اور گولکنڈہ میں شاہی عاشور خانے موجود تھے اور یہاں مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی اور گولکنڈہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں خاص طور سے اس پر زیادہ توجہ کی گئی تھی۔

---

[1] داستانِ اردو از مرحوم نواب خیال

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں جشن میلاد مبارک کے جلسوں کے ساتھ ساتھ محرم کی تعزیہ داری میں بھی ترقی ہوئی۔ تمام ممالک محروسہ میں ایام عاشورہ تک نوبت نقارہ موقوف رہتے۔ گوشت اور پان کی دکانیں بند ہوجاتیں تمام مسلمان اور ہندو ماتم میں شریک ہوتے تھے ۔

گولکنڈہ[1] میں دو شاہی عاشور خانے تھے۔ یہاں چودہ علم چہاردہ معصوم کے کھڑے کرائے جاتے۔ روشنی کا خاص طور پر انتظام ہوتا تھا۔ سو سو دو دو سو چراغ کا ایک ایک برنجی درخت بنایا گیا تھا جو اپنی روشنی سے عاشور خانہ کو منور کر دیتا تھا۔ یہاں مرثیہ خواں اور مداح شہدا ہر شب کو جمع ہوتے اور اردو میں مراثی اور مناقب پڑھتے تھے۔ جب مراسم تعزیہ داری ادا ہوجاتی تو حکومت کی جانب سے سب کی دعوت ہوتی، مگر اس میں بے گوشت کی غذائیں ہوتی تھیں۔ ہر گلی و کوچہ میں یہی ہوتا تھا چھٹی تاریخ کو عاشور خانہ کے باہر کے علم اٹھائے جاتے ان کے ساتھ محبان ائمہ اطہار ہاتوں میں مشعل لئے ہوتے اور ذاکر و مداح مرثیہ خوانی اور مداحی اشعار پڑھتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ دسویں تاریخ کو خود سلطان عبداللہ سیاہ لباس میں برہنہ پا علموں کے ساتھ ہوتا تھا۔ مرثیہ خواں آگے آگے مرثیے پڑھتے جاتے تھے۔ واقعات شہادت اور احوال گرفتاری حرم محترم بھی سنائے جاتے۔[2]

اسی طرح بیجاپور کے شاہی عاشور خانے کا نام "حسنی محل" تھا۔ نصرتی نے

---

[1] اس وقت قطب شاہیوں کا دارالسلطنت گولکنڈہ سے حیدرآباد تک پھیلا ہوا تھا۔

[2] سلسلہ آصفیہ تاریخ دکن جلد دوم۔

اپنے قصیدہ میں اس کی تزئین اور آراستگی کی پوری تفصیل کی ہے، اور بیان کیا ہے کہ علی عادل شاہ نے منت مانی تھی کہ اگر جنگ سے فتح یاب ہو جائے گا تو علم بٹھا کر مرثیہ خوانی کرے گا

اس وقت تک قدیم سے قدیم جو کتاب واقعات کربلا کی ہمدست ہوئی ہے وہ نظام شاہی سلطنت کے شاعر اشرف کا "نو سر ہار" ہے۔ اس کے بعد جو مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ گولکنڈہ کے مشہور و معروف شاعر وجہی[1] کا ہے۔ اس کے بعد گولکنڈہ اور بیجاپور کے دیگر شعرا اور مرثیہ گویوں کے مرثیے ہیں۔

ان ابتدائی دکھنی مرثیوں کی جو خصوصیتیں ہیں ان کا مختصر اظہار ضروری ہے۔

۱۔ ان مرثیوں سے صاف طور پر مرثیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلِ بیت رسالت کا غم والم تازہ کرنا اور ان کی یاد میں آنسو بہانا تھا۔

۲۔ فرضی روایات اور افسانوں کو مرثیوں کا جزوِ اعظم قرار نہیں دیا گیا تھا۔

۳۔ مرثیوں میں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے۔

۴۔ ان مرثیوں سے واقعہ نگاری اور مرقعہ نگاری کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

۵۔ اکثر مرثیوں سے خود مصنفین کے متعلق تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اور دوسرے شاعروں کا نام ان کے وطن اور دیگر ہم عصروں کی صراحت بھی معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] وجہی کی نثر سب رس کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق صاحب نے روشناس کرایا تھا۔ اور اس کی مثنوی قطب مشتری اور مرثیہ کا پتہ راقم ہی نے چلایا اور ان کو متعارف کرایا تھا۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ مرثیے پیش کرتے ہیں۔ اولاً احمد نگر پھر گولکنڈہ اور اس کے بعد بیجاپور کے مرثیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مرثیہ اشرف:-

رو رو کہے یوں حسین | اب کے پچھوڑی کد ملین
وہ تون جانا مجہ دک دہر | یوں در ماندا بلکے گہر
تجہ تھیں سرا ہوں ما باپ | اب کیوانوں طاقت تاب
تیری پیاروں ہوں نہا شاد | ما باپ ناوتے کدھیں یاد
اب یہ دکھ ہوں کیوں سہون | کس پکاروں کس کہوں
اب بچھورا ہوا جسم | تجہ بن تھا کی بوں پر کم
اب کہ ہون کس کا ناوں | کس پکاروں کیدہر جاوں

مرثیہ وجہی: وجہی گولکنڈہ کا مشہور شاعر ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" اور نثر "سب رس" کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس کا ایک مرثیہ بھی ہم کو دستیاب ہوا ہے۔ جس کو ہم آج سے بہت پہلے ہی اہل علم سے متعارف کرا چکے ہیں[1]۔ یہ مرثیہ حسب ذیل ہے:-

حسین کا غم کرو عزیزاں | انجونیں سوں جھڑ و عزیزاں
بنا جو ادل ہے غم کا | عرش گگن ہور دھرت ہلایا

---

[1] دیکھو مجلہ مکتبہ حیدرآباد

قضا ہیں جوں جوں لکھیا الٰہی   گریا حسین پر اوہی سمجایا
نبیاں ولیاں کے انجواں سوں لکڑے   یو غم حسین کا جنم دھولایا
دلاں میں دوگی پہوہ نے چٹکیاں   یو غم نے سلگا دبرک لگایا
یو کیا بلا تھا یو کیا جفا تھا   مگر قضا تھا سو حق دکھایا
محب دلاں کوں اجل کا ساقی   پیالے غم کے سو بھر پلایا
یو کیا اندیشہ اندیش کیتا   فلک شہاں پہ ستم خدایا
حسین پہ باراں نہ ردو دہجو   کہ دین کا یو نہ بوا جلایا

تمارے دکھی کوں یا اماماں
نہیں تمن بن یو اسس کہ سایا[1]

مرثیہ غواصی: گولکنڈہ کا مشہور شاعر ہے جس کا ذکر صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے۔ اور اس کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ مرثیے بھی کہا کرتا تھا۔ متفرق طور پر اس کے مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن کو ہم ایک علیحدہ مضمون کے ذریعہ اہل علم سے روشناس کرا چکے ہیں[2]:-

دستا نہیں کروں کیا وہ بیان کربلا کا   پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا
آسمان تے خدایا جبرئیل اوتر کو آیا   روتا او پرتے لایا فرمان کربلا کا
گھر باند کر بلا ہیں کر شکر ہر بلا میں   کیوں ہے کہ کربلا ہیں کہ سلطان کربلا کا

---

[1] یہ مرثیہ ہمارے بزرگ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کی مملوکہ بیاض سے لیا گیا ہے جو ہم کو عزیزی محمد غوث ایم اے کے ذریعہ ملی تھی۔ [2] ادبی دنیا لاہور بابت جون ۱۹۳۰ء۔

بے دکھ بڑا یو سب تے نیں کس قرابت تے — پکڑیا حسین جب تے میدان کربلا کا
دکھ سر ملک لٹے ہیں ماتم زدے ہوتے ہیں — رو رو دریا کٹے ہیں آسمان کربلا کا
چندا سک سوں سوتا اس دکھ سوں عمر کھوتا — تاریاں سوں روز روتا فرمان کربلا کا
جلتا ہے سورج تی دنیا کھڑی ہے روتی — کاں تے ہوا یو کوئی مہمان کربلا کا
منجہ سک نہیں ہے دکھ بن عمیں میں ہال جھون جھن — لاگیا ہے رات ہور دن منجہ دھیان کربلا کا
کر رو دو دکھ پیارا منجہ ساہ کرنے ہارا — سو ہے حسین پیارا شہ جان کربلا کا

غواصیا معطر عالم کوں نسب کہا ہے
گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا[1]

ماہ محرم سوز سوں آیا اہل دل منبر سیوں — روتا عالم یک یزسوں کیا کام کیتا ہائے ہائے
کیوں حیف نہیں آیا تجھے کن بد سکلایا تجھے — یو کام کیوں بہایا تجھے کیا کام کیتا ہائے ہائے
گر بادشاہی پر منم شاہاں کوں دیتا غم پو غم — مظلوم پر کرتے ستم خوف نہ کھایا ہائے ہائے
دکھ شاہزادے کوں دیا بدنامی اپنے سر لیا — آخر او کافر کیوں کیا اتنا ج تتایا ہائے ہائے
مور اک کفنی پہا گلے جوگی جنگم پہنے چلے — ازاد سوں دیتا کے تعصب تن جلایا ہائے ہائے
روتے ملک سب عرش اک سورج ستارے اپنا جھلک — مشرق تے تا مغرب تلک اندکار پار ہائے ہائے
غم سوں بکر بیت الحزن یعقوب نے کھویا نین — شیریں کے بہانے کوہ کن آپ جیگنوایا ہائے ہائے
بولے غواصی مرثیہ سن بوئے دکن کے اولیا — ہر سال کا یو مرثیہ کیا کام کینا ہائے ہائے[2]

---

[1] مملوکہ حضرت مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

[2] بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

مرثیہ لطیف: یہ بھی گولکنڈہ کا مرثیہ گو ہے۔ ظفر نامہ بھی اس کی تصنیف ہے، جس کا ذکر گزر چکا ہے:۔

اے اہل دل اشک سوں انکھیاں کوں تر کرد ۔۔۔ نکلیا ہے پھر پویا ہے محرم نظر کرد
نازل زمین پو سر تے ہوا غم حسین کا ۔۔۔ ماتم زدیاں کو دینک طرف تے خبر کرد
پھر تن عود سوز ہیں غم کی انگارہ آج ۔۔۔ جیوان کون عود ہور دلاں کوں اگر کرد
سلطان کربلا کی غریبی کون یاد کر ۔۔۔ ٹکرے جگر کوں ہور دلاں کوں خنجر کرد
ہے درد اگر تمن کوں قیامت کے دھوپ کا ۔۔۔ سایہ کون اہل بیت کے سر کا چھتر کرد
جہاں لگ خوشی دنیا کی ہے سب ناخوشی ہے ۔۔۔ ہور اس ناخوشی تے بات میری سن خدا کرد

بے دین ہو یزید کیا دین میں خلل ۔۔۔ لعنت مدام اس کے اوپر سر بسر کرد
گر شہ علی ہے بات میں ثابت قدم نہیں ۔۔۔ آیات ہور حدیث ہور سمیں اثر کرد
جکوئی تمنکوں جیودی پیدا کیا ازل ۔۔۔ دگر چلو نپت نہ آپسکوں نذر کرد
دولت اوپر ابد کی نظر ہے تو دل کوں آج ۔۔۔ گنجینۂ محبت اثنا عشر کرد

آلِ عبا کے غم سوں جنم آج صرف کر ۔۔۔ محشر کے دیس فوق خوشیاں میں اثر کرد
غواص کے زماں کے اچھہ لطیف تو ۔۔۔ اے عارفاں ہو باد تمن بو اچرہ کرد[1]

مرثیہ کاظم: کاظم بھی گولکنڈہ کا شاعر ہے۔ صرف مرثیہ گوئی اس کا پیشہ تھا۔ اس کے مرثیے خاص طور پر اس لئے قابلِ لحاظ ہیں کہ ان میں دیسیت...

[1] بیاض کتب خانہ حضرت مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

اور مرثیہ میں دونوں پائے جاتے ہیں :-

تم اپنے دلبراں کی خبر لو علی ولی — بے تاج سروراں کی خبر لو علی ولی
نیزوں اوپر سراں کی خبر لو علی ولی — ظلم و ستم گراں کی خبر لو علی ولی

آرام دل سکینہ بے تاب کوں نہیں — انکھیاں میں اوس کے راہ دیکھو خواب کوں نہیں
کہیں اٹھایو درد کے اسباب کوں نہیں — غم ہائے بے کراں کی خبر لو علی ولی

جن کو سولاتے گود میں رکھتے تھے دوش پہ — دریائے خون میں چلا ادن کے جوش کر
کیا صبر کر رہے ہیں وہ لب کوں خموش کر — اوس نازپروراں کی خبر لو علی ولی

ہے سر پہ ادن کے تیغ کو ہنسان کے روش — دل خون ہوا ہے غم سوں بدخشاں کے روش
برسے انجھو نین سنن نیاں کے روش — اس پاک جوہراں کی خبر لو علی ولی

گلزار احمدی پہ چلی صرصر خزاں — کانٹوں پہ سو گوار ہو بیٹھے ہیں بلبلاں
ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں — بیدل عنبراں کی خبر لو علی ولی

دریائے خوں میں غرق محباں ہیں شاہ کے — تا آسماں بگولے اوڑتے ہیں آہ کے
آتش لگے ہے خرمن ہستی میں ماہ کے — اوس خاک بستراں کی خبر لو علی ولی

دنیا منے ہے بس کہ محباں اوپر ستم — طاقت نہیں ہے ان کا بیاں سب لکھے قلم
فضل و کرم سیں اپنے پوسن ماجرائے غم — کاظم سے مضطراں کی خبر لو علی ولیؔ

ے یورپ میں دکھنی مخطوطات

کیوں یزیداں نے ستم بر سر سلطان کیا
اوس رخ پاک کیتن خون سے گل افشان کیا
زلف جمعیت ایمان کو پریشان کیا
دین کوں ہات سیں دے کفر بہ طغیان کیا

بستر خاک سیں اوس پیکر خونیں کو اوچا
سینہ اپنے سوں لگا کر سر زانو پہ رکھا
بند سیں بند لگا ٹوٹنے دل کا ہر جا
آہ سینہ سیں نکل چرخ پہ جولاں کیا

آہ کر کہنے لگے اپنے جگر کا احوال
کہ جدائی سوں ترے بے ہدف تیر ملال
تا قیامت تلک اس درد کا دارو ہے محال
لاجرم گریہ و زاری کو ہیں درمان کیا

لے چلے مجہ کوں طرف شام کے وہ نار بیا
عیج امید مری کر کے پریشان و تباہ
کیوں کٹے گی تری فرقت منے مجہ سوں آہ
یوں کا فر بے دین نے جو شیطان کیا

لے چلے اوں کوں طرف کوفہ کے وہاں حسین تا شام
جو کچھ اس رہ منے گذرا ہے جفا اوں پہ تمام
کیا لکھے کاظم غمناک قلم کا نہیں کام
غیر تسلیم جو کچھ ایزد رحمان کیا[1]

مرثیہ افضل افضل کا ذکر شعرائے گولکنڈہ میں آچکا ہے۔ "محی الدین نامہ" اس کی تصنیف ہے۔ یہ مرثیہ بھی گویا کہ تازہ نمونہ پیش ہے:۔

حسین کا دلبر و دلدار قاسم
حسین کا مونس او غمخوار قاسم
کشیدہ رنج و غم بسیار قاسم
جہاں سوں دیدہ خوں بار قاسم
گیا از بدعت کفار قاسم

[1] اردو شہ پارے۔

زمین اس غم سوں ہے درجوشش افضل فلک گردید نیلی پوشش افضل
ملائک سب ہوئے بے ہوش افضل کتوں زیں داستاں خاموش افضل
گیا از بد عنت کفار قاسم[1]

مرثیہ شاہی: شاہ قلی خان شاہی گولکنڈہ کا نامور مرثیہ گو ہے۔ تاناشاہ کے عہد میں موجود تھا۔ اس کے مرثیے خاص طور پر حیدرآباد میں مشہور تھے۔ جب عالمگیر نے گولکنڈہ فتح کیا تو اس کے سپاہیوں نے اس کے مرثیے زبانی یاد کرلئے۔ اور اس طرح وہ شمالی ہند میں پہنچ گئے۔ اکثر شمالی تذکرہ[2] نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

ہائے غریب یتیم نمائے عابد تری زاری ہے
باپ کا مرنا دکھ بہر ناتس پہ یو بیماری ہے
تیغ گھڑی سے دشمن سر پر داد بلا دکھ بھاری ہے
درد مصیبت عابد تم پر آج کے دن بسیاری ہے
جبرئیل کہتی بتاؤ مجھ کون نام کیا اس وادی کا
مناجب کربل یہی ہے مقتل حسین علی سے ہادی کا
کہا بہشت سے پیام لیایا عابد تیری دادی کا
کٹھن گھڑی ہو پڑتے میرے نجہ پہ سنگ ساری ہے
کلثوم زینب اور سکینہ جندی جو تجہ بندشے سات
مرید ر کانیچے اوپر کہاتے جادیں ملی لات

---

[1] یورپ میں دکنی مخطوطات۔ [2] نکات۔ میر حسن۔

کریں محفل سیحنتے ایسی گہہ نا سکیں دل کی بات
چمکی بجلی گرجے بادل منہ کے رات اندھاری ہے

ٹھنڈے تپ اور تن برہنہ مند ہوں سنجب اکڑے ہیں
ننگے پاؤں پا کہ بیڑی طوق گلے ہیں جکڑے ہیں

بے گنہ نبی کے فرزندیں تقصیروں فریادی پکڑے ہیں
بھوکے پیاسے کئی کئی دن کے مدت سے بیداری ہے

- - - - - - - - - - -

وحدت بعثت اور ولایت یہ ہیں وصی کے مرتبے سب
دوست دوست اور دشمن دشمن ہوے مومن سب

یا محمد محشر اندر شاہی جب تجہ بخشے رب
تب شفاعت کرو مجہ پر سب کے وہاں لاچاری ہے[1]

جیتے تے وہر با امام چلن کربلا منے — تب تے ہوا ہے غم کوں رہن کربلا منے
افسوس صد ہزار کہ سرو حسین کا — ہو کر دھیا ہے سرخ بدن کربلا منے
جس روز تے او سورہ چلیا جگ کوں کر وداع — اس روز تے ہے سوزدیں کربلا منے
ہو لالہ زار سر لہو سارے شہید کے — دستے ہیں لہو سوں لال چمن کربلا منے

تہ کا دیپک لگا کہ جو شاہی نے ڈھونڈ کر
پایا ہے پی بہا یہ رتن کربلا منے[2]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۸۳۔

[2] بیاض مملوکہ حضرت مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

مرثیہ مرزا: گولکنڈہ کا مشہور مرثیہ گو ہے۔ بیجاپور کے اسی تخلص والے مرزا سے اس کو تعلق نہیں، اس کی جداگانہ شخصیت ہے۔ شمال کے قدیم تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مرزا گولکنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تاناشاہ کا درباری تھا۔ جب تاناشاہ کو مقید کر لیا گیا تو اس نے فقیری اختیار کر لی، اور گوشہ نشین ہو گیا۔ زمانہ مابعد میں ایک عرصہ تک اس کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے مرثیے مختلف عنوانوں پر ہیں، اور کافی طویل ہیں۔ اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ کی بیاض کے علاوہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کے کتب خانہ کی بیاض میں اس کے مرثیے موجود ہیں۔

ان مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اکثر مشکل زمینوں میں مرثیہ لکھا کرتا تھا جو اپنے سوز و گداز کے باعث اعلیٰ درجہ کے قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ زبان کے لحاظ سے صاف نہیں ہیں مگر پُر اثر ہیں۔ مرثیوں کا نمونہ پیش ہے:۔

زخم تن اوپر جب لگے بے حساب — پڑے سرور اس رن میں جوں آفتاب
اٹھیا شور ہر شئی سوں اس وقت پر — گیا ہانک یو عرش کے تخت پر
دھواں آہ کا اس گگن لگ گیا — سورج غم سوں شعلہ ہو سب جل گیا
نہ کلثوم زینب کوں طاقت رہیا — نہ کچھ شہربانو کوں راحت رہیا
جتے اہل معصوم ہو رہتے یتیم — گھڑیا سب اوپر یو جفا ہور عظیم

کہوں کہ درد اصغر کا اور نور چشم سرور کا — شہ غازی کے جوہر کا کہ و زاری مسلماناں
عزیزاں دل ہوا پر خوں یو سن اصغر کے ماتم کوں — گئے معصوم شہادت سوں کہ و زاری مسلماناں

حسین اصغر کوں منگائے ان کے تیں تو بسلائے — بزاں لشکر کٹے لائے کرو زاری مسلماناں
جیتاں پر ہانک تب مارے کہے اے سکینہ ڈلاں سارے — پرائی ہیں نہ تم ہارے کرو زاری مسلماناں

یہی نہ تھا لباس نیلا ہے سب محباں کے تن میں غم تھیں
سیاہ پہیرا ہے پتلیوں نے ازل سوں جگ کتنے بیں ہیں غم تھیں
ہنوز زاری کا حق نہ ہوتا اہمارے گلے سوں بیشک
بساں ندیاں ہو لوہو کی بہتن اگرچہ سب کے بدن میں غم تھیں
ملا تھا بلبل سوں میں سحر گہ سنا ہوں احوال گلستاں کا
نہیں ہے کوئی بغیر نرگس ڈلے ہے گراں چمن میں غم تھیں
خطا کا احوال مشک کہتا ہے جب سول پہنچی ہے یہ خبر واں
ہوا ہے سودا سوں جل کے کالا لوہو غزال ختن میں غم تھیں
حسین کا احوال عشق کہتیں خدا نہ دکھلائے اس دنوں میں
نہیں ڈٹے ہے لوہو میں رو روز لف پڑے نے شکن غم تھیں
یہ مرثیہ بوتراب سنے قبول پاوے تو کچھ عجب نہیں
کہ روح قادر کی زار روے پڑے جو مرزا دکن میں غم تھیں

ہوئی جب تشنگی غالب امام انس و جان اوپر
خبر یوں سن کے پانی نے اپس میں پیچ کھایا ہے
شہیداں کا لوہو زمین پر پڑیا جب کربلا میانے
فلک تعظیم سوں شفق کرنے اچایا ہے

ہوا تن تے جدا جب سر شہنشاہِ دو عالم کا
گگن سر کاٹ سورج کا شفق کے لہو میں نہایا ہے

الوداع اے الوداع شاہ شہیداں الوداع
الوداع ابن علی دو جگ کے سلطاں الوداع
شاہ دو عالم ہوئے مظلوم حیراں الوداع
یو چلے دنیائے فانی سوں عزیزاں الوداع
یو شفق نیں ہے گگن پر صبح و شام اس دکھ سوں
نت بھرادیں لہو منے دامن گریباں الوداع

- - - - - - - - - - -

ہر محرم میں حسین کے درد کے تازے ہزار
دل اوپر مرزا کوں ہوتے ہیں یو داغاں الوداع[1]

بیجاپور کے شعرا کے مرثیے بھی اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

مرثیہ نوری: دکن میں اس تخلص کے دو شاعر ہوئے ہیں۔ ایک تو وہ نوری ہے جس کو گولکنڈہ سے تعلق تھا، اور تاناشاہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ دوسرا نوری یہ ہے جس کو بیجاپور سے توسل تھا، اور مرثیے کہا کرتا تھا۔ بقول نواب نصر حسین خاں خیال مرحوم اس نے دہلی کی بھی سیر کی تھی۔ اور

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ (۱۰۸) و بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

ایک زمانہ تک ابوالفضل اور فیضی کا ساتھ رہا[1]۔

مگر یہ رائے اس لیے صحیح نہیں ہوسکتی کہ جس مرثیہ کو اس کی جانب منسوب کیا گیا ہے وہ اپنی صفائی کے لحاظ سے اس زمانہ کی پیداوار نہیں بلکہ مابعد کا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کا زمانہ ابوالفضل اور فیضی کا ہوتا تو مرثیہ اس قدر صاف ہرگز نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ اس زمانہ اور اس کے مابعد کے کلام سے نوری کے کلام کا مقابلہ کیا جائے تو اس کی حقیقت پوری طرح روشن ہوجاتی ہے :-

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا ۔۔۔ دلے سب تعصب دیا ہم ہٹا
نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا ۔۔۔ دہم مرثیے سے بہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعات ۔۔۔ وہم تک احوال پورا لکھا
میں جب اسکوں لوگوں کے آگے پڑھا ۔۔۔ عجب حال عاشور خانہ میں تھا
جن وانس کرتے تھے سب واہ وا ۔۔۔ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زبان اپنی میں کس نے ایسا لکھا ۔۔۔ کبھی اس سے پہلے سنانے پڑھا

اماماں سے اس کا ملے گا صلہ
کہ ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا[2]

مرثیہ ہاشمی : نوری کے بعد بیجاپور کے مرثیہ نویسوں میں ہاشمی نے نام پیدا کیا جس کا ذکر صفحات ماقبل میں ہوچکا ہے اس کے مرثیہ کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

---

[1] داستان اردو۔ [2] داستان اردو از خیال۔

دلبند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں	فرزند مرتضیٰ کا تابوت لے چلے ہیں
سلطان دو جہاں کا سردار اولیا کا	مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں
حضرت حسین حسن کا شاہِ زمیں زمن کا	حضرت نبی منگا کہ تابوت لے چلے ہیں

حضرت کے تھے نواسے حیدر کے تھے خلاصے	ہوئے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں
اے ہاشمی شہاں کا سلطان دو جہاں کا	مقبول اس جواں کا تابوت لے چلے ہیں[1]

مرثیہ مرزا: بیجاپور کا مشہور مرثیہ گو ہے جو علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھا۔ اس نے سوائے مرثیے کے کسی اور صنعت میں طبع آزمائی نہیں کی۔ بادشاہ کا تقرب حاصل تھا۔ مگر نہ کبھی قصیدہ لکھا اور نہ مدح کی۔ بادشاہ نے جب خود خواہش کی تو ایک مرثیہ میں بجائے اپنے تخلص کے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔

مرزا اپنی مرثیہ گوئی کو ایک مذہبی فرض تصور کرتا تھا۔ اسی انہماک کا نتیجہ تھا کہ اس کو عالم رویا میں بھی مرثیہ نویسی کا کشف و انکشاف ہوتا تھا۔ مرزا کی شہادت بھی بہ روز عاشورہ ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مرثیہ لکھ رہا تھا کہ کسی نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ افسوس کہ انتقال کا سنہ معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر جہاں تک قیاس ہے سنہ ۱۰۸۲ھ سے پیشتر اس کا انتقال ہو چکا تھا۔

بیجاپور میں شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں مدفون ہے۔ مؤلف بساطین السلاطین نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ مرزا کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

شریعت اساسی پہ اپنا ستم	حقیقت شناسی پہ اپنا ستم

---

[1] از بیاض اڈنبرا یونیورسٹی۔

بنی کے نواسے پہ اپتا ستم　　سب امت کے آسی پہ اپتا ستم

دیا زہر پانی میں ملا ظالماں　　سولاگا کلیجے کوں جا کر ندہاں

جگر گوشہ حسن کا پڑا بے گماں　　مدینہ کے باسی پہ اپتا ستم

حسین ابن حیدر خدا کا ولی　　جگر گوشہ فاطمہ اور علی

بروج دہ دوہ کا بد جبلی　　شہ کر گھراسی پہ اپتا ستم

- - - - - - - - - - -

مبارک بدن سوں ہوا سر جدا　　اسی غم سوں کہتا ہے مرزا اسدا

کیا کیا وہ بدبخت نے اسے خدا　　شہنشہ پیاسی پہ اپتا ستم[۱]

قطب شاہی اور عادل شاہی و نظام شاہی اردو پر تبصرہ :

صفحات ماقبل میں بیان ہو چکا کہ ۸۹۵ھ میں احمد نگر پر نظام شاہی اور ۹۱۶ھ میں گولکنڈہ پر قطب شاہی اور ۸۹۵ھ میں بیجاپور پر عادل شاہی پرچم لہرانے لگا۔ اور تقریباً دو سو سال کے بعد یہ علم سرنگوں ہو گئے۔ اس طرح ۱۰۴۳ھ، ۱۰۹۷ھ اور ۱۰۹۸ھ میں احمد نگر و کھرکی بیجاپور اور گولکنڈہ پر مغلیہ جھنڈا بلند ہو گیا۔

اس عرصہ میں ان سلطنتوں نے علم و ہنر کی ترویج اور تمدن و تہذیب کے رواج دینے میں جو کچھ سعی کی تھی وہ ہرگز فراموش نہیں ہو سکتی جب ہم ان کے مختصر رقبہ مملکت کو پیش نظر رکھ کر ان کی شان و شوکت اور دبدبہ و طمطراق کو دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی عظیم الشان دولت و ثروت اور بیش قرار لشکر

۱؎ بیاض اڈنبرا یونیورسٹی۔

کس طرح فراہم ہوتا تھا۔ جس طرح ان کی دولت مندی اور ان کے زر و جواہر کی فراوانی بادی النظر میں افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی علم دوستی اور اہل کمال کی قدردانی بھی حیرت انگیز ہے۔

احمد نگر، گولکنڈہ اور بیجاپور علم و ہنر کے مرکز تمدن اور تہذیب کے گہوارے تھے۔ دور دور کے اہلِ علم و فن یہاں کی قدردانی کا شہرہ سن کر آتے اور اپنی محنت و مشقت کا کافی صلہ پا کر نہال ہو جاتے تھے۔ یہاں کے چشمہ ہائے فیض کی آبیاری سے چمنستانِ علم و فضل سرسبز اور شاداب تھے۔ مے خانہ علم و فن معمور، شعر و سخن کی مجلسیں آباد تھیں۔ گھر گھر مشاعروں کے جمگھٹے ہوتے تھے۔ غرضیکہ بیجاپور اور گولکنڈہ کو اگر زمانہ سلف میں قرطبہ اور بغداد سے مماثل سمجھا جاتا تھا تو اب لنڈن کو اس کے مقابل لا سکتے ہیں۔

عربی و فارسی کے قطع نظر ہم کو دکھنی یہ الفاظ دیگر اردو کی ترقی پر ایک تنقیدی نظر ڈالنی ہے۔

یہ امر ہم کو معلوم ہے کہ اردو کی ابتدا دکن میں ان سلطنتوں کے قیام کے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اور وہ اگرچہ عام بول چال کے دور سے گزر چکی تھی، اور پھر نثر و نظم کے مدارج بھی طے ہو چکے تھے۔ مگر پھر بھی نثر فقہ و تصوف کی ایک دو کتابوں تک محدود تھی اور نظم کے بھی ایک آدھ نمونہ کا پتہ چلتا ہے۔ ان سلطنتوں نے اردو کی سرپرستی فرمائی اور اس کو ترقی دے کر بارور اور مثمر کر دیا۔ اس کو اپنی سرکاری زبان قرار دے کر عزت دی۔ ان خاندانوں کے خود کئی ایک تاجدار اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام آج تک موجود ہے۔ اور اپنے اپنے مصنفوں کی اعلیٰ قابلیت کا زندہ گواہ

ہے۔ سلطان محمد قلی اور عبداللہ قطب شاہ کے کلیات اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اردو کے جواہر پارے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کا نورس اور علی عادل شاہ کی کلیات اور مثنوی بدیع الجمال درحقیقت کلام الملوک ملوک الکلام کے مصداق ہیں۔

ان حکمرانوں کے دور کی مسلسل اور طویل نظموں کے نمونے موجود ہیں۔ جو صرف کسی اور زبان کے ترجموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ اپنی اور طبع زاد بھی ہیں۔ صنف شاعری کی متعدد اقسام مثلاً مثنوی، قصیدہ، غزل، مخمس، رباعی اور قطعہ میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اور اپنی یادگار میں شعر و سخن کے بہتر سے بہتر نمونے چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں رزم و بزم۔ واقعہ نگاری، مرقعہ نگاری، عشق و محبت، تصوف و فلسفہ سب کچھ موجود ہے۔ اسلوب بیان کی جدت، تخیل کی بلند پروازی، خیالات کی ندرت اور سادگی و صفائی، تسلسل اور پاکیزگی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

گولکنڈہ میں وجہی کی قطب مشتری۔ غواصی کی سیف الملوک، ابن نشاطی کی پھول بن۔ جنیدی کی ماہ پیکر، طبعی کی بہرام و گل اندام۔ غلام علی کی پدماوت اور لطیف کا ظفر نامہ شہ کار ہیں۔ تو بیجاپور میں صنعتی کا قصہ تمیم انصاری۔ رستمی کا خاور نامہ، نصرتی کی گلشن عشق اور علی نامہ، ہاشمی کی یوسف زلیخا، احمد نگر کے شوقی کا فتح نامہ نظام شاہ اپنی خوبیوں سے ادب اردو کے جگمگاتے نگین ہیں۔ اس زمانہ کے قصیدے اپنے شوکت لفظی اور تخیل کی پرواز۔ واقعہ نگاری وغیرہ کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔

ان سلطنتوں میں مرثیہ گوئی کا بھی آغاز ہوا۔ اس وقت کے مرثیے اپنے

سوز و گداز سے خاص اثر پیدا کرتے تھے۔ اس زمانہ کے مرثیوں سے مجلس عزا میں حقیقی درد و بُکا، اشک باری ہوا کرتی تھی۔ ان کا جوہر مرثیہ پن تھا۔ اشرف، نوآتی، کاظم، مرزا، شاہی، ہاشمی، مرزا (بیجاپوری) کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس امر کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ ان سلطنتوں کے قیام کے پہلے اردو نثر کی ایک دو کتابیں مرتب ہو چکی تھیں جو مذہب، تصوف یا فقہ پر مشتمل تھیں۔ مگر اس دور میں ادبیات کے جواہر بھی مرتب ہونے لگے۔ وجہی کی سب رس اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس دور کا بہترین شہ کار ہے۔ اس کے علاوہ امین الدین اعلیٰ کے رسائل اور شمائل الاتقیاء وغیرہ کو بھی مثالاً بیان کیا جا سکتا ہے۔

غرض زبانِ اردو اور ادب کی جو خدمت ان سلطنتوں نے انجام دی ہے وہ تاریخ اردو میں آبِ زر سے لکھی جائے گی۔ اور جب تک زبان اردو کے جاننے والے اس پردۂ عالم پر موجود رہیں گے۔ ان سلطنتوں کے احسان کے منت پذیر رہیں گے۔

تیسرا دور

سنہ ۱۱۰۱ ہجری تا سنہ ۱۱۳۶ ہجری

مُغلیہ اُردُو

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مغلوں نے اول کہر کی سنہ ۱۰۴۳ ہجری میں اور سنہ ۱۰۹۷ ہجری میں بیجاپور اور سنہ ۱۰۹۸ ہجری میں گولکنڈہ فتح کر کے سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لئے۔ اس طرح نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اب عالمگیر کی جانب سے یہاں صوبہ دار مقرر ہونے لگے۔ احمد نگر و گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعراء اردو کے ساتھ بے حد مراعات کی جاتی تھیں۔ انہیں ان کی تصنیفات کا معقول صلہ دیا جاتا تھا۔ نہ صرف سلاطین بلکہ امرائے دکن بھی اردو کی سرپرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ لیکن مغلیہ دور میں اس قسم کی قدر دانیوں کے کم ہو جانے کے باوجود قابل افراد بلا کسی صلہ یا قدر دانی کی امید کے اردو میں شعر و سخن کی داد دینے لگے تھے۔ علاوہ ازیں عالمگیر نے بھی فتح بیجاپور کے بعد دکھنی شاعری کی قدر دانی کی اور نصرتی کو ملک الشعراء کے خطاب سے مشرف کیا تھا۔ چنانچہ فتوت نے اپنے تذکرہ ریاض حسنی میں نصرتی کے حال میں ذکر کیا ہے:۔

"وقتیکہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی انار اللہ برہانہ ولایت دکن را

در تسخیر ورآورد حکم بنفاذ پیوست کہ سخن سنجان این ملک را در نظر
بگزرانند بموجب حکم گزرانیدند. کلام نصرتی را برہمہ افضل فرمودہ
بخطاب ملک الشعرائے ہند سرفرازی یافت :-

ص (۲۰۸)، از مخطوطہ دفتر دیوانی ومال وغیرہ

اس بیان سے اس امر کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ عالمگیر نے بھی اردو کی
سرپرستی فرمائی ہے ۔

اورنگ آباد کو اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۰۶۲ھ میں اپنا صدر مقام قرار دیا
تھا، اسی وقت سے اس کی رونق زیادہ ہونے لگی تھی ۔ پہلے قطب شاہی پایۂ تخت
گولکنڈہ اور عادل شاہی دارالحکومت بیجاپور شاعری کے مرکز تھے تو اب مغلیہ دور
میں اورنگ آباد نے اس کی جگہ لے لی ۔ اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنت مغلیہ
کا مستقر ہونے کے لحاظ سے دہلی کے امرا، رؤسا، علماء اور شعراء کا مرکز بن گیا۔
بلکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا بھی ملجا ٹھیر گیا۔ شعر و شاعری کا چرچا بڑھا۔ اس
طرح اردو شاعری کے بھی قدم یہاں اچھی طرح جم گئے ۔ اور شعراء نے اپنی یادگار
میں بہترین کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ ۱۰۹۶ھ میں تقریباً پورا دکن قلمرو مغلیہ میں شامل ہوا تھا
اور ۱۱۳۶ھ میں حضرت آصف جاہ اول نے سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس (۴۷)
سالہ مدت میں اردو کے کئی ایک شعراء مشہور ہوئے جن کی مثنویاں ۔ دیوان اور
مرثیے آج تک موجود ہیں ۔ اس زمانہ میں اورنگ آباد کے علاوہ برہان پور بھی
بھی شعرا کا مرکز بن گیا تھا. یہاں کے بیسیوں شعرا کا کلام محفوظ ہے ۔

اس دور کے جن شعرائسے ہم واقف ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

نمبر شمار	نام	تصنیف	سن تصنیف
۱	ولی	کلیات	قبل سنہ ۱۱۱۵ھ
۲	ضعیفی	عشق صادق	سنہ ۱۱۰۰ھ
		ہدایت نامہ	
۳	امین	یوسف زلیخا	سنہ ۱۱۰۹ھ
۴	ذوقی	غوث نامہ	
		منصور نامہ وغیرہ	
۵	بلبل	چندر بدن	
۶	راجی	نامہ علی	سنہ ۱۱۱۰ھ
۷	دریا	وفات نامہ	سنہ ۱۱۱۱ھ
۸	عبدالمحمد زین	شمائل النبی	سنہ ۱۱۱۱ھ
۹	قاضی محمود بحری	من لگن	سنہ ۱۱۱۱ھ
۱۰	مجرمی	گلشن حسن و دل	سنہ ۱۱۱۴ھ
۱۱	وجدی	پنچھی باچھیا	سنہ ۱۱۳۱ھ
		تحفہ عاشقان	سنہ ۱۱۵۲ھ
		باغِ جانفزا	سنہ ۱۱۴۵ھ
۱۲	محبوب عالم	دردنامہ	؟
۱۳	فتح		سنہ ۱۱۳۰ھ

۱۴	عاشق	اشارت الغافلین	قبل ۱۱۴۲ھ
۱۵	اشرف	جنگ نامہ حیدر	۱۱۲۵ھ
۱۶	ولی ویلوری	روضۃ الشہداء	۱۱۳۷ھ
		روضۃ الانور	۱۱۵۹ھ
		روضۃ العقبیٰ	۱۱۶۲ھ
		دعائے فاطمہ	
		رتن و پدم	
۱۷	عشرتی	دیپک پتنگ	
		چیت لگن وغیرہ	
۱۸	بیچارہ	نظم	
۱۹	طالب	نظم	
۲۰	فراقی	مراۃ الحشر	
۲۱	یتیم احمد	مرثیہ	
۲۲	ندیم	مرثیہ	

اب ہم تفصیل کے ساتھ اس عہد کے شعراء کو پیش کرتے ہیں۔

ولی دکھنی: سب سے پہلے ہم اس دور کے سب سے بڑے شاعر کا ذکر کرتے ہیں جس کو ایک زمانہ تک اردو شاعری کا بابا آدم شمار کیا جاتا تھا۔

ولی کا صحیح نام ولی محمد[1] تھا۔ دکن کے رہنے والے تھے۔ پیدائش کا صحیح سن معلوم نہیں ہے تحصیل علم گجرات میں کیا۔ اور ایک مدت تک وہاں اقامت اختیار کی۔ نہ صرف علوم ظاہری کا اکتساب کیا بلکہ حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی سے فیض باطنی بھی پایا۔

پہلی مرتبہ عالمگیر کے زمانہ میں دہلی گئے اور اپنی شاعری کے باعث مشہور ہوئے۔ وہاں کے شعرا نے ان کی پیروی کی[2]۔ اور فارسی کو خیرباد کہہ کر اردو میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

دوسری مرتبہ پھر محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی کا سفر کیا۔ شاہ ابوالمعالی بھی ساتھ رہے۔ دیوان بھی ساتھ تھا۔

ولی کے انتقال کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ۱۱۵۵ھ میں انتقال ہوا اور بعض ۱۱۴۱ھ صحیح خیال کرتے ہیں۔ مگر اب مولانا عبدالحق صاحب کی تحقیقات سے ۱۱۱۹ھ صحیح قرار دیا گیا ہے[3]۔

اگرچہ یہ امر صحیح نہیں ہے کہ ولی اردو کا پہلا شاعر تھا مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ شمالی ہند میں ولی کے بعد ہی اردو شاعری کا عام طور سے آغاز ہوا اور جو اب تک جو شاعری دکن میں مروج تھی اس کی بھی اصلاح ہوئی۔ مثنوی کے بجائے غزلوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ اس خاندان سے ولی کے سر مجددی کا سہرا ضرور باندھا جا سکتا ہے۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ [2] دہلی میں اردو شاعری مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین۔

[3] رسالہ اردو۔

ولی کی قابلیت کے متعلق بعض اصحاب اعتراض کرتے ہیں، اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی عربی اور فارسی معلومات بہت ہی محدود تھیں، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ولی کی حیثیت مجددکی سی ہے، اس نے عربی اور فارسی کے جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان کو گویا اردو میں اسی حیثیت میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ ولی ایک فطرتی شاعر تھا۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اپنی شاعری کو عربی اور فارسی لغویات کی کتاب یا لغت بنادے۔

ولی کا دیوان مشہور ہے اور متعدد مرتبہ شائع ہو چکا ہے یہاں تک کہ یورپ میں بھی ایک مرتبہ طبع ہوا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی جانب سے ولی کا کلیات نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ مگر اب بھی قلمی دیوانوں میں ایسا کلام موجود ہے جو اس کلیات میں نہیں ہے۔

ولی کے زمانہ میں تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ اور خود ولی نے صوفیانہ مسلک اختیار کر لیا تھا اس لئے اس کا کلام سراپا تصوف ہے۔ اس کے کلام میں سلاست اور متانت پائی جاتی ہے۔ اس کا دیوان اس عہد کی بولتی تصویر ہے۔ لطف زبان، سادگی، صفائی اس کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

بعض اصحاب "دہ مجلس" کو ولی کی تصنیف قرار دیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے اس کے متعلق ہم نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔[1]

ذیل میں ولی کی مسلسل اور غیر مسلسل نظموں کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

---

[1] صفحہ ۲۹۲۔

مثنوی

عجب شہر اِس میں ہے پر نور ایک شہر — بلا شک وہ ہے جگ میں مقصود دہر
رہے مشہور اس کا نام سورت — کہ جانے جس کے دیکھنے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور — اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب — ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب
سمرج سن آب اس کی جگ میں کا نپا — سمندر موجزن رگ رگ میں کا نپا
لگانے اس کے ایک دریائے تپتی — کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے پتی
کیا سب تن خجالت سوں یہ جیوں عرق — ہوا دریا الپس کے عرق میں غرق
شہر سیتی ہے وہ ہم باز د ہمیشہ — دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ آبِ خضر کی ہے اس میں تاثیر — ہوا نپتی ہے اس کی یاد کشمیر
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم — صبح ہور شام جب کرتا ہے عالم
عجب قلعہ ہے وہاں اک باقرینہ — انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ
رہے اس حاشئے پر جائے آرام — طلسمی باغ وہاں ہوتا ہے ہر شام

قصیدہ

ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ
ہوا ہے غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

جہاں کے گل بدناں جلوہ گر ہوتے ہیں جہاں
اڑا ہے ان کی تجلی سوں عاشقاں کا رنگ

سیہ عاشقاں کے جلانے کوں مستعد ہیں مدام
گویا ہے اس کے اپر نور شمع و حال پتنگ
سدا اُنجے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل
سدا اُئے خونِ جگہ نہیں دسا مجھے گل رنگ
دسا نہیں جو گلِ بے وفا ہیں رنگ وفا
تو یو بچہ شور ہیں ہیں بلبلانِ خوش آہنگ
فلک کے دیکھ کے خشکی جگت ہوا بے دم
رہا نہیں ہے خواصے کے دل ہیں آب امنگ

جگت کے دیکھ کے حالات لاعلاجی سوں
ہوئے ہیں گوشہ نشیں اہلِ دانشِ فرہنگ
ہو دستگیر مجھے یا علی ولی اللہ
کہ اس فلک نے کیا ہے کمال مجکوں تنگ

غزل

اہلِ گلشن پر تیرے قد نے جب امداد کیا
اولاً سرکوں غلامی سنتے آزاد کیا
اس کی تعظیم ہوئی اہلِ چمن پر لازم
بلبلِ باغ نے جب مصحفِ گل یاد کیا
روز ایجاد تیری چشم سوں اے نورِ نظر
حسن کے فخر دیدہ دیوان ازل صاد کیا

سب سوں ممتاز ہوا سلسلۂ عشق میں
دل دیوانے کوں جب عشق نے ارشاد کیا

سینۂ بلبل و قمری کوں کیا محشر میں درد
جب کہ اس سرو نے سیرِ گل و شمشاد کیا

آج تجھ یاد آئے دلبر شیریں حرکات
آہ کوں دل کے اوپر تیشۂ فرہاد کیا

اے ولی جب سوں کیا عشق تحصیل جنوں
روح مجنوں نے ایس کا مجھے استاد کیا

صاف دل کو اگر مدام رکھو
جام جمشید کا مقام رکھو

گر تمیں تاب انتقام نہیں
بے سمجھ مت کسی سے کام رکھو

خیال کی مت کرو طرف داری
خاطرِ زلف مشک فام رکھو

ناز سے سرکشی کوں دیکھوں گا
آج میرا نیاز نام رکھو

ماہی دل شکار کرنے کوں
کھول زلفاں سجن نے جال کیا

غیر دشنام نہیں سنیا ہے ولی
جب سجن پاس عرض حال کیا

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا
اسکوں پہاڑ ہووے کوہ طور کا تماشا

اے رشک باغ جنت تجھ پر نظر کئے سوں
رضواں ہووے دوزخ پھر حور کا تماشا

روز سیاہ اس کے موموسوں جلوہ گر ہے
تجھ زلف میں جو دیکھا دیجور کا تماشا

ہے جس کی یادگاری وہ جلوہ گر ہے ہردم — چینی میں دیکھ جا کر فغفور کا تماشا

وہ سربلند عالم از بس ہے تجھ نظر میں — جیوں آسماں عیاں ہے تجھ دور کا تماشا

تجھ عشق میں ولی کے انجھواں امنڈ چلے ہیں — اے بحر حسن آ دیکھ اس پور کا تماشا

رباعی

مہربانی و لطفِ دلبر یا — سا بقا تھا سو اب نہیں دستا

یا مگر خواب وہ زمانہ تھا — کہ مجھے خواب میں نہیں دستا

مرثیے کا نمونہ :-

غوغا ہوا جہاں میں شہ کے وصال کا — سینے منے پڑا ہے پھالا اس ملال کا

محتاج ہیں جہاں کے محباں تمام مل — دیدار چاہتے ہیں مبارک جمال کا

- - - - - - - - -

جو کوئی کرے زباں سوں اُنو کا ورد مدام — ہے یہ ولی خلاصہ جواب و سوال کا

اے ہادیٔ سینسار تو کیوں جا بسایا کربلا — اے واقفِ اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا

اے نورِ چشمِ مصطفیٰ فرزند نوشاہ مرتضیٰ — اے دلبرِ خیر النساء تو کیوں جا بسایا کربلا

- - - - - - - - -

تو دوستاں کا جان ہے نرا ذکر ایمان ہے

تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا بسایا کربلا[1]

---

[1] ولی کی مثنوی اور قصیدہ "کلیات ولی" میں شامل ہے۔ غزلیں مولوی خلیل اللہ صاحب کے دیوان سے لی گئی ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ اور رباعی "یورپ میں دکنی مخطوطات" سے لی گئی ہے۔

ضعیفی: ضعیفی[1] بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ شیخ داؤد ان کا نام تھا قطب شاہی دور کے آخر میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ زوال سلطنت قطب شاہی کے بعد ان کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔

ضعیفی اپنے وقت کا بہت بڑا عالم اور صوفی تھا۔ اس کی قابلیت کی بین دلیل خود اس کی تصانیف ہیں۔ تین مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی ہدایت نامہ۔ عشق صادق اور نصیحت بدن[2]۔

عشق صادق میں ایک فرضی قصہ لکھا گیا ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۱۰۰ھ یا اس کے قریب تصنیف ہوئی ہے۔

اس مثنوی میں ہندی الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ہیں خصوصاً عورتوں کی گفتگو جہاں آئی ہے وہاں اسی سے کام لیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی زبان مردوں سے جدا تھی۔ مثنوی سے مصنف کی اعلیٰ قابلیت کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ ان پر بادجود جھوٹ ہونے کے اصلیت کا شبہ ہوتا ہے[3]۔

ہدایت نامہ سنہ ۱۱۰۱ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اس میں فقہ حنفی کے مذہبی عقائد اور قوانین معجزات وغیرہ بیان کئے ہیں۔ کتاب کو پچیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۳۳۱۔

[2] ہدایت نامہ فقہ ہندی سے بھی موسوم ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں کئی نسخے ہیں۔
نصیحت بدن بھی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

[3] انڈیا آفس میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

(۱) ہدایت نامہ :-

بہی ایک روز پیغمبر راہ پر ۔۔۔ کئے تھے جو اطراف کتن گذر
سو دیکھے یہودی کوں آتا ہے ۔۔۔ لگہ ایک ہرن کوں لاتا ہے
یکایک ہرن نے زبان کھول کر ۔۔۔ نبی سات دہ زمزدا بول کر
کہی یوں کہ اے خاص خیر البشر ۔۔۔ میرا بند چھوڑ آنکہ اے بول کر
تمیں لک میرے واسطے ہو زبان ۔۔۔ زبان ہو منجے تک دلائے امان
کہ جاؤں اپنے بچوں پاس ہیں ۔۔۔ کہ وں دور دل کا سو دسواس ہیں

اورنگ زیب کی مدح اس طرح کرتا ہے :-

یہ دور جہان دار اورنگ زیب ۔۔۔ کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب
شہنشاہ عادل رہے دور امور ۔۔۔ کہ بدعت ضلالت ہوا جس نتے دور
دیا حق تعالےٰ نے یوں جس کو جس ۔۔۔ جو دشمن ہوا اس انگے خار و خس
دھریا سر پہ چھپن شہی کا دو تاج ۔۔۔ دلی ہور دکھن کا ہوا ایک راج
عجب فتح و نصرت ہے اس کے سنگات ۔۔۔ جو کوئی نہیں کیا اس سوں دعوٰی کی بات
کہ شاہاں بھی اول ہوئے ہیں تو کیا ۔۔۔ نہ کوئی زہد و تقوٰی میں ایسا دسیا
لیسے اس منے یہی دلی کی صفات ۔۔۔ کہ ہو آئے جو موں سوں کا آتے سو بات
بڑا دین اسلام کا کارساز ۔۔۔ الٰہی توں کر عمر اس کی دراز

غرض اس زمانے منے شاہ کے ۔۔۔ مسائل کیا دین کی راہ کے
جو تاریخ ہجرت ہزار ایک سو بیچ ۔۔۔ ہدایت ہندی ہوا ہو تو بیچ
اگہارا سو اس میں بھرے تھے تمام ۔۔۔ اوسی بیچ تمت کا دیکھا تمام

صدی بارہ دین کا آگیا تھا برس — اسی بیچ یاجا یو دکھنی حبس

مسائل یہ فقیہاں کے استاد سوں — ٹکا سے کیا پڑ کر استاد سوں
کہ اگر زبان ہندکی اس طرف — لگے خوش جو پڑتے ہیں دکھنی حرف
اس واسطے یہ بہ بو ہند کہن — جو لیایا دکھن سال کے سناد سوں
بدایات ہندی لگر اس کا ناؤں — رکھیا ہور لیایا ہوں ہندیاں کے ٹھاون

---

(۲) عشق صادق کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

نبی کی محبت کا سوگند تجھے — دیکھیا بہار برتے تمنے موں منجے
تجھے سوگند نبی کی سو دیدار کا — دیکھیا دیدتیرا منج یکبار کا
اگر توں نبی کا جو دھرتی ہے چار — تو دکھلا تیرے موں کوں برقہ تے نار
دکھائی تو سمجھوں گا تج کون کھڑی — محبت سچا توں نبی پر دھری

جو یوں لعل شعلہ ہوا وہ تنور — بڑاں نارکوں دین بلایا حضور
بولا او تنور دیکھلا کہ اس — لکھیا جا بہتر اس تنور کے توں گھوس
تجھے سیتوں نبی کی سو ہے پیار کا — تجھے سیتوں نبی کی سو دیدار کا
تو تو ہوئی تیرا محبت سچا — دگر نیں تو تیرا عقیدہ کچا

دم اس نار کا جب گیا چھوڑ تن — سو دے غسل کر اس کی تن کوں کفن
سو کر دیں نماز اس جنازے اپہ — لجا کر اتارے قبر کے بہتہ
بڑے مرتبہ سات اس نار کون — دفن کو نبی آئے پیار سوں[1]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۳۲۔

امین: امین[1] تخلص کے بھی دکن میں مختلف اشخاص مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے ان شاعروں کا ذکر ہو چکا ہے جن کا تخلص امین تھا۔

اس امین کو عہد مغلیہ سے تعلق ہے۔ شیخ محمد امین ان کا نام تھا۔ گجرات کے باشندہ تھے مگر اورنگ آباد میں عرصہ تک قیام رہا۔ جس کے باعث دکھنی شعرا میں ان کا ذکر بھی شامل کر لیا گیا ہے

امین مذہبی آدمی تھے۔ قادریہ طریقہ میں بیعت کی تھی۔ ان کی ایک مثنوی یوسف زلیخا ہے جو ۱۱۰۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ مثنوی کسی فارسی یوسف زلیخا کا ترجمہ ہے۔ مگر مصنف کی قابلیت کے باعث یہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ ان کا یہ ترجمہ فارسی اثر سے بالکل آزاد ہے۔ زبان صاف ہے مگر جہاں تصوف کے مسائل بیان کئے ہیں وہاں اس کا اسلوب پیچیدہ ہو گیا ہے۔

اس مثنوی کا ایک نسخہ پیرس کے کتب خانہ[2] میں بھی موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

اول تعریف سن خالق کی اے یار ۔۔۔ کہ دونوں جگ کا ہے کرن ہار
وہی نابود سوں سب کو کرے بود ۔۔۔ کرے سب کوں حیاتیں دے کے خوشنود

دیکھی صورت عزیز مصر کی جب ۔۔۔ پڑی دھرتی اوپر بجھیر اسے کر تب
کہ وادیلا کہ وادیلا کر دائی ۔۔۔ بخت رب نے میرے اوندھی لکھائی
وہ تو کچھ اور تھا اینو ہے کچھ اور ۔۔۔ اینو دشمن رہے اس دوست کے ہوڑ

[1] طبقات الشعرا میں بھی اس کا ذکر ہے۔ [2] یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۳۳۸۔

ہمیں دے کہ ملے گا مجھ سین درس — اے ہیہات اور افسوس افسوس
ہیں کیونکر ملے گا مجھ سوں وے شاہ — ہزار افسوس اور صد آہ صد آہ
گیا وہ گنج اور یہ رہ گیا سانپ — صورت دیکھ جراہی مجھ موج اور کانپ

زلیخا نے سو تب پردا اٹھا کر — صورت یوسف کی نظروں بیچ لیا کر
پہچاناں ہے وہی دل یار جانی — کہ جس کارن ہوں پھرتی تھی دیوانی
یوسف کو دیکھ کر روتی پکاری — پڑی ہو بے خبر کر کے زاری
سواری کوں شتابی لیکہ بھاگے — زلیخا کو سے آئے گھر کے آگے
انا ایسے گھر میں تب ہوئی خبردار — پوچھی تب دائی نے یوں اس کو گفتار
تری پھر عقل اور سدھ کاں گئی تھی — ایسی توں بے خبر کیوں ہو رہی تھی
کہا تب وہ سے غلام ہے یار میرا — اسی اوپر ہے دل کا پیار میرا[۱]

ذوقی : سید شاہ حسین ذوقی بھی ایک مذہبی آدمی تھے۔ ان کے مرشد شاہ خان محمد[۱] نے ان کو بحر العرفان کا خطاب دیا تھا۔ شعر و شاعری میں ان کو کافی دستگاہ حاصل تھی۔ اپنی شاعری پر بڑا فخر کرتے ہیں خود کو نصرتی سے بلند پایہ اور اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے حسان ہند تصور کرتے ہیں۔

انہوں نے متعدد مثنویاں تصنیف کی ہیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔ وصال العاشقین۔ خوش نامہ۔ وفات نامہ۔ منصور نامہ۔ ماں باپ نامہ وغیرہ۔

---

[۱] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۳۲۸۔ — [۲] رسالہ اردو۔

ان مثنویوں کے علاوہ غزلیں اور مرثیے بھی ذوقی کی یادگار ہیں۔ غوث نامہ یورپ[1] میں موجود ہے۔ بعض مثنویاں انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں ہیں[2] ذوقی کے کلام سے پایا جاتا ہے وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور ان کو اپنے فن میں استادانہ مہارت حاصل تھی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

غوث نامہ

بقا ابن بطو کہے ایک روز — تھے منبر اوپر او سرور نیک روز
تجلی کیا ان کے دل پر خدا — ہوئے اوس تجلی میں خود سوں جدا
کری اوں کوں بیخود تجلی رب — لگی ہوویں پوکرنے نہ لا تاب تب
رسول خدا ہات پکڑ ان کے تئیں — رکھے ثابت اوس وقت منبر اوپریں
تجلی مناسب بنیاں کی تھی اد — نہ رہی اوس سبد نشے میں طاقت کی بو
میسر نہیں کسوں کوں یہ حال — اگرچہ مراتب میں پاوے کمال
بناں حق جلالی تجلی کیا — چڑی کے نمن شاہ لاغر ہوا
گھٹا جسم شہ کا ہوئے ناتواں — جمالی تجلی کیا بعد ازاں
بڑیا شیخ کا جسم اتنے یتا — کہ ہوئے ہول دیکھیں من اوسکی سدا

مرثیے

اے شمع بزم مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے تم بن جہاں جلوا دکھاتے کیوں نہیں

---

[1] یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۳۴۲ ۔ [2] رسالہ اردو

وہ جاہل دوزخ وطن آئے ہیں بادل کے نمن
جوں برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں
وہ شمع بزم مصطفےٰ بادِ اجل سوں گل ہوا
سب سوز دل سوں تن سدا اباراں گلاتے کیوں نہیں
چھوڑو سگل دنیا کے کام دس رین تلک اے خاص و عام
ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلاتے کیوں نہیں
سنتے ہو تم اے مومناں شہ کی شہادت کا بیان
سب خاک و خون کے درمیان تن کو رلاتے کیوں نہیں
ذوقی تمارا ہے غلام فضل و کرم سے یا امام
اپنی زیارت کو مدام اس کو بلاتے کیوں نہیں

شاہ ماتم تخت گردوں پر دسا ماہ محن	فوج غم نے ملک دل ویراں کئے ہیں جوں کدھن
تب ہزاروں درد و غم سوں شہر بانو نے کہا	مجہ کوں کس کوں سونپ کر جاتے ہو اے سرور تمن
تم بناں اے جان جاناں کیوں کروں میں زندگی	تم بناں کس کوں کہوں میں یہ اپس کا دکھ کٹھن
تم بناں ہر روز مجہ مہینے منے یک سال ہے	تم بناں ہر رات غم سوں مجہ اوپر ہے یک قرن
تم کوں روتے سوں نہیں کرتا منع اے غم گسار	مو پریشاں مت کرو دامن پارہ پارہ پیرہن

گرچہ اے ذوقی ترے بے حد گناہاں ہیں ولے
شکر اللہ ہیں شفیع روزِ محشر پنج تن[1]

---

[1] یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۳۲۳ و ۳۷۶

بحری:- قاضی محمود نام اور بحری تخلص تھا۔ ان کے باپ کا نام بحرالدین تھا، یہ گوگی کے قاضی تھے۔ جو بیجاپور کے علاقہ میں تھا۔ ۱۰۹۵ھ میں بیجاپور آئے اور اس کے فتح ہو جانے پر حیدرآباد کا رخ کیا مگر یہاں بھی پھولنا پھلنا نصیب نہ ہوا اور نگ آباد چلے آئے[1]

من لگن نام ان کی مشہور مثنوی[2] ہے۔ ۱۱۱۱ھ اس کا سنہ تصنیف ہے۔ اس میں عالمگیر کی مدح بھی ہے اور خود کو اورنگ زیب جیسے عادل بادشاہ کے حکومت میں ہونے پر مبارک باد دی ہے۔ اس کے سنہ انتقال سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ سید نے ان کا کلیات بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

بحری کی زبان صاف اور اسلوب بھی آسان ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

اے روپ ترا رتی رتی ہے — پربت پربت بہتی پہتی ہے
اٹ اے قلم اس گھڑی نہ گھر جائیں — ٹک نعت نگر کی سیر کرائیں
ہے نام واحد نشان احمد — سُرخی سو احد ہے پاں احمد

اب بول توں مدح بادشاہ کا — ہو نہ اس کی کما لیت کلاہ کا
جس کی بود و بال پن کی عادت — عالم گیری ہے اور عبادت
یک ملک نہیں جو اُن لیا نہیں — یک نفل نہیں جو ان کیا نہیں
دیندار دلیر ہو نہ دانا — یک علم نہ سب منے سیانا

---

[1] رسالہ اردو۔ [2] اس مثنوی کے نسخے مختلف مقامات پر ہیں چنانچہ نواب سرامین جنگ بہادر اور مولوی خلیل اللہ صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے اور شائع بھی ہو گئی ہے۔

اڑ شیخ جو رہنما ہے جہاں کا | پایا ہے جگت کے عاشقاں کا
شبراز کوں راز کے مہاراج | راجا کوں جگت کے درۃ التاج
تھے گنج میں یک ایس چھپا کر | کپٹ کوں دوئی کے سب کھپا کر
بیدار ایس کے بھید پر جسم | جان ڈر جو تیگ امید بر ہم
ایسے منے ایک دوست آیا | جو مغز کے پاس پوست آیا
پوچھیا لے ادب اب تک اے شاہ | اسرار سوں بیخودی کے آگاہ
تنہا تجے یاں رہنے ہیں کب تے | بولے تجے جو سوں آئی تب تے[۱]

مجرمی:- شاہ بیر اللہ نام اور مجرمی تخلص تھا۔ بیجاپور کے باشندے تھے۔ ان کی ایک مثنوی جو گلشن حسن و دل کے نام سے موسوم ہے ۱۱۱۴ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں وجہی کے قصہ سبرس کو نظم کا لباس پہنایا گیا ہے[۲]۔
مثنوی ہماری نظر سے نہیں گزری، کلام کا نمونہ جو رسالہ اردو میں شائع ہوا تھا پیش کیا جاتا ہے:-

زبان ہور نظر دونو مل یار ہو | چلے ہیں تماشے کو اک ٹھار ہو
چلے جب تماشے کو مل کے ملوک | تو دیکھے تمیز کر کرتے سلوک
سلوک سوں ہر ایک ملک کا لے خبر | تو واقف ہو پھرتے تھے کرتے نظر

بلبل:- اس دور کا ایک شاعر بلبل تخلص ہے۔ ہم کو اس کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثنوی چندر بدن اور مہیار

---

[۱] مخزن کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد۔
[۲] رسالہ اردو۔

کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں محفوظ ہے[1]۔ یہ مثنوی مقیمی کی مثنوی سے ضخیم ہے۔ اس میں بھی وہی قصہ نظمایا گیا ہے جس کو مقیمی نے دکھنی میں نظم کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور میں مقیمی کی دکھنی تصنیف کے بعد آتشی نے جو اس زمانہ میں بیجاپور میں تھا اور فارسی شاعری کے لحاظ سے مشہور تھا، اسی واقعہ کو فارسی مثنوی میں قلم بند کیا اور زمانہ مابعد میں بلبل نے اس کا ترجمہ دکھنی نظم میں کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کے حسب بیان یہ مثنوی سنہ ۱۱ ھ کے قبل تصنیف ہوئی ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

بنام نقش بند نقش ایجاد	کیا قدرت کے نقشے کا و بنیاد
بندا نقشہ زمین و آسماں کا	بہار گلشن و جانِ جہاں کا

قدم پر جا کیا آداب سجدہ	بجالایا اد سرسین داب سجدہ
جنوں بے تاب ہو محل دعا میں	نیاز عرض کیتا مدعا میں
تو ہیں سلطانِ خوباں شہ پری ہے	یو صورت تجہ دیوانہ مجہ کری ہے
چھرائی محکوں پہ ہے جانماں سوں	کری تاراج مجکوں دل و جان سوں
نثار تجہ قدم اب نیم جان ہے	یہی ہے آرزو فرماں رواں ہے
اسے سر میرا نثار خاک راہ ہے	دل پر خونِ شہدا جلوہ گاہ ہے
تری اے زلف مشکیں گرہ گیر	ہوئے ہیں دام دل زنار و زنجیر
ترے بت کا صنعابت خانہ دل ہے	ترے مہتاب کا دیوانہ دل ہے
دیا سب آگ میں ساماں طاقت	فغاں سے دل اپر شورِ قیامت
قبولے نیں نماز با نیازی	کہے فاسق سوں ظاہر بے نیازی

[1] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۸۔

یو سن کر آغصے میں ہوئی غضب ریز | کری شب دیز کوں غمزے سے مہمیز
قدم سوں اس کے سر کوں مار ٹھوکر | کہی بکتا ہے کیا دیوانہ ہو کر
کہاں میں چاند موں ہور توں دِوا ہے | مرے دیوانہ بے ہودہ ہوا ہے
نہیں ہے تاب ذرہ وصلِ خورشید | کرے کیا قطرہ یا دریائے امید
سجودِ بت مسلمانی میں دشوار | نہ ہووے رشتۂ تسبیح و زنار
نہ کر دیوانہ سودا البوہس خام | کہاں پروانہ ہوتا ہے مگس خام
یہ کہہ کر اس کے سر کو مار ٹھوکر | کرشمہ ناز ہور غمزے سیں ہو کر
رواں ہوئی نو نہال سرو مایاں | کرے قمری نمن فریاد خلخاں

توں بلبل خاص گلزارِ سخن ہے | سخن تیرا چمن اندر چمن ہے

ہوا بلبل او پر اس تے ضرورت | دکھانا فرس کی ہندی میں عورت

وہ سن بہرِ مبارک باد آواز | کہا بلبل او چوں پروانہ پرواز[1]

راجی :- اسی دور کے ایک شاعر شاہ عبدالعلی ہیں جن کا تخلص راجی تھا۔ ان کے متعلق بھی تفصیلی حالات کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ انہوں نے ۱۱۰۰ھ میں "نامہ علی" کے نام سے ایک مثنوی قلم بند کی ہے۔ اس میں حضرت علی کا ایک معجزہ بیان کیا گیا ہے، جو واقعات اس میں لکھے گئے ہیں وہ ایک داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صداقت سے اس کو تعلق نہیں

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو۔

ہے ۔ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔[1]
کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

کہ ایک دن محمدؐ علیہ السلام — جو بیٹھے تھے اصحاب یاران تمام
ابابکرؓ عمرؓ عثمانؓ تھے — علیؓ مرتضٰے شاہ مردان تھے
دس نکوں بیٹھے تھے آس پاس — شفاعت کا شربت پیئے عام خاص

محمدؐ کہے یا امامِ علیؓ — ترے حق پہ اتریا ہے نادِ علیؓ
کہ تو پیر پیران کا خوب پیر ہے — کہ تو میر میران کا توں میر ہے
کہ ظاہر د باطن تجھے ہے عیان — کہ طٰہٰ دیا سین ہے بیان
کفر توڑنے کا تجھے جس دیا — کہ شیر مرداں علیؓ ہے امام ہدا
علیؓ کوں ولایت عنایت اتھا — عجائب علم بے نہایت اتھا
علیؓ نے کہے اے محمدؐ رسول — رضائے مجھ ہیں کروں گا وصول

دریا :۔ یہ بھی اس دور کا شاعر ہے ، حالات نامعلوم ہیں " وفات نامہ" ان کی تصنیف ہے ۔ ساڑھے تین سو سے زیادہ شعر ہیں۔ ۱۱۱۱ھ میں یہ مثنوی تصنیف ہوئی ہے ۔ ادارہ ادبیات اردو میں اس کے تین نسخے[2] اور جامعہ عثمانیہ میں ایک نسخہ موجود ہے ۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

بنا اول کروں حمد خدا میں — زبان اوپر آیس کی ابتدا میں

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر (۲۳)
[2] تذکرہ اردو مخطوطات (نمبر ۱۰ ، ۱۹ ، ۱۲۰)

کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت   بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

کہوں سلواۃ کہہ کر بعد ازاں میں   نبی جو نقل کیتی سو یہاں میں
عربی فارسی سوں ہے بیان یو   کب تک ایمان ۔۔۔۔ بیاں یو
ہر یک دکھنی زبان سوں پر کو بوجے   نہ رہے محتاج کسوں اب سوجے

عمر جنگے بیس عثمان کے منجے تیس   علی کیے منجلوں مارہ گنگو چالیس
کہیا او مرد ساریاں کون نکوکار   تیں ہمیشہ رہو ساری اپس ٹھار
امام درجہان ہر دو برادر   کہے اسی مرد سوں بون التجا کر

عبدالحمد ترین:- عبدالحمد ترین نے گیارہویں صدی کے اوائل میں ایک مثنوی "شمائل النبی" کے عنوان پر لکھی ہے۔ شاعر کے متعلق کوئی معلومات نہیں ہیں۔ مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ پشتو زبان سے اس کو دکھنی میں نظم کیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں آنحضرت صلعم کے سراپا اور اخلاق وعادات کو نہایت خوبی سے قلم بند کیا ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[1]۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

الہی سچا توں ہے پروردگار   دونو جگ میں قدرت ترا آشکار
سچا توں ہے قادر سچا توں حکیم   سچا توں ہے صانع سچا توں رحیم

کیا قصد عبدالحمد ترین   شمائل نبی کا کہوں بہترین

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر (۱۴)

انوندر و بزانی جو پُشتو منے — کیا ہے سو منکتا ہوں ہیں بولنے
شمائل نبی کا منگوں بولنے — کریاکرم کر زباں کھولنے
ترتیب الفہم نظم دکھنی اچھے — ہر ایک کس کا دل اس کو سکھنے اچھے

محمدؐ کے اس سر مبارک اوپر — اتھے بال گنتے دکھو یاد کر
اتھے لاک بارا او تیرا ہزار — دیگر تین سو تیں اندر شمار
و خوش شکل مرغوب ہور سبز تر — رکھی تھے نبی کے سو سر کے اوپر

وجدی:- اس دور کا ایک باکمال شاعر وجدی ہے، ان کا نام وجیہ الدین اور تخلص وجدی تھا۔ اگرچہ صوفی منش شاعر تھے، مگر بالکلیہ صاحب عرفان نہیں تھے۔ وہ دنیا کی رنگینیوں اور رومانی زندگی سے واقف تھے۔ وجدی ایک خوش حال، خوش فکر اور فارغ البال شاعر تھے۔ ان کی شاعری سے اس زمانہ کے تمدن اور تہذیب، رسم و رواج پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے کسی کی تعریف اور مدح میں اپنا زورِ قلم صرف نہیں کیا۔

ان کی تین مثنویاں مشہور ہیں: پنچھی باچھا، تحفہ عاشقاں اور مخزنِ عشق۔ پنچھی باچھا شیخ فرید الدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ اس کو ۱۱۳۱ھ میں وجدی نے دکھنی نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس مثنوی کے ۲۶۵۰ شعر ہیں۔ وجدی نے شیخ عطار کی مثنوی کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ بہت کچھ کمی و بیشی اور ترمیم کر دی ہے، اس کو آزاد ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ وجدی کی دوسری مثنوی تحفہ عاشقاں عطار کی گل و ہرمز کا ترجمہ ہے، یہ بھی لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ وجدی نے اس کو پھیلا دیا ہے، اور

بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے، اس کی تصنیف ۱۱۵۲ھ میں ہوئی ہے۔ تیسری مثنوی مخزنِ عشق ہے اس کا دوسرا نام باغ جانفزا ہے۔ اور ۱۱۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ یہ وجدی کی اچھی مثنوی ہے۔ کسی کا ترجمہ نہیں ہے۔ مثنوی پنچھی باچھا طبع ہو چکی ہے۔ اور اس کے قلمی نسخے متعدد کتب[۱] خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ تحفہ عاشقاں[۲] اور باغ جانفزا (مخزن عشق[۳]) کے نسخے نایاب ہیں۔

محمد بن عمر صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) نے وجدی پر ریسرچ کر کے اپنا ایم۔ اے کا مقالہ قلم بند کیا ہے۔ جس سے ان مثنویوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

وجدی کی مثنویوں کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے اس نے سیرت نگاری، مرقع نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے مثنویوں کے کردار واضح ہیں۔ مرقع نگاری میں لڑائی کا منظر، باغ کا سماں، بزم کے واقعات کامیابی سے قلم بند کئے ہیں۔ وجدی کا اسلوب بیان بھی قابل قدر ہے۔ ان کا طرز بیان حسنِ ترتیب، سادگی، تشبیہات، مکالمے لائقِ تحسین ہیں۔ فنی نقطہ نظر سے ان کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ بیان کا تسلسل کافی اچھا ہے۔ وجدی نے اپنے کلام میں اس زمانہ کے رسم اور رواج تمدن اور تہذیب پر جو روشنی ڈالی ہے یہ اس لئے قابلِ داد ہے کہ اور کسی شاعر نے ان چیزوں کو بیان نہیں کیا ہے۔

وجدی کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

---

[۱] ہمارے خاندان اس کے نسخے موجود ہیں۔ اور یورپ میں بھی موجود ہے۔ [۲] اس کا نسخہ پروفیسر آغا حیدر حسن کے پاس ہے۔ [۳] عمر یافعی کے پاس اس کا نسخہ ہے۔ اور جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں تینوں مثنویاں موجود ہیں۔

۱۰ پنچھی یا چھا :-

واہ واہ اے ھدھد ہادی راہ
ہے تجھے معلوم سب وادی کی راہ
ہے سبا کے شہر پر تیرا گزر
کیا سلیماں کو دیا تو خوش خبر
تا تجھے ہے تاجداری سازدار
جب سلیماں کا تو چ ہوا رازدار
کرا نکے دیو کون بیگی سوں بند
بعد ازاں کرنت سلیماں سوں انند
بند کرنا نہیں جید کا اس دیو کوں
کب سلیماں کو ملے گا جا کے توں

جب اٹھاتا ہے وو سیمرغ نقاب
تب چمکتا منہ ہے مثل آفتاب
ڈالتا ہے سایہ اپنا خاک پر
پھر کے اس سایہ پر کرتا ہے نظر
بس جناورا اس جہان کے سر بسر
سایہ سیمرغ ہیں سن بے خبر
جب معمّا تجھ سے سمجھا جائے گا
نسبت اس حضرت سے اپنی پائیگا
گر نہ ہوتا جنگ میں سیمرغ ایقلان
تو نہ ہوتا سایہ اور نام و نشان

جب تلک تجھ کو منی ہے اور غرور
تو حقیقت سے بڑا ہے دور دور
طبع میں تیرے غروری ہے اگر
مو بمو تیرا ہے فرعون دستگر
جب تلک باقی ہے تیرے میں منی
آنتوں سے تجکو نہیں ہے ایمنی

ہند داں ہیں کوئی راجہ تھا گنبھیر
کیں ہوا محمود سلطان کا اسیر
لے کے آئے جیوں اسے محمود پاس
دین سوں کیتے نبی کے روشناس
جب ہوا اسلام سنیں او آشنا
دل دو عالم سوں کیا اپنے جدا
الیکلا بیٹھا بیس گوشب کی مجہار
رات دن رونے لگیا جب زار زار

کچھ نہ تھا کام اس کوں غیر از سوز و آہ
روز اس کا رات سوں بدتر سیاہ

سوز و زاری جب گئے حد سوں گزر
ہوئی بزاں محمود سلطاں کو خبر

بس بولا راجا کون شاہ نامدار
نہر بانی سوں کہا توں کیوں ہے زار

میں تجے دیو نگا تیا کچھ ملک و مال
جی توں یک ساعت میں ہو جائے نہال

بس لگیا کہنے کون راجا شاہ سوں
میں روتا نہیں جو ملک و مال سوں

سوز و زاری ہے منجے اس کے سبب
جی قیامت میں کہے گا یو مجہ رب

اے بیرے بد عہد بندے بے وفا
کسو غلیا کہتا ہے توں ایسا جفا

- -

تمہارا مسارا ہے منجے اس بات کی
سوز دن کا ہور زاری رات کی

تو بھی اے درویش دل رشتی یہ آ
راہ انصاف و وفا در پیش لیا

۲۔ تحفہ عاشقاں:۔

کروں پاک دل ہور زبان پاک سوں
ثنا پاک اس عاشقِ پاک سوں

کہ جس سے ہوا ہے وہ گم عشق کا
اجوں لک ابلتا ہے خم عشق کا

پڑیا عکس اس نور کا جس رخن
جھلکنے لگا آرسی کے تمن

الٰہی بحق محمد رسول
میرے رنج کو محنت کوں کر توں قبول

سو اس رنج سوں گل رخ بے گناہ
لگی دل میں کرنے کوں افسوس آہ

کہ اے چرخ یو کیا ہے مجہ پر ستم
کہ ایک دن گزرتا نہیں بے الم

جنم درد ہور دکھ سوں رونے گیا
سو اول کے داغاں سوں دھونے گیا

نہ ماباپ کے گھر بے نکہ سوں رہی
نہ خرم کبھی یار کے تک سوں رہی

نہ دلبر میرے ہات نا بر ہیں دل
سو یو جیو رہے دو طرف سوں خجل
اچھول کیں نہیں اس دکھی دل کوں چین
نہ دل غم سوں خالی نہ انجواں سوں نین

دھیں شاہ گل رخ کوں چھانی لگا
دل سے سوں بولیا کہ لے دل ربا
جو قسمت میں گردش اٹھی چند روز
تو دیکھے ہمیں اس رغا رنج سوز
اتا دل سوں اپنے سگل دکھ بسار
کہ توں دوچ دلبر ہے ہیں دوچ یار
دھی تو بچ گل ہے ہیں بلبل دھی
ازل کے ہمیں بلبل و گل سہی
نزاں ایک ایک سکے رنج و سفر
کہے کھول مل پیں بایک دگر
رہے ایک ایک سکے مشتاق ہو
ملو یو بچ ہر کون ملے جو کہ دو

۳۔ مخزنِ عشق (باغ جانفزا) :۔

پکڑ دل میں فراقِ یار کا غم
کیا قرشاخ طوبا کے نمن ختم
جہنم کے صفت سوز جگر سوں
نکالے آہ سوں دل کے دھوییں لوں
کدی کب شمع سوں مل ہم زبان سے
کبھی پروانہ سوں لب راز جانے
کہ اے روشن دلاں کی انجمن ساز
پریزیاں کی مجلس میں سرافراز
جلن سوں عمر کے تیری درازی
مجھے بھی جلن سوز سرفرازی
اگن سوں کام ہم دونوں کے حاصل
یو سب رونق اگن کے باج باطل
کہوں کیا میں تجھے اے شمع سرباز
کہ توں آئی ہے میری محرم راز
مجھے بھی آپڑیا ہے مرتے سودا
اگر سر جائے تو نیں مجکو پروا

تصور جب کرے دو لعل سے گال | کرے گالاں کون اپنے لہو منے لال
کرے جیوں یاد اوس کی زلفِ ابتر | پریشاں ہو رہے جیو میں سراسر
جو چیت میں لیاو چاہِ زنخداں | پڑے غوطہ منے حسرت کے حیراں
جب اوس کے ہجر کا دو کہ یاد آئے | تیں سوں پورا انجھواں کے بہادے
لذت ملنے کی یاد آئے چت میں | کرے قربان اپسکوں اوس کے بت میں
غرض اس دہات نت رہے غم | نہ یک دم اوس کے غم سوں جیوں اچھے کم

نہ کچھ مجھے بادشاہی کی ہے درکار | نہ کچھ اس ملک کا میں ہوں خریدار
نہ کچھ دھن مال کی دھرتا ہوں لالچ | نہ تیرے باج ہونا مجکو ہے کچھ
سبان کرتا ہوں اس کوں بادشاہ بیان | نکو میلا کرا پنے دل کوں اے جان

وجدی کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

چنچل کا آج بچھرا بجھ اُپر بھاری ہوا یاران
تو میں اس دو جگت سیتیں نرا دھاری ہوا یاران

ہماری بت پرستی کوں نہیں سمجھے اجھوں زاہد
برائے کفرست دیں کو توپوجاری ہوا یاران

نکو کہہ وجدیا اپنیاں چپٹ سب وصل کیا باناں
کنتے ہیں لوگ سب تجہ کوں کہ زناری ہوا یاراں

کٹی ہے عمر سب میری سدا صورت پرستی میں
سُنیا ہے جس کا مدجہ سو ہشیاری تھے مستی میں

نکل جا وجدیا شیخی کے شویاں کی جھنج سیتے
اگر مقصود خود حاصل کیا ہے بت پرستی میں

تل دیکھ کر سکھی کا یک تل میں بھل گیا ہوں
اس حسن کا سو مدپی مستی سوں جھل گیا ہوں
وجدی کوں آج حاجت کس کیف سوں نہیں ہے
تریا بھونک پرت کا کیفاں ہیں گھل گیا ہوں[1]

محبوب عالم:- یہ شیخ جیون کے نام سے بھی مشہور تھے، ایک مذہبی آدمی تھے امام حسین کے وصال کے متعلق ایک مرثیہ لکھا تھا۔ ان کی دوسری تصنیف "ردنامہ ہے۔ جس میں تقریباً ساڑھے پانچ ہزار شعر ہیں[2]

فتح:- فتح شریف نام اور فتح تخلص۔ اس کی دو مثنویاں ہمدست ہوئی ہیں۔ ایک "زلیخا" ثانی سے موسوم ہے۔ اور دوسری "پندنامہ لقمان" سے آخر الذکر مثنوی سنہ ۱۱۳۰ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اول الذکر جامعہ عثمانیہ[3] میں اور آخر الذکر کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[4]۔ شاعر کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات نہیں ہیں۔ صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے وہ "گوڈر" کا رہنے والا تھا۔

---

[1] از بیاض مملوکہ محمد نصیر الدین خاں صاحب۔ [2] مقالہ محمد بن عمر صاحب صفحہ ۱۲
[3] فہرست سرودی نمبر ۷، ۵۔ [4] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۱۲۔

اور اپنے دوست محمد امین کے کہنے پر زلیخا کا قصہ لکھا ہے۔ دونوں مثنویاں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :-

زلیخا :-

عزیزاں روایت سنو کان دھر — اول فارسی تھا یو دکھنی دگر
انھا گوڈر ایک شہر کا جو نام — ہمیشہ فتح کا اتھا وہاں مقام

انگے بھی سو بدپٹ۔ لقمان ہے — سمجھ کر کرے تجہ جو عرفان ہے
وے نثر ہیں فارسی تھا اول — کیا نظم دکھنی سوں یوں بے بدل
رہے جس منے فائدہ تجہ عظیم — کرے پند او دل سیتی مستقیم
سو بولے ہیں لقمان اس دہات سات — جو فرزند اپنے سو کھولے نکات

عاشق :- اس کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ شاہ عشق اللہ نام تھا۔ اور شاہ نظام الدین ثانی اورنگ آبادی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شاہ نظام الدین کا انتقال ۱۱۴۳ھ میں ہوا۔ عاشق کی ایک تصنیف "اشارت الغافلین" ہے۔ یہ ضخیم مثنوی ہے۔ اخلاق اور تصوف کے مضامین اس میں منظوم کئے گئے ہیں۔ بعض عنوان حسب ذیل ہیں :-

فضیلت وضو، نماز، بدکرداری، سخاوت، حرام، عورت، قیامت، بہشت، بیعت، تصور، عقل و عشق وغیرہ۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[1]۔ عشق کے کلام کا نمونہ :-

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۳۴

دے دیکھ کیا ہے عجائب نکات — تعجب نکر یو ہے د بیچ بات
جو توں دیکھتا سو ہے اسرار رب — یو سنتا سو ہیں اوس کے بھید سب
کہیں کچھ ہوا ہور کہیں کچھ ہے جو — بھی دیکھ تو ہے ایک کا ایک او

مرشد کی تعریف:۔

کیا پیر یہ میں اپس کون خدا — او ہے بادشاہ میں ہوں اوس کا گدا
نگہ پیر میرا سو ایمان ہے — کہ ایمان کیا بلکہ رحمان ہے
نظام الدین ثانی ہے ثانی علی — بتایا مجھے اون خفی ہور جلی
ولی چشت کے گھر کا ہے جس پہ بار — کہ عالم ہے اس فیض کا انتظار
نظام الدین میرا خدا ہور رسول — کیا بھید مخفی او مجھ پر حصول
وگر نیں تو اسرار پانا محال — اگر مجھ عمر ہوتی کئی لاکھ سال
تصدق ہوں بلہار اس پیر کے — نظام الدین ثانی سے اکسیر کے

سنو نام اس کا سو اے مسلمیں — کہتے اس کوں اشارت الغافلین
یو رکھنے ہیں بولیا ہوں اس واسطے — ہر اک شخص کی بو سمجھ واسطے
مسلماں کو اسنے ہووے فائدا — اگر بختور ہے یا وہ ہووے گدا

اشرف:۔ سید اشرف نام اور اشرف تخلص، شمالی ہند اور دکن کے اکثر قدیم تذکروں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مگر تفصیلی حالات بیان نہیں کئے گئے ہیں۔ مثنوی اور غزل کے ساتھ اس نے مرثئے بھی

کہے ہیں۔

غربت اور مفلسی میں بسر ہوتی تھی۔ دکن سے شمالی ہند کا سفر کیا۔ اور دہلی بھی ہو آیا تھا۔

اس کی ایک مثنوی جنگ نامہ حیدر دستیاب ہوئی ہے[1] جو ۱۱۲۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں ایک فرضی داستان منظوم کی گئی ہے۔ جس کے ہیرو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ یہ داستان دوسری قدیم داستانوں کی طرح ہے۔ طلسم کشائی، جنگ و جدل وغیرہ امور کے ساتھ تبلیغ اسلام کا جگہ جگہ تذکرہ ہے۔ مرثیوں کے معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو فطرت نگاری کا خوب ملکہ حاصل تھا۔ اور ادبیت بھی ہاتھ سے جانے نہیں دی ہے:۔

خداوند اکبر ہے صاحب کریم	کہ جس کا محمد ہے نائب مقیم
نہ مادر پدر اس کوں نا نار ہے	دو جگ او پیدا کرنہار ہے

مدینے تے مغرب طرف یک شہر	کتے دور ہے بہوت اس کا سفر
برس ایک پرچھ مہینے کی راہ	اتھا روم کے ملک میں بادشاہ
بڑا شہر کتے کوہستان میں	نہ ایسا کئیں ملک آسمان میں
عجب نام اس کا حصار اس کتے	او کافر ملک ہر نگار اس کتے
کہے نام اس بادشاہ کا فضل	اتھی ایک دختر اسے خوش شکل
اتھا نام اس کا سحل دختری	او تیرے خدا کی اتھی استری
عجب خوبصورت تھی رو خوش نگار	جو قربان تھے اس پو پریاں ہزار

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۳۴۷

قنبر نے سو یک وار بد کر دیا — سحل نے سو اد وار رد کر دیا
پیا پے کیا وار قنبر — سحل نے لیا تازبانے اوپر
بہی چوتھا ضرب دے لہو گھوٹ کر — قنبر کی سو تلوار گئی ٹوٹ کر
قنبر کا نکلتا ضرب ہات کا — سحل تھا کتا کفر کی ذات کا
سحل بعد انداں گرز آسمان کر — سو ماریا قنبر کے اوپر تان کر
جیاتی قنبر کی اتھی پور پور — سو گھوڑا قنبر کا ہوا چور چور
قنبر سو ہوا پا پیادہ ودے — سحل نے کمند کھول ڈالیا گلے

سو اس میں قنبر کوں تبسم ہوا — سحل نے کہا کیا رسم ہے تیرا
مگر ہے دیوانہ یا خفتی نگر — مرا جیو جاتا تو کیا فکر
سنیا ہیں ہے تو خواجہ میرا علی — وہ شیرِ خدا پہلواں بنی
نچھوڑے تجے کیں زمانے میں جار — اگر باد ہو توں تو او شہسوار

نچھوڑے تجے سات دریا کے پار
نچھوڑے تجے کیں زمیں کے تلار

مرثیے

بانو کئیں اصغر نہیں اب میں جھلاؤں کس کے تئیں
سوتا ہوا ہے پالنا اب میں سولاؤں کس کے تئیں
نہلا کے ہیں کپڑے پنا اسکوں سنباتی گل نمن
وہ پھول سوکھا تیرے بن اب میں بناؤں کس کے تئیں

سوتا تھا وہ جب نیند بھر پیئے اوٹھاتی دور کوں
بیدم ہے دیکھو آج وہ اب میں جگاؤں کس کے تئیں
جب مسکراتا وہ بچا میں شاد ہوتی دل منے
بے جان پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں
جب شہ کو غمگیں دیکھتی لے جا کے دیتی گود میں
سوتا کفن وہ اوڑھ کر اب میں لیجاؤں کس کے تئیں

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسن میرا
کہاں ہے وہ حسین ابن علی صفدر شکن میرا

اگن سوں ماتمِ شہ کے جلا ہے تن بدن میرا
برنگِ برقِ خرمن سوزِ دل ہے ہر سخن میرا

لگا ہے بسکہ تیر ماتمِ شہ دل منے کاری
شہیدِ کربلائے غم ہوا ہے جگ میں من میرا

ہوس گلگشتِ عنواں کی کرے کیوں عندلیبِ دل
محبت کی گلی میں شاہِ دین کے ہے وطن میرا

ہوا ہے بسکہ زخمیِ خنجرِ داغِ غمِ شہ سوں
برنگِ لالہ ہے لبریزِ خونِ دل کا چمن میرا

مہ و خورشید کے جھلکار سوں نس دن ہے روشن
غبائے حبِ آلِ مصطفےٰ سوں انجمن میرا

کیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جب سے دلِ ماتم کا
ہوا مشتاق ہر یک شاعرِ ملکِ دکھن میرا

جو کوئی ہے عدو دل سوں دوستدارِ آلِ پیغمبر
اے اشرف اس کے پگ کی خاک ہے کحلِ میں میرا[1]

ولی ویلوری:- میر ولی فیاض نام اور ولی تخلص تھا۔ ویلور علاقہ مدراس[2] ان کا وطن تھا۔ اولاً سات گڈھ میں اقامت کی سراست خاں

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۲۲۷، ۲۲۹۔

[2] ولی کے حالات ہم کو ان کے ایک رشتہ دار سے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۲ پر)

صوبہ دار رسالت گڈھ کی ملازمت اختیار کی، اس کے بعد سدہوٹ آکر قلعدار ان سدہوٹ کی سلک ملازمت میں داخل ہوئے۔ جیٹ پٹہ ان کی جاگیر تھی۔ آخر زمانہ میں اپنی جاگیر میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ ارکاٹ میں انتقال ہوا۔ محلہ اسدپور میں مدفون ہیں۔ سنہ وفات معلوم نہیں۔ مگر ۱۱۶۲ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

ان کی کئی ایک مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ جن کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

۱۔ روضۃ الشہدا ۔ یہ ملا حسین واعظ الکاشفی کی فارسی "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ ہے۔ مثنوی دس مجلسوں میں منقسم ہے۔ جیساکہ نام سے واضح ہے اس میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا بیان ہے۔ اس کی تصنیف کے متعلق مختلف اصحاب نے اپنی معائنہ کردہ کتابوں سے مختلف سنین کا اظہار کیا ہے۔ مگر اب ڈاکٹر زو۔ کی تحقیقات کے لحاظ سے اس کی تصنیف ۱۱۳۷ھ میں ہوئی ہے[۱]۔

۲۔ **روضۃ الانور** ۔ یہ بھی کسی فارسی کا ترجمہ ہے۔ اس میں آنحضرت صلعم کی سیرت کا بیان ہے۔ اس کی تصنیف ۱۱۵۹ھ میں ہوئی ہے[۲]۔ یہ نایاب ہے۔

۳۔ **روضۃ العقبیٰ** ۔ اس کی تصنیف ۱۱۶۳ھ میں ہوئی ہے[۳]۔

۴۔ **دعائے فاطمہ** ۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں ہے[۴]۔

(بقیہ حاشیہ ۲۸۱) معلوم ہوتے ہیں۔ اور طبقات الشعرا میں بھی ان کا ذکر ہے جس میں ولی فیاض نام لکھا گیا ہے۔

[۱] تذکرہ اردو مخطوطات۔ نمبر ۳ ص ۳۰۲ رسالہ معارف نمبر ۱ جلد ۵۴ مضمون غلام مصطفیٰ خاں۔

[۲] یورپ میں دکھنی مخطوطات

۵ - مثنوی رتن و پدم - اس میں رتن سین اور پدماوت کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ اس کی تصنیف کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی تصنیف "روضۃ الشہدا" کے پہلے ہوئی ہے۔

"روضۃ الشہدا" کے نسخے اکثر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ کتاب طبع بھی ہو چکی ہے۔ مگر اب مطبوعہ نسخے نایاب ہیں۔

دوسری مثنویاں نایاب ہیں۔ ان کے ایک ایک نسخہ کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی مثنوی ۲،۳ پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں کے پاس اور مثنوی ۴ انڈیا آفس میں موجود ہے۔ ۵ کے کسی نسخہ کا پتہ نہیں چلتا۔

ولی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھا - ان کی مثنویوں کے اشعار کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے - ان کی تصانیف میں مذہبی رنگ زیادہ ہے۔ لیکن پھر بھی شاعرانہ خصوصیات اور نکات سے خالی نہیں ہیں۔

ہم نے "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں "روضۃ الشہدا" کا فارسی سے مقابلہ بھی کیا ہے، جس سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ولی نے کامیاب ترجمہ کیا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے وہ شاعری میں بلند مرتبہ رکھتا تھا۔

ولی کا نمونہ کلام حسب ذیل ہے :-

۱ - روضۃ الشہداء :-

کروں نامہ کوں بسم اللہ سوں آغاز ۔۔۔ انہوں تا میں فصاحت میں سرفراز
سراون کیا اسے جن پاک سخن میں ۔۔۔ بندایا جیو دم کے رشتہ سوں بدن میں

کروں میں مجلسِ دویم پر غم — وفات فاطمہ کر کر مرقسم
تولد بولنا لازم اول — مناقب تس لگا کرنا مسلسل
خدیجہ سوں جو اولادِ پیمبر — اتھے سب دو پسر ہور چار دختر
ہنی تھی فاطمہ سب دختراں میں — دو اچنا چاند جیوں سب اختراں میں
شکم میں ماں کے تھا جیوں اُن کو آرام — رکھے حضرت نے اون کو فاطمہ نام
نبوت سوں نبی کے پانچوئے سال — ولادت کا ہوا نیر دیکھ سال
خدیجہ نے بشارت یوں سنائے — قبیلے کے زناں کوں سب بلائے

یزاں طارق کا بیٹا یک عمر تھا — عبد کے فن میں خر سا بے خبر تھا
اوسنے اکبر کا آئیں دار کھایا — جہنم میں پدر کوں جا میلایا
دو جا تھا طلحہ کر طارق کا فرزند — اتھا ملعون ہاتی سا تنومند
جل اپنے باپ ہور بھائی کے غم سوں — تڑپ شہزادے پر دیا یا منم کون
سو اکبر کا گریباں ہات سوں دھر — منگیا تھا کھینچ کر سینے زمیں پر
تلک اکبر نے جلالی کر ہنر سات — سٹے ملعون کے گردن اوپر ہات
بکڑ قوت ستے ایسا مروڑے — جو گردن کی رگاں ہور ہاڑ توڑے

بکس پر چلاوے تول نیزے — ہوئے دونوں میں گولا گول نیزے
گئے پس منمانی تو ر دونو — کھڑے نیزے سوں نیزہ جو دونو
دونو تھے نیزہ بازی میں ہنرمند — دونو بھی ہات کرتے سوں رہے بند
کسی پر کوئی کچھ سرسبز نہ ہوئے — کسی کا ہات کسی پر نہ رنہ ہوئے

تلک شمشیر سے عَلَم کر — ستّیا سمعان کے نیزے کون قلم کر
او نے بھی ہات ڈالیا تیغ پر داں — دلے ہاشم منے کچھ فرصت دیا نین
کیا بھی وار اس پر ہانک کر کر — ستّیا دین زین لگ دو تیماں کر کر
جب اس خواری سوں اوسمعان ہوا ہے — بڑا افسوس مدہیاں کون ہوا ہے

دلیکن شاہ کا او دبدبہ دیک — صلابت ہور عالی مرتبہ دیک
قدم شوخی سوں آگے نا رکھے کوئی — نہ انکھیاں کھول کر یک پر دیکھے کوئی
سو ہو ناچار تب سب نابکاراں — لگے کرنے کون شہ پر تیر باراں
زرنگ اوپر سوں اُترے شاہ شبیر — کہ نا تیزے کون ناحق نا لگے تیر
او تھا جد و پدر کی یادگاری — کلہ کے کر اں چپا دس کے خواری
دیکھے جب کافراں نے شاہزادا — زرنگ کون ست ہوا ہے یک پیادا
دلاور ہو لگے بہانے کون تیران — لگے شہ جب کھڑے کھانے کون تیراں
پیشانی پر لگیا یک تیر کاری — او کھاڑی سو ہوا لہو داں سے جاری
بہرا دبن لہو بیتے اوس ہات سرور — ملیں اوس لہو کوں لے مکہ سانتے سرور

---

۲ - روضۃ الانور :-

کئے یو نقل حضرت عمر خطاب — ہوا معراج کا جس دن خوشی باب
کیا حضرت رسول اللہ سوں ہیں سوال — نہانی راز ہا کا کچھ کہو فال
سو فرمائے کہ امت کا شکایت — کیا مناجات بول دو رب عزت

کہ عصیاں وو زمیں سب مل بخلوت
کریں ووا انجمن میاں اطاعت

ولے ہیں پردہ پوشی ہیں ہوں ستار
ہوں دائم بخشش رحمت سوں غفار

علی مرتضیٰ سوں ہے یو منقول
سخن راز نہانی کا یو مدلول

گنہ کرتے تھے امتہائے پیشیں
عذاباں نزت ان پر تھے سو تعین

کہ بعض غرق ہو در آب طوفان
ہو کیتے آب رود نیل غرقان

کیتاں کوں صیحۂ جبریل سوں مار
ہو بعضیاں اپر باران سنگ سار

کیتے غرق زمیں ہیں مثل قارون
چلے جاتے اچھوں تحت الثریٰ کون

کیتاں کے نیں سو مسخ صورتاں کر
ہوئے تلپٹ کتے از بادہ صرصر

کیتاں کوں بھیں سمیت اٹھا کو مارے
جہنم کے لئے وو باٹ سارے

ولیکن تجھ امت کوں یا محمد
بدی ان کی کدن کر نیکی ستی رد

تری امت ہیں منجھ کوں بہوت پیاری
غضب ہو قہر سوں یو ہیں کنارے

۳۔ روضۃ العقبیٰ :۔

ہو اللہ السمیع الحی و قادر
ہو الرب البصیر البطن و ظاہر

ہو الجبار و قہار و معدل
ہو الستار و غفار و مفضل

الٰہی توں رہے بینا و دانا
یو میری ضعف ہمت پر توانا

کیا تا لیف یو ہیں مختصر قال
ترے محبوب پیغمبر کا احوال

سو حال آخرت سب اس میں لایا
سگل خوف و رجایاں کوں سنایا

وعید و وعد لایا ہوں جمع کر
وعیداں سوں ڈریں وعدہ یو دل دھر

۱؎ از رسالہ معارف

کیا میں فارسی دکھنی میں منظوم | کہ تا ہووے ہر یک نوں ترت معلوم
الہٰی توں ہے غفار و عطا کیش | ضعیفاں کا غلط سہو و خطا پوش[1]

۴ ۔ رتن پدم :۔
خدایا تو ہے پاک پروردگار | ترن کار و آثار و اچھے آثار

حراست خان امیر ایک نامور تھا | سکونت گاہ اس کوں سات گڑھ تھا
اتھا او اہل درد و نیک اعمال | رفاقت میں اتھا ہیں اس کے خوش حال
قضارا اوان سوں ہو قسمت سوں برخاست | سو آیا میں طرف کڑپہ کے دہر خواست
نواب عبدالمجید ابن عبدالحمید ایک | اتھا وال نامور صوبہ سعید ایک
سواد بحر شجب پروانہ لکھ کر | سلک نوکراں میں منسلک کر
تعین کر مجکوں سدہوٹ کو روانہ | کیا دہ صاحب شیریں زبانہ
سو حسب الحکم میں سدہوٹ کو آیا | رنگا رنگ واں تماشے میں نے پایا[2]

۵ ۔ مثنوی دعائے فاطمہ :۔
حکایت عجب یک سنو دردمند | سیں تو کھلے دل کے قفلاں کے بند
سنو اس کہیں کان دے دل سوں سب | کہتے ہیں محمد رسول عرب

گئے مشورۃ جب صحابہ کرام | گئے فاطمہ کن کہر سب تمام
سنے فاطمہ جب ہوئے بے قرار | چلے ساتھ یاراں کے حضرت کی ہار

---

[2] اردوئے قدیم ۔ [1] رسالہ معارف

لئے سات اپس قرۃ العین کوں　　　حسن ہور حسین ہر دو سعدین کوں[1]

عشرتی:- سید محمد خان نام اور عشرتی تخلص تھا۔ عالمگیر کے عہد میں موجود تھے۔ ان کی شرافت اور نجابت کے لحاظ سے بادشاہ نے قدر دانی فرمائی۔ جاگیر اور منصب سے سرفراز کیا۔ ان کی اولاد آصفی دور میں باعزت عہدوں پر ممتاز رہی۔

حیدرآباد ان کا وطن تھا۔ اسی جگہ انتقال ہوا ہے۔ شاہ راجہ حسینی کی گنبد میں شمال کی طرف مدفون ہوئے۔[2]

عشرتی پُرگو شاعر تھے۔ متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:- دیپک پتنگ۔ چت لگن۔ نبہ درپن۔ ان کے علاوہ غزلیں بھی پائی جاتی ہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

۱۔ مثنوی دیپک پتنگ

کہ اے گل مجے آگ تجہ بن ہے بن　　　کہ گھر تجہ سجن بن دسی بجیوں سجن
جگت میں تجہ سوں تیرا نام ہے　　　کہ تجہ سو دبن دن تیرا اسنام ہے
تسوں کہائے حسرت میرے لالہ زار　　　بغیر تجہ ہے منج سیج پر پھول خار
اے تج سوں تیرے خوض میں زیر ہے　　　تیرے باج منن خاک منجہ سیر ہے
اے تج سوں تیرا حاصل یہ مدعا　　　اگن تجہ بنا مجہ کوں بادِ صبا
تسوں بخت میں زیب مجہ نور ہیں　　　ہے تجہ باج آرام مجہ گور ہیں

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۳۷۰۔　　　[2] رسالہ اردو۔

اے تجہ شمع تے بزم انوار ہے — بغیر تجہ میرے دل منے نار ہے
اے تج سوں تج ہے مجکوں از ہور نیاز — نہ تج بن بغیر سوز ہ ستتا ہے ساز
نہ ہو بیگٹر ستت کہ مجہ دل پو خمار — جدائی کے پردے کا نہ جیبیٹ تار
نہ کر بے وفائی دستا دار ہو — میری دیک تاری نہ بیزار ہو[1]

۲- نیہ درپن

طبل بجتے تھے ہور نرسنگ ہور غم — دمامے ہر کدھن بجتے تھے دہم دہم
لگے ہونے تلک، ددہر کے رن سور — اُبلتے تھے غضب سوں جیوں کہ سمدور
اٹھے یوں منتظر جو ہو سے گھتر — نکالیں میاں سوں کنبے کا خنجر
کھرگ لے ہات میانے ایک بار — کہ بن جواہر آپس کا آشکار
دلبراں نے صفاں آراستہ کر — دسے تھے مردمی کے داو یک سر
پڑے ہر تن او پر داراں سنتے غار — بدل پانی کے نکلیا لہو کا انگار
لگائی چھاتی سو چھاتی مو کو گل جوڑ — سٹے سر ہور سینا ہور ہات یک توڑ
کرے گرزاں کے ایسے دھات سوں مار — پڑے تھے دہرت کوں پاتال لگ غار
زرہ پوشاں پڑے ہور رن میں پامال — پڑے جیوں یں بھیں ایراں بے حال
کریا یوں پھوڑ ہر یک ہات کا تیر — کہ جو میاہات ہر ایکس کا رنگیبر
و ہنگ جب کہنچتا ہر ایک کماں دار — چلا کھتا رہا زرہ اُس کوں سو بار
دسے یوں پاکھراں سوں ہست کا دل — کہ جیسا نیر بھر بادل دیا چل
دسے زخمیاں کا عکس اس میں رکت سوں — دکھایا جیوں شفق بادل منے موں[2]

---

[1] ، [2] اردو شہ پارے صفحہ ۲۸۲-

غزل کا نمونہ

قیامت کا کٹھن دن ہے نبی منجہ اسرا دینا — گنہہ منجھ سر پو سنگیں ہے نبی منجھ آسرا دینا
رکھیا غفار سر آکر مبارک اس قدم اوپر — دونوں نیاں سوں انجواں بھرتی منجہ آسرا دینا

کمینہ عشرتی بولے دنیا میں اس پری جھولی — جنے مشکل وتی کھولے محی الدین قطب ربانی[1]

بیچارہ[2] :- ان کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ گولکنڈہ کے باشندے تھے اور عالمگیر کے زمانہ میں دہلی بھی گئے تھے۔

پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدایا یوں ہوا — جز صبر کچھ چارہ نہیں بیچارہ ہو رہنا پڑا

طالب[3] :- مرزا طالب گولکنڈہ کے رہنے والے عالمگیر کے زمانہ میں تھے۔
ہمنا کے خون چشم سے آلودہ کب کرے — وہ پگ جسے گرانی ہے رنگ حنا سیتی

فراقی :- سید محمد نام اور فراقی تخلص تھا۔ بیجاپور کے متوطن تھے۔ آخری دور عادل شاہی میں موجود تھے۔ اس کے بعد اورنگ آباد آ گئے۔ ولی کے ہم عصر تھے۔ فراقی کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کیونکہ دکن کے کسی تذکرہ میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ شمالی ہند کے تذکرہ نویسوں، خاتم اور میر حسن نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ مگر کوئی تفصیل نہیں دی معلوم ہوتا ہے فراقی نے شمالی ہند کا بھی سفر کیا تھا۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۲۰۲۔ [2]، [3] تذکرہ میر حسن۔

اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ فراقی اپنے وقت کے بڑے صوفی تھے۔ اور تصوف میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ ان کی ایک ضخیم مثنوی "مراۃ الحشر" نام دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں حشر کے دن کے حالات کا نہایت تفصیل سے تذکرہ ہوا ہے اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فراقی کو علم معانی اور منطق میں بھی کمال حاصل تھا۔ غزل بھی لکھا کرتے تھے، ان کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کمر سے کھینچتا خنجر چڑھاتا آستین آوے[1]

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
محمد کی گلی بہتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا
عبث خوبان کی گلیوں میں عمر توں صرف کرائے دل
مدینے کی زیارت کوں گیا ہوتا تو کیا ہوتا
ارے مجنوں ہوا بدنام توں لیلیٰ کو دل دے کر
اگر میرے نبی کو دل دیا ہوتا تو کیا ہوتا
ازل کی دین میں یارب اگر مفلس بھکاری ہوں
نبی کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا
منجہ اس مکتب مجازی میں جو عشق استاد نا ہوتا
تو میرے دل کی کثرت کا سبق برباد نہ ہوتا

---

[1] تذکرہ میر حسن۔

نظر ہے علم منطق ہور معانی ہیں فراقی کون
اگر علم حدیث مصطفیٰ ہوتا تو کیا ہوتا

"مراۃ الحشر" کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

گگن کا دیا سایبان تان کر
شفق کی کسوئی نے افشان کر

دیا عناصر چاروں عناصر کے چار
تو پکڑی ہے ایسی عمارت قرار

زمیں کا کیا فرش ہموار صاف
سُپیا دھوپ کا تس پہ باریک غلاف

فراقی تخلص ہے میرا مدام
دلے اصل سید محمد ہے نام

تو احتیاج کہا بس نہ ہے کچھ دوجا
گنہ گار ہے پے تو جنت ہیں جا

رضا دے رکھے سرورِ کائنات
میرے سر پہ اپنا شفاعت کا ہات

میرا ہوئے جب اس دھات خوش حال ہیں
ہیں اتنا چہ آخر کوں بولوں بچن [۳]

نعیم احمد :۔ نعیم [۲] احمد نام اور یہی تخلص کرتا تھا۔ برہان پور سے تعلق رکھتا ہے۔ اڈنبرا میں اس کے سات مرثیے ہیں۔ مرثیوں کے سوا غالباً کسی اور صنف میں اس نے طبع آزمائی نہیں کی۔

حیف گھائل ہے حسین تن تیرا
جسم پر خون ہے پیرہن تیرا

تو کہاں ہور کید ہر تن تیرا
کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا

---

[۱] بیاض مملوکہ البیہ محمد غوث صاحب ایم اے۔ [۲] مراۃ الحشر کتب خانۂ آصفیہ مثنوی نمبر ۲۵
[۳] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

نہیں ملتا یو ندکس کہتیں پانی
سخت طفلاں کے سر پو حیرانی

جیف اصغر نے تجکوں رُ ہانی — جگ سوں پیاسا گیا تن تیرا
تیر لگ لکھ سوں لہو جو ہوا ہے ہے — دا مصیبت ہیں بال پن تیرا

اھے توں دلبر حسین کے اصغر
آج روتا نہیں توں ہٹ کر

ندیم :- سید شاہ ندیم اللہ حسینی المتخلص بہ ندیم بیجاپور کے باشندے تھے۔ فتح عالمگیری کے بعد مشہور ہوئے۔ باقر آگاہ نے آپ کے کلام کی تعریف کی ہے۔ اور عرفان حقیقی کی چاشنی سے آپ کا کلام مملو ہونے کی صراحت کی ہے[1]۔ افسوس ہے کہ ہم کو آپ کے مرثیوں کے سوا کوئی اور کلام نہیں ملا۔ مرثیہ کا نمونہ پیش ہے :-

ہے ہے اصغر ابن حسین سونا تیرا پالنا — رو رو بانو کرتے ہیں ہیں سونا تیرا پالنا
تجہ بن بانو ہیں بے حال لہو میں بکھیرے سر کے بال — کہتے ہے ہے میرا لال سونا تیرا پالنا
تھا نوشہ کا من تا جاؤ مجہ دکھا کے من کا بھاؤ — کاری ہے مجہ دل پہ گھاؤ سونا تیرا پالنا
تھا جو بچہ میرا ایسا گھات مجہ کوں بی لیجانا سات — اصغر مجہ سوں کر کچھ بات سونا تیرا پالنا
تھا مجہ دل میں یہ ارمان سالگرہ کرتی ساماں — تجہ کون تھا یہ برس ندان سونا تیرا پالنا
چھاتی کوں کس لاؤں ہیں کس کو دودھ پلاؤں میں — اصغر تجہ کو کہاں پاؤں ہیں سونا تیرا پالنا

---

[1] دیباچہ مثنوی گلزارِ عشق۔

گودی میں اب کس کوں سوؤں کس کوں تجھ بن لوں ای دن — گودیں جاکر سویا توں سونا تیرا پالنا

کیوں کر دیکھا تیرا لکھ تجھ پر بھاری ہر دم دکھ — جیونے کا اب کیا ہے سکھ سونا تیرا پالنا

تجھ بن جوگن کا بھیس رالکھ لگا موں کھولے کیس — تجھ کوں ڈھونڈھوں دیس بدیس سونا تیرا پالنا

دکھ کی کنتھا پہنوں تن غم کی دہوتی جالوں من — تجھ بن مجھ کوں گھر ہے سونا تیرا پالنا

غم سوں تیرے روؤں زار اصغر اصغر کردوں پکار — جیونا مجھ کوں ہے دشوار سونا تیرا پالنا

آج ندیم اس غم کے ہیں کرتا انجھواں ہر کئیں
اصغر شہ کے قرۃ العین سونا تیرا پالنا[1]

---

[1] اردو شہ پارے۔

تیسرے دور کی نثر

تیسرے دور کی نثر کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے "دکن میں اردو کی تیسری طباعت تک ہم کو اس دور کی نثر کا نمونہ دستیاب نہیں ہوا تھا، اب اس کا نمونہ بھی بہم دست ہو چکا ہے۔

تفسیر سورۃ اذا جاء:۔ افسوس ہے کہ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر زور صاحب کی صراحت کے بموجب سنہ ۱۱۵۰ھ کے قبل اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو صراحت فرمائی ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بجائے خود ایک کتاب ہے اور اس کا مصنف کوئی دکھنی عالم ہے جس نے قرآن اور حدیث کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور جس کو لکھنے کی بھی اچھی مہارت حاصل ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن یہ رسالہ دکھنی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ دکھنی مفسروں نے قرآن شریف کی تفسیریں کس شرح و بسط کے ساتھ لکھی تھیں"[1]

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۲۲۶۔

نمونہ عبارت :۔

"پیغمبر صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلّم کے بھیجنے میں خدائے تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ مکارم اخلاق کو تمام کرنا اور بنا کلمۂ توحید کی مضبوط کرنا۔ اور دین اسلام کو ظاہر کرنا اور خلایق کو ہدایت کرنا۔ جس وقت کہ یہ امور بوجہ احسن تمام ہوئے تو خدائے تعالیٰ اپنے رسول صلعم پر یہ آیت نازل کیا۔

- -

جس وقت کہ یہ سورہ نازل ہوا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سن کر روئے، حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلّم نے پوچھا کہ اے عباس! تم کس واسطے روئے ہو۔ حضرت عباسؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اس کے نازل ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تئیں دنیا سے سفر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

- -

اور جو شخص کہ سورت کے تئیں خواب میں پڑھا تو خدائے تعالیٰ اوس کو دشمنوں پر فتح دے گا۔ اور تمام مشکلات اوس کے حل ہوئیں گے اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ خواب دلالت کرتا ہے موت کے نزدیک ہونے پر۔"

تبصرہ:- تیسرے دور کی نظم و نثر پیش ہو چکی ہے۔ اس سے شعرا کے کلام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کا پہلا اور زبردست شاعر ولی ہے۔ دوسرے شعرا اس کے ہم عصر ہیں۔ ان میں سے بعض شعرا اس دور کے بعد بھی زندہ تھے۔ مثلاً ولی ویلوری۔ وجدی۔ مجرمی وغیرہ۔ مگر چونکہ ان کا اکثر کلام اسی دور میں تصنیف ہوا ہے۔ اور وہ اسی زمانہ میں مشہور ہو چکے تھے اس لئے ان کا ذکر اسی دور میں کرنا ناگزیر تھا۔

دور ماسبق کی طرح اس دور میں بھی دکھنی شعرا نے اپنے کمال کا اظہار مثنویوں کے ذریعہ کیا ہے۔ مگر اسی دور سے ایک نئی شاعری کا آغاز ہوا۔ یعنی مثنوی کے بجائے غزل کہی جانے لگی۔ ولی اورنگ آبادی نے اس کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس کے ہم عصر شاعروں نے اس کی پیروی نہیں کی۔ مگر زمانہ مابعد میں اس کی پیروی ہونے لگی۔ دکھنی شعرا غزلوں میں اپنے زور بیان اور کمال فن کا اظہار کرنے لگے۔

چونکہ ولی خود ایک صوفی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور اس وقت کا ماحول بھی صوفیانہ تھا۔ اس لئے ولی کا کلام تمام تر تصوف ہے۔ اور اس کے تتبع کرنے والوں نے بھی پوری طرح پیروی کی ہے۔ اور اس زمانہ کی مثنویاں بھی زیادہ تر تصوف ہی میں رنگی ہوئی ہیں۔ وصال العاشقین۔ غوث نامہ۔ منصور نامہ (ذوقی)، من لگن (بحری)، تحفہ عاشقاں۔ منطق الطیر۔ باغ جاں فزا (وجدی) سب تصوف ہی میں ہیں۔ اور جو مثنویاں عشق و عاشقی اور قصہ کہانیوں کے متعلق لکھی گئی ہیں مثلاً عشق صادق (ضعیفی)، یوسف زلیخا (امین)، گلشن حسن و دل (مجرمی)،

وغیرہ بھی تصوف سے مملو ہیں۔

ادبی حیثیت سے اشرف کی مثنوی "جنگ نامہ حیدر" اور ولی ویلوری کی "پدماوت" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زبان کی تدریجی ترقی کے لحاظ سے اس میں صفائی کا ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ دور ما سبق کے کلام سے اس زمانہ کا کلام صاف ہے۔ اگرچہ بعض مثنویوں میں صفائی نہیں ہے۔ مگر عام طور سے اس زمانہ کی مثنویاں صاف ہیں۔

مرثیوں کا بھی اس زمانہ میں رواج تھا۔ خاص مرثیہ گو کے علاوہ دوسرے شعرا بھی مرثیے کہا کرتے تھے۔ چنانچہ خود ولی نے مرثیے لکھے ہیں۔ ذوقی کے کئی ایک مرثیے ہیں۔ یتیم احمد۔ اشرف اور ندیم بھی مرثیے کہا کرتے تھے۔ بلکہ یتیم احمد تو مرثیہ گو ہی تھا اس کے علاوہ ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" گویا تمام تر مرثیہ ہی ہے۔

اس زمانہ کے مرثیے ادبیت اور سوز و گداز کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔

اس زمانہ کی نثر کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ زبان صاف ہو چکی ہے۔

چوتھا دور

سنہ ۱۱۳۶ھ تا سنہ ۱۲۲۰ھ

اُردو اور سلطنت آصفیہ

عالمگیر نے دکن کی فتح کے بعد اپنے سب سے چھوٹے فرزند شہزادہ کام بخش کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد خانہ جنگی برپا ہوئی اور شاہ عالم بہادر شاہ کو دہلی کا تخت و تاج نصیب ہوا۔ دکن بھی اس کے زیر حکومت آگیا۔ بہادر شاہ کے صرف چار سالہ حکومت کے بعد جہاں دار شاہ اور پھر فرخ سیر یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔ فرخ سیر کے عہد میں نواب نظام الملک آصف جاہ دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

کچھ عرصہ کے بعد جب حکومت رفیع الدولہ۔ رفیع الدرجات کے بعد محمد شاہ کے حصہ میں آئی تو آصف جاہ کو دکن سے سنبھل اور مراد آباد پر بدل دیا گیا۔ اور دکن کی صوبہ داری پر حسین علی خان کو مامور کیا گیا۔ اس زمانہ میں مغلیہ حکومت پر زوال آچکا تھا۔ شیرازۂ حکومت درہم برہم ہوگیا تھا۔ سکھ مرہٹے اور راجپوت سر اٹھا چکے تھے۔ بادشاہ چند امیروں کے ہاتھ کٹ پتلی کی طرح

تھے۔ نظام الملک جو مراد آباد سے مالوہ کی صوبہ داری پر منتقل کئے گئے تھے۔ آئے دن کی بدانتظامی سے تنگ آکر دکن کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس اثنا میں سیدوں کا آفتاب عروج غروب ہوگیا۔ محمد شاہ نے نظام الملک کو دکن سے طلب کرکے قلمدانِ وزارت آپ کے سپرد کیا۔ (۱۱۳۴ھ) آپ نے ملک کا انتظام شروع کیا تھا کہ نادر شاہ نے اپنا نادری حملہ کیا۔ سلطنت مغلیہ کی حالت گو نہایت کمزور ہوگئی تھی۔ تاہم نواب نظام الملک نے جان توڑ کوشش کی کہ بگڑی ہوئی حالت درست ہوجائے۔ مگر محمد شاہ کو لوگوں نے آپ سے بددل کردیا۔ آپ نے دوری مناسب تصور کی اور بادشاہ سے اجازت لے کر دکن کی طرف متوجہ ہوئے۔ (۱۱۳۶ھ ہجری)

آپ کے وزارت دہلی کے زمانہ میں عماد الملک مبارز خان کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا جب آپ واپس ہوئے تو شکر کھیڑہ کے مقام پر اس کے سپہ سالار عالم علی خان سے مقابلہ ہوا۔ مگر آپ منصور و مظفر اورنگ آباد میں داخل ہوئے اس طرح آصف جاہ کی حکومت کا آغاز ہوا۔ سلاطین آصفیہ کی فہرست حسب ذیل ہے :۔

۱۔ حضرت آصف جاہ اول	۱۱۳۶ھ تا ۱۱۶۱ھ
۲۔ نواب ناصر جنگ	۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۳ھ
۳۔ نواب مظفر جنگ	۱۱۶۳ھ تا ۱۱۶۴ھ
۴۔ نواب صلابت جنگ	۱۱۶۴ھ تا ۱۱۷۳ھ
۵۔ نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی	۱۱۷۳ھ تا ۱۲۱۸ھ

۶۔ نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث — ۱۲۱۸ھ تا ۱۲۴۴ھ

۷۔ نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع — ۱۲۴۴ھ تا ۱۲۷۳ھ

۸۔ نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس — ۱۲۷۳ھ تا ۱۲۸۵ھ

۹۔ نواب میر محبوب علی خاں غفران مکان آصف جاہ سابع — ۱۲۸۵ھ تا ۱۳۲۹ھ

۱۰۔ اعلیٰحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سادس — ۱۳۲۹ھ

آصف جاہ اول کے بعد آپ کے صاحبزادے نواب ناصر جنگ نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، مگر آپ کے بھانجے مظفر جنگ ہدایت محی الدین خاں نے فرانسیسیوں کی تائید سے آپ کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ باہم صلح پر جنگ کا خاتمہ ہوگیا تھا لیکن بعض مفسدوں نے ناصر جنگ کو شہید کر دیا اور مظفر جنگ حکمران بنے۔ مگر ان ہی مفسدوں نے ان کو بھی قتل کر دیا۔ اس کے بعد آصف جاہ کے تیسرے فرزند نواب صلابت جنگ مسند نشین ہوئے (۱۱۶۴ھ) فرانسیسیوں نے عروج حاصل کر لیا۔ مرہٹوں نے سر اٹھایا اور ایک بڑے حصہ ملک پر قابض ہو گئے۔ گیارہ سالہ حکمرانی کے بعد صلابت جنگ کے حکومت سے کنارہ کش ہونے پر ان کے چھوٹے بھائی نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی جانشین ہوئے۔ ابتداً فرانسیسیوں سے آصف جاہ ثانی کو اتحاد رہا مگر آگے چل کر انگریزوں نے رسوخ پیدا کر لیا اور محمد علی خان والاجاہ صوبہ دار ارکاٹ کی کوشش سے انگریزوں سے آپ کی دوستی مستحکم ہوگئی۔ متعدد مرتبہ آپ نے عساکرِ آصفی سے انگریزوں کی مدد

فرمائی۔ آپ نے ملک کا باضابطہ انتظام فرمایا، ایک طویل حکمرانی کے بعد ۱۲۱۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے فرزند نواب سکندر جاہ اور ان کے فرزند اکبر ناصر الدولہ اور ان کے بعد ان کے فرزند نواب افضل الدولہ یکے بعد دیگر مسند حکومت پر جلوہ گر ہوئے۔ آپ ہی کے زمانہ میں ۱۸۵۷ء کا مشہور معرکہ ہوا۔ آپ نے حسب وعدہ انگریزوں کی حمایت فرمائی۔ ۱۲۸۵ھ میں افضل الدولہ کا انتقال ہوا۔ آپ کے اکلوتے فرزند نواب میر محبوب علی خان صغیر سنی میں جانشین ہوئے۔ انتظام حکومت ایک ریجنسی کے سپرد ہوا۔ ۱۳۰۱ھ میں آپ کو پورے اختیارات دیئے گئے۔ ۱۳۲۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا اور اعلیحضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خان بہادر نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۹ء میں پولیس ایکشن کے بعد آپ کو راج پرمکھ کی حیثیت دی گئی ہے۔

(۲)

آصف جاہ[1] اول بڑے مدبر عقلمند ذی علم اور علم و ہنر کے قدردان تھے۔ آپ کی علمی قدردانی ضرب المثل بن گئی تھی۔ اس لئے آپ کا سادہ مگر بارعب دربار باکمالوں کا ملجا و ماویٰ تھا۔ جب آپ دکن کی جانب متوجہ ہوئے تھے تو بہت سارے اہل کمال بھی ہمرکاب ہوئے۔ ان اصحاب نے دکن ہی میں اقامت اختیار کر لی اور یہیں کے ہو رہے، اور کچھ ایسے اصحاب علم و فن تھے جنہوں نے

---

[1] حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:۔

(۱) راحت افزا۔ (۲) گلزار آصفیہ۔ (۳) تزک آصفیہ (۴) تاریخ رشید الدین خان۔ (۵) تاریخ خورشید جاہی۔ (۶) تاریخ دکن سلطنت آصفیہ۔ (۷) تزک محبوبیہ۔

دہلی کے سونی ہوئے پر دکن ہی کو اپنا ملجا پایا۔ ہندوستان کا مشہور ادیب جس کی عربی قابلیت کا لوہا سبحۃ المرجان کے باعث عرب بھی مانتے تھے یعنی مولانا غلام علی آزاد بلگرامی آپ ہی کے زمانہ میں اورنگ آباد تشریف لائے۔ اور یہیں سے دار البقا کا راستہ لیا۔

حکومتِ آصفیہ میں زبان اردو کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ نہ صرف بڑے بڑے شعرا نے نام آوری پیدا کی اور نظم و نثر کی کتابیں تصنیف ہوئیں بلکہ دیگر مراتب بھی طے پائے جن سے اردو کی ترقی میں مدد ملی۔ ان کی تدریے تفصیل بے محل نہیں ہو سکتی۔

فارسی کی تقلید میں دکھنی شعرا کے تذکرے بھی لکھنے کی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ ۱۱۶۴ھ میں خواجہ خان حمید نے گلشنِ گفتار[1] کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کیا۔ افضل بیگ خان نے ۱۱۶۵ھ میں اپنا[2] تذکرہ لکھا اس کے بعد ۱۱۶۸ھ میں خواجہ عنایت اللہ فتوت نے اپنا تذکرہ ریاض حسنی[3] اور ۱۱۷۵ھ میں لالہ لچھمی نرائن شفیق نے اپنا تذکرہ چمنستانِ شعرا[4] لکھا۔ ان سب کے بعد ۱۱۹۴ھ میں اسد علی خان[5] تمنا نے اپنا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد اور بھی تذکرے لکھے گئے۔

---

[1] سید محمد صاحب ایم اے عثمانیہ نے اس کو مرتب کر کے مکتبہ ابراہیمیہ کی جانب سے شائع کیا ہے۔

[2] اس تذکرہ کا ایک مخطوطہ دفتر دیوانی و مال سرکار نظام کے کتب خانہ میں ہے۔ ہم نے اس پر تفصیل سے مضمون لکھا ہے جو رسالہ "ہندوستانی" میں شائع ہوا ہے۔

[3] انجمن ترقی اردو نے اس تذکرہ کو شائع کر دیا ہے۔

[4] کتب خانہ آصفیہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ ہم نے تفصیل سے اس پر مضمون لکھا ہے (رسالہ معارف)

ان تذکروں میں نہ صرف جنوبی ہند کے شعرا کا حال لکھا گیا ہے بلکہ شمالی ہند کے شعرا کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اور بعض شعرا کے متعلق ایسی ادبی معلومات جمع کی گئی ہیں کہ وہ زمانہ مابعد کے شمالی ہند کے تذکروں میں دستیاب نہیں ہوتیں۔

آصف جاہ اول کے بعد بھی اہل علم اور اصحاب فن کی سرپرستی ہوتی رہی۔ نہ صرف سلاطین آصفیہ بلکہ امرائے عظام اور جاگیرداران بلند مقام نے شعرا اور اصحاب ہنر کی قدردانی اور دستگیری کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔ چنانچہ ارسطو جاہ جو ۱۱۸۷ھ سے ۱۲۱۸ھ تک وزیر اعظم بنے رہے شعرا کی سرپرستی کے لحاظ سے بھی مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے سیاسی کارناموں کے ساتھ ساتھ تہذیب اور تمدن، علم و فضل کی آبیاری سے بھی دکن کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ ان کی بارگاہ ہر علم و فن اور اصحاب ذوق کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ان کی سخن فہمی اور علم دوستی کے واقعات سے تاریخ دکن پر ہے۔ دو سو سے زیادہ شعرا کی سرپرستی کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ جو قصائد اور قطعات ان کی مدح میں موزوں کئے گئے تھے ان کے ضخیم مجموعے مرتب ہوئے ہیں جو "مجموعہ فصاحت[1]" اور "خزینہ سخن" کے نام سے موسوم ہیں ان کو اس دور کے ایک باکمال صاحب فن مورخ، شاعر اور ادیب شاہ تجلی نے اسمٰعیل یار جنگ کی فرمائش سے مرتب کیا ہے۔ ان میں شعرا کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار قصائد اور قطعات ہیں یہ مجموعے ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہوئے ہیں۔

دوسرے امرائے دکن مثلاً شمس الامرا مہاراجہ چندولال وغیرہ کا تذکرہ آگے

[1] راقم نے اس کتاب پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیا ہے جو مقالات ہاشمی میں شامل ہے۔

آتا ہے۔ ان اصحاب ذوق کی سرپرستی سے دکن کی سرزمین علم وفن اور تہذیب و تمدن کا مرکز بنی رہی۔ جو تمدن پیدا ہوا وہ مغلیہ تمدن کی یاد دلاتا رہا۔ اور جو کلچر وجود میں آیا وہ ہندو مسلم کے اتفاق، اور اتحاد کا انمول گنجینہ تھا۔

اس دور میں شاعری، مصوری، موسیقی کی جو ترقی ہوئی اس کے اظہار کے لئے ہمارے مختصر اوراق کافی نہیں ہیں۔ ہر عنوان کے لئے ایک ضخیم مقالہ درکار ہے۔

سلطنت آصفیہ کی اگرچہ سرکاری زبان فارسی تھی، اور علماء کا ایک بڑا حصہ فارسی میں اپنے کارنامے پیش کرتا تھا۔ فارسی گو شعرا موجود تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ عام طور سے اردو کی بھی ترقی ہوتی رہی۔ شعرائے اردو اور ادیب اپنے کارناموں سے اردو کے خزانہ کو پُر کرتے رہے۔ قصائد لکھے گئے۔ غزلیات کے دیوان مرتب ہوئے۔ مثنویاں لکھی گئیں۔ مرثیے مرتب ہوئے۔ غرض کہ باغ اردو سرسبز اور شاداب ہوتا گیا۔ اس کے بعد (یعنی ۱۲۲۰ھ کے بعد) وہ زمانہ آتا ہے جبکہ اردو کی ترقی کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اور اردو زبان میں انگریزی اور فرانسیسی کتابوں سے سائنس کی کتابوں کے ترجمے کی ابتدا ہوئی۔ اردو کا پہلا علمی رسالہ شائع ہوا تو وہ بھی دکن سے اور اردو کی یونیورسٹی قائم ہوئی ہے تو سلطنت آصفیہ ہی کے ہاتھوں۔ درحقیقت زبان اردو پر سلطنت آصفیہ کا جو احسان ہے وہ احاطہ تحریر سے خارج ہے، اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کو جو کچھ ترقی نصیب ہوئی وہ تمام اسی سلطنت کی آبیاری کے باعث ہوئی۔

(۳)

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اردو زبان کا یہ دور ۱۱۳۶ھ سے ۱۲۲۰ھ تک

تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ دکن کی مسندِ حکومت پر آصف جاہ اول اور آصف جاہ ثانی کی حکمرانی رہی۔

اس زمانہ میں نہ صرف اورنگ آباد ہی علم وفضل کا مرکز تھا یہاں گولکنڈہ و بیجاپور کے اہل کمال کے ساتھ دلی کے اہل کمال بھی موجود تھے بلکہ برہان پور اور حیدرآباد بھی شعر و سخن کے مرکز بن گئے تھے خصوصاً آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں جب حیدرآباد سلطنت آصفیہ کا دارالسلطنت قرار پایا تو اب دکن کے اہل کمال حیدرآباد ہی میں جمع ہو گئے۔ اور ایک زمانہ آیا کہ برہان پور اور اورنگ آباد کی جگہ بھی حیدرآباد ہی نے لی تھی۔

غرض کہ اس دور کے شعرا نہ صرف اورنگ آباد ہی بلکہ برہان پور اور حیدرآباد سے بھی تعلق رکھتے ہیں

اب ہم تفصیل کے ساتھ اس دور کے شعرا اور مصنفین کو پیش کرتے ہیں تاکہ اردو کی ترقی میں ان لوگوں نے جو جو خدمتیں کی ہیں وہ واضح ہوجائیں۔

اس دور میں عہد قطب شاہی و عادل شاہی کے کئی ایک الفاظ متروک ہو گئے مگر پھر بھی بیسوں لفظ وہی استعمال ہوتے تھے۔ مثلاً:۔

بن	بجائے	بغیر	بہئی	بجائے	بھلی
کنے	″	پاس نزدیک	غم ناک	″	غمگین
کبھو	″	کبھی	بر	″	تن جسم
پاناں	″	پہونچنا	ٹک	″	تک
ناہوے گا	″	نہ ہوگا	کن	″	کس

جان	بجائے	معشوق	کوں	بجائے	کو
سجن	"	معشوق	نت	"	ہمیشہ
تجہ لب	"	تیرے لب	کسو	"	کسی
توں	"	تو	مکہ	"	منہہ
جیوں	"	جب	میں	"	سے
مور	"	اور	اپس	"	اپنا

اس دور میں صدہا شاعر ہوئے جنہوں نے داد سخن دی اور اپنے کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا۔ ان شاعروں میں بیسوں ایسے ہیں جو دربار کے امیر اور صاحب مال و دولت تھے۔ بیسوں ایسے ملیں گے جو صاحب حال و قال تھے پیری مریدی ان کے گھرانے کی میراث تھی۔ کوئی رند نظر آئے گا تو کوئی صوفی ثبت ہو گا۔ غرض ہر طبقہ نے میدانِ شعر و سخن میں جولانی کی ہے۔ ان کی تعداد جن کے حالات دکھنی تذکروں[1] میں مندرج ہیں تقریباً دو سو ہوتی ہے۔

ان کے ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ اس لئے صرف چند افراد کے تذکرہ پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اس دور کے پہلے دکن میں عام طور سے مسلسل نظم (مثنوی) کا رواج تھا اور ہر ایک شاعر کوئی نہ کوئی مثنوی اپنی یادگار چھوڑتا تھا۔

---

[1] گلشن گفتار۔ ریاض حسنی۔ تذکرہ تمنا۔ چمنستان شعرا۔ ان میں سے نمبر ۱، ۳، ۴ شائع ہو گئے ہیں۔ اور صرف نمبر ۲ ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔

لیکن اب ولی کے بعد ایک عام تغیر ہو گیا اور شعراء غزل کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ اگرچہ ولی کے بعض ہمعصر شعرا نے بھی غزلیں لکھی ہیں مگر اس دور میں ولی کی پیروی میں غزلوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور شعرا نے غزلوں کے دواوین زیادہ بہ زیادہ مرتب کرنے شروع کئے۔ اس کے ساتھ مثنوی، قصیدہ قطعہ اور رباعی کی مشق بھی انہوں نے جاری رکھی۔

سلاطین قطب شاہی اور عادل شاہی کی طرح سلاطین آصفیہ نے بھی اردو میں شعر کہے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے کلام کو پیش کیا جاتا ہے:۔

آصف:۔ نواب میر قمر الدین آصف جاہ اول فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ فارسی میں بکثرت کلام ہے۔ آصف اور شاکر آپ کا تخلص تھا۔ عبد القادر بیدل سے اصلاح سخن لی ہے، اردو میں بھی آپ نے طبع آزمائی فرمائی ہے

کالی نہ کھو کوئی میرے دلبر کوں حسد سے
مجھ دل کی کلی بیچ دعا کی یمنی[1] ہے

شمیم کاکل مشکیں سے جب میں اونگ گیا
تو آئے کہنے لگے اس کو سانپ سونگ گیا

میں تنہا نہ تن بلکہ جان بیچتا ہوں
یہ ہنسنی کی ساری دکان بیچتا ہوں

---

[1] ریاض حسنی (تذکرہ فتوت) و تذکرہ تمنا۔

دور سے سمجھا تھا میں سنجاف کی تحریر ہے　　پاس جا دیکھا تو خوں عاشق کا دامن گیر ہے

ادھر دیکھو تو کس نازو ادا سے یاد آتا ہے　　مسیحا کی موئی امت کو ٹھوکر سے جلاتا ہے

کس طرح سے ماہِ نو انجم کے عقدے وا کرے　　ہوویں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے

جی سے کہہ دو کہ آہِ سرد کے ساتھ　　ٹہلتے ٹہلتے چلے تو چل نکلے

اس گلبدن کے غم میں رونا ہے عین حکمت
کرتی ہیں ضعیف دل پہ آنکھیں گلاب پاشی[1]

ناصر:- آصف جاہ اول کے خلف الرشید نواب ناصر جنگ شہید المتوفی ۱۱۶۴ھ بھی فارسی کے شاعر تھے۔ ایک سے زیادہ دیوان موجود ہیں، آپ نے اردو میں بھی طبع آزمائی فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں

نین تیرے شکار کرتے ہیں　　دل ہمارا فگار کرتے ہیں
خوب رو جب سنگار کرتے ہیں　　آرسی پہ بہار کرتے ہیں
کس پے داد سوں چمن میں آج　　پھول سارے پکار کرتے ہیں
اہل دل گریہ ندامت سین　　سیر ابرِ بہار کرتے ہیں
چشمِ بد دور کہ دلبریں سائے　　اپنے ناصر کون پیار کرتے ہیں[2]

یار خورشیدِ جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا　　ذرہ ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

[1] رسالہ نوائے ادب بحوالہ تحفۃ الشعرا فن تذکرہ فارسی نمبر (۱۲۲)، کتب خانہ آصفیہ۔ [2] تذکرہ فتوت۔

مجھے بہاری گلی ڈالا گویا خوش نہیں آتا
کھٹکتا ہے کلیجے میں وہ باریک سر ڈالا[1]

اے کبوتر جا کہ یوسف کو گو ہر سے نکل
چاہ سے تیرے زلیخا ہو گئی ہے باولی[2]

روز بد میں کس سے ہے یار و رفاقت کی امید[3]
گر زوال آتا ہے ٹل جاتا سایہ ساتھ سے

اب بعض دیگر شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

سراج:۔ سیّد سراج الدین سراج اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ درویش منش صوفی صافی تھے۔ ۱۱۲۶ھ میں تولد ہوئے اور ۱۱۷۷ھ میں[4] انتقال فرمایا۔ بہت پُر گو شاعر تھے، صرف چار سال کے عرصہ میں ضخیم دیوان مرتب کیا جس کے پانچ ہزار شعر ہیں۔ اس میں ردیف وار غزلیں، مثنویاں، مخمس، ترجیع بند رباعیات سب کچھ شامل ہے۔ مضامین کی شگفتگی، خیالات کی بلندی اور پھر کلام کی صفائی اور سادگی سے حیرت ہوتی ہے۔ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ کے شاعر ہیں۔

شمالی ہند کے تذکرہ نویس میر حسن اور میر کسی شاعر حمزہ کو ان کا استاد قرار دیتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ دکن میں کوئی شاعر اس تخلص کا نہیں گزرا۔ جہاں تک کہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے سراج کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں تھا۔

سراج نے اپنے کلیات کے علاوہ ایک مثنوی "بوستانِ خیال" بھی یادگار چھوڑی ہے۔ کلیات سراج" پروفیسر سرور کے اہتمام سے شائع ہوگیا ہے۔ "بوستانِ خیال" کا

---

[1] تذکرہ شفیق۔
[2] بیاض مملوکہ مولوی صفی الدین مرحوم۔
[3] طبقات الشعراء (شوق)۔
[4] تذکرۂ فتوت۔ تمنا۔ شفیق اور محبوب الزمن۔

مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

سراج کے کلام نے خود ان کی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی، ان کی غزلوں سے ایک طرف مجلس سماع میں صوفیا کو روحانی غذا بہم پہنچتی تھی تو دوسری طرف اہل ذوق کے لیئے لطف و مسرت کا ساماں ہوتا۔ غرض کہ دکھنی شاعروں میں سراج اپنی آپ نظیر تھے۔ ذیل میں نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے:-

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو توں رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

ہئی سمت غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیان کرو
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی

تری جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کو جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

کافر ہوا رشتۂ زنار کی قسم
تجھ زلف حلقہ دار کے ہر تار کی قسم

ہرگز مریض ہجر کوں بن وصل نہیں علاج
اس کی ادا کی نرگس بیمار کی قسم

تیرے بھنوں کی یاد نے ٹکڑے کیا ہے دل
ہے ذوالفقار حیدر کرار کی قسم

درشن دکھا کے آتش غم کو میرے بجھا
میں تشنہ لب ہوں درشن دیدار کی قسم

اس گلبدن کے شوق سے گلشن میں اے سراج
گلزار لالہ زار ہے گلزار کی قسم

بار کا بیدا نہ پاکر اے سراج شکر رحمٰن کر کہ تو واصل ہوا

اے سراج اپنی خودی کو بے خودی میں محو کر
شغل جاری رکھ ہر یک دم میں ہو الرحمٰن کا

تجھ قبا پر ہے نرگسی بوٹا گویا نرگس کا پھول ابھی ٹوٹا
لعل تیرے ہونٹوں کی سچی ہیں کیوں نہ یاقوت کو کہوں جھوٹا
عشق میں شوخ سنگدل کے سراج شیشۂ ناموس تنگ کا پھوٹا

تو احد ہے نام تیرا احمدِ بے میم ہے زیب پایا تجھ صفت سوں ہر ورق قرآن کا

دھوپ میں غم کے عبث جی کو جلایا افسوس پیو کے سائے میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا
سب جگت ڈھونڈ پھرا پیو کو نہ پایا ہرگز دل کے گوشہ میں مکان تھا مجھے معلوم نہ تھا

کیا شرابِ محبت نے دل کے خم میں جوش
عجب نہیں جو قیامت تلک رہوں مدہوش

جامِ مئے الست سے بیخود ہوں اے سراج
دورِ شراب شیشۂ پر مل سے کیا غرض

ہر قطرہ اشک درد کا بحر عمیق ہے مردم ہمارے چشم کا اس میں غریق ہے

الٰہی آہ کو آتش فشاں کر میرے آنسو کے پانی کو رواں کر

دریائے قناعت میں آزاد ہو جو آیا ‏ درکار نہیں ہرگز کشتی میں اسے لنگر

رباعی

تجھ غم میں ہے رنگ زرد باناں میرا ‏ دشوار ہے ہر کسی کو پاناں میرا
درکام نہیں کہ تجھ گلی میں جاؤں ‏ آناں تیرا ابھی ہے جاناں میرا[1]

سراج اور میر کا زمانہ ایک ہی ہے، شاہ سراج کی کئی غزلیں میر کے ہم ردیف ہیں۔ بعض کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

عشق نے خوں کیا ہے دل جس کا ‏ پارۂ لعل اشک ہے تس کا
چشم ساقی کے وصف لکھتا ہوں ‏ لے قلم ہات شاخ نرگس کا
بے کسی مجھ سیں آشنا ہے سراج ‏ نہیں تو عالم میں کون ہے کس کا

میر کی ایک اور غزل ہے

میرے سنگِ مزار پہ فرہاد ‏ رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

سراج کی غزل ہے

تجھ جدائی میں اے بہار مراد ‏ خوب لگتی نہیں چمن کی یاد

میر

موند آنکھیں سفر عدم کا کر ‏ بس ہے دیکھا نہ عالمِ ایجاد

سراج

نظر آیا ہے قد ترا مجھ کوں ‏ سرو آزاد گلشنِ ایجاد

[1] سراج کا کلام دیوان قلمی کتب خانۂ آصفیہ سے لیا گیا ہے۔

میرؔ

ہر طرف ہیں اسیر، ہم آواز — باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد

سراجؔ

دل ہمارا ہے مرغِ دست آموز — رحم لازم ہے اس پہ اے صیاد

سراجؔ کی مثنوی کا نمونہ

وہی بے خودی نے کیا تھا ہجوم — وہی کشورِ دل میں تھی غم کی دھوم
وہی آہ و زاری مرا کام تھا — وہی حال کیا صبح کیا شام تھا

صارم:۔ قبل ازیں[1] میں نے بیان کیا ہے کہ زبان اردو میں ہر کس و ناکس نے طبع آزمائی کی ہے۔ امیر سے لے کر ایک خانہ نشین فقیر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ایک طرف سراجؔ جیسے ایک آزاد منش درویش نے اردو کی خدمت کی ہے تو اسی طرح اپنے وقت کے دیوان میر عبدالحی خان صمصام الملک نے بھی اس کی خدمت بجا لانا اپنے لئے باعثِ فخر تصور کیا ہے۔ عبدالحی خان کو آصف جاہ نے قلمدان وزارت سرفراز فرمایا تھا۔ اورنگ آباد ان کا وطن تھا۔ ۱۱۴۲؁ھ میں تولد ہوئے اور ۱۱۶۲؁ھ ان کا سنہ وفات ہے[2]۔ صارمؔ تخلص تھا۔

میں مدت کے بعد ایک دم جو سویا — دیکھوں تو مجھ کنے ہے صنم گویا

سجن تجھ زلف میں ہل مل رہا ہے — ہمارے ہاتھ میں کب دل رہا ہے

---

[1] فتوحات۔
[2] تذکرہ شعرائے دکن

نہیں کھلتا بہار و باغ سوں دل — یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے

از بسکہ تم اب عشق کی سیکھیں گھاتیں — سب بھول گئے شادی کے باتیں

مجھے گر جاں کنی کا حکم وہ شیریں دہاں کرنا — کہاں اس کا خدا کی سوں لے یار و بجاں کرنا[1]

اعظم[2] :- سید اعظم نام - اعظم تخلص ، برہان پور وطن تھا - اور ولیؔ کا زمانہ دیکھا تھا :-

دل شمع نمن گل ہو جلانا مزہ جانا — معشوق کے اسرار چھپانا مزہ جانا
کعبہ کی عبادت میں حلاوت نہیں پایا — محراب میں تجھ بھوں کی دوگانا مزہ جانا[3]

ابدال :- مرزا ابدال[4] بیگ نام - ابدال تخلص - برہان پور کے رہنے والے تھے حمیدؔ نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے :-

دل جب سیں تجھ عشق میں مجھ سے جدا ہوا
بھڑکا جلا ہوا نہیں معلوم کیا ہوا
کیا بے وفا ہے دل کہ تری یک نگاہ سیں
بیگانہ ہو کے مجھ سے ترا آشنا ہوا
کوچے سے آہ آج پری رو کے دل مرا
آیا نہیں ہے پھر کے اسے کیا بلا ہوا

---

[1] تذکرۂ شعرائے دکن [2][3] گلشنِ گفتار۔
[4] ننوبت۔

سینے میں آہ دل میں طپش اشک چشم میں
ٹھہرائے عاشقی کا مرے جا بجا ہوا

غمزہ سیں مارتا ہے جلاتا ہے ناز سیں
کیا ملک حسن کا صنما تو خدا ہوا[1]

غضنفر:- غضنفر حسین کا بھی یہی زمانہ ہے۔ قدیم شعرا کی طرز پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے، جو جنگ نامہ عالم علی خان سے موسوم ہے۔ اس میں آصف جاہ اول اور عالم علی خان کے جنگ کے واقعات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ رسالہ اردو[2] میں یہ مثنوی شائع ہوئی ہے۔ شاعر کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات ہمیں حاصل نہیں ہیں:۔

اول حمد واجب ہے کرتار کا ۔۔۔ دو عالم کے وارث خریدار کا
قضا اور قدر جس کے ہے ہاتھ میں ۔۔۔ نہیں شک شبہہ کچھ کسی بات میں

ہر آن آپڑی مار تلوار کی ۔۔۔ بڑے زور کی اور بڑے مار کی
عزیزاں گئے چھوڑ سارے نکل ۔۔۔ نمک کی شرط نار کیے گئے نکل
جدھر دیکھتا ہے ادھر مار مار ۔۔۔ کیا جو رضا پاک پروردگار
سٹیا ہات ھت سوں شمشیر پہ ۔۔۔ سو مارے دیکھو جھٹکہ ہووے ادپر
لہو لال موں کے اوپر یہ چلا ۔۔۔ ادھر کا ادھر جا بجا بہ چلا
لئے ڈھال موں پر ابس کو چھپائے ۔۔۔ ادہر کا ادھر مار کوں موں جھکائے[3]

---

[1] گلشن گفتار۔ [2] جنوری ۱۹۳۲ء۔ [3] رسالہ اردو کی مطبوعہ مثنوی کے علاوہ مخطوطہ مملوکہ عبد الحمید صاحب وکیل کنٹر دیکھا گیا۔

خاکی[1] :- سید محمد قادری نام اور خاکی تخلص تھا۔ ولی کا زمانہ دیکھا ہے۔ دیوان ہنوز شائع نہیں ہوا۔ ریختی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے کتب خانہ میں ان کا دیوان موجود ہے۔

بیابن اے سہیلی الجنوں سے مکہ دھوتی ہوں
کبھی میں متمنع گھرا اندھارا دیکھ روتی ہوں
رہوں کیوں ابتدا میں میں دسے جب انتہا مجکو
فنا فی الشیخ ہوکر میں بقا باللہ ہوتی ہوں[2]

محرم[3] :- محمد ماہ نام، محرم تخلص معظم خاں خطاب تھا۔ شجاعت خاں صوبہ دار برار کے فرزند تھے۔ شفیق نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ سنہ ۱۱۶۶ھ میں انتقال ہوا۔

شاخ کی مینا کو کس شوخی سے لاتی ہے بہار
گل پہ شبنم نہیں اس کو مے پلاتی ہے بہار

نزاکت بس کہ رکھتا ہے وہ دلدارِ جہاں آرا
صفائی آینہ ہے باز اس کے عکس عالی کا

داود[4] :- مرزا داؤد نام اور داؤد تخلص اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد بلخ سے آئے تھے۔ داؤد کی پیدائش اورنگ آباد

---

[1] تنوت۔ [2] تذکرۂ ریختی تمکین۔ [3] چمنستانِ شعراء شفیق۔
[4] چمنستانِ شعرا، وتنوت وحمید۔

میں ہوئی، ولی کا تتبع کیا کرتے۔ بعض کا خیال ہے کہ ولی کے شاگرد بھی تھے۔ سنہ ۱۱۹۸ھ
میں انتقال ہوا۔ ایک مختصر دیوان یادگار ہے[1] جو ہنوز شائع نہیں ہوا۔ ان کے فرزند
جمال اللہ عشق بھی اچھے شاعر تھے۔ داؔؤد کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

عزیزاں خواب میں دیکھا ہوں آج اس سرو قامت کو
ہوا معلوم وقت آیا ہے میری سرفرازی کا

قانون شفا نطق میں ہے یار کے موجود
اے دل نہ ہو محتاج طبیباں کی دوا کا

مرا احوال چشمِ یار سے پوچھ — حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ
مرے حالِ پریشاں کی حقیقت — صنم کے زلف کے ہر تار سے پوچھ
مری ہر یک صدائے راہ کا پیچ — سجن کے چہرۂ بلدار سے پوچھ

آتشِ عشق سوں ترے جل جل — دل ہوا دل ہوا کباب کباب[2]

اخلاص:۔ ان کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں، البتہ اس کا پتہ چلتا ہے کہ یہ اس دور کے شاعر تھے، اور اپنے فن میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں ان کا کلام موجود ہے۔
کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

اوس روز قیامت ہوا یار کا چلنا — مجھ دل پہ دیا داغ جدائی کا دو بلنا

---

[1] اس کے مخطوطات کتبخانہ آصفیہ اور کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں [2] از دیوان داؤد

ہے فضل خدا کا وہ مجھے دیکھتا تجکوں | امید قوی ہے کہ مجھے یار سیں ملنا
اخلاص محبت میں رہو ہو کی سدا تم | وہ دن کی اپس زندگی میں سب تئیں ملنا

تجہ عشق بجاں سوز کا حافظ بھی خدا ہے | تجہ ماہ دل افروز کا حافظ بھی خدا ہے
ہے وعدۂ اخلاص اگر راست تمہں آج | تجہ قول کے اقرار کا حافظ بھی خدا ہے

دلبر گیا دل چھوڑ ہمارا بھی خدا ہے | ہے ظلم و ستم روز ہمارا بھی خدا ہے
نہیں شرط ہے اخلاص یہ ہر یک ستے ملنا | گئے ہم سنیں مکھ موڑ ہمارا بھی خدا ہے[1]

عاشق:- میر یحییٰ عرف عاشق علی خان المتخلص بہ عاشق، برہان پور وطن تھا۔ آصف جاہ اول کی رفاقت میں اورنگ آباد آگیا اور یہاں ہی عمر گزار دی علم و فضل اور انشا پردازی کی وجہ سے اپنے زمانہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اسی طرح شعر گوئی میں پوری مہارت تھی۔ فتح علی گردیزی، علی ابراہیم خاں وغیرہ نے ان کا حال لکھا ہے۔ شیدا سے تلمذ تھا۔ عبدالجبار ملکاپوری نے بھی اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں ایک مختصر دیوان موجود ہے[2]۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

صفحۂ دل پر کتابت کر کے بسم اللہ کا | تحفہ صلوات لکھتا ہوں رسول اللہ کا
بصنعتہ متی جسے فرمائے ہیں حضرت رسول | جی سیں کہلاتا ہوں بندہ خاص اس درگاہ کا

دلی سن یہ غزل عاشق کہتا اگر ہوتا | رہا کر سگ ہو تو نجم نبی کے آستانے کا

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات، ص ۳۱۳۔
[2] تذکرہ اردو مخطوطات، ص ۱۶۹۔

جب ملے شیدا سا کوئی اوستاد صاحب معرفت — خوب ظاہر ہوئے عاشق بھید عشق اللہ کا

یار و شفق میں ڈوب گیا آفتاب سب — دیکھ اوس صنم کے طرۂ زرنار کی لٹک
عاشق جو گلرخوں میں نہیں ہوش کیا عجب — سن یار کی زبان سیں مجھ اشعار کی لٹک

تنگ کرتا ہے سر یجن کا تغافل رنگ رنگ
پہنچ دیتا ہے پریشانوں کو کاکل رنگ رنگ[1]

جام کو لب سے آشنا مت کر — نام اوس کا پیا کٹورا ہے

ہر ایک ساغر کے پیچھے چومنا تسپہ دہن اوس کا
گزک عاشق علی خاں کو مستی میں بہاتی ہے

بات پر بات میرے دہر کے چلے چلے آناسات — دیکھ طالع کے مدراج پڑی برسا بات

جس وقت جان نکلی مجھ پاس کوئی نہ آیا — شمشیر تیری ایکدم بیٹھی تھی میرے سر پہ

ہیں شہید کربلا سب سرخ پوش — مصطفیٰ کی آل کا کیا رنگ ہے[2]

ایما ؔ:- عاشق علی خاں ایما، خوشحال خان ان کے نانا کا نام ہے۔ خوشحال خان کا عالمگیری عہد میں بادشاہ کے زمرۂ منصبداران میں شمول تھا۔ ایماء نظام الملک آصف جاہ کے منصبداروں میں شامل تھے۔ عربی اور فارسی کے

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات ص ۱۶۹ ۔ [2] تذکرہ محبوب الزمن ص ۴۲۳ ۔

علاوہ ہندی سے بھی واقفیت تھی۔ شعرگوئی اور تاریخ گوئی کا بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ۱۱۷۲ھ سنہ وفات ہے[1]:-

طبیبِ عشق میں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا
کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

عاشق نہیں ہے تجکو کچھ خوف معصیت کا
موسیٰ رضا بنیں گے امام ضامن اپنا

کیوں نہ گھبرا دے وہ کمانِ آبرو واسطے جس کے کھینچتے ہیں چلّے[2]

عاصی:- نور محمد نام عاصی تخلص۔ برہان پور کے باشندہ تھے۔ ان کے باپ عالمگیر کے زمانہ میں کاشغر سے برہان پور آئے تھے۔ آصف جاہ اول کے ایک صوبہ دار نصیر الدولہ کی ملازمت اختیار کی۔ عاصی کی یہاں پیدائش ہوئی۔ کم عمری میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ شاعری شروع کی۔ محمد علی تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔ نصیر الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا اس کی بنا پر داروغہ قلمدان بنائے گئے۔ نصیر الدولہ کے انتقال پر راست آصف جاہ کی سرکار سے عاصی کا تعلق قائم ہو گیا۔ اور پھر ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے زمانہ میں بھی سرکار آصفیہ کے نمک خوار رہے۔ ۱۱۷۵ھ میں انتقال ہوا[3]۔

چند مثنویاں تصنیف کیں جن میں سے خلاصۃ المعانی اور انواع العلوم کا

---

[1]، [2] تذکرہ شعراء دکن، گلزار آصفیہ۔ [3] فنونت شفیق۔ [4] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

پتہ چلتا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

تجہ غم کی آگ دل میں رکھا ہوں چھپ کے میں
ڈرتا ہوں تا فلک نہ اڑے یہ شرر کہیں
تجہ قد کی جب سے نقل کیا ہے چمن میں جا
دیکھا نہ تب سے سرو نے روئے ثمر کہیں
سمجھے ہیں ہم کہ اب کہیں تم نے دل دیا
بیٹھے کہیں ہو بات کہیں ہے نظر کہیں

کیا ظلم ہے اے سُوی پلکوں والے ۔۔۔ آہستہ سیو زخم ہیں دل کے آلے[2]

مہر:۔ مہر علی[3] نام اور مہر تخلص تھا۔ کم عمری سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ مرزا محمدی بیگ مرزا سے اصلاحِ سخن لی ہے۔ سراج اورنگ آبادی سے ہمعصری تعلق ہے۔ ان کی رنگین خیالی اور خوش فکری کی شفیق نے بڑی تعریف کی ہے۔ ۱۱۷۰ھ میں انتقال ہوا۔

خاک ہونا کیمیائے عشق کی تدبیر ہے ۔۔۔ پارۂ بیتابئ دل مارنا اکسیر ہے
آبروپائی شجاعت نے عطائے فقر سے ۔۔۔ موج نقشِ بوریائے جوہرِ شمشیر ہے

دن بدن کیوں زرد رو اور ناتواں ہوتی ہے یہ
کچھ دوا کر باغباں اس نرگسِ بیمار کی

ظاہر میں عشق و حسن میں اتنا ہی فرق ہے ۔۔۔ تم نے جفا و جور کئے میں دعا دیا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ [2] تذکرہ شعرائے دکن (قلمی)۔ [3] شفیق (قلمی)۔

سوزِ دل سے آہ کی بھڑکی اٹھاؤں تو سہی　　خرقۂ پشمینۂ زاہد جلاؤں تو سہی

پڑھ نماز بار تو ہر وقت رندوں کو نہ چھیڑ　　تجھ کو اے زاہد پرائی کیا پڑی[۱] اپنی نبیڑ

اسی مضمون کو تقریباً ایک صدی بعد خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی (متوفی ۱۲۷۱ھ) نے یوں ادا فرمایا ہے:۔

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو　　تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

یہ توارد بہت دلچسپ ہے۔

عاجز:۔ عارف[۲] الدین خان عاجز دکن کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کے باپ اورنگ زیب کے عہد میں بلخ سے ہندوستان آئے تھے۔ عاجز کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ دربار آصفی میں باریابی کا شرف حاصل تھا۔ منصب بھی حاصل تھا۔ فوج کے بخشی بنائے گئے تھے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہا کرتے۔ ان کی یادگار ایک مثنوی "لال وگوہر" اور دیوان ہے۔ یہ دونوں کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یورپ[۳] میں بھی ان کے نسخے موجود ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو میں بھی ان کا ناقص دیوان موجود ہے۔ دکن کے ہر ایک تذکرہ نویس نے ان کا ذکر بڑی تعریف سے کیا ہے۔

بعض اصحاب مثنوی لال وگوہر کو عاجز کی تصنیف اس لئے خیال نہیں کرتے کہ وہ صاف اور سادہ زبان میں لکھی ہوئی ہے مگر عاجز کے کلام کی یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ وہ تمام تر سنگ لاخ زمینوں میں ہی ہوتا ہو۔ ان کے دیوان میں دونوں

---

[۱] شفیق: تمنا۔　[۲] حمید۔ ذوق۔ شفیق۔ تمنا۔　[۳] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۵۲۵۔

قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ ۱۱۷۰ھ میں عاجز کا انتقال ہوا۔ نمونہ کلام درج ہے :۔

مثنوی لال و گوہر

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی　　عطا کر مجھ کو یاقوتِ معانی
سخن کا لعل دے میری زبان کو　　دُرِ معنی سے بھر میرے بیان کو

کروں میں دشت کی کیونکر صفت کو　　زبان پر کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار　　اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار
بیابانِ عدم کے تھا برابر　　وہاں تھا جہاں عزرائیل کو ڈر
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی　　وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی باد تھی شوریدہ صرصر　　وہاں کی کنکری تھی مثلِ اخگر
بگولا تھا وہاں دن رات قائم　　وہاں چکر سدا آندھی تھی دائم
کبھی سردی سیں ہر ہر کانپتا تھا　　کبھی گرمی سیں دم ہرپانتا تھا
کبھی روتا تھا نیستاں کو نظر کر　　غرض ہر حال میں کہنا تھا گوہر

الٰہی کب دلِ غمگیں ہمارا شاد ہووے گا　　یہ اجڑا شہر یا رب کس گھڑی آباد ہووے گا

ادا سیں گر ہماری بزم میں وہ فتنہ ساز آوے
بجا کر مہر کا وف چرخ کھا کھا کر گرے زہرا

سحر اس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا
ظہورِ حق کو دیکھا خوب دیکھا باضیا دیکھا

تمہارے پنجۂ رنگین کو گر چمن دیکھے   اڑے گلوں ستی رنگ بہار ہانوں ہات

نہ پیچ و تاب ہوا سے ہے آب میں گرداب
کہ میری اشک کے آگے کرے ہے جیوں رقص

ہاں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اجڑا سمجھوں
مشت خاک اپنی اڑا کر اوسے صحرا سمجھوں

ہے عاشقوں کو پند و نصیحت سے احتیاط
مستوں کو جیسے واعظ کے صحبت سے احتیاط

اس کے ہم دام محبت میں پھنسے ہیں عاجز
بال جس شوخ ستمگر کے گھنگر والے ہیں

تم بن اب آہ دل میں لگی ہے کھٹ پٹ
آنکھوں سے اشک پل پل گرتے ہیں لال پٹ پٹ

درگاہ :- درگاہ قلی خان المتخلص بہ درگاہ موتمن الدولہ سالار جنگ بہادر خطاب تھا۔ خاندان قلی خان کا فرزند تھا۔ خاندان نواب سالار جنگی کے آپ ہی مورث اعلیٰ ہیں۔

آصف جاہ اول نے آپ کی سرپرستی فرمائی۔ اور جس وقت آپ کی عمر صرف چار سال کی تھی جاگیر اور منصب سے سرفراز فرما دیا تھا۔ بیس سال کی عمر سے آپ آصف جاہ اول کے ہمرکاب رہنے لگے۔ نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ

لے تمنا

مرحوم کے زمانہ میں آپ کے مدارج میں مزید ترقی ہوئی۔ خطاب سے سرفراز کئے گئے۔ ایک زمانہ تک صوبہ خجستہ بنیاد کے صوبہ دار رہے ۱۱۷۹ھ میں خدمت سے علیحدگی اختیار کرکے اپنی جاگیر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۱۸۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ جاگیر سے لاش اورنگ آباد لائی گئی اور باپ کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ فارسی کے آپ اچھے شاعر تھے اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر مرثیے کہا کرتے تھے۔

نمونہ قصیدہ

پڑی ہے آکے گلے ناگہانی بلا سفر
سفر نہیں ہے سفر بل سقر سے ہے بدتر

زباں خامہ ہے اس کے بیاں میں عاجز
ہے جس کا شمہ کلفت حساب صد دفتر

اسیر پنجۂ تعذیب صامت و ناطق
غریب بچہ تخریب ہے گا سب لشکر

نہیں ہے تختہ بازار پہ اناج کی جنس
نہ غلہ بلکہ سبھی نقد و جنس ہے کمتر

گیہوں کی جنس ہے نایاب مثلِ آدم خوب
مثل میں نظر آتی نہیں ہے اب تو بہ

مگر ذخیرہ کیا ہوئے ماش خوروں نے
ہے دال ان کی رکاکت پہ باکمال ہنر

ہوا ہے قحط سے دیکھو دوبا جرا عالم
نہیں ہے ہمت اک جو کسی میں بل کمتر

اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند
کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقتِ سحر

کھڑا ہے آکے سرہانے یہ پیر نورانی
لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کہا کمال عنایت سے کیا ہے فکر تجھے
ہے تیرے کام کا حامی امام جن و بشر

شہ سریر کرامت امیر کل امیر
ولی حضرت مولیٰ وصیِ پیغمبر

امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک
کہا ہے لحمک لحمی جسے شہِ سرور

فزوں جو حد بشر سے ہے منقبت اسکی ہوا ہے مشرق خاطر سے مطلع دیگر

جناب اقدس حیدر رہے وصف سے برتر یہاں وصف سے عاجز لب و دہان بشر

مراد بندۂ درگاہ روز ہے کہ کرے ابو تراب کی تربت کی خاک کحل بصر[1]

بغیر اوس کے کہو کون شاہ مرداں ہے خدا نے سیف دیا اور رسول نے دختر

پکھراج غم سے زرد و زمرد ہے زہر نوش موتی کے دل میں چھید ہے نیلم سیاہ پوش

اس دکھ سے اس دل یاقوت ہے خموش مرجان لہو و لعل بدخشاں لہو لہو

فریاد کرکے شاہ شہیداں کہے خدا چھوٹے بڑے شہید ہوئے کوئی نہیں رہا

جینا ہے تلخ ہائے نہیں زندگی روا بیگا وداع اہل حرم سخت اب بلا

کلثوم و شہربانو و زینب یہ ماجرا سن کر گرے ہیں پاؤں پہ مل پچھاڑ کھا

جانے کہاں ہو چھوڑ ہمیں وا مصیبتا ہم سب کریں گے جان تیرے پاؤں پہ فدا

اے وارث غریباں بہر خدا مرد

بے یار و بے برادر و بے آشنا مرد

حاجی[3] :- میر اکبر علی نام اور حاجی تخلص۔ رمل میں کافی مہارت تھی مظہر تاباں اور سودا کا زمانہ دیکھا ہے۔

رکھتا ہے آج قتل کا دل میں خیال توں غصے کی تیر سے ہم نے یہ نظریں پچھانیاں

بھٹکتے باغ میں پھرتے ہو کیوں اے عندلیبو تم

چمن میں گل ہزاروں ہیں ولے اس گل کو آ دیکھو

---

[1] دہلی بارہویں صدی ہجری میں۔ [2] تذکرہ تمنا۔ [3] چمنستان شعرا

چشمِ شہلا دیکھ اس کی ہو گیا مخمور دل
کیونکر بھولے مجھ سے ایسے نرگستان کی بہار
اس کے دامِ زلف میں حاجی ہوا پابند آج
ہے پریشاں جس کے آگے سنبلستان کی بہار

کل تو ہمارے گھر میں تم آؤ گے یا نہیں ۔۔۔ اپنا جمال ہم کو دکھاؤ گے یا نہیں
جلتا ہوں جیوں سپند تمہارے فراق میں ۔۔۔ آتش کو دل کی جان بجھاؤ گے یا نہیں [1]

رحمت:- خواجہ رحمت اللہ نام رحمت تخلص، ایک صوفی بزرگ تھے جو دکن میں مشہور رہیں - خواجہ صاحب تورانی الاصل تھے اور سادات حسینی سے تھے آپ کے والد، آصف جاہ اوّل کے ہمراہ دکن میں آئے تھے، اس کے بعد بیجاپور کے ایک گاؤں بلگاؤں میں اقامت کر لی، رحمت اللہ یہاں تولد ہوئے۔ جوان ہو کر حاکم کرنول کی ملازمت میں شامل ہوئے ۔مگر جب سید علوی بیجاپوری کے مرید ہوئے تو دنیا ترک کر دی۔ مکہ معظمہ گئے وہاں سید اشرف مکی سے فیض باطنی کا اکتساب کیا واپس ہو کر مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے کڑپہ آئے۔ یہاں ادھوگیر کے قلعہ دار عبدالقادر خان نے آپ کے نام پر رحمت آباد آباد کیا، ادوگیر میں خواجہ رحمت اللہ کا انتقال ہوا، خواجہ رحمت اللہ ''نائب رسول اللہ'' کے نام سے مشہور ہوئے [2]

خواجہ صاحب شاعر تھے، چند مثنویاں آپ کی یادگار ہیں۔ ان میں سے

---

[1] چمنستان شعراء [2] اولیاءِ دکن جلد اول صفحہ ۳۶۲

ایک "تنبیہ النساء" ہے ۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے اس میں عورتوں کے لئے نصیحتیں بیان کی گئی ہیں ۔ اس کے کئی نسخے کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں[1]، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ۔

حمد بے حد ہے اوسی سبحان کو ۔۔۔ جو کیا پیدا جسم اور جان اکو
وہ جہان کا خالق و دائم ہے او ۔۔۔ سب فنا آخر کے تئیں قائم ہے او

بد رسم اون کے چھڑانے کے بدل ۔۔۔ ہیں کیا مشرک رسم سارے نقل
کفر کے چن چن رسم بولیا ہوں میں ۔۔۔ شک شبہ کے سب گرہ کھولیا ہوں میں
جو سخن سانچا اقتدا بر حق تمام ۔۔۔ بے ملاحظہ ہو گیا مطلق تمام
فاضلاں کو بات یہ نا بات ہے ۔۔۔ جاہلاں کے تئیں جگر میں لات ہے

نام تنبیہ النساء اس کا دھر دن ۔۔۔ مشرکاں کے رسم سب ظاہر کردن
یا الٰہی اپنی رحمت فضل کر ۔۔۔ رات اور دن رحمت اللہ کے اوپر

خواجہ صاحب نے معاشرتی اور مذہبی برائیوں کو نہایت سخت اور بلیغ الفاظ میں واضح کیا ہے اور نہایت عریاں الفاظ میں ان کو بیان کیا ہے ۔ انہوں نے برے رسوم اور رواج کی بری طرح خبر لی ہے اور مذمت کرتے ہوئے مضحکہ اڑایا ہے ۔ طنز نگاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

سن سہاگن بات میری رکھ نام ۔۔۔ دیکھو تو فقہ عقائد میں تمام
سب کتاباں میں نکاح مذکور ہے ۔۔۔ رسم تیرا کس میں نہیں منظور ہے
بد کے عادس نوشہ کو جواز ۔۔۔ دو رخی مت ہی چھوڑا روزہ نماز

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صہ ۱۷

گئے سماں ڈھونڈ کر بکارتی رہی تو | کانگی نرسو کی پوجاری بنی رہتو
رقص شادی میں کرانا ہے گناہ | بی مراسن کو بلانا ہے گناہ
ونیسے بی بی کا نکاح ایسا ہوا | کیا سب تو یہاں جو کرتے چلو ہا

ہدایت:۔ ہدایت اللہ خان شمالی ہند کے باشندہ تھے۔ حیدرآباد آکر یہاں ہی مقیم ہو گئے، پہلے امیر بیگ کے ملازم ہوئے، پھر شمس الامرا کی پائگاہ میں منتقل ہوئے۔ شمس الامرا کی سرپرستی حاصل رہی۔ قصائد اور ہجو دونوں لکھا کرتے۔ قصائد میں ہدایت اور ہجو میں افسق تخلص کرتے تھے۔

ان کے قصائد تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں، اس میں آصف جاہ ثانی کے عہد کے بعض حالات درج ہیں، ۱۱۹۸ھ کے لکھے ہوئے قصائد کا ایک مجموعہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[1]۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

ایسا بلند جس کا وہ عشرت محل ہے خاص
اطلس سے آسماں کے جسے سائبان رہے
کیجے سواد صحن کا اوس کے یہاں اگر
مشتاق اوس کو دیکھنے باغ جناں رہے
قامت سا گلرخوں کے ہر یک جس کا سرو سبز
فیض نسیم صبح سے جلوہ کناں رہے

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ (۱۲۱)

آب و ہوا کے جس کی تفرج کے خرچ سے
ہر غنچہ دل کا گل سا شگفتہ وہاں رہے

قالین کے جس کے فرش کا گلزار دیکھ کر
نرگس کی چشم وا یہ سوئے آسماں رہے

احمر بنفشہ سوسن و سنبل چمن چمن
زیبِ روش سے فرش کے گستر نشاں رہے

بارِ ثمر سے مجرے کو خم ہووے ہر نہال
رونق فزا جیب اوس میں وہ شاہ جہاں رہے

رقصاں بمثل حور کے ہر اہل رقص وہاں
طاؤس سا یہ زیب مسرت کناں رہے

ایسی طرح سے بزم طرب گرم ہوئے وہاں
ہر عندلیب بخوشی غزل خواں رہے

اس قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو۔

ہے دل میں جب تلک کہ مرے تن میں جاں رہے
اور نہ دہن میں فضل خدا سے زباں رہے

ارسطو جاہ وغیرہ کی ہجو کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

حال پہ فرعون سا غرے میں جو بڑھ چڑھ رہے — سر پر اوس کی قبر میں نت آتش آمود ہے
ایک دن اہل سپہ کورہ میں یوں دکھلا دیا — نہ زرہ تن میں اور سر او پہ ہر اک کے خود ہے
کردن کیا شرب و مذہب کا ذکر اب اس کے — نہ شیعہ اور نہ سنی نہ نطفہ اکفیر

نہ شیخ، سید و مرزا نہ قوم افغان ہیں | جولا ہا ذات کا مومن نام وہ ہے شریر
حریف اپنے بے محسن کا آشنا کش وہ | غریب اور حرامی ور اصل جیوں عصیفر

فضلی:- شاہ فضل اللہ فضلی[1] اورنگ آبادی - یہ اور ان کے باپ سید عطاء اللہ نمازی الدین خان فیروز جنگ کے ساتھ مدتوں رہے فضلی کے اشعار میں ایہام زیادہ ہوتا تھا - کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے قصہ "پریم بن کا" اور قصہ "ببرہ بیوکا" اردو مثنویاں ہیں فن سلوک میں بھی ایک رسالہ موسوم "زاد راہ" ان کی تصنیف ہے ۱۱۸۴ھ میں انتقال ہوا۔

دیکھ کر تیرے پاؤں کی مہندی | مجکو تلوؤں سے آگ لگی

اے کبوتر جا کہہ یوسف کو کو میں سے نکل
تجھ بنا رو رو زلیخا ہوگئی ہے باولی

رکھا ہوں نیم جان جاناں تصدق تجھ پہ کرنے کو
کیا سب تن کو میں در پن اچھو درشن بنا ہوں

دو بہوال دیکھ کر کہا میں یوں | دو گھڑی رات دن میں آتی کہوں

یار[2]:- نواب منور الدولہ احمد یار خان بہادر رستانہ جنگ امراء دربار آصفی سے تھے ان کے باپ شجاعت الدولہ بہادر دل خان ناظم حیدرآباد تھے - احمد یار خان کا تخلص یار تھا شاعری کا بڑا شوق تھا - فقر دوست تھے ۱۱۸۵ھ میں انتقال ہوا -

---

[1] حمید - نغمات[2] شفیق، تمنا

بہارِ گلشن خوبی چمن میں آیا ہے   کہاں ہے جام کہاں ہے شراب کا شیشہ

گریباں چاک مطعونِ جہاں بدنام عالم ہوں
پڑے خاک اس طرح کی ہائے رسوائی کے جینے میں

صنم نے میرے سخن کو سن سن کہا اتنا نہ مضطرب ہو
جو ابتدا کو نہیں سمجھتا تو کیا خبر ہوگی انتہا سے

مجھ سے پوچھا کہ کہو تم میں وفا ہے کہ نہیں   میں کہا تم تو کہو تم میں جفا ہے کہ نہیں

ہمارے دل کو ناحق خوبرو ہر دم جلاتے ہیں
کہیں بت بتکدے کے بھی برہمن کو ستاتے ہیں[1]

شیدا:۔[2] نوازش علی خان بہادر نام و خطاب اور شیدا تخلص تھا نواب نظام علی خان کے میر سامان تھے متعدد ضخیم مثنویاں لکھی ہیں ان میں سے ایک "اعجاز احمدی" نام آنحضرت کی سیرت ہے اور دوسری "روضۃ الاطہار" واقعات کربلا پر لکھی ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۷۳ھ ہے۔ گلشن ایمان کے نام سے تیسری مثنوی لکھی ہے۔ شیدا بڑے پُرگو شاعر تھے۔ ان کی ضخیم مثنویوں سے ان کی پرگوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اعجاز احمدی کی زبان کے بہ نسبت روضۃ الاطہار کی زبان زیادہ صاف ہے اور اسلوب میں بھی روانی ہے۔ یہ مثنوی بارہ مجلس پر منقسم ہے اس کی کئی خصوصیات ہیں۔ مثلاً یہ کسی فارسی کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مصنف کی ذاتی اپج ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف تاریخی حالات ہی کو منظوم

---

[1] چمنستان شعرا و تمنا۔ [2] فتوت۔

نہیں کیا ہے بلکہ معجزے اور روائتیں بھی بیان کی ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ دکنی مثنویوں کی یہ آخری یادگار ہے اس کے بعد جو مثنویاں دکن میں لکھی گئی ہیں وہ شمالی ہند کی فصیح اردو میں لکھی جانے لگیں۔

"اعجاز احمدیؐ" کا حجم "روضۃ الاطہار" سے زیادہ ہے یہ مثنوی کئی حصوں میں منقسم ہے۔

"گلشن ایمان" میں نعتیہ قصائد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اوّل الذکر دونوں مثنویاں کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو وغیرہ میں موجود ہیں۔ مگر آخر الذکر یعنی گلشنِ ایماں نایاب ہے۔

شیدا شاہی عاشور خانہ کے منتظم بھی تھے، انہوں نے عزاداری اور مرثیہ خوانی کو بہت ترقی دی تھی، علم مغفرہ وغیرہ کی نگرانی بھی شیدا کے ذمہ تھی۔

اعجاز احمدی کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

اے ساقی مجھے دے توں جام ہلال — کہ ہے بدر کی جنگ کا اب خیال

نہ وہ جام جس سیتی ہووے خمار — کرے بلکہ اسرار کا راز دار

قلم کا یہ میری ہلالی تراش — اسے بدر کی فتح کا ہے تلاش

سنو اے محبانِ نصرت شعار — ہوا بدر کا کس طرح کارزار

کہ پہنچی نبی کوں خبر ناگہاں — کہ نکل ہے کعبہ سیں کب کارواں

گراں جنس ہے سات اونٹی تمام — وہ جہتی ہیں جانے کیتیں ملک شام

بوسفیان ہے اس کارواں میں امیر — ہوئے ہیں رفیق اس کے کئی یک شریر

لکھے راویاں ہے روایت صحیح — میں کر بیاں ہوں سنو تم صریح

کہ بیٹھے تھے ایک دن امام الرسول | مہاجر و انصار حاضر تھے کل
یہودی اک آتا ہے با احتشام | تھا نام اس کا عبداللہ ابن سلام
شرافت میں اس سا نہ تھا دوسرا | اتھا عقل میں علم میں وہ رسا[1]

دیکھے عباس سرور کے علم دار | موئے بھائی بڑے سارے ہیں یکبار
کسی کا سر نہیں ہے تن کے اوپر | کسی کے ہاتھ کٹ گئے ہیں سراسر
کسی کا تن ہے سب زخموں سے چور | پڑا نزدیک کوئی ہے کوئی ہے دور

عمر دیکھا کہ پانی سے چلے ہیں | بہادراں کے آگے سے ڈھلے ہیں
اگر پیوینگے یہ پانی وہ پیاسے | کریں گے جان سے ہم کو نراسے
سو مردا ینکو ایک سرور کے تئیں | وہ بھیجا چار ہزار سوار دے دیکھیں
گرے عباس پہ ایک باری | لڑائی آپڑی اس وقت بھاری
ہوا جب ختم یہ مضمون ماتم | کہا تاریخ ہاتف مجلس غم ۱۱۷۳ھ
کیا چاہو تم آسانی سے اذبر | اگیارا سو برس تھے تب تہتیر
ارے نیدا دعا پر اب زبان کھول | جناب حق ہیں اپنا دعا بول[2]

چمن کے گلگشت کو نکلتا یوں گھر سے جب خوش خرام نکلا
تیرے بھواں کے ادا دیکھنے ہلال کرتا سلام نکلا
اگرچہ کتنے تھے قمریاں سب چمن میں آزاد سر و سا نہیں
جب ہم نے تحقیق کر کے دیکھے تمہارے قد کا غلام نکلا

---

[1] اعجاز احمد [2] روضۃ الاطہار [3] فتوت

قیاسی:- سید عبد اللہ نام اور قیاسی تخلص تھا۔ ۱۱۶۱ھ میں ایک مثنوی طوطی نامہ کے طرز پر لکھی تھی جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم[1] میں ہے۔

پوچھی لعل ہیرے ہیں تیرے کتنے | کہیا نیں ہیرے لعل میرے کتنے
ہے بازو کے دو کاندار ان کیتیں | بلا کرے آیا بزاں ان کوں دیں
کتک دھات کے اوجیا ہیرے آئے | بھوت بے بہا بیش نادر لے آئے
کیتک وقت لگ شہر سارا ابھر آئی | بھوت کر کے ماندے سو یک ٹھار لائی
ہزار ایک کوچے میں بھڑکل اتھا | دو تینوں کوں اس جا گٹے اوپر بٹھا
کہی یاں اچھو گھر میں جاتی ہوں میں | تمارے لئے پیسے لے آتی ہوں میں

کہ ایسا ئی بنائی او نادر بچہ | جکوئی دیکھ بولیں ہے آدمی سچا
عجب صنعتی سوں بنائی اوسے | کہ کپڑے او بستان پنائی دسے
کہی جان اہے جو نہری کی دوکان | اسے دائی لیا جکوں دو ہی ٹھتان
بچے کوں لے کر اپنے گود کے بیچ | سنوار سر اُپر برتنے کون و پنجہ
لے کر دائی کوں سات نکل بہار | چلی ڈولتے ٹھکے سوں جوں گلعذار سلہ

دردمند[2]:- محمد فقیہ دردمند اور گیر (بیدر) کے رہنے والے تھے - دہلی جاکر مرزا مظہر جان جاناں کی شاگردی کی - ان کا ساقی نامہ مشہور ہے ان کے ساقی نامہ کے متعلق رسالہ اردو[3] میں تفصیل سے مضمون شایع ہوا ہے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

لہ ۔۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات صد ۵۰۰، ۲ے چمنستان شعرا و تذکرہ و تمنا، ۳ے بابت جولائی ۱۹۲۴ء

ہے غم سے رقیبوں کے میرا دل ناشاد
اس دہر سے جاتے ہیں سبھی عیش برباد

پرویز کے شیشہ خانہ عشرت پر
سنگ آباد ایک سخت، آیا فرہاد

ساقی نامہ

ارے ساقی اے جانِ فصلِ بہار
یہی تھا ہمارا و تیرا اقرار

بہارے بسر نیں کی یہ فصل ہے
فراموش کرنے کی یہ فصل ہے

کہ ہیں جاں بلب ہوں پیالے کی طرح
لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح

ادا سے بہکنے کی تجھ کو قسم
نشے سے بہکنے کی تجھ کو قسم

تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں
تجھے اپنے سوگند کھانے کی سوں

جو تو نے کیا مے کو مجھ پہ حرام
تو اتنا کر دے ظالموں کے امام

کہ اسی سرکشی سیں نہ کر پائمال
مرے خون کو مے کی طرح کر حلال

سامی[1] :- غلام قادر نام اور سامی تخلص تھا۔ اورنگ آباد کے باشندے تھے۔ شاعری میں خوب ملکہ تھا۔ خوش نویس بھی تھے ان کے والد کو آصف جاہ اول کے زمانہ میں نو ہزاری کا منصب حاصل تھا۔

سامی نے ایک مثنوی "سرو شمشاد" نام لکھی تھی جس کے سات ہزار شعر تھے ایک اور قصہ "طالب و موہن" نام لکھا تھا۔ شفیق نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ خصوصاً "سرو شمشاد" سے انھوں نے بڑا تاثر حاصل کیا ہے۔ "سرو شمشاد" کا ایک

---

[1] چمنستان شعراء، ریاض حسنی فتوت

نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔[1]

کہ اے شمشاد باغ بے قراری — گل رنگین بہارِ غم گساری

پس از آداب شوق بیقراراں — کہ وسعت ہجر سیں ہیں اشک باراں

دو ابر کو سلام اس قد خم سے — نگہ کو دیدہ بوسی چشم نم سے

ہمیں کیا جاؤ چل کر باغ و بستاں — کہ ہے کنج قفس ہم کو گلستاں

طبیبوں کو عبث دیتے ہو آزاد — بنے ہیں ہم غمِ ہجراں کے بیمار

زبس ہیں روز و شب مشتاق دیدار — یہ دو مخمور ہیں گوشہ میں بیمار

شہر خجستہ بیچ ہمیشہ بہار ہے — ہر کوچہ و گلی میں دیکھو لالہ زار ہے

عزلت: سید عبد الولی نام اور عزلت تخلص تھا۔ شاہ سعد اللہ کے فرزند ہیں۔ ۱۱۰۴ھ میں تولد ہوئے۔ اپنے والد سے ابتدائی تعلیم پائی۔ اپنے وطن سورت سے نکل کر اورنگ آباد آئے پھر دہلی اور مرشد آباد کی سیر کی۔ دہلی میں ایک عرصہ تک قیام رہا۔ پھر اورنگ آباد آئے اور یہاں سے حیدرآباد کی راہ لی۔ حضور نظام کے دربار میں باریاب ہوئے نواب آصف جاہ ثانی کی ان پر خاصی عنایت تھی۔ خطاطی۔ موسیقی۔ مصوری اور شاعری میں کمال حاصل تھا۔ بڑے رنگین مزاج اور زندہ دل تھے۔ صوفی منش اور فقیر بے ریا تھے۔ رجب ۱۱۹۸ھ میں انتقال ہوا۔ دکن اور شمالی ہند کے ہر ایک تذکرہ نویس نے ان کا ذکر خیر کیا ہے۔ متعدد تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں، مثنوی راگ مالا۔

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات ص ۲

دیوان ، ساقی نامہ ، باراماسی وغیرہ - اول الذکر کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے علاوہ یورپ میں بھی موجود ہیں[1]

جل ہوا کاجل کس نین کی طوطیا کے واسطے
خون ہوا کس کے ہاتھوں کی حنا کے واسطے

دیکھتا ہوں جمع کر خاطر پریشانی کی راہ
کہ رہا ہوں کس کے کوچے کی صبا کے واسطے

اس عرق ریزاں ذقن کی چاہ کا ہوں میں مریض
سیب کا شربت ہے یہ میری دوا کے واسطے

شور بلبل سن عدم کے خواب سیں جاگیں گے لوگ
مت دھر وگل کو کسی کی قبر اوپر خدا کے واسطے

مثل عزلت باب خانۂ دخود تجھ پہ کھلے
دل کو جیوں آئینہ روشن کر خدا کے واسطے

قتل عزلت سے نہ منکر ہو کہ گل کے مانند
لب پہ ہنستا ہے ترے خون نمایاں میرا

آج دل بیقرار ہے میرا
کس کے پہلو میں یار ہے میرا

مثنوی راگ مالا

خدا کے حمد میں کہتا ہوں ہر دم
کیا ایک حرف سیں جس نے دو عالم

درود مصطفیٰ و آل اطہر
کہوں ہوئے موبمو اپنا زبان کر

عمارت ایک سرکوب فلک تھی
در و دیوار میں دہہ کے جھلک تھی

مرصع تخت پر بیٹھا جواں ایک
کہ دولت اور طرب کا کامراں ایک

قبا دلچسپ تھی سبز اس کے بر میں
کلاہ سر معرق تھی کہر میں

خط سبز اس کے رو روشن تھا نمایاں
تعجب ہر کا تھا گل سر ریحاں

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۵۱۵

اور اس کے گھر میں تھی اک پری رو — منہ اس کا فتنہ خیز اور زلف جادو

بارا ماسی

دلِ بے عشق عالم میں کہاں ہے — جو سچ بولوں تو نام عشق جان ہے
چکوریں ماہ کی نظر بان ہیں با شوق — گلے میں قمریوں کے سرو کا طوق
سمندر کو ہے آتش آب حیواں — گل بکمدن؟ کا البر ماہ تاباں
جو بلبل ہے تو گل اوپر فدا ہے — پتنگا شمع کے مانند منہ پر بھلا ہے
ہوا ہے کوہ کن شیریں کا مفتوں — ہلاک جلوۂ لیلیٰ ہے مجنوں

لطفی[1]:- میر لطف علی نام اور لطفی تخلص تھا۔ درویش محمد خان صوبہ دار برار کے نواسے تھے۔ ایک مثنوی "بہلول صادق" لکھی تھی اس کا ایک نسخہ یورپ میں[2] ہے ۱۲۰۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

مثنوی

بیان کرتے ہیں وے مرد صادق — دفا محبوب کا اور مرد عاشق
عشق کے بات سن کر تجہ ہوس ہے — دفا معشوق بیس نادرست ہے
شہر ہے ایک ہندوستا میں خوش — کہ ہے مشہور اس نامی بنارس
یہی ہندواں کا تے قبلہ ہوا ہے — تمام عالم میں شہرت ہوا ہے

تجہ عشق کے اگن میں شعلہ ہو جل اٹھا جی — دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے

---

[1] شفیق ، [2] یورپ میں دکھنی مخطوطات ،

میں عشق کی گلی میں گھائل پڑا ہوا ہوں — جوبن کا ماتھا آکر مجھ کو کھندل گیا ہے[1]

مہتاب:۔ لالہ موہن لال نام اور مہتاب تخلص تھا۔ اپنے عہد کے باکمال شاعر تھے۔ سنہ ۱۲۰۱ھ میں انتقال ہوا۔[2]

تشنہ لب ہوں شراب کی سوگند — جل گیا جی کباب کی سوگند
ہر گھڑی تو قسم نہ کھا جھوٹی — تجکو دل کی کتاب کی سوگند
بے سخن ہوں ترا دھن دیکھے — یار حاضر جواب کی سوگند
دل صاحب ہے کیا پریشان آج — زلف کے پیچ و تاب کی سوگند
دور کر اب حجاب کو اپنے — چادرِ ماہتاب کی سوگند[3]

حمید:۔ خواجہ خان نام اور حمید تخلص تھا۔[4] ترکتازخان قوی جنگ الدولہ کا خطاب تھا اور اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ عارف الدین خاں عاجز سے اصلاحِ سخن لیا کرتا تھا۔

موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ سنہ ۱۱۶۵ھ میں ایک مختصر تذکرہ شعرائے اردو کا مرتب کیا جو گلشنِ گفتار سے موسوم ہے۔[5]

موجودہ معلومات کے لحاظ سے شعرا دکن کا یہ پہلا تذکرہ ہے۔

حمید کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

زلف خم ہو کے لٹک جان کے سب کان میں رات — مو بہ مو کھول کے حال پریشان بُرا

---

[1] محبوب الزمن۔ [2] شفیق۔ [3] محبوب الزمن۔ [4] فتوحات۔

[5] سید محمد صاحب ایم۔ اے عثمانیہ نے اس کو مرتب کیا اور مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔

مجکو دنیا ہے نگاہوں میں دبالا دبالا | جیسے بلکل نے بر نکیو سے سنبھالا بھالا

محمود:۔ سید محمود نام اور محمود تخلص۔ مصنفینِ یورپ نے ان کی تصانیف کو عارف الدین خان عاجز سے ملا دیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم پوری طرح ان کے حالات سے باخبر نہیں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے وہ ایک مذہبی آدمی تھے سید اخوند میر شاہ سے بیعت تھی۔ غالباً ان سے خلافت بھی حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب اس نے ایک فارسی قصہ پڑھا تو اپنے مرشد سے اجازت چاہی کہ اس کا ترجمہ دکھنی زبان میں کرے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ مرشد کی روحانی مدد کے بغیر یہ کام ان سے ختم نہ ہوگا۔

ان کی دو مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک "ظفر نامہ" سے موسوم ہے اور ۱۲۰۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور دوسری "ملکہ مصر" ہے جو ۱۲۰۶ھ میں مرتب ہوئی ہے ان کی تصنیف کے سنین خود مصنف نے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ "ظفر نامہ" کی تصنیف کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

خدا مقصود حاصل کر کے میرا | ظفر نامہ کیا انجام سارا
کیا اتمام جب شہ کا انجم | تو بارہ سو پہ تھا سالِ چہارم

ملکہ مصر کی تصنیف:۔

سنہ بارہ سو چھ او پر تمام | کہا ہوں جو اس وقت پایا نظام

ظفر نامہ میں محمد بن حنفیہ کا قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے سیوک اور لطیف قطب شاہی عہد میں اس قصہ کو منظوم کر چکے ہیں۔ ظفر نامہ کسی فارسی

مثنوی کا ترجمہ ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے :-

کروں نامے کو حمدِ رب سو آغاز
فصاحت میں رہوں دائم سرافراز

خدا کے نام سوں نامے کوں اتمام
کروں میں تا کہ ہو جلدی سوں اتمام

بجا لا کر اول آداب و تسلیم
کیے تجھ حکم میں ہے ہفتم اقلیم

ادب سے ہو کھڑے چاروں وہ فی الحال
ہر ایک مطلب کو اپنے تب کیے آمال

کیے محبوب تم سچ ہو خدا کے
چراغ و مشعل و راہِ ہدا کے

ہمیں بہت روز سے آئے تم پاس
کرو دل کو ہمارے مثلِ الماس

کہا اک نے کہ اے سردارِ عالم
میرا سب ماجرہ بر حسب عالم

مجھے ہے ایک دختر نیک اختر
ہوئی بالغ نہیں مجھ کو میسر

نہیں وسعت مجھے اس کو بیاہا
نہیں اک دفتہ کا مجھ گھر میں کھانا

اگر امداد مجھ ہووے کم و بیش
کروں دختر کا اول کاج در پیش

برائے حق مجھے اب کچھ عطا کر
میرا یہ عرض سن حاجت روا کر

مجھے درکار ہے دینار چھ سو
کہا میں مدعا دل کا التماسہ

قصۂ ملکۂ مصر بھی ایک فارسی قصہ کا ترجمہ ہے۔ فارسی کتاب ۱۱۰۰ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ بعض اصحاب نے قصۂ "ملکۂ مصر" کو قصۂ "فیروز شاہ" سے موسوم کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بالکل علیحدہ قصے ہیں۔ اول الذکر مثنوی نایاب ہے کتب خانہ ادارہ ادبیات کا ایک نسخہ موجود ہے[۱] "ملکۂ مصر"

---

[۱] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۹۱۔

جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ کے علاوہ یورپ میں بھی موجود ہے[1]۔

ملکہ مصر کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

کہوں میں ثنا صفت اس کا اول ۔۔۔ بنایا ہے جوں یو جگت بے بدل

ستو اے عزیزاں کتا ہوں سو بات ۔۔۔ نہ سمجھو گے یعنی حکایت کی دہات

کہوں اب قصہ سب کوں اظہار کر ۔۔۔ کتے ہیں کہ تھا شاہ یک بخت ور

دھرے نام سلطان فیروز شاہ ۔۔۔ اتھا مصر کا شہر سو تخت گاہ

بھی بیٹی نہ تھا اس کوں فرزند سو ۔۔۔ اچھے شاہ ایسے ساہ دل بند ہو

ملے گا اچھے ناؤں اس نار کا ۔۔۔ اتھا جگ میں شہرت اس او نار کا

شفیق :۔ لالہ لچھمی نرائن شفیق دکن کے مشہور مصنف اور شاعر ہیں۔ ان کے والد راے منسا رام آصف جاہ اول کے عہد میں معزز عہدہ پر سرفراز تھے۔ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔

شفیق ۱۱۵۸ھ[2] میں تولد ہوئے۔ رواج زمانہ کے موافق عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ کم عمری سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی سے

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] مولانا عبدالحق صاحب نے چمنستان شعراء کے مقدمہ میں ان کا سنہ پیدائش ۱۱۵۸ھ لکھا ہے (ص۲) ؛ چمنستان شعراء ۱۱۷۵ھ کی تصنیف ہے (ص۱۶۰) ظاہر ہے کہ یہ سن کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس سنہ کو کتابت کی غلطی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ "مقدمات عبدالحق" میں بھی یہی سنہ لکھا گیا ہے۔ خود مولانا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر اس تذکرہ کی ترتیب میں ہوئی اس لئے صحیح سنہ پیدائش ۱۱۵۷ھ ہے۔ انجمن ترقی اردو کی جانب سے یہ شائع ہوئی ہے۔

تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ پہلے صاحب تخلص تھا پھر شفیق قرار دیا۔ فارسی اور اردو دونوں میں مشق سخن کی ہے۔ تاریخ سے خاص ذوق تھا۔

تصنیف و تالیف کا بڑا شوق تھا۔ کئی ایک کتابیں ان کی یادگار ہیں "گل رعنا" شعرائے فارسی کا اور "چمنستانِ شعرا" شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔ ۱۱۷۵ھ اس کتاب کا سنہ تالیف ہے۔ یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں شمال اور دکن کے دو سو تیرہ شعرا کا ذکر ہے۔

شفیق نے مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی وغیرہ غرض سب اصناف سخن میں جولانی دکھائی ہے۔

"تصویر جاناں" ان کی ایک مشہور مثنوی ہے؎۔ ایک دوسری مثنوی معراج نامہ ہے۔ غالباً ۱۲۱۵ھ کے بعد شفیق کا انتقال ہوا۔

کلام کا نمونہ پیش ہے:-

قصیدہ

یک زبردست ہے میرا والی	یک قوی دل ہے میرا پشت و پناہ
حق و باطل ہے سامنے جس کے	یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ
یعنی نواب میر احمد خان	اسد الملک حضرت عالی جاہ
باپ جس کا نظام دولت و دین	جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

مثنوی ساقی نامہ

ارے ساقی اے روح بخش جہاں	ارے ساقی اے جان کے تن کے جان

؎ رسالہ تجلی حیدرآباد میں شائع ہوئی ہے۔

ترے دیکھ کر یہ تغافل کے ڈھنگ
بھر آئی ہے چھاتی مری بے درنگ

تری گردشِ چشم بس ہے مجھے
یہی دور کی اب ہوس ہے مجھے

دو پیالے مجھے دے کے مت بھول جا
کہ ہوں بحر نوش اب میں فضلِ خدا

دے شیشے پہ شیشے گھڑے پر گھڑے
پلا اس طرح دا جھڑے وا جھڑے

تجھے نا کہوں تو کہوں کس سے اب
تجھے تجھ سے اغماض کیا ہے سبب

نشہ گل کا یہ اذن اب عام ہے
کہ لب ریز بہتر ہے جو جام ہے

غمِ مے سے لالہ چمن میں ہو داغ
بھرا اپنے خوں سینے اپنا ایاغ

نسیم مست رواں ہے بادِ صبوح
کہ نکلی چلی جاتی ہے گل کی روح

نمونہ غزل :-

بہار آئی ہے جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیمِ صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

ہمیں کنجِ چمن میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے
خدا جانے وہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

عاشقی نے کر دیا دونوں جہاں میں نامور
مر گئے ہیں ورنہ مجنوں سے یہاں لاکھوں کروڑ

اب یقین کی یاد میں صاحب اگر روتا ہے ابر
کوکتی ہیں کوئلیں اور شور تو کرتے ہیں مور

پنجرے میں ہمیں نہ آنا تھا | کیا کریں یہاں بھی آب و دانہ تھا
اس کی جا کر گلی میں کھویا وقر | اب میں جانا کہ وھاں نہ جانا تھا
ایک دن وہ نظر پڑا صاحب | جس لیئے شب کہ تلملانا تھا
تب کہا چشم کو میں اے کم بخت | وصل میں اشک یہ بہانا تھا
اس کی تصویر آئی آنکھوں میں | پاؤں اس کے مجھے دھلانا تھا

قتل پر کس کے چلا ہے یہ ستم گر کہ بس | آستینوں کو یہ چڑھا کھینچ کے تلوار کہ بس
آخری دم ہے ٹک اک دیکھ بھلا اے ظالم | بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں کہ آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھوں سیتی میخانے میں دھوم
کوئی گریباں چاک، بیدل کاں بسے گا صاحبا
کوہ میں فرہاد و مجنوں کو ہے ویرانے میں دھوم

برجہت بادِ صبا کے یہ قدم کا فیض ہے | مرقدِ بلبل یہ گل جو یوں چراغاں ہو گئے

ایجاد:- مرزا علی تقی خاں نام، ایجاد تخلص اور نقد علی خاں خطاب تھا۔ خاندان قاچار سے تھے۔ سلیمان صفوی کے وزیر شیخ علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ آصف جاہ اول کے زمانہ میں ان کے باپ نقد علی خان دیوانی بادشاہی میں ملازم تھے۔ ایجاد بھی اس زمانہ میں مامور ہو گئے اولاً کوتوالی لشکر اور پھر باپ کی خدمت ملی۔ صلابت جنگ کے زمانہ میں داروغہ

فیل خانہ اور آصف جاہ ثانی کے عہد میں صاحبزادہ نواب انتظام الدولہ نصرت جنگ کے اتالیق بھی مقرر ہوئے۔ ۱۱۹۲ھ میں حیدرآباد میں گوشہ نشین تھے۔

فارسی نظم میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اور اردو اگرچہ ان کی مادری زبان نہیں تھی تاہم اردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔

ایجاد تیرہ رو نے نجف کی زمین میں
نقشِ قدم ہے خاک رہ بوتراب کا

ہم اسیروں کو ترے زلفوں سے ہے دل بستگی
کون کافر چاہتا ہے ایسے داموں سے نجات

تربت پہ میری شمع اگر تو نہ لائے گا
جلتا رہوں گا حسرتِ ناک میں کفن کے بیچ
تجھ لب سا کوئی عقیق نہ پایا سہیل نے
راتوں کو چراغ لے ڈھونڈا یمن کے بیچ

بیٹھا ہوں تیرے ابروے خمدار کے نزدیک
سر اپنا رکھا ہوں اسی تلوار کے نزدیک
بکتا ہوں زہر کو بازار وفا میں
ان مولوں گراں نہیں ہوں خریدار کے نزدیک

کیسے دریا سا دل اپنا ہم اے دلدار دیتے ہیں
ہر اک کو ہم کہاں یہ گوہر شہوار دیتے ہیں

رکھتا ہوں اس دل نازک کو جان کر شیشہ
جس احتیاط سے رکھتا ہے شیشہ گر شیشہ

گل گشت کی خبر جب ترے چمن میں باتی
بادِ صبا خوشی سے پھولوں میں نہیں سماتی[1]

۱؎ تذکرہ تمنا

مہرباںؔ:- میر عبدالقادر مہربانؔ تخلص۔ ان کے اجداد نیشاپوری تھے۔ ۱۱۱۵ھ میں مہربانؔ کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ حافظِ قرآن تھے۔ عربی اور فارسی کی بہت اچھی قابلیت تھی۔ شاعری میں مولانا غلام علی آزادؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ شفیقؔ نے ان کی نازک خیالی کی بڑی تعریف کی ہے۔ شاعری کے علاوہ نجوم اور جفر سے بھی واقف تھے۔ ترکی بھی جانتے تھے۔ پہلے نگینؔ تخلص کرتے تھے۔ مگر اس کے بعد مہربانؔ تخلص قرار دیا۔ بقول تمنا مہربانؔ عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۱۹۲ھ میں زندہ تھے۔

مرا دل لے جانے کہ دلبر تمھیں ہو | جفا جو ہو ظالم ستم گر تمھیں ہو
جو ابر کے دیکھنے سے کیا مجھ کو حاصل | میرے حق میں اب لعل و گوہر تمھیں ہو

معلوم نہیں یہ دلِ وحشی کہاں گیا | چل مبتلا اب اوس کی کہیں جستجو کریں

شکستہ خاطر عاشق نکر ظالم تغافل سے | مرا آئینۂ دل ہے ترا اسباب خود بینی[1]

آہ کیوں کریں شکستہ دلاں | ٹوٹی انگلی بھی کہیں چٹکتی ہے

فردا محشر میں لیوے داد قاتل سے میرے لیکن
سبب جس دل کے میں مارا گیا اس سے نہ را سمجھے[3]

بیکلؔ:- میر عبدالوہاب نام اور بیکلؔ تخلص تھا۔ علاوہ ازیں فارسی میں افتخار

---

[1] چمنستان شعرا و تذکرہ تمنا۔ [2] تذکرہ تمنا۔ [3] تذکرہ شفیق۔ [4] شفیق و تمنا۔

تخلص کرتے تھے۔ ان کے دادا بخارا سے آئے تھے۔ دولت آباد میں اقامت گزیں ہوئے۔ بیکل کی پیدائش یہاں ہی ہوئی۔

بیکل کو آزاد سے تلمذ حاصل تھا۔ ایک تذکرہ شعرا موسوم "بے نظیر" انہوں نے تالیف کیا تھا جو نایاب ہے۔ ۱۱۹۶ھ میں زندہ تھے۔

برسے ہے ابر رحمت ساقی کہ ہر سے ملنا | ہنگام بادہ خواری جواب نہیں تو پھر کب
جاتا ہے وہ کہ جس سے تھا لطف زندگانی | آتی اجل ہماری جواب نہیں تو پھر کب

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا | سرخ و سفید باقی کی مورت ہوئی تو کیا[1]

آج پھر دل تڑپ میں آیا ہے | کس پری کی جھڑپ میں آیا ہے

کوئی اس خورشید رو کے نا مقابل ہو سکا | چاند نکلا ہے کہے گا کیا اجالا دیکھئے

کوہ بھی ہنگام بارش میں عروس وقت ہے | سر پر اس کے سہرہ مروارید کا ہے آبشار[2]

عروج: میر بہاؤ الدین حسین خان عروج[3]۔ ان کے والد کا نام ضیاء الدین حسین خان رنگین تھا۔ عروج کی پیدائش ۱۱۷۵ھ میں اورنگ آباد میں ہوئی۔ انور الدین ذکی سے تحصیل کی اور اولاً ان سے ہی شاعری میں علاح لی اس کے بعد بلیغ سے علاح لینے لگے۔ ایک تذکرہ شعرا "خزاں و بہار" کے مصنف ہیں جو نایاب ہے۔ ۱۱۹۶ھ تک زندہ تھے۔

روئے خوب اس کو دیا حق نے ہمیں بخت سیاہ | اس طرف صبح وطن شام غریباں اس طرف

---

[1] تمنا۔ [2] چمنستان شعرا بحوالہ تحفۃ الشعرا۔ [3] تذکرہ تمنا۔

یوں ظلم اُسے پیارے کہ تو کیا کرے گا   عاشق کوئی بچارا کیونکر جیا کرے گا

انورؔ:- محمد سیف اللہ نام اور انورؔ تخلص اورنگ آباد کے رہنے والے اسد علی خاں تمنّاؔ کے ہم درس تھے۔ عربی اور فارسی کی بہت اچھی قابلیت تھی۔ میر انور الدین دلؔ کے شاگرد تھے۔ تمنّاؔ نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ ۱۱۹۴ھ تک زندہ تھے۔

مگر گنجِ شہیداں کا باغبان تھا اس بیاباں میں

جو بختِ دل سوا کچھ او گتا نہیں اس خیاباں میں

ہے نمایاں رُخ پہ تیرے خطِ ریحاں آج کل   مور کے قبضہ میں ہے ملک سلیماں آج کل

عاشقوں کے قتل پر امروز و فردا خوب نہیں   دیکھ لیں تو جائے گا کافر مسلماں آج کل

آرسی کو مت دکھا مژگاں و ابرو ہمدگر   خنجر و شمشیر شیشہ میں لڑاتا ہے کوئی

ہو گئی گرد تیرے دام کے خوشبو صیاد   بال بلبل سے مگر نکہتِ گل کرتے تھے

عصمت کا لاف مار نہ گل میرے پاس سے   بدنام تو بھی ہیگا چمن میں ہزار سے[1]

تمنّاؔ:- اسد علی خاں تمنّاؔ اورنگ آباد وطن تھا۔ صمصام الملک اور ارسطو جاہ کے درباری شاعر تھے۔ حیدرآباد میں اقامت کر لی تھی۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ ثانی کی مدح میں بھی قصیدے پیش کرتے تھے۔ "مجموعہ فصاحت"[2] میں ان کے قطعات

---

[1] تذکرہ تمنا یعنی تذکرہ تمنا و مجموعہ فصاحت۔ [2] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

۱۱۹۷ھ سے ۱۲۰۳ھ تک شامل ہیں ۱۲۰۴ھ میں انہوں نے انتقال کیا۔
۱۱۹۴ھ میں انہوں نے ایک تذکرہ شعرا لکھا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ ہم نے تفصیل سے اس پر مضمون لکھا ہے[1]۔ افسوس ہے کہ خود ان کے تذکرہ میں ان کا حال یا کلام نہیں ہے۔ مجموعۂ فصاحت میں ان کے قطعات اور قصیدے شامل ہیں۔

تمنا استادِ سخن تھے ان کے کئی شاگرد تھے۔ بقول مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب موصوف نے ان کا کلیات دیکھا ہے جو خاصا ضخیم ہے مگر یہ نایاب ہے۔

کلام کا نمونہ پیش ہے :۔

چل ایک بارگاہِ وزارت پناہ میں
رہ کئی دنوں سے دل میں جو ہے مدعا گرہ

نواب مستطاب معلیٰ جناب کی
ہوگی کرم سے عقدۂ مطلب کی وا گرہ

نسبت گرہ کو ہے گرۂ سال سے نہیں
سولی پیا گہر سے ہے افزوں بہا گرہ

فرحت ہے خوش ہو رشتہ بہجت سرشتہ میں
دیتی ہیں آج سال گرہ کی کہا گرہ

سبحہ ہزار دانہ کا ہے یا گہر کی سلک
یا زلف میں صنم نے گرہ پہ دیا گرہ

میں نے کہا کہ شکر خدا و ندِ ذوالجلال
تا عد ہزار اس میں ہو نامِ خدا گرہ

مدحت سرا ہوں اس کا وہ ممدوح ہے مرا
کیونکہ رکھوں دہن میں زبان تمنا گرہ

باغِ جہاں میں یارب جب تک گلِ بقا ہو
گلشن ہو باغباں ہو غنچہ ہو اور صبا ہو
سبزے کی پرورش پر بارش کرے نزحم
گرمی ہو گرم جس جا وہاں باد کش ہوا ہو

---

[1] ملاحظہ ہو مقالات ہاشمی

سنبل کا طرہ ہووے اور زینت خیاباں
جان زلف کا حلقہ ستانہ گرہ کشا ہو
شاعر ہو اور رنگین مضمون ہو وست بستہ
پائے نگار ہو اور رنگینیٔ حسنا ہو
قمری ہو اور صنوبر پروانہ اور چراغاں
ہیں اور حصول میری خاطر کا مدعا ہو
وہ مدعا کہ جس پہ پڑھتا ہوں قطعۂ نو
ممدوح سے اجابت مداح سے دعا ہو[1]

تجلیؔ:- تجلی علی شاہ نام اور تجلیؔ تخلص امرائے دربار آصفی سے تھے۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے ساتھ شاہی سفروں میں ہمرکابی کا شرف حاصل تھا۔ علمی لیاقت مسلمہ تھی۔ تزک آصفیہ زندہ یادگار ہے جو دکن کی معتبر تاریخ ہے۔ فارسی اور اردو میں شاعری کی ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں انتقال ہوا۔[2]
کلام کا نمونہ پیش ہے:-

گر وصل گل بدن دے مجھے ایک بار دست
ہر مو سے بہر شکر ہوں پیدا ہزار دست

اوس زلف مشکبار پہ جی تک کروں نثار
دیوے یہ بخت تیرہ جو بہر نثار دست

ہر چند خاکساری کو میری ہے دست رس
دامن فلک بہ تیری ہے رخنہ دار دست

لکھتا ہوں اور مطلع رنگیں حضور میں
مضمون ہزار دیوے ہے بے اختیار دست

---

[1] مجموعۂ قصائد۔
[2] گلزار آصفیہ و محبوب الزمن

ایسا دیا ہے حلم میں تجکو خدا نے دست   باندھے سپہر روبرو جیوں کو مسار دست
زر پاشی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب   رکھتا ہے اپنے چہرہ پہ ہو شرمسار دست
یک دست جو ہے تجکو زمانے میں اقتدار   پایا تھا کون ایسا شہ و شہریار دست
بذل و سخا و جود و کرم فیض و لطف و خلق   کھولے ہیں تیرے سامنے یہ ہفتاد دست
جیب تنک گہر فشاں ہے نیساں کا دست فیض   ریزش میں ہو نزار نہ سنا بیاد دست

مانند گوسپند ہو قربان ترے عدو
احباب کو دے عید کا نت روزگار دست[1]

ایمان[2]:- شیر محمد خان ایمان نے بھی اس دور میں شہرت حاصل کی تھی۔ ان کے بیسیوں شاگردوں نے میدان سخن میں ناموری حاصل کی ہے۔ حیدرآباد ان کا وطن تھا۔ عاقل خان باپ کا نام ہے جو وقائع نگاری کی خدمت سے سرفراز تھا۔ باپ کے بعد ان کو یہ خدمت ملی۔ ارسطو جاہ دیوان دکن کے ساتھ سفر و حضر میں بطور مصاحب رہا کرتا۔ شعر گوئی کا خاصہ ملکہ تھا۔ تجلی سے تلمذ حاصل تھا۔ صاحب تصنیف تھا اور نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ قصائد مثنوی اور غزل میں اچھی مشق حاصل تھی۔ ۱۲۲۵ھ کے بعد انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

گئی فصل ہے نوجوانی کی اب   ہوس کس لئے زندگانی کی اب
یہاں دل سے دل مل گیا نامہ بر   نہیں بات باقی زبانی کی اب
کہاں کا وہ فرہاد اور وہ مجنوں   یہ باتیں ہوئی ہیں کہانی کی اب

---

۱ مجموعہ فصاحت۔   ۲ گلزار آصفیہ۔

لے آیا ہے اک کو کمن جو ئے شیر ۔ کوئی نہر تو لادے پانی کی اب ۔

گر نہ اٹکی ہو تری زلفوں میں جاں ۔ آہ جاتی رہے یک نالۂ شب گیر میں جاں
آب حیوان سے بجھا ہے مگر اس کا پیکاں ۔ تازہ پڑتی ہے ترے تیر سے نخچیر میں جاں
آئے جس دم کہ تو اعجاز مسیحائی پہ ۔ بات کہتے ہیں پڑی قالب تصویر میں جاں

دیت اس قاتل بے رحم سے کیا لیجئے گا ۔ اپنی ہی آنکھوں سے اب خون بہا لیجئے گا
اس قدر سنگدلی تم کو نہیں ہے لازم ۔ کبھی مظلوم کی آہ ہے تو دعا لیجئے گا

ایمان کے قصیدے بھی مشہور ہیں ایک قصیدہ سے انتخاب پیش ہے :-

ہوا ہے آج کی شب ماہتاب کا یہ وفور ۔ کہ شش جہت کو جو دیکھو ہے ایک عالم نور
زمیں جو دیکھو تو ہے خوان نقرۂ گویا ۔ ہے آسمان بنے ہی سر پوش نقرہ کا ظہور
ہے بسکہ دامن صحرا پہ نور پاشی ماہ ۔ ہر ایک کوہ ہوا کوہ برف سے مشہور
فلک پہ گویا ہزاروں ہلال ہیں پیدا ۔ جو دیکھو بحر میں کشتی سے تا ضرنگا عبور
برنگ برق ہے ہر ایک موج تابندہ ۔ یساں ہالہ ہے گرداب ہے قصور و قلنشور

- - - - - - - - - -

لکھوں کچھ اور بھی ایمان آب نقرہ سے ۔ جو ہو وئی خامہ الماس اور لوح بلور
کہ ایک لطیفہ مضمون خاص کا اظہار ۔ ہے ایسی طرز کی تمہید سے مجھے منظور
کہ فیض عام ہے یہ ایک روشن اختر کا ۔ ہیں جس کے عہد میں اب شاد کام سب جمہور
امیر اعظم و عالی ہمم ارسطو جاہ ۔ وزیر شاہ دکن فخر قیصر و فغفور
بہ بزم ثانی جمشید و کیقباد نسب ۔ بروز رزم مبارک مظفر و منصور
بہ بذل مثل فریدوں بعدلت کسریٰ ۔ جہاں کشائی میں مثل سکندر و تیمور

- - - - - - - - - -

دعا پہ ختم میں کرتا ہوں اب قصیدہ کو | الہیٰ تا ہے یہ گردشِ سنین و شہور
برنگِ صبح رہیں رو سفید تیرے دوست | سیاہ رو ہوں عدو تیرے جیوں شبِ دیجور[1]

مثنوی برق تاب

عجب برسات کی ہے فصل پیاری | کہ جس کا فیض ہے عالم میں جاری
لکھوں کس رنگ سے تعریف اس کی | کہ کاغذ خود بخود ہوتا ہے ابری
اگر صفحہ پہ کھینچوں جدولِ نسیم | رواں ہوتی ہے مثلِ جوئے تسنیم
ہر اک نقطہ سے قطرہ ہووے پیدا | بنے ہر سطر اشکِ موجِ دریا
ہے آتش سنگ میں بھی بس کہ نایاب | شرر کی جائے نکلے قطرۂ آب
سمندر کی یہ سنتے ہیں زبانی | ہوا جاتا ہوں میں بھی پانی پانی
یہ دشتِ دہر میں بارش کا اثر ہے | کہ خارِ خشک بھی مژگان تر ہے
خطِ جادہ ہے از بس رود پر آب | ہوا ہر نقشِ پا مانندِ گرداب
زمیں اوپر ٹھہرتا سنگ ہے کب | شناور ہے بساں سنگ پشت آب
زمیں گیری محال از بس ہوئی ہے | پڑے پھرتی ہے ترتے اب لیلا مے[2]

فتوت: خواجہ عنایت اللہ فتوت بھی امرائے دربار آصفیہ سے تھے۔ باپ کا نام خواجہ عبدالرحمٰن اور خطاب اعتماد الدولہ لشکر جنگ تھا۔ ان کے اجداد بدخشان کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان آنے[3]

---

[1] مجموعہ قصائد در مدح اصطلاحات (مخطوطہ)   [2] رسالہ تحفہ۔

[3] ریاض حسنی و تذکرہ تمنا

کے بعد اولکہ (چاندہ) میں اقامت کی۔ اس کے بعد ان کے دادا خواجہ آفتاب اورنگ آباد آ رہے۔ سلطنت آصفیہ کی جانب سے جاگیر اور منصب ملا۔

فتوت کے باپ کو موسیقی کا خاص شوق تھا۔ کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہا کرتے ۱۱۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ فتوت کی پیدایش اورنگ آباد میں ہوئی۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ سید سراج الدین سراج سے تلمذ حاصل تھا۔ "ریاض حسنی" کے نام سے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ۱۱۶۴ھ میں مرتب کیا ہے۔ محرم ۱۲۲۳ھ میں انتقال ہوا۔

تجھ تبسم کا اگر غنچہ خنداں پھوٹے
قتل ہونے میں شہیدوں کے گلستاں ہوٹے

جو ہوا زلف پریشاں کے محبت میں شہید
قبر پر اس کی بجا سبزۂ ریحاں پھوٹے

نام شیریں ہے میرے دل کا وظیفہ ہر دم
شورش آہ کوہیں تیشۂ فرہاد کیا

اب تلک چاک گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا
غنچۂ دل کبھو خنداں نہ ہوا تھا سو ہوا

مجھ کو کچھ خوف نہیں گرمیِ محشر کا سجن
ہوں گا مشہور ترے سایۂ بنا ہوں کے بیچ

ہو گا طوفان اشک خونیں سے میرے
ہر دم چشم اسے الحفیظ

بزم سے شعلہ عفت گر وہ زرہ پوش اٹھے
دل سوزاں سے میرے آہ شرر جوش اٹھے

یہاں تلک مجھ سے ہے غیاو کو ربط قلبی
دم بدم نالہ مرے دل سے ہم آغوش اٹھے

---

[1] سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن میں ایک نسخہ ہے۔ اس پر میں نے ایک مضمون لکھا ہے جو مقالات ہاشمی میں شریک ہے۔

ٹکڑے رازلف کے لٹے جانِ قتیل ٹکھو لو کیا بجا مجھے جو یہ شام غریباں پھولے

میں قربان ہوں تیرا اے جان جرأت اس کو کہتے ہیں
نگاہِ دیدۂ بسمل ہوں حیرت اس کو کہتے ہیں

تیرے ابرو کے مقابل نہ رہا وہ رتبہ ماہِ نو واسطے تعظیم کے خم ہے کہ نہیں

عیشِ بہار و رنگِ خزاں دیکھ مر گئے بلبل نے اپنا کام جو کرنا تھا کر گئے

میں خواب میں ہوا ہوں ہم آغوش گلبدن کیا دیکھتا ہوں صبح کو بھیگا کنار سرخ[1]

نام شیریں ہے میرے دل کا وظیفہ ہر دم سوزش آہ کو ہیں تیشۂ فرہاد کیا

کاظم:- صوفی شاہ نام اور کاظم تخلص۔ اورنگ آباد میں اسد علی خاں تمنا کے ہم درس تھے۔ تمنا نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ تاہم مبتذل را کاظم کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

جب میں اے شوخ تجھے بر میں سراپا کھینچا
تب میں خمیازہ میں پھرتا ہوں میں کھینچا کھینچا
نام زلف و الف قد کو ترے دیکھ صنم
صفحۂ حسن پہ کونین کے میں نا کھینچا
صبح ساقی کے قدم سے ہوئی عشرت کی مری
ہاتھ ساغر کا پکڑ گردن مینا کھینچا

---

[1] تذکرہ تمنا۔

مجھ دل کا شیشہ آج یہ کہنا صدا گرا
پھر جان سے اوٹھا جو نظر سے گرا گرا

کیا پوچھتا ہے یار مری موت و زندگی
مشتِ غبار تیری ہوا میں اوڑا گرا

گلزار ہو رہی ہے گلی آج یار کی
از بس ہمارا خونِ جگر جابجا گرا

زلف کو اوس نے پیچ و تاب دیا
دین و آئین کو ہیں جواب دیا

آزاد نہیں ہوں حلقۂ زنجیرِ زلف سیں
کاظم گلے پڑی ہے میرے کس بلا کی شرط[1]

کاظم :- کاظم علی نام، کاظم تخلص حیدر آباد کے ایک صاحب ذوق امیر زادے تھے۔ کنک گیری کے نواب میر جنگ کے داماد حضرت اوجالا شاہ کے مرید تھے۔ کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کاظم فطری شاعر تھے۔ ان کا کلیات جو سنہ ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[2] اس کلیات میں عام دواوین کی ترتیب کے خلاف زمانہ تصنیف کی ترتیب سے نظمیں غزلیں، مرثیے اور مثنویاں وغیرہ درج ہیں۔ کلام میں آورد اور تصنع نہیں ہے بلکہ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ مثنوی روزگار:-

ظلم بیدادی ہمیشہ گرم ہے
بادشاہ مملکت کیا نرم ہے

ایسے ظالم چو طرف پھیلے ہیں یار
اون کے یہاں جانے کسی کو نیں ہے بار

ہاں مگر پاجی غلاما نیشں ہیں
مال و زر سے سب طرح دو پیش ہیں

---

[1] گل عجائب تذکرہ تمنا صفحہ ۱۲۹ تا ۱۴۹۔ [2] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۲۱۔

جنگ و دولہ ہو گئے پاجی سبھی | اون نے بابا موش نا مارے کبھی
خلق عالم اوس کے ہاتوں سے موا | نائب دجال خر پیدا ہوا
بارھویں صدی کے سب آثار ہیں | سید و اشرف سارے خوار ہیں

دوسری مثنوی:۔

قیامت تک ہے میرے ساتھ پیارا | عجب ہے باوفا دلبر ہمارا
خدا اوس کو رکھے نت آبرو سے | حیا و خوش دلی اور سرخرو سے
ہے کاظم جان و دل سے اس کا عاشق | وہ پیاری کا وہی تھا خوب لائق

اوجالا شاہ کی مدح:۔

شفیع و حامی روز جزا اوجالا شاہ | ولی و والی ہر دو سرا اوجالا شاہ
خدا کی راہ کے ہیں پیشوا اوجالا شاہ | حبیب و عاشق حق ہے ربا اوجالا شاہ

صحیبت مرشدِ من ہے ربا اوجالا شاہ

امین دین ہیں پانچوں کے رہبر کامل | صفا ہیں پاک ہیں فاضل ہیں حق ستی شاغل
مراد شاہ و گدا ہیں گی او ستی حاصل | عجب وہ شاہ قناعت ہے رب ستی واصل

صحیبت مرشدِ من با خدا اوجالا شاہ

ضیاء:۔ مرزا عطا نام اور ضیاء تخلص تھا۔ برہان پور کے ایک موضع میں ۱۱۴۳ھ میں ولادت ہوئی۔ خاندان برلاس سے ان کا تعلق تھا۔ اور ان کے نانا میر برہان اللہ سادات حسینی سے تھے۔ سن شعور کو پہنچ کر اپنے قصبہ سے نکلا۔ برہان میں

سکونت اختیار کی تحصیلِ علم میں مصروف ہوئے۔ جب شاہ سراج الدین اورنگ آبادی برہان پور آئے تو ان کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ پھر اورنگ آباد آکر آزاد بلگرامی سے درس لینے لگے۔ اسد علی خاں تمنا نے ان کو اپنا ہم درس اور خواجہ تاش بتایا ہے۔ میر حامد یار خان مخاطب بہ ارسلان جنگ (جو رکن الدولہ میر موسیٰ خاں کے رشتہ دار تھے) کی سرکار سے ضیاؔ کو تعلق تھا۔ شعر گوئی میں اچھا ملکہ حاصل تھا۔ ان کے کلام کی تعریف شفیقؔ اور تمناؔ دونوں نے کی ہے۔ اور دونوں نے ان کا حال قلم بند کیا ہے[1]۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

تجھے کیا یاد ہے ساقی وہ عالم بے حجابی کا ادھر تو جام کا ہنسنا ادھر رونا گلابی کا

اے ساقی دل میں پھرتا ہے خیال اس بے حجابی کا

وہ ہی ساغر کا چلنا اور کھڑا رہنا گلابی کا

تری آنکھوں کو ساقی دیکھ شاید جان جاتی تھی گلابی بیٹھی منہ میں جام کے پانی جو آتی تھی

دیکھتے ہی اس کے خط کی شان دل مرجھا گیا اس دھویں کو دیکھ آنکھوں میں اندھارا چھا گیا

رنگ اڑ گیا سمن کا نرگس بھی زنک دبی ہے گلشن میں گلبدن بن کھچڑی سی پک رہی ہے

اٹھادے اب تو اے ساقی تقید بے حجابی کا کہ کیا ضبطِ سخن سے پیٹ پھوٹا ہے گلابی کا

جو تم کو مونہہ سے کبھی اُس نے باؤنا نہ کہا میاں غضب ہوا کچھ بھلا برا نہ کہا

---

[1] چمنستانِ شعرا صفحہ ۲۵۵ - گلِ عجائب صفحہ ۶۷-

کیا بات ہے کہ جس کو رکھے دل میں گانٹھ باندھ گر بے وفا کہا تو کہا کیا برا کہا

ہمیں جو پوچھو تو محوِ ظہورِ خسان ہیں کوئی تو ڈھونڈ کوئی شیخ یار عاشق ہیں
کسو زمانے میں یہ رسم تھی پر اب وہ کہاں کہ دور جاتے ہیں اور صحبتیں موافق ہیں

آزمایا تیغِ ابرو کا اگر مر کو نہ سبے فکر اتنی کیا ہے بسم اللہ ظالم ہم تو ہیں

اللہ باقی من کل فانی کس کام کا ہیں کس کام کا تو
دل تو لے ہیں صاحب ضیاء سیں مارو گے پھر کیا جی سیں کسی کو

اے بتو تمہارے پہ دل ہوا مرا گمراہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ

گر چشمِ فتنہ گر کو تغافل سے زیب ہے پر اے میاں کبھی تو کریں گے نگاہ بھی[1]

مبتلا: الف[2] خاں المتخلص بہ مبتلاؔ اورنگ آباد ان کا وطن تھا۔ جوانی میں کسی پر فریفتہ ہو گئے اور اس کی وجہ سے مجنوں کا سا حال بنا لیا تھا۔ تمنا کے دوست تھے۔ رفتہ رفتہ پھر اچھے ہو گئے۔ شفیق ان کو جوان صالح کہتا ہے۔ اور کلام کی تعریف کی ہے۔

دل بدل کیوں نہ رہے وہ ناتواں تڑپتی ہے یہ کچھ دوا کر باغباں اس نرگسِ بیمار کی

ظاہر میں عشق و حسن میں اتنا ہی فرق ہے تم نے جفا و جور کیے ہم دعا دیے

---

[1] شفیق و تمنا۔ [2] چمنستان شعراء صفحہ ۲۰۳۔ گل عجائب صفحہ ۲۶۔

گہ ناز، گہ عتاب، گہے جنگ، گہ غضب　　دلبر ہے ان دنوں میں دل آزار بے طرح

مرا دل لبھانے کو دلبر تمہیں ہو　　جفا جو ہو، ظالم ستمگر تمہیں ہو

جواہر کے دیکھے سے کیا مجھ کو حاصل　　مرے حق میں اب لعل و گوہر تمہیں ہو

مثال طلا دل کو آتش میں غم کی　　تپاتے ہو کستے ہو زرگر تمہیں ہو

نگاہِ تلطف ہے مجھ پہ تمہاری　　اے آرامِ جاں بندہ پرور تمہیں ہو

کئے مبتلا دل کو کس کس ادا سے　　نظر میں ہو صاحب فسوں گر تمہیں ہو

معلوم نہیں کہ یہ دل وحشی کہاں گیا　　چل مبتلا اب اوس کی کہیں جستجو کریں

شکستِ خاطرِ عاشق نکر ظالم تغافل سے　　مرا آئینہ دل ہے تیرا اسباب خود بینی

افسر سید نوازش خاں راز کے فرزند تھے، اورنگ آباد وطن تھا۔ ہر مشاعرہ میں اپنی غزلیں سناتے تھے۔ تمنا سے بڑی دوستی تھی، اس ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔

یہ نہ سمجھو کہ میرا پاک گریبان ہوا　　زخمِ دل پردہ نشیں تھا سو نمایاں ہوا

حسن یوسف کی نہیں چاہ مجھے سننا ہے　　چاند صدقے ترے مکھڑے کے میں قربان ہوا

قاتل لہو سے غسل تو دے کر لپیٹیو　　ہم بسملوں کی نعش گلابی کفن کے بیچ

روشن کیجو شمع کو زنہار دیکھنا　　پروانہ ساں جلوں گا ابھی انجمن کے بیچ

افسر دل دبا کیئو جل جل نہ جائے ہائے　　بے طرح شعلے آہوں کے بھڑکے ہیں تن کے بیچ

۱؎ گل عجائب صفحہ ۱۰۔

عشق میں شیریں کے ناحق جی دیا ہے کوہ کن
کس سے سیکھا تھا ئے ظالم ایسی مر جانے کی طرح

کیا جانئے کہاں ہے ہمارا غریب دل — بیچارہ دل ستم زدہ دل بے نصیب دل

محفل میں دل جلوں کی نہ لاؤ چراغ کو — روشن کرو نہ کوئی میرے دل کے داغ کو
گر ایک شب سحر کو نکالوں جگر سے آہ — مرغ چمن جلا دوں گا میں تیرے باغ کو

ئے جو سینۂ سوزاں سے آہ نکلے ہے — زبان شمع سے جوں شعلہ واہ نکلے ہے

آشفتہ:- خواجہ ابو طالب خاں نام اور آشفتہ تخلص تھا۔ خاندانی امیر تھے باپ خواجہ اشرف خاں بہادر غضنفر جنگ، اور دادا اعماد الملک مبارز خاں تھے جن سے فتحیاب ہو کر آصف جاہ نے دکن کی حکومت قائم کی تھی۔ آشفتہ علمی قابلیت بہت اچھی رکھتے تھے۔ شعر و سخن کا بھی پاکیزہ مذاق پایا تھا۔ دوست نواز، دوست پرست اور علم مجلس سے پوری طرح واقف تھے۔ تمنا سے تلمذ تھا۔ خود کہتے ہیں ؎

استاد فلاطونم در شاگرد تمنا
آشفتہ دو عالم شد یکساں زمن امروز

وہ اپنے گھر ستی مست شراب نکلے ہے — طلوع صبح کا جوں آفتاب نکلے ہے

آتا ہے کہاں غنچہ کو یہ ڈھنگ تبسم — جو لب پہ نمایاں ہے ترے رنگ تبسم

میں کب سے ترا طالب دیدار کھڑا ہوں — رسوا شدہ کوچہ و بازار کھڑا ہوں
کرنا ہے اگر قتل تو پھر دیر کی کیا وجہ — حاضر ہوں ترے روبرو جلاد کھڑا ہوں

خم جوش میں ہے ساغر و مینا ہے لوٹ پوٹ[1] — کس نے گلابی آنکھ ملی ہے چمن کے بیچ

ٹکڑے کر اپنے دل کو اے بلبل سحر کے وقت — غنچوں کے چاک کرنے کو باد صبا چلی

پھر مزا کیا رہا مراد صاحب — بات جب امتحان پر آئی[1]

خیال:- محمد طاہر المتخلص بہ خیال اورنگ آباد کے متوطن تھے۔ میر نور الدین ولی اور محمد سیف اللہ انور سے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم پائی۔ حیدرآباد میں درس اور تدریس میں مشغول تھے۔ خیال کے ساتھ رخشاں بھی تخلص تھا۔

ہم ان دنوں میں نو اور ہی معاش رکھتے ہیں — نہ فکر دنیا نہ دین کا تلاش رکھتے ہیں
یہ میرزا منشی ہے دماغ میں اپنے — نہ بوئے گل سے ہمیشہ خراش رکھتے ہیں
گئے ملال و گیے شاد ہر طرح رخشاں — ہم اپنی زندگی اب اس قماش رکھتے ہیں

دیوانہ اور دل میں ترے راہ کیا کرے — سنتا نہیں تو کس کی کوئی آہ کیا کرے
آتے ہوں ساتھ آہ کے کٹ جس کے لخت دل — پھر پھر وہ آہ اے میرے اللہ کیا کرے[2]

سالم:- محمد کرم بخش نام اور سالم تخلص تھا۔ ذکا سے تلمذ رکھتے تھے۔ قصبہ پیری کے قاضی تھے۔ عربی کی بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ تنسان

---

[1] گل عجائب صفحہ ۱۶ تا ۱۸۔ [2] گل عجائب صفحہ ۴۹، ۵۰۔

کی شاعری کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ اور اپنے تذکرہ کو ان کے ہی ایماء سے مرتب کرنے کا اعتراف کیا ہے۔[۱]

میں نے دل اب تو ترے ہاتھ دیا یا قسمت
کام جو مجھ سے نہ ہونا تھا ہوا یا قسمت

کوئی دن خوب سہی ہم۔ نہ بھی مجالیں دھو ہیں
اب وہ ہم ہی ہیں تو وہ دل ہی دیا یا قسمت

ایک تھا مجھ طرف آنے تجھے عذر حیا
تس پر اب پاؤں کو باندھی ہے حنا یا قسمت

جس طرح کھیت کو شاداب رکھے ہے شبنم
سبز ہے حسن ترا یوں عرقِ شرم کے سات

خوب رویوں کو نہیں پردے میں ہرگز اعتبار
دُر صدف کی قید سے نکلے پہ پاتا ہے وقار

دیکھیے آتا ہے قاتل کس طرف خنجر بکف
ایک میں ہوں سو تو آپی بے رہا ہوں سر بکف

کس بت طامع سے اے خورشید سودا ہے تجھے
ہر سحر دیکھا تو آتا ہے لیے تو زر بکف

مجھے تونے عبث کیوں نیم بسمل کر دیا قاتل
نہ جینا ہی نہ پھر مرنا چکا یہ کیا کیا قاتل

حجاب دخترِ رز کو تجھی سے نہیں زاہد
جہاں گئی ہے تو بے پردہ سیو نہ گئی

کبھی نظریں چرا کر مسکرانا کچھ نگہہ کرنا
غرض کیا لطف ہے جب آشنا سے آشنا روٹھے

اک جہان ہے سوا ستنگ تجھ بن ترس رہی ہے
پھر پوچھتا ہے پیارے کیا کیا ہوس رہی ہے[۲]

عشرت :- خواجہ ابوالبرکات خاں نام اور عشرتؔ تخلص تھا۔ نواب لشکر جنگ،

---

[۱] گلِ عجائب۔ صفحہ ۶۱۔
[۲] گلِ عجائب صفحہ ۶۲۔

کے فرزند تھے۔ سید شاہ سراج الدین کے شاگردوں میں شامل تھے۔ حیدرآباد میں سکونت تھی۔

ہجر کے درد مصیبت نے کیا از بس اداس ... سر کہیں آنکھیں کہیں اور دل علی ہذا القیاس

میں ہوا جب سے تری نرگس خفتاں سے جدا ... تب سینتی خواب ہوا دیدۂ حیراں سے جدا

گلشن دل میں اگر سرو خراماں گزرے ... اشک خونی سے گلستاں میں طوفاں گزرے

ارے دل تیرے ٹکڑے ہیں کہاں آنسو کے دانے ہیں
مگر آنکھیں یہیں نیں ہیں کہ یہ سارے بہانے ہیں

حسرتِ نام بدنظر رکھے یہی دعا ... دل جائے جان جائے پہ ہرگز نہ جائے آنکھ[1]

قدر:- خواجہ محمد منعم خاں المتخلص بہ قدرؔ۔ ان کے اجداد ہمدان سے آئے تھے۔ ان کے دادا خواجہ عبداللطیف اورنگ آباد میں متوطن ہوئے۔ قدرؔ کی پیدائش اسی مقام پر ہوئی۔ ان کے والد خواجہ عبدالمغنی خاں صمصام الملک کے سررشتہ میں ملازم تھے۔ قدرؔ علم و فن میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ سوانح دکن کے نام سے اونھوں نے تاریخ لکھی ہے جو مستند تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ قدرؔ کو شاہ معین الدین تجلی سے تلمذ حاصل تھا۔ تمناؔ سے یارانہ اور خلوص تھا۔ دونوں حیدرآباد میں ہم محلہ تھے۔

کوہ کن کی اک جہان حسرت گئی تیشہ سے
ہات شیریں کے لگا تو بھی نہ تار دامن

---

[1] گل عجائب صفحہ ۹۶۔

ساقی گیا ہے روٹھ کے ہم سے ہزار حیف | آتی ہے کیوں تو دھوم سے اب کے بہار حیف

آبِ رنگِ نازکی کو گل سے پوچھا چاہئے | شیوۂ دیوانگی بلبل سے پوچھا چاہئے

تختِ شاہی ہے زمرد کا دوانے کے لئے | مینہ برسنے سے نہیں سبز ہے رنگِ صحرا

صحنِ چمن میں تھکے جو ساقی ہوا چلی | تجھ بن گھٹا بھی آئی سو ہم کو رلا چلی
بلبل ہوئی ہے دام میں صیاد کے اسیر | غنچوں کے کان کھولنے بادِ صبا چلی
لالہ نہیں ہے کوہ پہ فرہاد کی ہے خبر | شیریں نے آگے اوس پہ چراغا جلا چلی

نہ چھپ سکی میرے مرنے کی بات اے قاتل | کہ بعدِ قتل جہاں میں شتاب چھوٹے ہے[1]

ہوش:- غلام امام الدین علی نام اور ہوش تخلص، ان کے دادا خواجہ کمال بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ اکثر رؤسا دکن آپ کے معتقد تھے۔ ہوش نہ صرف شاعر بلکہ نقادِ سخن تھے۔ آپ کے اجداد کا وطن احمد نگر تھا۔ شفیق آپ کے کلام کی تعریف کرتا ہے۔ اور اپنے دوستوں میں شمار کیا ہے۔

بنایا دل کی وحشت نے جہاں میں کئیں مکان اپنا
رم آہو کے ساتے میں ہے باندھے آشیاں اپنا
اے دل جا کہہ یہ پیچ و تاب کا ان خوش دماغوں کو
لکھو موجِ نسیمِ نگہتِ گل پہ بیاں اپنا

---

[1] گل عجائب صفحہ ۱۲۴۔

منتشر نہیں زلف پرچیں چہرۂ دلدار پہ — زنگ کے لشکر نے دیکھو روم پر شب خون کیا
جوشِ سودا دیکھ مجھ میں نازنیں فصاد نے — نشترِ مژگاں سے جاری فیضِ دل کا خون کیا

شعلہ رو کے خالِ مشکیں کے سوا ہم آج تک — آگ پر بیٹھا ہوا اسپند کہیں دیکھا نہیں

دیکھ چشمِ مست ساقی خواب میں بخود ہوا — میری آنکھوں سے شرابِ ناب کھنچلا ہے[1]

بے جان:- لالہ جے کشن المتخلص بہ بے جان اورنگ آباد میں رہا کرتے اور شاہ سراج الدین سراج سے تلمذ حاصل تھا۔ صلابت جنگ کی فوج میں ملازم تھے۔ شفیق سے دوستی تھی۔ ایک مرتبہ رخصت کے وقت ایک غزل موزوں کی جس کا مقطع یہ تھا ؎

تری یاد کمر سے یوں عدم میں مل گیا بے جان
کہ قالب بھی نہ پاوے گر کوئی اس کا کفن کھولے

شفیق کا بیان ہے پھر ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-
یا دہندی بھرے ہاتھوں سے اگر ہوے طبیب — شاخِ نبضِ دل بیمار سے مرجاں ہوئے

نگہ کی جوت بجلی کی نیں سیتی نمایاں ہے — اندھاری رات میں بجلی بھی چمکے ہے خدا حافظ

باغ میں کرے نرگس عرض حال گر اپنا — آنکھ کی اشارت سے تب جواب بنتا ہے

کیوں نہ حاصل ہوے خوشی جگ میں — دل بے جان میں جان آیا ہے[2]

---

[1]، [2] چمنستانِ شعرا صفحہ ۹۹ و ۶۰۔

ہنر:۔ سید احمد نام اور ہنر تخلص تھا "عشرتی" کے فرزند تھے۔ کئی مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ ایک "نیہ درپن" ہے جو ۱۱۸۳ھ میں قلم بند ہوئی ہے۔ یہ مثنوی ابن نشاطی کے "پھول بن" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ایک دعوت کا سماں ملاحظہ ہو:۔

بچھائے چاندنی کا فرش نرمل | کہ جیسا چاندنی میں تے جھلاجھل
بچھائے سوزنیاں زرباف کی صاف | ہے اس گل سوں جو بلبل کیا انصاف
روپہری اور سنہری مسنداں پر | صدر میرے ہے جیوں سوانِ چندر
اتنے پروار تکیے پرنیاں باف | پریاں کے گال جیسے نازک ہور صاف
سرنگ آسماں گیریاں تھیں شفق سی | اتھی گلدار جیوں گھن کے طبق سی
رکھے پھولاں سو بھر اس ٹھار گلدان | رکھے تھے پان بیتے بھر تنبول دان
جڑنت کے شمع دان میں شمع کا نور | نوے چندینیاں لگن میں گھن کے پرنور
قندیلاں کے دکھن جھمکے سہانے | انگوراں کے جھمکے خوشہاں کے دانے
دیویاں سوں کنگراں ایسے سہنائے | کہ جیوں قوسِ قزح میانے ستارے

طبق طور کی خوشبو سوں بھر
ہزاروں چاند تھے جیوں انہیں کے اپر

رسا:۔ مرزا جان نام اور رسا تخلص تھا۔ اس دور کے استادِ سخن تھے۔ فارسی اور عربی میں عالم و فاضل تھے۔ ادیب کامل سمجھے جاتے تھے۔ زمانہ دراز تک آصف جاہ کے دارالانشاء میں مامور تھے۔

ذرّہ:- بالاجی ترمبک نام اور ذرّہ تخلص تھا۔ رسا سے تلمذ حاصل تھا۔ سنہ ۱۱۵۰ھ سے سنہ ۱۲۰۰ھ تک ان کے موجود رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ کتب خانۂ آصفیہ میں خود ان کا قلمی دیوان موجود ہے۔ غزلیں عموماً چار چھ شعری ہیں۔ دو مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ ایک "مظہر نامہ" اور دوسری "لطیفہ" سے موسوم تھی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

مجھ دل موسوی پہ بیضا کب آئے گا
اس جانِ ناتواں کا مسیحا کب آئے گا

کہ تھا یہ ہمدم اپنا یار اپنا جان نثار اپنا
نہ بولی شمع اتنا ہائے پروانے کے ماتم پر

جب تلک ہے جہاں میں تو خوش باش
پیر ہادی نے یوں کہا ذرہ

حق محبت کا ادا کرتے ہیں ہم
بے وفاؤں سے وفا کرتے ہیں ہم

مضموں کا اس کے رنگ پڑا ہے رسا کے ہاتھ
ذرہ بھی اپنے رنگ میں خورشید طبع ہے

دل دیا ایک بار آنکھوں نے
کھو دیا اعتبار آنکھوں نے

تیرا دنیا میں کیا خدا ہی نہیں
ایسے خوبوں کو دل نہ دے زنہار

پروانہ:- شاہ ضیاء الدین نام پروانہ تخلص۔ شاہ سراج الدین سراج کے معتقد، شاگرد اور منظور نظر تھے۔ برہان پور وطن تھا۔ پروانہ صوفی تھے اور مرشد سراج پر پروانہ کی طرح نثار تھے۔ اور فنافی السراج ہو گئے تھے۔ پروانہ کے متعلق تجلی سروری صاحب نے رسالہ اردو کراچی میں تفصیل سے

ط۱ ادارہ ادبیات اردو نے انکا کلام شائع کیا ہے۔

روشنی ڈالی ہے۔ پروانہ نے غزلیں بھی کہی ہیں اور مثنوی بھی لکھی ہے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

چشم جاں کے لئے ہے شمع و چراغ — دل ہے پروانہ کا ترے غم میں داغ
ڈھونڈتا ہوں تجھ کو ہر محفل میں میں — بلکہ ہر یک جسم میں اور دل میں میں
نے میں میرے دل کے ہے تیرا نوا — بزم میں تو ہے تری خالی ہے جا
دھن میں تیرے وصل کی مجھ تار میں — ہے صدا مستی کی اس ہشیار میں
بلکہ مجھ پر شے میں تیرا راز ہے — ساز تیرا ہے ترا آواز ہے
کاسہ سر میں میرے طنبور وار — آرزوئے وصل تیری کے پکار

ہے عشق گلبدن کا جس دن سے مجھ کو سودا — صحرا ہے باغ مجھ کو اور باغ ہے گا صحرا
ہے دل میں تو ہمیشہ کس طرح تجھ سے ملئے — رہتی ہے یہ ہمیشہ دل میں مرے تمنا
رقیباں ہو گئے مغلوب سارے — مرے طالع کا غالب ہے ستارا

دل ترے عشق میں کیا کیا نہ کیا — سب کیا غیر کیا سودا نہ کیا
نہ کیا کعبے کا دل جا کے طواف — اور بت خانہ کی پوجا نہ کیا
نہ ہوا یار کا دیدار اسے — دل کو جو عرش معلا نہ کیا
نہ ہوئی اس کی جہاں میں شہرت — عشق میں خود کو جو رسوا نہ کیا
داغ پروانہ ہوا جل کے تمام — جان جانے کی دو پروانہ کیا

تالاب میں تن کے خوش آب کا تماشا — اور اس میں اشک گلگوں سرخاب کا تماشا
آنکھوں میں اشک میرے کرتے ہیں رقص تجھ بن — اے سرو دیکھ جو ہیں گرداب کا تماشا

سید سراج تجھ بن پروانہ ہیگا بیکل ... آتش میں دیکھ آکر سیماب کا تماشا

تشنۂ وصل ہے جو کوئی کی بیتاب ہوا ... آب تیغ کفِ قاتل سیتی سیراب ہوا
جل کے خاکستر اکسیر ہوا پروانہ ... مثل سیماب وہ جلتے ہیں نہ بیتاب ہوا

پہم چند:- لالہ پہم چند نام اور یہی تخلص کرتے تھے۔ دیوگدھ (خاندیش) کے قلعدار برہان شاہ کے متوسل رہے۔ شاہنامہ کا ترجمہ ۱۲۰۰ھ میں کیا پانچ سال کی مدت میں اس کو مکمل کرنے کی صراحت کی ہے۔ پہم چند کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

سنو اے سخن سنج دانش پناہ ... ذکر بادشاہ ہے کیومرث شاہ
کیا جس نے بنیاد تخت اور تاج ... نہیں تو جہالت میں نہ تھا یہ رواج
رہے کوہ میں سات انبوہ کے ... چرم چارپایوں کی پوشاک سے
سیامک اسم اس کو فرزند تھا ... شکل خوب محبوب دل بند تھا
تھا ایک دیو دشمن کیومرث کا ... اسے ایک فرزند مکار تھا
وہ آیا کیومرث کی جنگ کو ... گراں فوج دیووں کی لے جنگ کو
سیامک جو فرزند تھا بادشاہ ... سو آکر مقابل ہوا باسپاہ
لڑا دیو بچہ سنے ذات سے ... ہوا اس نگوں بختگی بات سے

یہ کہہ کر شتابی سے ڈالا کمند ... سو رستم نے سر کو بچایا نہ بند
بپندار خشگی سر میں آوہ طناب ... سو رستم نے چاہا نکالوں نشاب

لہ رسالہ اردو کراچی ماہ اپریل ۱۹۵۱ء مضمون تخمین سروری۔

کمند پکڑ کو کی انچیا اس نے
ادھر اس نے کھینی جو اپنی کنے
کیا روز دونوں نے ٹوٹا ادھر
گرا زمن کاموس سے خوار تر
چھا پھر جو گھوڑے پہ ہوتا بلند
سو رستم نے ڈالا گلے میں کمند

نقارے بجے اور سجے پہلوان
ہتھوں پر کھلے ہفت رنگی نشان
ہوئے ہر دو لشکر مقابل کو جب
پوچھا پہلوانوں سے خاقان نے تب
کہو کون رستم سے لڑنا ہے اب
سو کاموس جنگی ہوا تیز تب
نکل اپنے لشکر سے گھوڑا کدا
بلایا وہ رستم کو میدان میں آ

عشق:۔ مرزا جمال اللہ نام اور عشق تخلص مرزا داؤد کا فرزند تھا۔ اور شاہ غلام قادر سامی سے تلمذ تھا۔ اولاً اورنگ آباد میں قیام تھا پھر حیدرآباد آکر بس گیا۔ ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ عشق کا حال اور نمونہ کلام مرقع سخن جلد دوم میں تفصیل سے درج ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

آتشِ رو تیرے آگے تاب کب لاتی ہے شمع
رشک سے تجھ حسن روز افزوں کے جل جاتی ہے شمع
چاند سی صورت کے آگے تیرے شرماتی ہے شمع
دیکھ روشن مکھ ترا بے نور ہو جاتی ہے شمع

سینہ بریاں چشم گریاں آہ سوزاں دل تپاں
کس قدر جلنے کا پروانہ کے غم کھاتی ہے شمع

خاطر سے غبار ہو گئے ہم
جتنا کہ ہنسے تھے رو گئے ہم
اے عشق بقول دردؔ سچ ہے
کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم

مرثیہ گو

اب ہم اس دور کی مرثیہ گوئی کو پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے
جب کہ ہنوز لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا تھا اور نہ اس کا رواج۔ البتہ دکنی
مرثیے دہلی تک پہنچ چکے تھے۔ اور وہاں کی مجالس عزا کو اشک بار کرتے تھے۔
یوں تو دکن کے شعرا نے دوسرے اصناف سخن کے ساتھ مرثیے بھی کہے ہیں۔
مگر بعض شعرائے صرف مرثیہ گوئی اپنا میدان سخن قرار دے لیا تھا۔ اس لئے ایسے
شعرا کا کلام علیحدہ ہی پیش کیا جاتا ہے۔

اس دور کے مرثیہ گو شعرا کی فہرست بھی طویل ہے۔ مگر ہم صرف چند
مرثیہ گو شعرا کو پیش کرتے ہیں تاکہ اس زمانہ کے مرثیوں کا اندازہ معلوم ہو سکے۔

رضی[1]: حافظ رضی الدین اس دور کا زبردست مرثیہ گو شاعر ہے۔
مصنف گلشن گفتار (خواجہ خان حمید) نے اس کو ولی اورنگ آبادی
کا شاگرد بنایا ہے۔ شاید یہ صحیح نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ دکن کے دوسرے
تذکروں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

رضی کے مرثیوں کا کوئی مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ اڈنبرہ
یونیورسٹی کے کتب خانہ کی بیاض میں اس کے دو مرثیے شامل ہیں معلوم ہوتا ہے

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات و تذکرہ حمید۔

کہ رضیؔ کے مرثیے عام طور پر دکن میں مشہور تھے۔

اس کے مرثیوں پر تضمین لکھی جاتی تھی اس کے مرثیوں میں ادبیت نہیں پائی جاتی۔ ان کا اصلی جوہر سوز و گداز اور مرثیہ پن ہے۔

غم سوں ہے بے قرار میرا دل ۔۔۔ دکھ سوں ہے زار زار میرا دل

گلشنِ غم میں ہے شہید ان کے ۔۔۔ لالہ داغدار میرا دل

نت شہید ان کے زخمِ غم سیں ۔۔۔ شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل

غم کی بجلی پڑی ہے جب ستے ۔۔۔ تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل

نیم بسمل نمن تڑپتا ہے ۔۔۔ ہو کے غم کا شکار میرا دل

گرد غم سوں امام کے اے رضیؔ
کیوں نہ ہو پر غبار میرا دل

نہیں رضیؔ معلوم رازِ حق تعالیٰ کا سبب
نورِ چشم ساقیِ کوثر بہوت ہے مضطرب
چشم تر لے فرات اوپر کھڑے جب تشنہ لب
نوح کا طوفان مگر اس وقت ہوتا آشکار[1]

قادر:۔ قادرؔ تخلص کے شعرا حیدرآباد اور بیجاپور دونوں جگہ ہوئے ہیں بیجاپور کے قادرؔ کا زمانہ علی عادل شاہ ثانی کا عہد ہے۔

حیدرآباد کے اس قادرؔ کا زمانہ اس کے مابعد کا ہے۔ ۱۱۴۹ھ میں تو

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

یہ بقید حیات تھا مگر ۱۱۶۹ھ کے قبل فوت ہو چکا تھا۔ اس کے ثبوت میں قادر کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

سن اگیارہ سو او پہ انچاس سال
سبز بانا قادر کا لہو میں لال[1]

برہان پور کا مرثیہ گو ہاشم علی اپنے مرثیہ میں کہتا ہے ؎

ہزار حیف نہیں شاعران دکھن   سو روحی و مرزا و قادر نہیں

ہاشم علی ۱۱۶۹ھ میں زندہ تھا۔ اس لئے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ قادر اس کے قبل انتقال کر چکا تھا۔[2]

جہاں تک معلومات ہوئے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ قادر صرف مرثیہ گوئی کرتا تھا۔

اس کے نام کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض اس کو غلام قادر سے موسوم کرتے ہیں اور بعض میر عبدالقادر سے۔ یہ آخر الذکر قول زیادہ صحیح ہے قائم نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میر عبدالقادر قادر تخلص حیدرآباد کے باشندے تھے۔ اکثر مرثیے مشہور ہیں۔ صاحب دل تھے۔ صغیر سنی سے فقیرانہ مذاق تھا جب پچاس سال کے ہوئے تو دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ان کے مرثیوں سے ان کی علمی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ علم نجوم اور علم ہندسہ میں بھی ان کو خاص مہارت تھی۔ ان کے مرثیے

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۶۳۰ - [2] ایضاً صفحہ ۶۳۰ -

تسلسل مضامین، سادگی اور انسانی جذبات کی ترجمانی کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں۔

افسوس ہے کہ ان کے مرثیوں کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوا۔ اڈنبرہ وغیرہ کی بیاض میں ان کے متعدد مرثیے موجود ہیں:۔

ہوا شہرت محرم میں یو غم ہے شاہ عالی کا — کہ ہے فرزند پیارا وہ دونو عالم کے والی کا
جیو پایا ہے دین کا چندر کہ جس سوگ سوں جگت پر — فلک پر ملک میں تانے شمیانا رات کالی کا
سنا ہے سب قدسیاں نے ملا کر سب گگن اوپر — حسین کے عرش کوں بھاندے منڈپ تباں کی جالی کا
نہیں یو اشک شبنم سوں کھڑے ہیں آہ کے گل بو — دیکھو غم کے چمن میانے لطافت غم کے مالی کا

قیامت کا پنا قادر تزلزل جب کرے ظاہر
مجھے تفتوئی تب آخر ہے حسین مردے عالی کا

محرم یو غم ہے لہل ہائے ہائے — ہوا شور ماتم سگل ہائے ہائے
شفق میں رنگیا سورج کا پیرہن — بھکا کر گگن میں انچل ہائے ہائے
حسینا کوں کہاں ہے پو سلاتے نبی — کریں پیار سب تے اول ہائے ہائے
حسینا کی خدمت کوں سورج خواص — کرن کا کرے مورچل ہائے ہائے
ان پر ظلم کے ستارے گرے — کہ مریخ زہرہ زحل ہائے ہائے
رو بن فاطمہ ہور حسد بچہ نبی — بو تقدیر اں کی آئے اجل ہائے ہائے
نبی کے گھراں کا دیا گل ہو گیا — خدایا توں کر یو عدل ہائے ہائے
کیا شہ اوپر ظلم ناحق بے گناہ — تو محشر کے صف میں خجل ہائے ہائے

سدا غم میں رہنا کھڑا اختادرا
دنیا خواب جھوٹا محل ہائے ہائے[1]

روحی:۔ [2] روحی کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ حیدر آباد کے پیرزادے تھے اور ہاشم علی برہان پوری کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسی زمانہ میں انتقال ہوا تھا۔

ان کے مرثیے اڈنبرہ اور کیمبرج کی بیاضوں میں موجود ہیں جو ادبی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔

آج غم ناک ہیں چمن کے گل — بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل
غمزدہ سینہ داغ حیران ہیں — نرگس و لالہ یاسمن کے گل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں — لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل
جب سنے شہ کی بات مجلس میں — جل بو جھے شمع انجمن کے گل
نقش پا و بکیہ دل ہوس رکھتا — سر پہ رکھنے کوں تجہ چرن کے گل
خوش لگے تجہ طبع سیں اے روحی — دل کے باغاں منے سخن کے گل[3]

امامی:۔ [4] امامی برہانپوری جوہر کنی کا پیشہ تھا مگر مرثیہ کہنے میں بڑا نام پیدا کیا۔ اس کا اسلوب بیان بہت دلچسپ اور دلکش ہے۔ وہ اکثر گفتگو کے طور پر لکھتا ہے اور اپنے مرثیوں میں ڈرامائی اثر پیدا کرتا ہے۔

اس کے مرثیے اڈنبرہ کی بیاض میں موجود ہیں۔ کوئی اور مجموعہ دستیاب

---

[1] بیاض مملوکہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔ [2] قائم۔ اسپرنگر۔ [3] یورپ میں دکھنی مخطوطات [4] تذکرہ فتوت۔

نہیں ہوا۔

محشر میں جب محمد شاہ زمن اوٹھیں گے
حیدر علی لوہو سوں آلودہ تن اوٹھیں گے
آلودہ خاک و خون میں دندانِ مصطفےٰ لے
ٹکڑے حسن کے دل کے جاما حسین کا لے

سب انبیائے مرسل پرغم حزن اوٹھیں گے
لینے لوہو کے ہلکان ہے ہے حسن اوٹھیں گے
لوہو سوں تربتر سب دستار مرتضےٰ لے
تربت سے فاطمہ جب لے بو برن اوٹھیں گے

دریائے غم میں ہرگز کرنا نہیں غواصی
امید تو قوی ہے پائے گا توں خلاصی

ہر چند توں آثامی عالم منی ہے عاصی
کرنے کتیں شفاعت جب پنجہ تن اوٹھیں گے

کیا ظالماں نے ظلم بے حساب آج
اس غم سوں مومناں کو ہوا پیچ و تاب آج
تھا آئینہ رسول کو درشن حسین کا
زخماں کے جواہراں دسے تن حسین کا
کیوں عرش فرش پر نہ گرے بے قرار ہو
مینا سے تند کوں شہ کے شکستہ کیا دیکھو

مظلوم کربلا میں عالی جناب آج
گویا علی کے گھر کا کھولا غم کا باب آج
ہے وہ جفا کی گرد میں درپن حسین کا
دستا ہے جوں شفق میں ظل آفتاب آج
کیوں تاب لا سکے نہ فلک دیکھ ظلم یہ
سنگیں دلاں نے ظلم کی پی کر شراب آج [۱]

ہاشم علی [۲]: ہاشم علی برہانپوری بھی اس دور میں بلند پایہ مرثیہ گو شاعر ہو گزرے ہیں ۱۱۶۹ھ تک ان کے بقید حیات رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۱۳۰ھ میں وہ خاصا مشہور مرثیہ گو تھا اور اس کے اعتقاد کے مطابق اس کے مرثیے سننے کے لئے آنحضرت صلعم خواب میں تشریف لایا کرتے۔

---

[۱] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ [۲] ایضاً

اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بصورت بیاض موجود ہے جس کو اس نے دیوان حسینی سے موسوم کیا ہے۔ اس میں ردیف وار مرثیے ہیں۔ یہ مرثیے۔ مربع۔ مخمس۔ غزل نما سب کچھ ہیں۔ ان کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ ہاشم علی ایک باکمال مرثیہ گو تھا۔ اس کے بعض مرثیے مکالمہ کی طرز کے ہیں جن کے باعث ان مرثیوں میں جان پیدا ہو گئی ہے۔

آج پرخون کفن ترا اصغر — آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے گلبدن ترا اصغر — جیبت یو بالین ترا اصغر

کیوں ہیں زلفاں کے بال تاروں تار
کیوں گلے سیں لوہو کے جاری ہار
تجہ کوں سوتے کبھو نہ لگتی بار
جیبت یو بالین ترا اصغر

اوٹھ گلے کا لوہو دھولاؤں میں — نیند آتی تجھے سولاؤں میں
چل ترا پالنا جھولاؤں میں — جیبت یو بالین ترا اصغر

جلوہ سیں اٹھ کے رن کو چلا تب کہی دلہن — دامن پکڑ کے لاج سوں انجھراں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدھارو تم اس حال میں ہمن — تم بن رہے گا ہائے یہ سونا بھون مرا
کیسی یو کد خدائی دکیسی ہے یو برات — آتا فراق تم سوں یہ جلوہ کی آج رات
گھر کون لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات — دیکھا نہیں جمال کوں بھر کے نین مرا
اس کربلا کے بن میں اکیلی میں کہوں رہوں — تجہ باج میں جہاں میں پھر امید کیا دھروں
جد کے مینے کیونکر میں اس ٹہالے سے پھروں — تم اپنے ساتھ لے کے دکھاؤ وطن مرا

جانتے ہو چھوڑ رن کی طرف مجہ کون تم رولا | نہیں شرم کا ہنوز یہ سر سوں گھونٹ کھلا
کرنے نہیں محبت وجانتے میبا بھولا | اس زندگی سوں آج بہلا ہے مرن مرا
مجہ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار | تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں علاج نہیں حکم کردگار | حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن مرا
ہے داغ دل میں تری جدائی کا کیا کروں | نہیں ہے امید رن سے پھر آکر تجے ملوں
جو کچھ ہوا ہے مقدروں میں راستی کہوں | دعدہ ہوا ہے حشر میں تم سوں ملن مرا

وہ دو صغیر موت آپس کی دیکھے عیاں | کہتے تھے بے کسی سوں کہ اے حارث الاماں
زلفاں کوں کاٹ بیچ ہمن کون جو بندیاں | منظور ہے اگر تجے سیم و طلا کیتئن

مسلم ہوا شہید ہمارا سو تھا پدر
ہے ماں ہماری آج مدینہ میں منتظر
توں کر رحم سوں ہماری یتیمی پہ کہ نظر
امید رکھ شفاعتِ روزِ جزا کیتئن

ہر چند کرنے عجز وہ طفلانِ خوردسال | اوں کوں کہا لعین بدافعال بدخصال
ہیگی نجات تم کوں میرے ہاتھ سوں محال | بھیجوں گا آج تم کوں میں دارالبقا کیتئں

دہوئے ہیں ہاتھ تب وہ اسیرانِ جان سیں
قطع امید کر کے وہ سب خان مان سیں
رشتے گئے وہ راندہ ہر دو جہاں سیں
مہلت دے ہم کوں سجدہ کریں ناخدا کیتئں

فرصت نماز کی وہ شقی نے نہیں دیا | شمشیر از نیام نکالا وہ بے حیا

ہر ایک کہئیں کہ مرمیں توں دل میری لگا ۔ نہیں تاب دیکھنے کا مجھے سر جدا کیتئیں[1]

قائم :- میر محمد قائم نام اور قائم تخلص ۔ برہان پور کا باشندہ تھا ۔ حمید اور شفیق نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ ایک مثنوی بھی ان کی یادگار رہے ۔ ان کے کئی ایک مرثیے اڈنبرہ کی بیاض میں ہیں ۔ ان سے معلوم ہوتا ہے ان کے کلام میں ادبیت کے ساتھ سوز و گداز بھی تھا ۔

تجھے فاطمہ آبو لا دیں حسین ۔ ترے بن کیتا تلملا دیں حسین
ڈھونڈیں بیخودی سوں نیادیں حسین ۔ روویں ہاتھ مل جیف کھادیں حسین

کہیں ہے رے جیو کے پیارے کہاں ۔ مجھے چھوڑ اکیلا سدھارے کہاں
دیکھو مجہ دکھی کے دو دکھیارے کہاں ۔ سبب کیا نہیں آج آویں حسین

پل تھا مرے گود میں وہ سدا ۔ ہوا نیں کبھو مجہ سوں یک تل جدا
ہوا کس بلا میں وہ جا کر ملا ۔ کہ نہیں آ مجھے مکھ دکھاویں حسین

دریغا مجھے چھوڑ نیارا ہوا ۔ اکیلا کہاں جا بچارا ہوا
یو غم اس کے جیو میں انگارا ہوا ۔ لگے دل و سینے آ بجھاویں حسین

ہے قائم غلامی میں امید وار ۔ گناہاں میں غرق گرچہ ہے بے شمار
ہے محشر کوں حامی مرا بر قرار ۔ شفاعت جو کر کہ چھڑاویں حسین[2]

---

[1]، [2] یورپ میں دکھنی مخطوطات ۔

نظر:- نظر کا ذکر کسی دکھنی تذکرہ میں نہیں ہے۔ مگر منشی کریم الدین[1] نے ذکر کیا ہے کہ سید محمد علی نام اور نظر تخلص اورنگ آباد کے مشہور شاعر تھے۔ ہر آٹھویں روز مشاعرہ کیا کرتے۔ درویش منش آدمی تھے۔ دوپہر تک طالب علموں کو درس دیا کرتے۔ اس کے بعد شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔

اڈنبرہ میں ان کے بعض مرثئے ہیں۔

یاراں ہزار حیف رسولِ خدا نہیں — اور فاطمہ علی و حسن مجتبا نہیں
تنہا حسین رن میں کوئی آشنا نہیں — بازو نہیں رفیق نہیں دلربا نہیں

اصغر کوں شہ نے گود میں لیکر منگے جو نیر — ملعون نے جواب میں مارا ستم کا تیر
بیداد کیا کیا تری تقصیر یہ صغیر — پیاسا نہیں نہ بان نہیں دست و پا نہیں

کہنے لگا ہے جب سوں الم کے نظم میں بیت — دنیا کوں دل سوں سہٹ کے توں بول اس الم میں بیت
دو جگ میں نظر کوں بجز حب اہل بیت — مقصد نہیں مراد نہیں مدعا نہیں[2]

سیدن:- سیدن کے متعلق ہمیں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ اڈنبرہ میں اس کے مرثیے ہیں۔ اپنے ایک مرثیہ میں موت کو شادی کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ماہ محرم میں دیکھو جیندا ہو مالی آئیا — تارے گگن کے گوندکر سہرا جو شہ کوں لائیا
گنگنا ستم کا باندکر روکہ کا اوبٹنا کوں لگا — حیرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سے تن نہلائیا

---

[1] طبقات الشعرا۔ [2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

دولا جیبنا چھڑ ترنگ سر ڈال لکھنا نور کا
سارے براتی سات لے دولہن کوں بہانے ڈھائے

باجے بجنتر دین کے غم کے نفیریاں کا ہے علی
ملعون لشکر مل سبی منڈف تیروں کا چھائیا

اپنے پیو جیو کوں وار کر دیوے نے ھنگانا بیس کا
ہر یک نے شہ کے سنگ سوں خلعت سہانی پائیا..

قاضی قضا کا عقد بن کر ختم شرطاں شرعیاں
ڈھال کے خواناں کر انگیں شمشیر جو بہا کھائیا

تھا رو دانشت کربلا ظلمات بحر خون کا
ہیں پیاس میں طفلاں سکل پانی ستیں ترسائیا[1]

شرف :- شرف کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ہے۔ اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے مرثیے موجود ہیں۔ نمونہ پیش ہے :-

سیج جھولے کی ہیں سنبھاتی تھی
بالے اصغر کوں تب جھلاتی تھی

آج پالک مرا نہیں دستا
باس اس کی مجھے بھی آتی تھی

جب دولارا وہ نیند بھر سوتا
دودھ پینے کو ہیں جگاتی تھی

ظالماں سنگدلوں نے مارا تیر
سخت فولاداوں کی چھاتی تھی

پھوپیاں سب صدقے اس کے جاتیاں تھیاں
چاؤ سوں جب اسے اٹھاتی تھی

تیر گزرا گلے سوں اصغر کے
ہائے کس دکھ سوں جان جاتی تھی

ہیں جب اصغر کوں گود میں لیتی
پھولے ہیں آنگ میں سماتی تھی

شاہ پھر کر لے آئے اصغر کوں
بولے رو کر اتنی جیاتی تھی

پانی بن خشک ہو گیا ہے شیر
دیکھ اصغر کوں تلملاتی تھی

آج جنگل میں توں اکیلا ہے
رات دن میں تری سنگاتی تھی

---

[1] اردو شہ پارے۔

آج کہہ کیا پوکار واں کہہ مجھ کوں   تب میں اصغر کی ماں کہلاتی تھی

شہر بانو کے شور کی آواز
اے شرف لامکاں کو جاتی تھی[1]

برہان:- اس دور کا ایک اور مرثیہ گو برہان ہے۔ سیدی برہان ان کا نام تھا۔ ان کے کلام میں حب اہل بیت کی نظمیں ہیں۔ اپنی نظموں میں خود ستائی بھی بہت کرتا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں ان کا کلام موجود ہے[2]

جس وقت علمدار نے چمکا کے پھریرا   میدان میں آیا
نقارہ کیا فوج میں تب اور دوبارا   واں تیغ بجایا

فارغ ہوا جو حضرتِ اکبر نماز سے   در دشت کربلا
کوئی کہے اوٹھے پیغمبر نماز سے   در دشت کربلا

---

[1] اردو شہ پارے۔

[2] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۲۹۳۔

چوتھے دور کی نثر

اب اس دور کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ شعرائے باکمال کا کلام تمام تر تصوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لئے حضرات مشائخین عظام نے نثر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار مناسب خیال فرمایا جس کے باعث تصوف میں کئی ایک کتابیں لکھی گئیں۔ ذیل میں ایک کتاب سے اس کی عبارت بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ نثر کی ترقی کس رفتار پر تھی۔

معرفت السلوک شاہ ولی اللہ قادری خلف اکبر شاہ حبیب اللہ قادری نے معرفت السلوک لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ سنہ تالیف معلوم نہ ہو سکا مگر اسی دور کی کتاب ہے کیونکہ شاہ صاحب کا انتقال محرم ۱۱۵۷ھ میں ہوا ہے۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے ارشاد سے اس کا فارسی[2] سے ترجمہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ قادری اپنے والد کے بعد ان کے جانشین ہوئے تھے۔ شاہ حبیب اللہ صاحب کا سنہ انتقال مصنف "مشکواۃ النبوۃ"[1] کو بھی معلوم نہیں ہے۔ بہرحال ۱۱۵۰ھ کے اوائل میں لکھی گئی ہے۔

---

[1] مشکواۃ نبوت قلمی مصنف علی الموسوی قادری

[2] فارسی کتاب کا نام بھی معرفۃ السلوک ہے جو شیخ محمود قدس سرہٗ کی تالیف ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول تھی اور کثرت سے لکھی جاتی تھی۔ میری نظر سے دو نسخے[1] گزرے ہیں ایک ۹ رجمادی الاول ۱۱۹۵ھ کا لکھا ہوا ہے دوسرا اس سے قدیم ہے جس کا سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا۔

یہ کتاب تصوف میں لکھی گئی ہے۔ واجب الوجود نفس امارہ۔ نفس لوامہ۔ توحید افعالی۔ توحید وجودی وغیرہ عنوانات کے تحت اپنی کتاب کو ترتیب دی ہے۔ قرآن شریف حدیث اور قصوں سے اپنے دعوئی کو ثابت کیا ہے۔ نمونہ درج کیا جاتا ہے :-

" صفت ہور سرانا بی غائت ہور شکر کرنا بی نہایت ثابت ہے، اس واجب الوجود کون جو ممکن الوجود کون ممتنع الوجود کی دائرین پیدا کیا۔ ہور اپنی واجب الوجود کو اس دونوں وجودسوں موجود ہور ظاہر کیا بزرگ ہے بزرگی اس کی ہور عام ہی نعمت اس کی ؛"

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :-

" من عرف نفس فقد عرف ربہ کے بیان میں بیان کروں ہور اس کی شرطاں کی شرح کون عیاں کروں کیا واسطہ کہ سر من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے نکتین کے تحقیق کرنا بہوت مشکل ہے کیا واسطہ کہ یہ کام صاحب دل کا ہے نہ ہر ایک بے دل کا ہے ہور عارفاں نے اس بات میں بہوت کتاباں کہی ہیں نفس لوامہ یعنی نفس ملامت کرنھار بری فعلاں پر نفس لوامہ قلب سبب کے تعلق ہے یعنے سالک نے

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں دو نسخے موجود ہیں۔

جس وقت سب باطن کے ہیں ہلن جلن کون قلب ہیب میں کھینچا جو دو
نفس امارہ کی ہلن جلن تھی اگرچہ نفس امارہ کیا تھا امایاس اس کی باقی
رہی تو نور بجتا ہی جو اس کوں نفس لوامہ دور کرے نفس لوامہ نفس امارہ
کی برعکس ہے دو حکم کرنہارا بڑی صفتاں پر ہی جھونکہ کبر۔ کینہ
حرص۔ حسد۔ غصہ۔ عداوت ہور حکم کرنہارا خوب صفتاں پر ہی
جیونکہ تواضع ہور علم رضا ہور صبوری اخلاص ہور محبت۔

بولتا ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد جارو بکش
درگاہ عالی بارگاہ اہالی عاجز فقیرالحقیر محمد ولی اللہ حکم کئے منجکوں
حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ
اولیا کے بری انقیا کے ہور صدرنشین محمد مصطفےٰ کے صاحب
شریعت ہور طریقت کے دریا حقیقت ہور معرفت کے وارث
محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھی اللہ
العالی انوکوں :-

رسالہ حقائق یہ ایک مختصر رسالہ علم تصوف میں ہے جس کے مصنف حضرت
شاہ میر ہیں۔ ۱۱۹۷ھ کا نسخہ میری نظر سے گزرا ہے۔ یہ کتاب کسی فارسی وحدت الوجود
کی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ مختلف مقامات سے درج ذیل ہے :-

لَیسَ کَمِثلِہٖ شَیٔ وَھُوَ السَّمِیعُ البَصِیر یعنی کوئی چیز اس سریکا
نہیں ہور وہ کسی سریکا نیں یعنی مخلوقات کی صفاتاں سوں ہور لواز مات
سوں پاک ہور منزہ ہور برتر ہی۔ اے عزیز موجود وصفت کا ہی ایک

واجب الوجود دوسرا ممکن الوجود۔"

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ جو خدای تعالیٰ فرمایا یعنی ہیں معبود نہیں بلکہ تمھاری ساجید ہوں خدا کی نسبت ہور خدا نیں بلکہ بندہ ہوں خدا کا رسول ہوں ہور تمیں مجد سوں ہی ہو ہیں خدا سوں ہوں یعنی تمیں میری نور ہیں ہور ہیں خدا کا نور ہوں ایس سوں مجکوں جدا مت جانو ہور مجھی ایس ہیں دیکھو ہور سمجھو کہ خدای تعالیٰ امت رکھیا ہی تمنا پر اس بات کا کہ نقل من اللہ

"حضرت شاہ حقائق آگاہ برہان الملت والدین قدس سرہٗ فرماتی ہیں فردِ آدم نور نبی کا پاک :: تا کہ صورت بر قبح خاک پس اس نور کوں تن کی تعلق سوں رُوح کھتی ہیں اور نور تن ہیں آکر روح ہوا بعد از اپنی نورانیت ہور روحانیت کوں بسر کر بشریت کی صفتاں سوں موصوف ہو کر محلِ خطرات ہور بعد از عالم مثال پیدا کیا مثال جسم لطیف کوں بولتی ہیں جیسا کہ خواب میکا نن یعنی تمثل ہور نمائش تمثل کا معنی ایسکوں اپی منگی میر کی صورت سوں دیکھنا جیسا جبرئیل علیہ السلام وحیہ کلبی کی صورت یا مور کی صورت سے کر حضرت کی مجلس ہیں آتی ہیں۔"

اب ہم ادبی کتابوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں اگرچہ ان کی تصنیف کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہے مگر بعض شہادتوں سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی دور کی نثر ہے:۔

اخلاق ہندی[1]:۔ ایک اور نثر کی کتاب اخلاق ہندی ہے۔ اس کے بھی مصنف کا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۶۷۔

نام معلوم نہ ہو سکا۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے :-

" دو دو عورتاں ایک بچے کے واسطے لڑتے تھے ہور شاہد دو نہیں رکھتے تھے۔ اور وو دونو عورتاں لڑتے ہوئے قاضی کے پاس گئے ہور انصاف چاہی۔ قاضی جلاد کو حکم دیا اس بچے کو دو ٹکڑے کر کر اس دونوں عورتوں کو دی۔ ایک عورت یہ بات سن کر خاموش رہی دسری عورت گریہ ہور داد بیلا کر کے پوکاری جو واسطے خدا کے بچے کو دو ٹکڑے مت کر اگر ایسا ہی انصاف ہی بچے کو میں چہیتے نہیں۔ قاضی تب یقین سمجھا جو ماں بچی کے یہی ہے بچا اس کو دیا ہور دسری عورت کو کوڑے مار کر چلا دیا۔ "

طوطی نامہ :- اس عہد میں طوطی نامہ کے کئی ترجمے دکھنی زبان میں ہوئے ہیں افسوس ہے کہ ان کے مترجمین کے نام معلوم نہیں ہوئے ۔

(۱) ابو الفضل کے طوطی نامہ کا ترجمہ :-

اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے[۵]۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

" پچھے سب تعریف صاحب زمانہ کے اور زمین کے یعنی خدائے کے تعریف کے بعد از اور پچھے سب تعریف صاحب جان اور تن پیدا کرنے ہارے کے چلنے ہارے پیرے راہ بندگی کو یعنی رکھنے ہارے کو وہ کون ابو الفضل بیٹا شیخ مبارک اوسکے تیں پاک حکم بادشاہ جاری ہونے کے پایا۔ یعنی بادشاہ حکم فرمایا یہ کتاب یعنی طوطی نامہ کو سات عبارت تازی کے سات روشن تھوڑی عبارت کے نقش ترتیب کا دیوے۔

---

۵ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۵۶۵ ۔

: بیچ شہر نیک کے شہران ہندوستان کے سوداگر نیک تھا۔ اوس کا نام مبارک تھا۔ آرزو فرزند کی نہایت رکھتا تھا۔ یکایک آواز دینے ہارا فضل خدائے عالم کا خوش خبری اس بات کی دیا وہ بات یہ ہے تمہیں خوش خبری دیتے ہیں۔ سات فرزند نیک کے بیچ کان اوس مبارک سوداگر کے ...... سوداگر اس مبارک حوعلہ کے تیں یعنی اوس فرزند کو میمون نام رکھا۔ جب خط رخسار اوس کے کا اوگیا یعنی میمون کو خط داڑی کا نکلیا اور عمر اس میمون کی اٹھارہ برس کو پونچی بیچہ وقت مبارک کے سات خجستہ نام والی عورت کے شادی کیا۔"

۲ - سید محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ کسی غیر معروف شخص نے ۱۱۴۲ھ میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

"پچھے سیں طرح طرح صفت و ثنا پیدا کرنے زمین و آسمان کے کیفیت و حقیقت یو ہے کہ داستان قصہا و حکایات حضرت نخشی رحمۃ اللہ کہ بیچہ طوطی نامہ کے ساتہہ عبارت سخت و دقیق کے لکھے۔ اس کتبیں مفصل بیان دراز واسطے معلوم ہونے تمام لوگاں کو محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ ان کا۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - -

تمام احوال شارو کا اور عاشق ہونا خجستہ کا اوپر ایک جوان کے

---

[1] فہرست اردو مخطوطات سروری صفحہ ۱۸۱۔

اور مرنا شارو کا دست سوں خجستہ کے اول سوں آخر تک میمون سوکہا میمون اسی وقت خجستہ کتیں مار ڈالا ہلاک کیا۔"

۳۔ سید محمد قادری کے طوطی نامہ کا دوسرا ترجمہ۔اس کے مترجم کا نام بھی نہ معلوم ہو سکا۔اور نہ سنہ ترجمہ کی اطلاع ہے۔البتہ ۱۲۰۵ھ کی کاتب ہے۔اس سے واضح ہے کہ اس کا پہلے ترجمہ ہوا ہوگا۔اس کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[1]

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"پہلی کہانی یہ کیفیت میمون اور خجستہ کی اور خرید کرتے ہیں میمون ایک طوطی کے۔اور ایک تاجر کی طوطی کی کیفیت اور مینا کی حکایت یوں ہے۔دانایاں اور عقلمند اس طور سے بیان کئے ہیں کہ آگے کے زمانہ میں ہند کے ایک شہروں میں سے ایک شہر میں کوئی سوداگر تھا۔صاحب مال اور ہمت اور نام اوس کا مبارک تھا۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

میمون کہا کیا کیفیت ہے تو ہی بول۔طوطا تمام احوال ہوا سو خجستہ کا کہا ایک جوان پہ اور مارے جانے میں شارک کے اول سے آخر تک۔میمون سے کہا۔میمون اوس وقت خجستہ کو نصیحت کیا۔"

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۳۳۳۔

تبصرہ:۔ صفحات ماقبل میں اس دور کا کلام پیش ہو چکا ہے۔ ہر صنفِ سخن مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی اور مرثیہ وغیرہ کا انداز معلوم ہو چکا ہے۔ اسی طرح نثر نگاری کا اسلوب بھی پیش ہو چکا ہے۔

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ولی کی پیروی میں غزل کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ اور کمال شاعری کا اظہار غزلوں میں ہونے لگا۔ اس کے ساتھ قصیدہ گوئی کا رواج بھی زیادہ ہو گیا، اور بے شمار قصیدے لکھے گئے۔

غزل گوئی ولی کی پیروی میں شروع ہوئی تھی۔ ولی کا کلام تصوف پر مشتمل تھا۔ اس لئے اس عہد کے اکثر شعراء کا کلام زیادہ تر تصوف ہی میں رنگا ہوا ہے۔

قصیدے کے جو لوازم ہیں ان کا اظہار ان کے قصیدوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ اس دور میں مرثیہ کو بھی خاصی ترقی ہوئی، اور مرثیوں میں تاثر پیدا کرنے کی قوت بڑھانے کے لئے ہندوستانی معاشرت کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا اور عربی کے بجائے ہندوستانی رنگ میں واقعات کربلا پیش کئے گئے۔ حضرت علی اصغر اور امام قاسم کے متعلق ان مرثیہ گویوں نے زیادہ توجہ کی ہے اور مختلف پیرایوں ان بزرگوں کے حالات و واقعات دہرائے ہیں۔

ان کے کلام کے مطالعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کا کلام صاف اور تشبیہ و استعارہ کی بے جا بھتات سے پاک ہے اور اگر تشبیہیں دی گئی ہیں یا استعارہ کو کلام میں لایا گیا ہے تو عام فہم۔

ان لوگوں کے کلام میں اکثر تکلف نہیں ہوتا۔ معمولی باتیں سیدھے سادہ طریقہ پر عام فہم تشبیہات کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔
پرانے الفاظ جو اب بالکل متروک ہیں ان کے کلام میں بہت نظر آئیں گے۔ مثلاً نت۔ کبھو۔ جاگہ جانو۔ غمناک۔ برہ۔ نا ہووے گا۔ اپس کسو وغیرہم۔ لیکن جو لفظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت صفائی اور کمال سے جڑے ہوئے معلوم ہوں گے۔ کلام میں فارسی اور عربی الفاظ مناسبت سے شامل کر دیتے ہیں جس سے ان کے کلام کی خوبی دو بالا ہو جاتی ہے۔ اور معمولی شعر کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مثلاً

اے ضیاؔ اُن ہی تمناؤں سے دل بالکل اٹھ گیا
عشق کی راہ میں تسلیم و رضا لازم ہے

جام مئے الست سے بیخود ہوں اے سراجؔ
دور شراب شیشۂ پرُ مل سے کیا غرض

امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک　　　کہا ہے تجھ کو لحمی جسے شہ سرورؐ

گریباں چاک مطعون جہاں بدنام عالم ہوں
پڑے خاک اس طرح کی ہائے رسوائی کے جینے میں

ادھر تو تم بھوؤں کو تان کر تیوری چڑھاتے ہو
ادھر میں دل میں بسم اللہ بسم اللہ کہتا ہوں

سنگ آباد لیک سخت آیا فرہاد پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر

زر پاشی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب
رکھتا ہے اپنے چہرہ پہ ہو شرمسار دست

ان کے کلام میں فارسی کے ایسے محاورے نظر آئیں گے جو کسی تبدیل و تحریف کے بغیر اردو میں آ گئے تھے مثلاً سر کرنا، سر کردن سے۔ خوش لگنا خوش آمدن سے۔

عشق کو خوش لگی ہے رسوائی
نہ چھپا آخر آشکار ہوا

بحالت جمع مونث فعل لاتے تھے مثلاً لائیاں آئیاں وغیرہ

آہ تجہ بن یہ بہاریں آئیاں رشکِ گلگوں انکھیں بھر بھر لائیاں

غصے کی تیرے ہم نے یہ نظریں پچھانیاں رکھتا ہے آج قتل کا دل میں خیال توں

دکن میں جو الفاظ روزمرہ بول چال میں کام آتے ہیں ان میں سے اکثر شمالی ہند کے اصحاب کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ الفاظ یہاں قدیم سے مستعمل ہیں۔ مثلاً "کر کے"۔ "بعد از" وغیرہ یہ الفاظ اکثر اس وقت کے شمالی ہند کے اساتذہ[1] نے بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً "بعد از"۔

---

[1] مقدمہ گلشن ہند۔

سوز کہتا ہے ؎

ہے جنتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا　　رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا

"میں کہا" ۔قائم کہتا ہے ؎

میں کہا عہد کیا کیا تھا رات　　ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

ان کے علاوہ بول چال کے اکثر الفاظ جو جنوبی ہند میں مستعمل تھے ان کو شمالی ہند کے شعرا نے بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً ٹک ۔ بن ۔ گھڑی ۔ سجن ۔ کن نے ۔ کرے ہے ۔ نپٹ ۔ آئیاں ۔ مچائیاں ۔ کبھو وغیرہم ۔

میر

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

انجام

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

سوز

چشم غفلت کھول کر ٹک دیکھ اے مست خواب
دہر نے کن کن کا کیا خانہ خراب

میر

اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد
یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے

سودا

کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی

امید

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے　　　در و دیوار سے اب صحبت ہے

آبرو

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن
عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا

قائم

کبھو دکھا کے کمر اور کبھو دہاں مجھ کو
نپٹ پتنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تاباں

سن فصلِ گل خوشی ہو گلشن آئیاں ہیں
کیا بلبلوں کو دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

حاتم

لگن میں تجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گزرا
شمع رو رو کے ساری سر تا پا کھڑی جلیاں

میر

دل سے شوخ رخِ کبھو نہ گیا　　　جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

حاتم

نہ پہنچے آہ نالہ گوش تک اس کے کبھو اپنا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنی نارسائی کا

بہرحال ان تمام نمونوں سے اس امر کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ جو الفاظ دکن میں استعمال ہوتے تھے وہ شمالی ہند میں بھی مستعمل تھے۔

اس دور کی نثر میں مقفیٰ عبارت کی طرز موقوف ہو چکی تھی۔ زیادہ تر اخلاق اور تصوف کی طرف لوگ مائل تھے۔ ان ہی فنون کی کتابیں اس زمانہ میں تالیف ہوئی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد ہم اس دور کو ختم کرتے ہیں۔

پانچواں دور

از سنہ ۱۲۲۲ ہجری تا سنہ ۱۳۰۱ ہجری

آصفجاہ ثالث۔ آصفجاہ رابع۔ آصفجاہ خامس

اب ہم ایک ایسے دور میں قدم رکھتے ہیں جب کہ دہلی سونی ہو چکی ہے۔ اور اس کے اربابِ کمال ایک طرف لکھنؤ کا رخ کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کو سرزمین دکن اپنی قدردانی کی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اس زمانہ میں دکن کی عنانِ حکومت نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث کے ہاتھ میں تھی۔ پھر نواب ناصرالدولہ آصفجاہ رابع اور ان کے بعد نواب افضل الدولہ آصفجاہ خامس فرمانروائی کرتے رہے۔ میر عالم اور مہاراجہ چندو لعل[1] جیسے ذی علم یہاں کی مسندِ وزارت پر سرفراز رہے۔ امیر کبیر شمس الامرا جیسا علوم کا قدردان، اہل علم کا محسن و مربی امیر پائیگاہ تھا۔ مہاراجہ کا نام شعر و سخن کے لئے اور شمس الامرا کا نام تراجم کی ابتدا کے لئے تاریخ دکن میں ہمیشہ جلی

---

[1] اگرچہ مہاراجہ چندو لال باضابطہ وزیراعظم مقرر نہیں ہوئے بلکہ پیشکار سلطنت آصفیہ تھے مگر ایک عرصہ دراز تک دیوانی پر کوئی مامور نہیں تھا بلکہ آپ ہی اس کا کام بھی کرتے تھے۔

حروف میں لکھا جائے گا۔

مہاراجہ چندو لال کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی۔ اور ہر وقت ان کے دربار میں اس کا چرچا رہا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے دور دور سے اہل کمال اپنے محبوب وطن کو ترک کر کے دکن آتے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیتے تھے۔ نصیرؔ مشتاقؔ حفیظؔ وغیرہ اسی زمانہ میں حیدرآباد آئے۔

شاہ نصیر استاد ذوقؔ نے چار دفعہ یہاں کا سفر کیا اور آخری مرتبہ جو آئے تو ایسے آئے کہ دکن ہی کو اپنا مدفن کر لیا۔ یہاں آپ کے بہت سارے شاگرد تھے۔ جنہوں نے ملک سخن میں نام پیدا کیا۔

مہاراجہ چندو لال نے بہ کمال قدر دانی ذوقؔ کو کئی ہزار روپے بھیجے اور انہیں حیدرآباد طلب فرمایا۔ مصرع "طرح" بھی اپنے مشاعرہ کا بھیجا۔ ذوقؔ نے حاضری سے معذرت چاہی اور اسی زمین میں دو غزلیں روانہ کیں۔ جن کا مطلع اور مقطع درج کیا جاتا ہے۔

مطلع :-

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

مقطع :-

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوقؔ لیکن اب نہ جا
عالمِ مضموں میں طرزِ نغمۂ جاناں چھوڑ کر

مطلع ۵

جب چلا وہ مجھ کو بسمل خون میں غلطاں چھوڑ کر
کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر

مقطع

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

اسی طرح غالبؔ نے بھی یہاں کے ذوق علم کے باعث اپنے آنے کا قصد کیا۔ مہاراجہ چندولال کے دربار کے ایک مشہور شاعر حفیظؔ دہلوی بھی تھے جنہوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا اور دکن ہی کو وطن کر لیا تھا۔ حفیظؔ کے کلام کے جادو نے مہاراجہ کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ مہاراجہ آپ کے کلام کے بیحد دلدادہ تھے۔ شہیدی مرحوم کا خیال تھا کہ میدانِ سخن کے نزدیک آج کل فن شعر میں صرف تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخؔ لکھنؤ میں۔ شیخ حفیظؔ دکن میں اور شیخ ذوقؔ دہلی میں۔ غرضیکہ حفیظؔ اپنے زمانہ کا استاد سخن تھا۔ جس نے دکن کو اپنا ملجا و ماویٰ بنا لیا تھا۔ حفیظؔ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

لبِ جاناں سے جی اداس آیا — ہم کو آبِ بقا نہ راس آیا

ہمارے دل میں یہ دردو الم کا جوش رہا — کہ سینہ داغوں سے دوکانِ گل فروش رہا

خیال کاکلِ مشکیں یہ مجھ کو دوش رہا — کہ مثلِ کعبہ مرا دل سیاہ پوش رہا

---

۵ دیوان ذوق۔

کھلتے ہی اس در کے جنت کی ہوا آنے لگی	چاک سینہ ہو گیا دل سے صدا آنے لگی
آپ فرمائیے قبلہ اسے کیا کہتے ہیں[1]	تس پہ تشہیر کیا قاتل بیچارے کو

خواجہ میر درد کے شاگرد مشتاق دہلوی بھی بہار راجہ کے مصاحب تھے ان کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے:۔

جس کو چتون تیری تیکھی نظر آتی ہوگی
بے اجل اس نے کٹی میرے کی کھائی ہوگی[2]

اس دور میں انگریزی کتابوں کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ سائنس کی کتابیں اردو زبان میں منتقل ہونے لگیں۔ اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں کثرت سے تصنیف و تالیف ہوئیں۔

اسی دور میں علمی رسالے بھی شائع ہونے شروع ہوئے۔ اور عام طور سے اردو کا رواج ہو چلا۔

چوتھے دور کے بہت سے الفاظ اس دور میں متروک ہو گئے۔ مثلاً:۔

ہور۔ کوں۔ سوں۔ توں۔ ٹک۔ نیں۔ پس۔ کنے وغیرہ۔ اس کے بجائے اور۔ کو۔ سے۔ تو۔ تک۔ نہیں۔ پاس وغیرہ الفاظ کا استعمال ہونے لگا لیکن پھر بھی جو الفاظ فصاحت کی کان سمجھے جاتے تھے آج متروک ہیں۔ مثلاً:۔

بولیا = کہا	کیجو = کی جیو	کبھو = کبھی
بھلا = اچھا	انی = چوٹی	نپٹ = خالص۔ بہت

[1] ، [2] گلزار صفیہ۔

بر = جسم	بھار = باہر	کیتیں = اس کو
کسو = کسی	کاہیکو = کیوں	بعداز = بعد میں
بن = بغیر	تلے = نیچے	پہ = پہ

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ شمالی ہند کے شعرا اور اصحابِ کمال کے آنے کی وجہ سے یہاں کی دکھنی زبان کا رواج کم ہوگیا۔ اور اس کے بجائے شمالی ہند کی اردو زبان نظم اور نثر میں استعمال ہونے لگی۔

پانچویں دور کی نظم

اس دور کے شعراء کی صرف فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ اس لئے ہم اس کو نظر انداز کرتے ہیں۔

بطور نمونہ بعض شعراء کا کلام مختصر صراحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) **شاداں** :- مہاراجہ چندو لال[1] المتخلص بہ شاداں کی پیدائش ۱۱۸۹ھ میں ہوئی اور آصفجاہ ثانی کے زمانہ میں تعلقدار کہ ورگیری کے عہدہ پر سرفرازی پائی۔ اور زمانہ مابعد میں ترقی کرتے ہوئے پیشکار سلطنت آصفیہ ہو گئے اور اسی پیشکاری کے زمانہ میں کئی سال تک دیوانی کے فرائض بھی انجام دے۔ ۱۲۶۱ھ میں آپ نے اس دار فانی سے کوچ فرمایا۔

آپ بڑے مخیر تھے اور آپ کی داد و دہش بہت مشہور تھی۔ آپ نہ صرف سخن فہم اور قدر دان اہل علم تھے بلکہ خود بھی ایک باکمال اور کہنہ مشق شاعر تھے شاداں کا اردو اور فارسی کلام مشہور ہے۔ آپ کا کلام نہایت سنجیدہ شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا ذخیرہ ہے۔ کلام کی رنگینی انداز بیان کی جدت اور تخیل کی بلند پروازی قادر الکلامی کے شاہد ہے آپ کے کلام کا زیادہ حصہ معرفت اور تصوف

---

[1] گلزار آصفیہ۔ تذکرہ شعرائے دکن وغیرہ۔

سے بھرا ہوا ہے آپ کے دو دیوان ہیں۔ اور شائع بھی ہو چکے ہیں۔ جملہ اصناف سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔

شاداں کے دربار میں بیسیوں شعر لئے نامدار جمع رہتے تھے ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

مولوی ابو تراب۔ مولوی محمد حسین۔ مولوی غلام حسین۔ ملا محمد۔ حفیظ دہلوی فائض۔ حاجی محمد علی ساغر۔ مرزا محمد طاہر تبریزی۔ حسین علی خان ایماء۔ حافظ تاج الدین مشتاق۔ ذو الفقار علی خان صفا۔ میر عنایت علی ہمت۔ ظہور۔ اکرم۔ میر مفتوں وغیرہ ان میں سے بعض صرف فارسی کے شعراء ہیں اور بعض اردو میں داد سخن دیا کرتے تھے۔

مہاراجہ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا — کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا
خوش نہیں آتا ہے مجھ کو راگ سننا غیر کا — کان میں نغمہ بھرا ہے بس اسی طنبور کا

دل کو سمجھ رہا ہوں میں دلدار کی متاع — اپنی جو ہے متاع وہ ہے یار کی متاع

موحد ہے تو یکتائی سے مت ٹل — نہ کہہ اپنی زبان سے دوسرا ہے

ہمیں کیا کام ہے دونو جہاں سے — ترا ملنا ہمارا مدعا ہے

پابگل ہے سرو جس کی خوش خرامی دیکھ کر — میں ہوں دیوانہ اسی کی نرگس مخمور کا
اس کے آنے کی خبر سن کیوں نہ شاداں شاد ہو — آج ہے کچھ اور ہی عالم دلِ مسرور کا

بندہ ہوں دل و جان سے میں اپنے صنم کا — سایہ ہے میرے سر پہ تو اس کے ہی قدم کا

خورشید میں ہے نور تری مہر و عطا سے — یہ وجہ ہے ہر ذرہ جو خورشید سے چمکا

جب غنچے نے سر اپنا گریباں سے نکالا — بلبل نے قدم پھر نہ گلستاں سے نکالا

شاداں تو سنا یار کو اک مطلعِ رنگیں — گر آج کرے تجھ سے وہ گفتارِ محبت
ہے کام یہاں عاشقِ صادق کا وگرنہ — اٹھتا ہے کسی سے یہ بھلا بارِ محبت کا

کرتا ہے کوئی خیر تو ایمان کے باعث — ایمان ملا اس کو یہ قرآن کے باعث

باغباں خود لٹا رہا ہے دیکھ — بھر لے جھولی کو تو ثمر سے آج

جامۂ یار کو کیا جامۂ گل سمجھا ہے — خار کی طرح سے دامنِ دلدار نہ کھینچ

دل کو جب تک نہ کچھ علاقہ ہو — کوئی اٹکتا ہے بے سبب کانٹا

تو ہر اک شے میں ہے اور پھر ہے منزہ سب سے — کبھو شاداں کو دکھا دیگا تو اپنا دیدار

خوبرو معشوق پر شاداں کا یوں آتا ہے دل — جس طرح جائے پتنگا دوڑ کر سوئے چراغ

نیکی کا کوئی کام آیا نہیں مجھ سے — کیا ہوویگا انجام مرا کچھ نہیں معلوم

تو ہی غفار ہے مجرم ہوں تیرا — خطا کیوں کر نہ ہو آخر بشر ہوں

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقتِ صبحِ صادق کو　　اثر رکھتی ہے اکثر جو دعائے صبحِ صادق ہو

پردۂ چشم اٹھا دیدۂ تحقیق سے دیکھ　　جب یگانہ وہ ہوا کوئی نہیں بیگانہ

مہاراجہ کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس پر صوفیانہ رنگ کس قدر غالب ہے۔ جب قدرداں اس طرح صاحب کمال ہو تو کیوں نہ عام طور پر شعر و شاعری کا چرچا ہو گا۔ عام و خاص ہر ایک کو اس سے دلچسپی تھی۔ صاحب سیف بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ چنانچہ ذکر ہے کہ ایک دفعہ مہاراجہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

کون کہتا ہے اُسے پاؤں سے پاپوش اُتار

جملہ حاضرین دربار کو اس پر مصرع لگانے کا حکم ہوا۔ ہر ایک نے تعمیل کی ایک سپاہی بھی حاضر تھا اس نے اجازت چاہی اور عرض کیا

صاحب عرش بلائے جسے پاپوش سمیت
کون کہتا ہے اسے پاؤں سے پاپوش اتار

سپاہی کو فوراً انعام سے سرفراز کیا گیا۔

اب ہم اس عہد کے دوسرے شعراء کو پیش کرتے ہیں بلحاظ سنہ انتقال ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۳) ایماء[۱]:۔ ایماء تخلص کے ایک شاعر کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ یہ دوسرے ایماء ہیں۔ ان کا نام حسین علی خاں

---

[۱] گلزار آصفیہ۔ اور محبوب الزمن (تذکرۂ شعراء دکن)

تھا۔ اورنگ آباد ان کا وطن تھا۔ بقول صاحب گلزار آصفیہ کیا بلحاظ فصاحت و بلاغت اور کیا بلحاظ لطف کلام اور کیا بلحاظ شیرینی سخن اور ترکیب بیان آپ اپنے وقت کے ناصر علی تھے۔ راجہ چندو لال کے مصاحبوں میں تھے۔ پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال ہوا۔ بوقت انتقال ساٹھ سال کی عمر تھی۔

آصفجاہ ثالث نواب سکندر جاہ نے ایک مرتبہ اس فارسی شعر پر تضمین کی فرمایش کی۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں | بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ایماء نے حسب ذیل تضمین کی۔

ہیں ساکنان چمن سے کیا سوال | ہم بھی تو تھے خزاں میں تمہارے شریک درد
کیفیتیں بہار کی ہم سے بھی کچھ کہو | اور دی بہشت و دے کی ہوئی کس طرح نبرد
غنچہ نے مسکرا کے دیا چٹ وہیں جواب | تو نے سنی نہیں کسو استاد کی فریاد

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد[1]

ایماء کے قصائد کا نمونہ ملاحظہ ہو:—

سب ہے زر جہاں میں کچھ نہیں آتا بکار دست | بدتر ہے آستین سے بے اقتدار دست
باغ جہاں سے ہم کو ثمر کچھ نہیں ملا | خالی ازل سے لائے تھے مثل چنار دست

---

[1] گلزار آصفیہ۔

جی میں ہزاروں حسرتیں از بسکہ رہ گئیں — زانو سے آشنا ہے سدا یار بار دست

غیر از گرہ کشائی تیری کچھ نہیں رہا — لایا ہے پیچ میں ستم روزگار دست

تیرا اوس کی دستگیری کا امیدوار ہوں — ایک دست پر سے معارقے ہے جس کے ہزار دستنا

یعنی وہ کون اعظم الامرا ہے جس کا نام — ہر امر میں اوسی کا ہے حاجت برار دست

ہاں تیری سواری کا اتنا ہے سر بلند — پہنچائے آسمان تک اس کا سوار دست

خوبی سیاہ سینہ کی اس کی ہیں کیا کہوں — ملتا ہے جس کو دیکھ کے ابر بہار دست

در رفتے سے پنجتن کے تیرا پنجہ ور رہے — یکدست تیرے دست کو دے کردگار دست

ماہی سے ماہ تک تیرے زیر نگیں رہیں
ایماء دعا کرے ہے اوٹھا بار بار دست[1]

---

۳ - احسان:- میر عباس علی خان[2] نام اور احسان تخلص۔ ان کے والد سہام جنگ یکے از امرائے دربار آصفی۔ احسان کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ اس کے ساتھ پتنگ بازی اور کبوتر بازی مرغ بازی سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۲۲۱ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے قصائد بھی مشہور ہیں اور اسی طرح ہجو گوئی میں بھی شہرت حاصل کی تھی۔

کہے گی خاک تو پیغام اسے صبا میرا — ہوائے یار میں دم ہے ہوا ہوا میرا

جو مر بھی جاؤں نہ کیجو میری وفات کا ذکر — دفا کے نام سے چڑھتا ہے بیوفا میرا

۱؎ مجموعہ قصائد احسن

۲؎ گلزار آصفیہ

اندھیری رات کو میں روزِ عیش سمجھتا تھا — چراغ تو نے جلایا تو دل بجھا میرا
تمہارے زلف کا شامت زدے کو سودا ہے — بلائے عشق میں دل ناگہاں پھنسا میرا
کسی نے پوچھا ہے احساںؔ غلام کس کا ہے — لبوں پہ لا کے تبسّم کو یہ کہا میرا

آستیں سے تری باہر جو کلائی ہوتی — شمع فانوس سے باہر نکل آئی ہوتی[1]

قصیدہ

گرچہ مشہور تو ہے رتبہ انساں گوہر[2] — لیک گوہر میں بھی ہرگز نہیں یکساں گوہر
کیوں نہ پا بوس کریں اوس کو حرفِ عقل تمام — جس کو فطرت کا دیا حضرتِ سبحاں گوہر
یعنی نوابِ فلک رتبہ وزیرِ اعظم — صدفِ بحرِ کیانی کا وہ تاباں گوہر
جس کو اکثر کہیں اوس کا ہے گر دامن — بخش دے پل میں جو سایل کو ہزاراں گوہر
نذر کو عید مبارک کے دلا تازہ رقم — کیجئے آج کوئی مطلعِ رخشاں گوہر
آبداری میں وہ ہو شستہ و روشن ایسا — جس کی خجلت سے رہے بحر میں پنہاں گوہر
اور اشعار بھی یوں اوس کے مسلسل ہوویں — جس کا ہر مصرعہ و ہر لفظ ہو غلطاں گوہر

جس گھڑی پیرست تو لے مہرِ درخشاں گوہر
لعل صدقے ہو دل و جان سے قرباں گوہر

قیس[3]:- محمد صدیق قیسؔ المتوفی ۱۲۳۰ھ شیر محمد خان ایماںؔ کا ہمشیر زادہ ہے اور تلمذ بھی اس سے حاصل تھا۔ راجہ چندو لعل اور شمس الامراء نے

---

[1] تذکرۂ شعرائے دکن [2] مجموعہ فصاحت [3] گلزار آصفیہ و تذکرہ شعراء دکن

یومیہ مقرر کر دیا تھا۔ وقائع نگاری کی خدمت بھی سپرد تھی۔ ریختی میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد بھی مشہور رہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں قلمی ضخیم دیوان موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

بر میں جو وہ سیم بر نہیں ہے ۔۔۔ اپنی بھی ہمیں خبر نہیں ہے
بستے ہیں اسی سے کعبہ و دیر ۔۔۔ کس جا پہ وہ جلوہ گر نہیں ہے
ہستی سے عدم کو کوچ کرنا ۔۔۔ اتنا تو بڑا سفر نہیں ہے
اڑ جائیں ہم ایک پل میں اس تک ۔۔۔ یہ کیا کہ تن کہ ہم کو پر نہیں ہے
سودا زلفوں کا تو اگر قیس ۔۔۔ ہم کو تو یہ دردِ سر نہیں ہے

جب اٹھ کے اپنے گھر کو وہ رشکِ قمر گیا ۔۔۔ یک تازہ اور داغ کلیجہ پہ دھر گیا

بعد از فنا بھی ہم کو رہا پاس یار کا ۔۔۔ دستِ دعا کے جائے ہے سبزہ مزار کا

تیری عارض کے اگر سامنے آجائے سحر ۔۔۔ عکس پیدا کرے آئینۂ تصویر میں گل

نکالیں گے ہم اپنی حسرتِ دل ۔۔۔ جو بات آؤ کسو دن، رات کو تم
ہمارے چاک گریباں کا ناصحا تجھ سے ۔۔۔ ہزار شکر کہ اک تار بھی سیا نہ گیا
وہ ذائقہ لبِ لیلا کے بوسہ کا اے قیس ۔۔۔ مثال شیریں کی لذت کو تو چکھا نہ گیا

وہ چاہے نہ چاہے قیس ہم کو ۔۔۔ پر بندۂ جاں نثار ہیں ہم

جبکہ وہ آئینہ رو پہنے ہے چن کر آستیں ۔۔۔ ہر شکن سے اپنے دکھلاتے تھے جوکم آستیں

گل میں یہ بو ہے نہ غنچہ میں نہ مشک و عطر میں
جس قدر اس گلبدن کی ہے معطر آستیں

بیقراری ہے درد فرقت میں ہے
سانس لینے کی کس کو فرصت ہے

گردشِ چشم سے کیا ساغرِ جم چرخ میں ہے
چرخ کو بھی جو میں دیکھا تو بہم چرخ میں ہے

قصیدہ

کیا نخلِ دعا نے دو سنو کس کی ثمر پیدا
ہوئی گویا کفِ بیضائے موسیٰ سے سحر پیدا

عبادت خانۂ مشرق سے یہاں فلک نکلا
رُخِ پُرنور سے ہے جس کے سجادے کا اثر پیدا

ملا صندل جبیں پر صاف شماشی گردوں نے
نہ ہوتا چرخ کو تا صبح محشر درد سر پیدا

ہمارے آسماں کا جلوۂ پرواز رنگیں ہے
شعاعی نور زر سے کیے کیا بال و پر پیدا

مبارکباد کی ہے دھوم رقاصانِ عالم میں
کیا ہے زہرۂ اظہر نے دو آہنگ تر پیدا

قمر سے تا عطارد پائے کوبے مستی ستارہ نکلی
بساط اطلس اخضر پہ جبیں ہے سر بسر پیدا

چمن نے اس خوشی میں حلۂ گلرنگ پہنا ہے
کہ جس کے ہر رگ و ریشہ سے ہے تحریر زر پیدا

نسیمِ صبح یوں پھرتی ہے لہراتی گلستاں میں
غبارِ راہ میں ہو جوں بریدِ خوش خبر پیدا

بھرا ہے ہر قدح لالہ کا اتنا شبنم تر سے
کہ ہو جوں حقۂ یاقوت میں عقد گہر پیدا

نکالے ہیں ریاحیں طرفہ تر شاخِ صنوبر سے
ہوا ہے بید مجنوں بھی چمن میں بارور پیدا

مرصع پوش ہے شمشاد سر سے تا قدم ایسا
ہوا پر حلقہ قمری سے ہے طوقِ کمر پیدا

ترانے گا رہی ہیں بلبلیں یوں شاخ گلبن پر
کہ ہر ہر کے ترنم میں ہے آہنگِ دگر پیدا

سنا جس نغمۂ تر کو بھی اس سے تر دشن ہے
ہوا نواب کے دل بند کو لخت جگر پیدا [1]

[1] دیوان قلمی مخطوطہ

ریختی ملاحظہ ہو :۔

ہوئی ہوں ترے قربان میرے کوکا | منہ پر تو دو شالہ کو مت تان میرے کوکا

سچ کہہ تو میرے سر کی قسم ہے تجھے دوا | سچا نہیں ہے یہ تو ہے جھوٹا زاد بنا

راحت افزا سے یہ کہو اجی گلشن بولو | ہاتھ دھونے کو میرے لائیو بیسن بولو

کاہیکو پہنوں گی باجی میں تمہاری انگیا | ایک سے ایک میرے پاس ہے بھاری انگیا

مجھ کو رخصت دے اب میرے گھر سے | لے کے بیسن اصیل آئی ہے

ایسا نہ ہو محل میں کوئی دیکھ لے تجھے
باندی کنارے بیٹھ کے دھولا ازار بند[1]

سحر :۔ محمد خلیل خان[2]۔ محمد جمیل خان کے فرزند ہیں امرائے دربار آصفی سے تھے۔ خانی و بہادری کا خطاب اور منصب دو ہزاری سے سرفراز تھے۔ حضرت آصفجاہ ثانی اور نواب ارسطو جاہ اور مہاراجہ چندو لال کی مدح میں کئی ایک قصیدے لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ دکن کے کسی قدیم اور جدید تذکرہ میں ان کا بیان نہیں ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

یارب دے اس کا یوں مجھے بوس و کنار دست
لب لب سے بر سے بر گلے میں ہو دہار دست

---

[1] دیوان قیس مخطوطہ [2] طبقات الشعراء مولفہ کریم الدین

نشہ میں اب کی کرئیگا سبیر بہار دست
دیکھ بدست لالہ رخ مشکبار دست
گل چو طرف کھلے ہیں غزل خواں ہے عندلیب
رنگینوں میں رکھتے ہیں صورت ہزار دست
بولا تجھے خبر نہیں ہاں اور ہنس پڑا
بی اختیار دست پہ اپنے وہ مار دست
دیوانہ کوئی بشر ہے پری کا اثر سحر
دل، یار میں لگ رہے تیرا اور بکار دست

نواب کامیاب ہے جشن غدیر میں
عید سعید دی ہے عجیب ادے کار دست
گل مل رہے شور غل ہے تجمل ہے ٹھاٹ ہے
کر کر جلوس بیٹھا ہے وہ حملہ وار دست[1]

چندا:- اسی دور میں ایک مشہور طوائف ماہ لقا بائی بھی شاعرہ ہوئی ہے۔ چندا تخلص تھا۔ ۱۱۸۰ھ میں اس کی پیدائش ہوئی۔ اس کا باپ صلابت خاں تھا۔ جس کو شاہ عالم کے زمانہ میں بسالت خاں کے خطاب سے ممتاز کیا گیا تھا۔ راج کنور بائی گجراتن اس کی ماں تھی۔ چندا کی علمی قابلیت بہت اچھی تھی موسیقی کے ساتھ شعر کہنے کا شوق تھا۔ شیر محمد خاں ایمان سے اصلاح لیا کرتی تھی صاحب جاگیر و منصب تھی۔ بڑے بڑے امراء اس کے موسیقی کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور اس کی تعریف میں نظم کہتے تھے۔ چندا کی فرمائش سے دکن کی ایک تاریخ۔ تاریخ دل افروز کے نام

[1] مجموعۂ فصاحت

سے مرتب ہوئی ہے۔

چندا کو مردانہ کھیلوں تیر اندازی۔ گھوڑے کی سواری۔ ورزش وغیرہ میں بھی کافی مہارت تھی۔ ارسطو جاہ کے حکم سے ۱۲۱۲ھ میں اس کا دیوان مرتب ہوا ہے[1]۔

اس کے اخلاق نہایت پسندیدہ تھے۔ نماز کی سخت پابند تھی روزانہ قرآن پڑھا کرتی تھی۔ ۱۲۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا ہے[2]۔ راجہ راؤ رنبھا کی ملازمت میں ایک عرصہ تک رہی۔ کوہ مولا کے قریب اس کا مقبرہ موجود ہے[3] اس کی ایک سوانح بھی "حیات ماہ لقا" کے نام سے غلام صمدانی خان گوہر نے شائع کی ہے۔

آتا نہیں ہے خواب میں بھی یار اب تلک | ہیں منتظر کی دیدۂ بیدار اب تلک
سب میکدے میں مست ہیں پر ایک تجھ سوا | دیکھا نہ ایسے دور میں ہشیار اب تلک
دیکھا رقیب ساتھ تھا لگ رو کے تب سے وہ | کھٹکی ہے دل میں وہ بھی سر خار اب تلک

توقع ہے یہی چندا کو ہر دم دین و دنیا میں | نہ بھولیں گے علی والی تجھے امداد سے ہرگز

ساقی دے مجھ کو جام مئے ارغوان پھر | افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جان پھر

مشک سے مطلب نہیں اس کو نہ عنبر سے غرض
ہے جسے صبح و مسا اس زلف دلبر سے غرض

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات [2] [3] حیات ماہ لقا۔

ملتے ہیں تو قع پہ تری غیر سے کم ہم
رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشم کرم ہم

معروضہ یہ چندا کو ہے شاہ نجف سے
دیکھیں نہ کبھو گردشِ افلاک سے غم ہم

قتل پر کس کے آج ہوئی ہے
توسن حسن پر سوار شراب

بنایا یار کی صورت کو وہ نقاش قدرت نے
کھچے نقشہ نہ ایسا مانی و بہزاد سے ہرگز

چشم کافر بھی ہے اور غمزۂ خونخوار بھی ہے
قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے[1]

کمتر:- کمتر[2] شاہ کمتر ایک صوفی بزرگ تھے، عموماً مرثیہ موزوں کرتے تھے، اساتذہ کے ہزاروں شعر حفظ تھے، حتیٰ کہ مثنویاں بھی نوک زبان تھیں، ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا، مؤلف محبوب الزمن نے ایک شعر نمونہ دیا ہے۔

برمیں جو آج اپنے وہ زہرہ جبین نہیں
وہ کیا ہیں کہ ہم نے یہ جانا کہ ہم نہیں

اڈنبرہ یونیورسٹی کی بیاض میں کمتر کے مرثیے موجود ہیں۔

گلِ محمد کے چمن کا یا حسین
سورۂ حیدر گگن کا یا حسین
جم رکھو شہ مجھ اوپر اپنا کرم
ہوں زرا بندگان کمتر یا حسین[3]

کہے فاطمہ آج نیارا حسین۔
پڑیا جگ میں غم کا اندارا حسین
زمیں سوں گگن تک دھلارا حسین
تجھے ظلم سوں مل کے مارا حسین

---

[1] دیوان چندا مخطوطہ [2] تذکرہ شعرائے دکن صفحہ ۹۴۷ [3] یورپ میں دکنی مخطوطات ۱۶۱

کہناں ہیں کمتر کمینہ غلام | ہے طالب تمہارا ہیں حضرت امام
علیک الصلوٰۃ وعلیک السلام | کرم جگ پو سارا تمہارا حسین[1]

ناطق:۔ ناطق اسی دور کا شاعر ہے۔ مگر افسوس ان کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں، انھوں نے ۱۲۴۰ھ میں ایک مثنوی "قصہ شہیدان" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں سکندر جاہ آصفجاہ ثالث کے زمانہ کا ایک تاریخی واقعہ نظم کیا ہے۔ مذہبی مناقشہ نہیں تھا۔ پر مہدیوں اور سنیوں میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ ناطق خود مہدوی ہے اور اس ہنگامہ کارزار میں شریک رہا ہے اس ہنگامہ کی پوری تفصیل اس مثنوی میں ملتی ہے۔

اگر حمد خدا ہیں دو جہان ہے | ادا کوئی کر سکے ہمت کہاں ہے
نہ پشہ اڑ سکے عرش بریں تک | نہ چمٹی جا سکے ہفتم زمیں تک

تھا ایک صوفی میاں بے دین بارد | بھنیجا قاضئ بارہ ور کا اد
مصدق قاضی رہا رو رکے ہیں | جہنم ہیں نگہ پونچا دہے ہیں
حسد اس بات کا صوفی رکھا تھا | چچا جس روز سے اس کا موا تھا
او ظاہر مہدیوں سے آشنا ہو | تھا رہتا راز دار خان بنہ ہیں لو
کہا ایک روز اس نے لعل خان کو | مراد خان بوڑھے اور لیسین خان کو

اوسی گھر کا ہے خانہ زاد ناطق | رہے کا قبر ہیں بھی شاد ناطق

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات ۲۵۶ [2] تذکرہ اردو مخطوطات ۳۲۶

اس مثنوی سے سوا صدی پہلے کے حیدرآباد کی معاشرت، تمدن اور خصوصیات ہتھیار لباس وغیرہ کی پوری صراحت معلوم ہوتی ہے۔

الفت:- محمد علی شاہ نام اور الفت تخلص، اسی دور کے شاعر تھے۔ امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ عربی اور فارسی کی بڑی اچھی قابلیت تھی۔ کئی مثنویاں لکھیں تھیں۔ جن میں سے "دین دیپک" اور "ایمان درپن"، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں[1]، اوّل الذکر مثنوی میں امامیہ عقائد کے پانچ اہم مسائل یعنی توحید، عدل، نبوت، امامت، معاد بشر کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور آخر الذکر مثنوی میں ایک قصہ منظوم کیا گیا ہے۔

ابتدا:-

کروں حمد اللہ سے ابتدا   یہ نامہ کے تئیں میں بنام خدا
کروں ان لکھا اوس کو شکر و سپاس   کیا گوہر علم العام ۔۔۔ (۹)

دوسری مثنوی:-

محمد علی اب تو مطلب طرف   زباں کھول چل بحث مذہب طرف
سبب اس رسالے کی تالیف کا   بیاں کر یہ نسخے کی تصنیف کا
کہ احمد علی نور چشم ایک روز   کیا مجھ سے اظہار وہ دلفروز
جو ہے حسنیہ کا رسالہ جلیل   ہے بحث مذہب پر روشن دلیل

وہ ناصب انتھا دین حق کا عنید   وہ ملعون کا نام ہارون رشید

---

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۸

جو موسیٰ کاظم تھے ہفتم امام — کیا ہے شہیدان کو دے زہر جام
موالی سادات اکثر وہ زشت — چنایا بہ دیوار جیون سنگ و خشت
وہ ملعون پرتا بہ روز جزا — ہزاران سے نفریں و لعنت سدا

مرزا:۔ محمد مرزا نام اور مرزا تخلص، حیدرآباد کے مشہور مورخ اور شاعر شاہ تجلی علی تجلیؔ کے فرزند تھے ۔ کافی قابلیت بہم پہونچائی تھی ۔ صدارت کے عہدہ تک ترقی کی تھی، بڑے پرگو شاعر تھے ۔ چھ ہزار شعری مثنوی چند ماہ میں قلمبند کر دی ۔ یہ مثنوی "حملہ حیدری" سے موسوم ہے ۔ اس کی پہلی جلد ذوالفقار علی خاں صفاؔ نے لکھی ہے ۔ مرزا کے متعلق تفصیلی معلومات کسی مورخ یا تذکرہ نویس نے نہیں لکھے ہیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۰ھ میں وہ بقید حیات نہیں تھے[1]

دلاور دو کر نام پروردگار ۔ — کہ لاکھوں حصاروں کا ہے یہ حصار
جو وہ ہے تو کافی ہے پٹی کی اوٹ — نہیں تو کرے کام آوے نہ لوٹ
جو دیوار اونچی بنائی تو کیا — فلک کو منڈیلی لگاوے تو کیا
عبث کر کے شداد وضع بہشت — کیا شہرۂ خلق ایک نام زشت

اور اوس سمت سے وہ شہِ نامور — مدینہ سے نکل بفتح و ظفر
ہوا راہبر کو یہ حکم نبی — کہ یوں ڈالے اب راہ اس فوج کی
کہ غطفاں و خیبر کے ہو درمیان — ذریں دیکھ لشکر کو غطفا نہان
نہ فرصت ملے ان کے تئیں یک بیک — نہ خیبر کی اون سے بن آوے کمک

---

[1] تذکرۂ اردو مخطوطات صفحہ ۱۸۶

یہ سن کر زمیں بوس ہوا راہبر	چلا فوج کو یوں ہی لے راہبر
جو خیبر کے سرحد میں پہنچا وہ جا	صحابہ سے عباد کو وہاں ملا۔
دیئے اوس کے ہمراہ کر بیس مرد	ہر ایک شیر میدان روز نبرد

شوق:۔ محمد علی خان المتخلص بہ شوق، اورنگ آباد میں ۱۱۸۱ھ میں تولد ہوئے ان کے اجداد مشہد کے رہنے والے تھے۔ان کے والد عبدالسلام خاں ۱۱۸۵ھ میں حیدرآباد آ کر بس گئے۔شوق کی تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی حیدرآباد آنے کے دو تین سال بعد ہی شوق کو داغ یتیمی اٹھانا پڑا۔آصفجاہ ثانی نے اس ہفت سالہ لڑکے کو آبائی منصب اور جاگیر سے سرفراز کر دیا۔شوق کے اوستاد مشہور معروف بزرگ شاہ محمد وزیر تھے۔چودہ سال کی عمر سے شوق نے شاعری کا آغاز کیا۔تمنا سے تلمذ حاصل تھا۔

شوق کی ایک طویل مثنوی "چہار درویش" ہے اس کے کئی ہزار شعر ہیں۔ ۱۲۲۵ھ میں یہ مثنوی شوق نے تصنیف کی ہے۔اس کا ایک ناقص الآخر نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[1]۔ شوق کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے اپنے اُستاد تمنا کی مدح کرتے ہیں۔

کہو کیا بیاں اوس کا مشہور تھا	کہ وہ شعر کا موسیٰ طور تھا
مزاج رسا اور فہم بلند	مضامیں کا تھا وہ تو ترجیع بند
درست اس سے تھی ریختہ کی بنا	وہی چار عنصر رباعی کا تھا
ہر ایک اس کے دیوان کی ہیئت الغزل	قصیدے سے رکھتی تھی معنی کمابل

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۱۱۹

تھا اس کا ہر اک مصرع انتخاب   زلال کی ہے منتخب جو پر آب

قصّہ کی ابتدا

تھا صحرائے محشر سا وہ ہولناک   تھی سوزندہ جوں آگ اوس جا کی خاک
وہاں کی تو وہ تیغ سے تیز ہے   وہاں کی ہوا تو شرر بیز ہے

ارے ساقی کرم خوش رو دل   ہے تخمیر مے سے مرا آب و گل
نہ موقوف رکھ ہاں تو کام سے   نہ محروم کر شیشہ و جام سے
پلا ساقیا وہ مے پر فتوح   کہ پھر جس کی پینے سے ہو تازہ روح
سخن مختصر طول کر ماجرا   کروں عرض یہ حاصلِ مدعا
دعا میں تھے مشغول با صدق دل   بصد عاجزی شاہ و درویش مل
اجابت کا تھا اوس گھڑی فتح باب   یکایک ہوئی وہ دعا مستجاب
حرم سے اوٹھا وہیں شادی کا غل   بجانے لگے تالیاں جز و کل
دیا آستانے سے خواجہ سرا   شہنشاہ کو مژدہ فرزند کا
ہوا پہلے شادی سے بیہوش شاہ   پھر آخر کو آیا جو وہ رو براہ
تعجب ہو خواجہ سرا سے کہا   خواصوں سے یہ کس کو پیدا ہوا
کیا عرض وہ شہ کی خاص حرم   کہ جس پر کئی دن سے تھا پیار کم
نہ تھی الغرض باریابِ سلام   حمل تھا اوسے شاہ کا لا کلام

کافی:- میر عباس علی خان بہادر المتخلص بہ کافی۔ مشاہیر حیدر آباد سے تھے۔ بیگن پلی کے جاگیرداروں سے ان کا تعلق تھا۔ فارسی۔ عربی کے ساتھ ہندی میں بھی کافی لیاقت حاصل تھی۔ اعلیحضرت اور مہاراجہ چندو لال کی مدح میں آپ کے قصائد مشہور ہیں۔ مہاراجہ کے زمرۂ مصاحبین میں شامل تھے ۱۲۳۷ھ میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام پیش ہے:۔[1]

لگا دی سوزش داغ جگر نے آگ سب تن میں
ہوا آخر یہ شعلہ برق سوزاں اپنے خرمن میں

بھرا اس چشم میں کس شوخ کا تھا شوق نظارا
کہ جیوں سیماب تڑپے ہے مرا ہر اشک دامن میں

جنوں سے کیوں نہ ہو ربطِ قدیمی مجھ کو اے ناصح
کہ آغوش پری گہوارہ تھا میرا لڑکپن میں

الٰہی یاد میں کس بت کی ہوں میں مضطرب خاطر
کہ ہے ناقوس کا نغمہ صدائے دل طپیدن میں

نہیں کچھ پیچ و تاب مرگ مجنوں طوق کو تنہا
دل زنجیر بھی ہے رات دن سرگرم شیون میں

رگ مجنوں سے وقت فصد یہ گرمی نکل آئی
کہ نشتر موئے آتش دیدہ تھا انگشت رگ زن میں

---

[1] گلزار آصفیہ اور محبوب الزمن۔

شب جو نقشہ چشم میں اُس شعلہ رو کا پھر گیا
اب تلک جیوں موئے آتش دیدہ ہے تارِ نظر

سخن:- میر غلام مصطفےٰ نام سخن تخلص تھا۔ لالہ لچھمی نارائن شفیق کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۱۷۴ھ میں تولد ہوئے۔ وفات کا صحیح سنہ معلوم نہیں سنہ ۱۲۳۹ھ تک ان کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

اورنگ آباد سے حیدر آباد آنے پر آصفی شہزادوں اور مدار المہاموں کا تقرب حاصل ہوا۔ قصائد اور غزلیں یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان[۲] غیر مطبوعہ ہے سخن کے مختصر حالات۔ کلام کا نمونہ مولوی عمر یافعی صاحب نے مجلّہ مکتبہ حیدر آباد کے کئی نمبروں میں شائع کئے ہیں۔ یہ بیان اسی سے ماخوذ ہے۔

استاد نے جس دم نقطہ نقطہ درس وفا تکرار کیا
دیوانہ کیا صد عاقل کو مدہوشوں کو ہشیار کیا
عشاق کیا عشاقوں کا مشتاق کیا مشتاقوں کا
محبوب کیا محبوبوں کا دل داروں کا دل دار کیا
معذور ہمیں اب رکھیئے گا آجائے جو منہ پر راز دروں
اک جام پلا کر ساقی نے سرشار مئے اسرار کیا
اسرار حقیقت مستی میں بے خواست زباں پر جب گذرا
اکثر نے کیا انکار سخن اور بعضوں نے اقرار کیا

خال اس سُرخ گال میں کالا — مثل لالہ ہے لال میں کالا

---

[۱] گلزار آصفیہ [۲] کتب خانہ آصفیہ

رنگ اس دل جلے کا مت پوچھو — ہو گیا حال حال میں کالا

کچھ سبب اجتناب کا نہ کھلا — راز خشم و عتاب کا نہ کھلا
کس کی زلفوں نے دل کو پینچ دیا — پیچ اس پیچ و تاب کا نہ کھلا
مبتلائے محاسبہ تو ہوئے — پر خلاصہ حساب کا نہ کھلا
آہ مافی الضمیر آج تلک — دلِ خانہ خراب کا نہ کھلا

فائدہ کیا مطالعہ سے سخن
جب کہ مطلب کتاب کا نہ کھلا

سو طرح کی آفتیں اب عشق میں ہو ویں تو ہوں — جان ہی سے اپنی جب گزرے تو پھر ڈرنا ہے کیا

مثنوی سر پرسخن :۔

تجھ کو لازم ہے اے نسیم بہار — کیجیو اتنا سب کے گوش گذار
ہیں جہاں تک کہ دوستانِ سخن — اور جتنے ہیں قدردانِ سخن
پہلے ان کو سلام کہدینا — بعد اتنا پیام کہدینا
کیا لکھوں شرح و داستانِ شوق — کیا لکھوں قصۂ بیانِ شوق
سوزِ ہجر اپنا کیا کروں اظہار — گردشِ روزگار نے اک بار
کیا شروعِ بہار میں مجھ کو — نشۂ انتظار میں مجھ کو

دوستانِ وطن سے دور کیا
بوستانِ وطن سے دور کیا[1]

---

[1] از مجلہ مکتبۂ حیدر آباد

قصیدے کا نمونہ :-

جلوۂ حسن شنفایق کے کہوں کیا میں مثل
آتشِ طور بھڑکتی ہے بہر دشت و جبل

رنگ ہے رنگِ چمن پر کہ تماشا کے لئے
شاید نکہتِ گل آئی ہے پردہ سے نکل

قوت نامیہ یہ اور ہے عہد ایسے کا
بارور کیوں نہ خلایق کا ہو پھر نخل امل

یعنی نواب فلک قدر امیرِ اعظم
جس کی ہمت کا جہاں میں ہے یہ کچھ قدر و محل

تا کجا شرح کروں میں تیرے اوصاف کو آہ
خرق عادت سے غرض کم نہیں یہ حسنِ عمل

اک وہ اعجاز ہمیر تھا کہ پیدا ہوتے
گر پڑے خاک مذلت میں وہیں لات و ہبل

اور ترا فیض قدم تھا کہ یکا یک یکبار
گر پڑا بام سے سر کردۂ کفار و غل

شجرۂ دولت و اقبال ہمایوں تیرا
گلشن دہر میں لایا کرے پھول اور پھل

اور اعدا کا تیری صرصرِ دوراں سے مدام
بے گل بے بروبی برگ رہے نخل امل [1]

سجاد:- میر سجاد علی خان بہادر نام اور خطاب سجاد تخلص آفتابی کے بھائی [2] ہیں شعر و سخن میں بھائی کے قدم بہ قدم تھے۔ مہاراجہ چندولال کے دربار سے بھی اُن کو تعلق تھا۔ سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام پیش ہے

دعویٰ کرے جو خال لبِ دلربا سے مشک
تا حشر منفعل رہے اپنی خطا سے مشک

ہے جو مریض خال و خط یار اسے مسیح
بہتر ہے اس کے حق میں تمہاری دوا سے مشک

گرنہ ہو مے تو بہار عین خزاں ہے مجھ کو
نکہت تختہ گل موج دخاں ہے مجھ کو

ناصحا مغز خراشی تو عبث کرتا ہے
پند سننے کی تری تاب کہاں ہے مجھ کو

---

[1] مجموعۂ فصاحت [2] گلزار آصفیہ

شررؔ:۔ محمد اکبر خان[1] المتخلص بہ شرر خاندانی حکیم تھے صحت طلب خان خطاب ملا تھا۔ مہاراجہ چندو لال کے مصاحبین میں شامل تھے جاگیر اور منصب سے سرفراز کئے گئے۔ نازک مزاج اور تیز طبیعت تھے۔ خود مہاراجہ سے کسی بات پر روٹھ گئے اور پھر ادھر کا رُخ نہ کیا۔ شرر کو میر اسد علی خاں تمنا سے تلمذ حاصل تھا۔ دیوان غیر مطبوعہ یادگار ہے۔

عمر یافعی صاحب نے ان کے کلام کا نمونہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے[2]

درِ وازہ دل کا الفت اصحاب سے کھلا ریختہ یہی ہے عشق کے دار السّلام کا

اس قدر غفلت شرر کیا کام کی خوف اب کچھ بھی تجھے ہے گور کا

ریختہ لکھ دیا اک یار کی خاطر شرر عقل کرتے رہی اغیار کی تو بہ تلا

دل گیا ہے کدھر نہیں آتا اس کی کوئی خبر نہیں لاتا

جس طرف دیکھتا ہوں کرکے نگاہ تجھ سوا کوئی نظر نہیں آتا

چاک کو دل کے جو کرے رفو وہ نظر بخیہ گر نہیں آتا

نسیم جاکر چمن میں کہیو تو بلبلوں کو سلام میرا
درود پڑھتا ہوں روئے گل پہ یہی قفس میں ہے کام میرا
ہمیشہ مخمور و مست ہوں میں ہے خواب میں بھی خیال ساقی
شراب الفت خم ہے شیشہ یہ دیدۂ تر ہے جام میرا

---

[1] گلزار آصفیہ [2] مجلہ مکتبہ حیدرآباد

شرر تخلص ہے جانتے ہیں یہ سارے معشوق اور عاشق
سراج و پروانہ[1] ساں ہے روشن ہر ایک مجلس میں نام میرا

کالی گھٹا چمن پہ ابھی آئے جھوم کر
گر رخ پہ اپنے کھول دے وہ نو بہار زلف

ہم دور سے وہ صورت اللہ دیکھتے ہیں
جس طرح آسماں پر سب ماہ دیکھتے ہیں

مریض عشق کو درماں کی احتیاج نہیں
بغیر شربت دیدار کچھ علاج نہیں

کیا قہر کیا تو نے شرر اس کو دیا دل
کرتا ہے کوئی دوست کو دشمن کے حوالے

پروانہ سا دل کیوں نہ ترے عشق میں جل جائے
گر شمع بھی صورت تری دیکھے تو پگھل جائے

ہمت:- خواجہ ہمت علی خاں ہمت بھی مہاراجہ چندو لال کے درباری شعراء میں شامل تھے۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔

حرم اور دیر کا معبود نار و نور کا خالق
وہی جلوہ نما نظارہ میں ہے دونو عالم کا

کچھ ایسا بار نزاکت سے قد ہے لہراتا
کہ جیسا بوجھ ہو ڈالی پہ چار پھولوں کا

اچھوتا کسی کو نہ تمہارا چھوڑا
لپٹا جسے زلف نے مار چھوڑا

---

[1] شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی اور ان کے مرید اور شاگرد پروانہ کی طرف اشارہ ہے۔

[2] مجلہ مکتبہ بہمن ۱۳۲۹ ف

مہندی لگا کر نہانہ تھا ہے آج غسل کا   وعدہ وفا ہو وصل کا کب جبلہ جو کے ساتھ

دیکھو نہ عزیز و دلِ ناکام کی صورت   دکھلاؤ مجھے میرے دلارام کی صورت

مجھے اس صنم کا حضور ہے نری بندگی میں قصور ہے
ارے شیخ تو ہے بخود غلط نہ خودی سے پہنچے خدا تلک

کافر بتوں کے بندے کہتے ہیں لوگ ناحق
ایمان اور امت ہیں دیندار ہم تم

ہوا ہے تیغِ نگہ سے شہید یاد آیا   جوانا مرگ وہ جنت مکان دل مرحوم

مثل منصور جو حق بات کہے سر نہ رہے   راست گو کا یہی انجام ہے اللہ اللہ[۱]

جولان:۔ میر حسن علی خان نام اور جولان تخلص تھا۔ حیدر آبادہی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار مشاہیر میں تھا۔ بقول صاحب محبوب الزمن[۲] آپ کو شعر گوئی میں کسی سے تلمذ نہیں تھا۔ کلام لطافت و شیرینی کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ ۱۲۵۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔ چندو لال اور ارسطو جاہ کی مدح میں قصیدے بھی کہتے ہیں آپ کے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

---

۱ مجلہ مکتبہ آذر ۱۳۳۹ ف   ۲ محبوب الزمن

قصیدہ :-

ہے زبس نیرنگیٔ دوراں سے دل زار و نزار
شیشۂ ساعت سا نت رہتا ہے خاطر پہ غبار
دور میں اس وضع بد کے ایک دم فرصت نہیں
در پئے ایذائے مردم ہے زبس لیل و نہار
سیر کرتا ہی میں پھرتا تھا چمن میں ناگہاں
کہہ دیا دل سے مرے ایک بار مجکو یہ پکار
لکھے خامہ کے تئیں للہ وصف ایسے شخص کی
تاکہ جلدی سے تری ہوویں سب ہی اجرائے کار
بات کے سنتے ہی میں نے اوس گھڑی مطلع کیا
تب کئے سب نے پسند اوس کو جو کوئی تھے ہوشیار
معدنِ جود و سخا مخزن تدبیر کار[۱]
زور بازو شجاعت سیعت ملک نامدار
چمن میں دہر کے گلچیں عجب ہے جور و ستم
برنگ لالہ دلوں میں ہے سب کے داغ الم
اب ایسی جام ساقی شراب ارغوانی بھر
کہ جس کو دیکھ کے زاہد کے منہ میں آئے پانی بھر[۲]

---

[۱] مجموعہ فصاحت [۲] محبوب الزمن

واقف:- واقف کے متعلق کوئی معلومات نہیں ہیں۔ اس نے قدیم شعراء کی تقلید میں ایک مثنوی لکھی ہے جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے اس مثنوی کا نام "چندر بان" ہے۔ اس کی تصنیف ۱۲۲۷ھ میں ہوئی ہے ۱۲۵۸ھ کا لکھا ہوا مخطوطہ میری نظر سے گذرا ہے[1]۔

کلام کا نمونہ پیش ہے۔

کرم سے اپنی اے ساقیٔ وحدت ‏ ‏ پلا مجھ کو تو صہبائے محبت

ساقی دے مجھے جام طہورا ‏ ‏ کہ تا دیکھوں خدائی کا ظہورا

ہوا اس کی نشہ سے مست و سرشار ‏ ‏ رہوں ہر آن تیرا محو دیدار

مجھے رکھ ہر گھڑی تو مست و مخمور ‏ ‏ کہ دیکھوں تا میں تیرا جلوۂ نور

اگرچہ میں بھی تو اہل دکن ہوں ‏ ‏ نہیں کچھ ہند کا صاحب سخن ہوں

ولی ہند سے اپنی حسب مقدور ‏ ‏ بیان کرتا ہوں سنئے اس کا مذکور

قطع فارسی کا میں کیا ہوں ‏ ‏ روایت ہر دو قصوں سے لیا ہوں

کہیں بولا حکایت کر زیادی ‏ ‏ کیا ہوں اپنی بھی کچھ استادی

پس از شکر خدا تاریخ کا شکر ‏ ‏ مجھے لازم ہے کہ تا اب یہاں ذکر

زمانہ ان کا نو دسال کا ہے ‏ ‏ نہیں کچھ آج کل اور حال کا ہے

سنہ ہجری سے دیکھا میں نے فی الحال ‏ ‏ تھا بارا سو پہ ستائیسواں سال

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

محکم:- روضۃ الشہداء[1] نام ایک منظوم کتاب واقعات کربلا میں لکھی ہے۔ جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۱ھ ہے محکم کے حالات سے ہم واقف نہیں ہیں۔ مختصر نمونہ درج ہے۔

روایت ہے کہ اک دن شاہ امت نپٹ غمگین تھے بہر شفاعت
سو جبریل امین ویسے میں آئے سلام حضرت عزت سنائے
حسین ابن علی کی دیکھ صورت لگے جبریل رونے بے نہایت

بہن زینب کو تب بلوا کے سرور لگے رو رو کے کہنے ہائے خواہر
حسن کا خاک میں ملتا ہے اب گھر چلا قاسم نبا کٹوانے کو سر
مجھے اس بیاہ کی اک آرزو تھی دولہن دولہا کی سہرا دیکھنے کی
اسے اب خیمہ گاہ میں تم لے جاؤ مرے قاسم کیتیں نوشہ بناؤ

مرا مرتا ہے بچہ اب پیاس سے آج میں بانکی کھڑی ہوں ہو کے محتاج

دہائی تم کو دیتی ہوں نبی کی بجھادو تشنگی اصغر علی کی
مصیبت مجھ بہو پر پڑی ہے مرے اصغر کو اب ہچکی لگی ہے

دہائی شاہ نے جب کچھ نہ پائے یکایک فوج میں گھوڑا چلائے
چلانے جب لگے اعداء پہ تروار ہوی وہاں سینکڑوں لاشوں کی انبار
چلائی تیغ وہ جب شاہ یثرب لگے پھر کانپنے ارض و سما سب

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔

وہی ظالم سیہ رو شمر آیا گلے پر شاہ کے خنجر چلایا

ظہور:۔ مرزا[1] عابد بیگ ظہور تخلص۔ حیدر آباد کے شاعر اور مہاراجہ چندولال کے درباری شعراء میں منسلک تھے۔ بلکہ ان کے شاگرد بھی تھے۔

افیون کے نشہ سے بھی واقف نہ تھے ظہور
اب بھنگیوں میں پینے لگے بسنتے بسنتے بھنگ

آفاق:۔ فریدالدین نام اور آفاق تخلص تھا۔ شمس الامراء کے ملازمین میں شامل اور دو سو روپیہ ماہوار پاتے تھے۔

کہتے جو ہو مثل گل چاک جگر جائے اور برنگ صبا جلد گذر جائے
سب سے ہے بہتر یہی آپ کی اگر جائے گلشن الفت سے دل لے یہ ثمر جائے
داغ بدل جائے دست بسر جائے

کیا کہوں تجھ سے دلا طرفہ ہے ایک ماجرا نکہت گل کا گیا آگے نکل قافلا
پہلے تو وہ رنگ تھا اب یہ نیا گل کھلا کر کے ہمیں پیشوا کہتی ہے باد صبا
ہیں کوئی دم چلی آپ ٹھہر جائے

قصیدہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

برق کی دیکھی ہے ابر بہاری میں چمک دل لگا کہنے کہ لا جلد مے ناب و گزک
چھوڑ کر یوں مجھے مخمور نہ جا اے ساقی تجھ سے کہتا ہوں سنا کیا نہیں تو نے اب تک

ہے جوش فصل گل سے گلستاں بہار پر نازاں ہے گل کا تار گریباں بہار پر

---

[1] گلزار آصفیہ

مضمون شعر تازہ نہ کس رنگ سے بندھے — جب ہو خیال قافیہ سنجاں بہار پر
لکھتا ہوں وصف گلشن مہر سپہر جاہ — کس رنگ سے نہ ہوئی قلمدان بہار پر
نواب شمس الامرا ہی رہے مدام … — اوس کے سبب ہے گلشن دو دن بہار پر[۵]

صفا:- ذو الفقار علی خاں نام اور صفا تخلص لکھنو سے دکن میں آکر بس گئے تھے۔ اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے۔ میر تقی میر جیسے استاد سخن سے ان کو تلمذ تھا۔ حیدرآباد میں میر عالم پھر راجہ چندو لال اور شمس الامرا کی سرکار سے تعلق رہا۔ قصائد، غزلیات، مثنویاں مشہور ہیں، "حملہ حیدری" ایک ضخیم مثنوی کو فارسی سے اردو میں منظوم کیا ہے۔ قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

ایک شہادت نامہ بھی قلمبند کیا جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ ۱۲۶۰ھ میں صفا کا انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

حسن گفتار نے طوطی کو قفس میں ڈالا — بھاڑ میں ڈالئے کیا ایسی زبان دانیکو

غنچہ و گل سے غرض کیا مرغ حسرت زار کو — آنکھ جو کھولی تو دیکھا صورت صیاد کو
ایک نالہ کر دکھاؤں خرچ گنج نہاد کو — کیا کروں یارا نہیں دیتا جگر فریاد کو
بعد مرگ اپنے وصیت ہے تمہیں اے دوستو — سونپ دینا میری مشت خاک دوش باد کو

ہم اپنے حال میں تھے وہ خیال میں اپنے — ایدھر سے آہ رہے اور ادھر سے واہ رہے

اے صفا کوچۂ محبت میں — کوئی میری طرح سے خوار نہ ہو

---

[۵] شمس الامرا کا علمی کارنامہ صفحہ ۱۰۳

جب ترقی ہو تنزل تو بھلا کیا ہونا — قطرہ ہوتے جو تمہارہ گیا دریا ہونا
پیر نابالغ اگر ہو کے جیا مرد تو کیا — اس کو یکساں ہے جوان مرد کہ بڈھا ہونا
رتبہ فکر تو اب عقل سے گزرا ہے صفا — ایک زنجیر کا باقی ہے بکھیڑا ہونا[1]

ہمدم :- رائے گلاب چند نام ہمدم تخلص، نواب شمس الامرا کی سرکار میں پیشکار تھے۔ احسن اللہ خان بیان دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۲۱۵ھ میں ان کا کلیات مرتب ہو چکا تھا جس کو ان کے فرزند چھوٹو لال زیب نے ۱۲۴۰ھ میں طبع کر کے شائع کیا ہے۔ کلیات میں مثنویاں، غزل، قصائد سب کچھ شامل ہیں کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمدم بلند مرتبہ شاعر تھے۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے :-

نہیں ہے ایک طرف پر زمانہ نیرنگ — جو دم میں کچھ ہے تو دم میں کچھ اور ہی ہے رنگ
خوش حصول ہے گاہے گہے خفا ہے دل — کبھو فسردہ ہے خاطر کبھو ہے دل پر امنگ
جہاں میں سلسلہ توام ہے شادی و غم کا — ہنسے سے جو اسے روتے ہیں کچھ نہیں ہے درنگ
لکھا ہے شخص کی تعریف نام ہے جس کے — خوشی سے غم ہو مبدل نہیں کچھ اس میں ہے درنگ
وہ کون یعنی ثریا جناب شمس الملک — کہ شمس الامرا بہادر ہے اور تیغ جنگ

جم اقتدار سکندر حشم سلیمان قدر
نظام سلطنت و زیب مسند اورنگ

غزلیات :-

جوشش چشم پر آب میں دیکھا — ہم نے دریا حباب میں دیکھا

---

[1] دیوان صفا مخطوطہ

چشموں کا تیر ہے جس کو مے خانہ نظر آیا　　وہ مے سے محبت کا مستانہ نظر آیا

ہمدم بنا ہے میرا دیوان ایک مرقع　　جو شعر کھینچتا ہوں تصویر کھینچتا ہوں

بظاہر جاگتا تو ہوں نظر پر کچھ نہیں آتا　　برنگِ دیدۂ تصویر ہوں میں خواب حسرت میں

نگہِ شوق کام کرتی ہے　　کار عاشق تمام کرتی ہے[1]

ملک :- غلام امام خان نام ہجر اور ملک تخلص تھا۔ تاریخ رشید الدین وغیرہ کے مصنف ہیں ان کا تفصیلی حال نثر نگاروں کے بیان میں آئیگا یہاں ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔ قصیدہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

کہاں ہے ساقیِ خوش وضع یاسمین اندام　　کہاں ہے ساغر و مینا کدھر ہے گلفام

کہاں شراب کہاں ہے کباب شغل کہاں　　کہاں ہے شربت دیدار یار دل آرام

کہاں ہے طبلہ و خانوں نیچاپ و طنبورہ　　کہاں ہے یار بدعصر نازنیں مقدام

ہے ابن ابن امیر کی شادی　　ملا دو لوں کو جو امید وار تھے آرام

وہ کون جس کو کہ خورشید دولہ کہتے ہیں　　ہے تیغ جنگ دم جنگ معرکہ میں نام

پدر ہے اس کا فلک رتبہ اقتدار الملک　　خسر ہے شاہ دکن مالک رقاب انام

یہ قصد ہے کہ یہاں اس کی دھوم دھام کرو　　پر اس طرح کہ کہیں واہ سن خواص و عوام

ہنوز تھا یہ زبان پر طرف ہاتف کے　　ہزار رنگ سے فرحت فزا ہوا الہام

سخن ہے راست مراعبد کے ہاں یہ ایام　　خوشی پہ آ کے مجھے دے ہے ہر طرف سے پیام

---

[1] دیوان ہمدم کتب خانہ نواب ظہیر یار جنگ

ہر ایک صبح پہ عاشق ہے صبح عید صیام ہر ایک شام پہ نوروز کی نثار ہے شام[1]

لایق :- بدر الدین خان، نام لایق تخلص اور امیر جنگ امیر الدولہ خطاب تھا آصفجاہ کے میر ساماں تھے ۔ آپ کے جد اعلیٰ آصف جاہ اول کے ہمراہ دکن آئے تھے ۔ لایق خاندانی امیر اور جاگیردار تھے ۔ ان کو شعر و سخن کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ ۱۲۶۶ھ میں انتقال ہوا۔[2]

آپ کے مزاج میں نفاست تھی۔ بہت سلیقہ مند تھے ۔ خوش اخلاق اور صاحب مروت تھے ۔ شاہی تقاریب اور شادی بیاہ کے موقع پر اہتمام ان کے ہی ذمہ ہوتا تھا۔ اپنے ان فرائض کو وہ نہایت سلیقہ سے انجام دیا کرتے تھے[3] کلام کا نمونہ پیش ہے ۔

خوش دماغوں کو میرا احوال پہنچے اس لئے نام پیغام اپنا نگہت گل میں گتھا

عشق نے حسن و وفا کو بسکہ دگرگوں کیا قیس کو لیلیٰ کیا لیلیٰ کینئیں مجنوں کیا
تابش خورشید تاباں سے ہو اگر سنگ لعل گرمی داغ جگر نے دل شرر کا خون کیا
اگر کھینچی کبھو نقشہ میری اس ناتوانی کا زمیں پر گر پڑے خامہ لرز کر ہاتھ مانی کا

میری بالین پر شب کو کوئی بیتاب آیا تھا چراغ آتشیں میں جاے روغن آب آیا تھا
درد دل کا حال ہم اب راز کر سکتے نہیں ضعف ہے اتنا کہ بس آواز کر سکتے نہیں
الفت صیاد سے کہتا ہے ہر مرغ اسیر گو قفس ٹوٹے پہ ہم پرواز کر سکتے نہیں
بات جو آئے زباں تک اس کو لایق روکئے کیونکہ اہلِ راز افشاء راز کر سکتے نہیں

---

[1] تاریخ خورشید جاہی [2] تزک محبوبیہ [3] گلزار آصفیہ

اپنی مطلب کے ہم سیانے ہیں گو ترے سامنے دیوانے ہیں
جب ہوا یار آشنا لائقؔ پھر تو بیگانے بھی یگانے ہیں

قتل کرنے کو بس ہے تیر نگاہ تیغ کیوں آپ کے تو ہات ہے آج[1]

قربان:- حاجی سید قربان حسین نے ایک مثنوی جنگنامہ امیر حمزہ کے نام سے ۱۲۵۷ھ میں لکھی ہے۔ ان کے حالات تاریکی میں ہیں۔ نمونہ پیش ہے۔

شہنشاہ کی بیٹی تھی اس مجھار انھا نام اسے جگ میں مہرنگار
امیر کی شجاعت کو سن جگ منے اتھی بہت حمزہ پو عاشق ا نے

ہتنے تھی ایک آدمی سوں ایک ماجرا انھا نام اس کا جو خواجہ سرا
اسے دیکھ حمزہ کو اس حوض پر گیا شاہ زادی کو جلد دینے خبر[2]

فیض:- اس[3] دور کے ایک زبردست شاعر فیض ہیں۔ آپ کا نام میر شمس الدین ہے۔ آپ کے والد مولوی محمد رحمت اللہ آصفجاہ ثانی کے زمانہ میں دہلی سے حیدرآباد آئے۔ فیض کی پیدائش ۱۱۹۵ھ میں برار میں ہوئی۔ آپ کے علم و فضل سے تمام دکن نے فیض حاصل کیا ہے۔ آپ کی تصانیف بہ کثرت اور شاگرد بے شمار ہیں فیض، کا شمار امرائے دربار آصفی میں ہے۔ منصب اور جاگیر سے سرفراز تھے۔

---

[1] دیوان لائق مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ [2] اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے
[3] گلزار آصفیہ ص ۵۲۴

فیض کو حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ مشتاق خواجہ میر درد رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اس طرح فیض کا کلام اسکول دہلی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مگر اس کے ساتھ لکھنو کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔

آپ کا کلام نہ صرف نزاکت اور لطافت کے لحاظ سے قابل تعریف ہے بلکہ زبان کی صفائی اور سادگی کے لحاظ سے بھی قابل ستایش ہے۔

فیض اپنے وقت کے بہت بڑے صوفی تھے۔ حلقہ ارادت وسیع تھا۔ تبلیغ و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتا تھا۔

۱۲۸۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ حیدر آباد میں مدفون ہیں۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

کفر جو تھا دین میرا ہو گیا[1] — بت بھی نصیبوں سے خدا ہو گیا
کیسی دوا مجھ کو مسیحا نے دی — درد محبت کا سوا ہو گیا
موت کدھر آتی ہے دیوانی ہے — فیض تو پہلے ہی فنا ہو گیا

حرم میں دیر میں جب کوئی رو برو آیا — مجھے یقین ہوا بس تو ہی کہ تو آیا
کسی کا کوئی بھی ممنون نہیں ہے گر انصاف — ادھر سے میں نکل آیا ادھر سے تو آیا
اٹھائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے — مگر نہ قبضہ میں دامان آرزو آیا

نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں — جو بت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے
تقاضا دیت کا مگر فیض ان سے — خدا سے کوئی خوں بہا چاہتا ہے

---

[1] دیوان فیض

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم
در و دیوار ہے نظروں میں اپنے آئینہ خانہ
کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہوئے آپ اپنا درشن ہم
نہ قیل و قال سے مطلب نہ شغل اشغال سے مطلب
مراقب اپنے رہتے ہیں جھکا کر اپنی گردن ہم
کب اٹھتے ہیں اٹھانے سے کسی شیخ و برہمن کے
در دلبر پہ اپنے مار کر بیٹھے ہیں آسن ہم
ہوا اے فیض معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

خط جادو ہوں یا میں نقش پا ہوں
غرض افتادگاں کا رہنما ہوں
جو ناکارہ ہوں یا میں کام کا ہوں
تمھارا ہوں بھلا ہوں یا برا ہوں
عبث رکھتے ہیں مجھ پر تہمت مرگ
بہت راتوں جگا تھا سو رہا ہوں
نہ کر اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار
ابھی اے فیض مر مر کے جیا ہوں

بت غنچہ لب پھر ہنسا چاہتا ہے
خدا جانے کیا گل کھلا چاہتا ہے
کسی بت سے دل کچھ کہا چاہتا ہے
خدا جانے کیا کیا سنا چاہتا ہے

کل سے پھر جی نڈھال ہے اپنا
آج جینا محال ہے اپنا

سر راہ گالیاں کھانے کھڑے ہو
ارے میاں فیض کیا چکنے گھڑے ہو

دھوم ہے نرگس شہلا کے خریداراں کی
دفن ہے لاش جہاں چشم کے بیماروں کی

ہے انانیت ہر اک انسان میں
کہہ گیا ہے کچھ فرشتہ کان میں

خاموش:- شاہ معینؒ الدین شاہ خاموش ۔ بیدر کے رہنے والے صابریہ طریقہ کے بزرگ تھے ۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے ۔ آپ کے مرشد علاء الدین شاہ علی صابر چشتی تھے ۔ اُن کے آپ خلیفہ بھی تھے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بارہ سال تک آپ عالم سکوت میں رہے ۔ اس کے باعث خاموش مشہور ہو گئے ۔ آصفجاہ رابع ناصر الدولہ کے زمانہ میں آپ حیدرآباد آئے اور مکہ مسجد کی عقبی خانقاہ میں مقیم ہوئے ۔ ۱۲۸۶ھ میں خاموش کا انتقال ہوا ۔ دیوان طبع ہو چکا ہے ۔ آپ کے کلام پر بھی اسکول دہلی کا رنگ غالب ہے ۔

شکل انساں میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا — حق سے ناحق میں جدا تھا مجھے معلوم نہ تھا
مطلعِ دل پہ مرے چھپایا تھا زنگارِ خودی — چاند بدلی میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
ایک مدت حرم و دیر کو ڈھونڈا ناحق — سیمبر بر میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
ہو کے خاموش عجب سیر و تماشا دیکھا — رنگ برنگ ہوا تھا مجھے معلوم نہ تھا

چمن میں رہتی ہے بلبل ترس ترس کے پاس — یہ شور کرتی ہے ہوتا قفس قفس کے پاس
لبوں پہ آہ تڑپ دل میں دم ہے ہستی ہیں — عجب اے لیل ادا ہے جرس جرس کے پاس
نہ قید کر ہمیں صیاد موسم گل میں — کبھو تو اپنا لے چل قفس قفس کے پاس

آشیاں اپنا گلستاں سے اٹھا لے بلبل — باغ کو چھوڑ دے جنگل کی ہوا لے بلبل
باغباں کا ہے ستم دوسرے صیاد کا ظلم — جان ان دونوں کے ہاتھوں سے بچا لے بلبل

---

۵۱ تذکرۂ اولیائے دکن مولفہ عبدالجبار ملکاپوری

چہچہے کرتی ہے کیا اس سے نہیں کچھ حاصل — مثل پروانہ پر و بال جلالے بلبل
محفلِ یار میں خاموش ہے لازم تجھ کو — مثل پروانہ پر و بال جلانا جانا

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا — عاشقاں آپ بھلے اپنا دلارام بھلا

ستم کو ترے کب ستم جانتا ہوں — عنایات لطف و کرم جانتا ہوں
دو عالم کی ہستی ہے موہوم ساری — جسے دیکھتا ہوں عدم جانتا ہوں

اگر شکل گل ہوں اگر خار ہوں میں — گلستان قدرت کا اظہار ہوں میں
تحیر مجھے ہے تری جستجو ہے — تو آئینہ سا خود میرے روبرو ہے

ہم گرچہ نہیں لائق دربار تمہارے — مشہور تو ہیں بندہ سرکار تمہارے[1]

ربط: — بالاپرشاد نام اور ربط تخلص۔ ان کے آبا و اجداد لکھنو کے رہنے والے تھے۔ اوائل عمر میں یہ حیدرآباد آئے۔ یہاں ہی ان کی پرورش ہوئی اور راجہ خوش حال چند کی دختر سے بیاہ کیا۔ اور راجہ خوش حال چند کی وفات کے بعد ان کی خدمت سے سرفراز ہوئے۔ شاعری کا بڑا شوق تھا لکھنو کے اہل کمال آپ کی شاعری کے معترف تھے، عام طور سے محفلوں میں آپ کی غزلیں گائی جاتیں تھیں۔ مرنے کا سنہ معلوم نہیں ہے۔[2]

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

تصویر اگر شمع رسالت کی لکھوں میں — خامہ سے نکل جلوۂ شق القمر آوے

---

[1] دیوان خاموش

[2] گلزار آصفیہ و محبوب الزمن

تاب و تواں و صبر گئے دل کے ساتھ ساتھ — محفل اٹھی ہے صاحب محفل کے ساتھ ساتھ
سر سے کفن لپیٹے ہوئے پھرتے ہیں دبط — مرنیکے اشتیاق ہیں قاتل کے ساتھ ساتھ

یوں تو یوہی صحیح منکر ہیں مرے قتل سے آپ — سرخی پنجۂ نازک کو حنا کہتے ہیں
وہ جو خنجر مرے مژگاں کی طرح ہے پر خون — یہ جو دامن پہ ہیں چھینٹے اسے کیا کہتے ہیں

تمیز:- بدر الدین خان تمیز، شمس الامراء امیر کبیر کے فرزند ہیں۔ صفر ۱۲۲۰ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۶۹ھ میں انتقال فرمایا۔ آصف جاہ رابع نواب ناصر الدولہ نے آپ کو رفعت جنگ معظم الدولہ کے خطاب سے سربلند فرمایا تھا۔

بڑے دلاور اور شجیع تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ علوم و فنون کے قدر دان اور خود بھی صاحب علم و فن تھے شاعری کا شوق تھا۔ فیض کے شاگرد تھے۔ دیوان موجود ہے جس میں ہر قسم کا کلام شریک ہے۔ ہنوز آپ کا دیوان طبع نہیں ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

کلام کا نمونہ پیش ہے۔

شور سن وہ اور بھی برہم ہوا نازک مزاج — نالۂ دل کا مرے اس کو اثر اچھا ہوا

یہ باد صبا تو نے کیا شغل کیا پیدا — شبنم کو رلا دینا اور گل کو ہنسا دینا

یوسف جو گیا مصر کے بازار میں بکنے — سب محو ہوئے لوگ زلیخا کو غش آیا

ا؎ گلزار آصفیہ اور تاریخ رشید الدین خانی

قیس جنگل میں رہا کوہ میں فرہاد رہا ۔ میں بگولے کی طرح عشق میں برباد رہا

اس کا عالم نظر آیا مجھے ہر آن جدا ۔ سارے خوبوں سے مرے یار کی ہے شان جدا

ہم سے رکھتا ہے وہ حجاب بہت ۔ کیوں نہ دیجے اسے شراب بہت

اس پری کی جو شب وصل میسر ہو تمیز
لب پہ لب سینہ بہ سینہ رکھوں اور گال پہ گال

پان کھا مسی لگا آپ جو تیار ہوئے ۔ صبر پر دل کے کہو کس کے یہ شبخون ٹھیرا

گیا باغ میں صبح جیوں غیرت گل تو دیکھ اس کا رخ اور قامت قیامت
ہوا اس اڑ گئے بلبل و قمریوں کے گل و سرو کا دل خیابان کھینچا

قصیدہ کا نمونہ (جو باپ کی مدح میں کہا گیا ہے)

چلی صبح ہوتے جو باد بہار ۔ تو کچھ نیند سی آ گئی ایک بار
نظر آئی اک مہ جبیں خواب میں ۔ کہ خورشید ہو جس کے رُخ پر نثار
کروں حسن کا اس کے کیا میں بیاں ۔ اسے دیکھ کر دل ہوا بے قرار
مصفیٰ تھے رخسار آئینہ ساں ۔ جبیں اس کی تابندہ تھی ماہ وار
مہ نو کی تفسیر تھیں ابرویں ۔ کہئے تو وہ تھی تیز دم ذوالفقار
میں آئی ہوں تجھ کو دینے نوید ۔ ذرا خواب غفلت سے ہو ہوشیار
میں اس کی گرہ سال کی رکھ خبر ۔ جو نواب ہے آج با اقتدار

کہیں ہیں اسے شمس الامرا تمام ہے مانند شمس اس کا نام آشکار
دعا پر بس اب ختم کر دے تمیز وہ زندہ رہے تا بہ روز شمار

مکھن [1]:- راجہ مکھن لال۔ مہاراجہ چندو لال کے طرف سے عرض بیگی تھے۔ اس حیثیت سے ان کو راجہ کا خطاب ملا۔ شاعری کا کافی مذاق تھا ۱۲۶۱ھ میں عمر خیام کے رباعیات کا ترجمہ اردو رباعیوں میں کیا ہے یہ جس قدر دشوار امر تھا وہ ظاہر ہے مگر راجہ صاحب نے نہایت آسانی کے ساتھ اس میدان کو طے کیا ہے۔ غالباً اُردو میں اس طرح کے سب سے پہلے مترجم یہی ہیں دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"اس نو مشق سخن خوشہ چیں ارباب کمال راجہ مکھن لال کو مدت سے یہ تمنا تھی کہ عند الفرصت اپنے ترجمہ رباعیات فارسی حضرت عمر خیام کا کہ اُس بزرگ کے کلام میں سراسر حقیقت اور معرفت تر روشن کرتی ہے۔ خلاصہ اس کا زبان اُردو میں موافق اپنے استعداد کے رشتہ تحریر نظم میں لاوے اگرچہ اس راقم آثم کو اتنا سواد اور مواد زبان ریختہ میں نہیں تھا کہ ترجمۂ کلام اس بزرگ کا کما ینبغی کرے لیکن بہ اعتبار اس کے کہ شاید برکت کلام عارفانہ سے اس بزرگ کے کہ فیض ظاہری اور باطنی اس میں متصور ہے اس مترجم کو بھی فایدہ نصیب ہو۔"

رباعی

جب عشق ہو پستی و بلندی پھر کیا ہے بے خردی تو ہوشمندی پھر کیا
رکھ طاق میں یار تو مریدی پیری رندی میں خیال ارجمندی پھر کیا

---

[1] گلزار آصفیہ

پہلے غم ہجر گرمیِ محفل تھا — چندے برکات شوق ہم منزل تھا
اے یار اب آکے دیکھ تربت کو مری — یہ مشت غبار کچھ دنوں دل تھا

جز عشق نہ کھو عزیز اپنی اوقات — زاہد سے نہ کر خراب ایام حیات
ناقہی سے وہ بنا ہے مزار رقیب — تو طالب ذلت نہ وہ خواہان صفات

گزری جو کبھو بہ لطف ساقی یہ عمر — صحبت میں بتوں کے بے نقابی یہ عمر
واللہ نہ پھر رہے گی حسرت دل میں — کاٹیں گی بہ عیش و لطف باقی یہ عمر

کعبہ میں جو ہم مطیع اسلام ہوئے — یا دیر میں ہم حریف اصنام ہوئے
ہے ہے ہمیں کچھ اس کا نتیجہ نہ ملا — بس دیر و حرم میں مفت بدنام ہوئے[1]

ذکا:۔ محمد حبیب اللہ ذکا کی پیدایش[2] ۱۲۴۴ھ میں مدراس میں ہوئی اُس کے بعد حیدرآباد آئے اور باقی زندگی یہاں بسر کی۔ ۱۲۹۱ھ میں انتقال ہوا۔

ذکا کی علمی قابلیت مسلمہ تھی نظم و نثر میں خوب مہارت حاصل تھی۔ افسوس ہے کہ ان کا کلام اب تک جمع نہیں کیا گیا۔ متفرق طور پر بعض رسالوں میں[3] شایع ہوا ہے۔ ذکا نے غالب سے بھی استفادہ کیا۔ غالب کو بھی ان کی قابلیت کا اعتراف تھا۔ چنانچہ انھوں نے ذکا کے متعلق لکھا ہے۔

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں۔ کسی شیخ شیاد کا نہیں یہ کلام میرے

۱؎ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے — ۲؎ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن

۳؎ رسالہ تحفہ و ترقی و شہاب۔

ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بہ نظر دشمن دیکھتا پس جب تملق نہیں مدارا نہیں تو جو مجھ کو نظر آتا ہے بے حیف و میل کہوں گا نثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا احیاء کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اٹھایا ہے مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا سخنور ہمہ داں دیکھا نکتہ طراز معنی آفریں آفریں صد آفریں صد ہزار آفریں۔"

غالب کی ایک درخواست جس کا مطلع

اے شہنشاہ آسماں اورنگ　　　اے جہاں دار آفتاب آثار

ہے بہت مشہور اور مقبول ہے۔ اس قسم کی ذکا کی درخواست کے کچھ اشعار نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں۔

اے خداوندگار بندہ نواز　　　فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی ترے آگے　　　گر میں چلاؤں روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف　　　ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا　　　کسی صورت سے ملزم سرکار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت　　　جس میں درماہ ہوئے بیش قرار
ہے مری ذات میں وہ استعداد　　　کہ نہیں شیوا میرا استعذار
کونسا کام جو نہ دوں انجام　　　کونسا گھاٹ جو نہ اتروں پار
بس ذکا دیکھی تیری گستاخی　　　باادب ہے یہ آصفی دربار[1]

---

[1] رسالہ ترقی۔

عاقل کبھی مجھ سے وہ ستمگر نہ ہوا تھا — یعنی کہ میں اندیشۂ محشر نہ ہوا تھا
اچھا کیا پہلی سے جو رخصت کی سنا دی — مرنے کا مرے وقت مقرر نہ ہوا تھا

نازک تم ایسے ہو تو مجھے کیا امید قتل — ایک کاٹھ کی تو ہاتھ میں تلوار چاہیئے

تمام ہو گیا کام اپنا رونے رونے میں — بہانا اشک کا بس موت کا بہانا ہوا

سجدے سے سر اٹھائے تجھے دیکھتے نہیں
بندوں کو اپنے عجز پہ کتنا غرور ہے[1]

ہوش[2]:- مرزا عبداللہ بیگ ان کے والد مرزا قاسم بیگ دولت آصفیہ کے اعلیٰ عہدہ دار تھے ۱۲۷۷ھ میں دیوان تصنیف کیا جبکہ ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی ۱۳۰۶ھ میں دیوان طبع ہوا ہے۔ عشقیہ غزلوں کے ساتھ اخلاقی غزلیں بھی کہا کرتے تھے۔

رفاقت دیگی کب دولت ہماری — چلی جائے گی بس تنہا سواری
ارے غافل ذرا شرما گنہ سے — جہاں تک ہو سکے کر اشکباری

پھرتا ہے ہر طرف تو جسے ڈھونڈتا ہوا — وہ جان جان ہے تجھ میں ہی آ دل چھپا ہوا
محبوب گر خدا ہے تو دولت پہ کیوں ہے غش — باطل تمام اس سے تو دعویٰ ترا ہوا
دونوں جہاں سے ہوش اسے کچھ غرض نہیں — جس شخص کا کہ دل ہے خدا سے لگا ہوا

---

[1] رسالہ تحفہ [2] دیوان ہوش کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

مال و زر کا ہے تو شیدا کس لئے — حب حق کا اس پہ دعویٰ کس لئے
مار اے دل نفس امارا کو مار — سانپ ہے یہ اس کو پالا کس لئے

آیا ہے تپ ہجر سے دم لب پہ ہمارا — اے رشک مسیحا خبر اے گیر خدا را
دل نالاں کے تو نالوں کو ذرا گر سن — سوز اس ورجہ کہاں نیر اے مزامیر میں ہے

ترے واسطے ہوش نے سب کو چھوڑا — مگر تجھ کو بے رحم کیا یاد ہو گا

رُخ پہ گیسو کا بکھر کر نہیں آنا اچھا — ابر خورشید درخشاں پہ نہ چھانا اچھا

اے ہوش کیوں نہ چرخ رکھے تجکو چرخ میں — تقصیر ہے یہی کہ تو صاحب ہنر بنا
پوچھتے ہیں جو ہوش کیا ہے — ان کو کچھ رحم آگیا ہو گا

وہ بولے دیکھ کر آئینہ میں رُخ روشن — لگی یہ کیسی خدایا آگ پانی میں

سنگدل ہو کیسے اللہ کی پناہ — مر رہا ہوں رحم کچھ آتا نہیں

یہ جاں کیوں ڈھونڈتی پھرتی ہے تن میں حضرت دل کو
وہ چھپ کر گیسوؤں میں اس بت پرفن کے بیٹھے ہیں[۱]

عصر:- میر احمد علی حضرت فیض کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ دیوان ۱۲۸۲ھ میں مرتب ہوا ہے کتب خانہ آصفیہ میں قلمی دیوان موجود ہے جو نہایت ضخیم ہے جس میں اکثر غزلیں طویل ہیں۔

---

[۱] دیوان ہوش

گل کر دیا چراغ تمنا بجھا دیا ۔۔۔ میرے طرف سے اس کو کسی نے لگا دیا
روشن رہا چراغ کرم کا سدا دیا ۔۔۔ جو چاہا مانگا آپ سے ہم نے لیا دیا
اے عصر جانتے ہیں ہم قافیہ عروض ۔۔۔ فیض جناب فیض نے شاعر بنا دیا

کام کب تدبیر سے ہو جب نہ ہو تقدیر میں ۔۔۔ طالع بیدار میرا رات بھر سویا کیا
جلا کے لالہ رخوں نے بنایا راکھ ڈھیر ۔۔۔ دھواں نہ نکلا دل داغدار سے باہر
غریق بحر محبت ہوں عصر بعد فنا ۔۔۔ گرا نہ لاش بھی اپنے کچھار سے باہر

صدمہ فراق کا ہے مجھے وصل یار میں ۔۔۔ عالم خزاں کا ہے مری فصل بہار میں
کیا کام ہے ہمیں لب دریا کے سیر سے ۔۔۔ اشکوں سے اپنے رکھتے ہیں دریا کنار میں
مدفن مرا مرے لئے گلزار بن گیا ۔۔۔ زیر زمین بھی چین سے ہوں میں مزار میں

حشر برپا ہے ان کی قامت سے ۔۔۔ باج لیتے ہیں وہ قیامت سے
وہی ان کا شفا کا نسخہ ہے ۔۔۔ بات خالی نہیں ہے حکمت سے[1]

ہمرنگ:- عزیز اللہ[2] نام اور ہمرنگ تخلص تھا، والد کا نام میر عالم حسینی ہے اور رنگ آباد کے باشندہ تھے۔ ان کے حالات کسی تذکرہ میں نہیں ہیں، ان کی ایک مثنوی جو "دو دولہہ" سے موسوم ہے ۱۲۲۳ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے اس مثنوی میں نصائح ہیں جو قرآنی آیات سے اخذ کی گئی ہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔

---

[1] دیوان عصر   [2] تذکرہ اور مخطوطات صفحہ ۶۳ جلد دوم

اے پرستار جہان پر جفا — اے گرفتار نگار بے وفا
بھول کر غافل نہ ہو یاد وطن — کا نسی دل کی سن اے پیماں شکن
موطن اصلی کیتی اے بوالفضول — یاد کر یکسر گیا کیوں دل سے بھول
وہ عجب ہے شہر بانو ر و ضیاء — جس کے آگے ہیچ ہے سقف سما
بوئے اس کی خاک کے عنبر سے خوب — پانی اس کا شہد اور شکر سے خوب

آہ صد افسوس ہے یہ زندگی — بندگی کچھ نہیں بڑی شرمندگی
لذت دنیا میں ہوئی سب عمر کم — بہر عقبیٰ دل کبھو بولا نہ قسم
پرورش میں نفس کے گئی ماہ و سال — عمر ضائع سب ہوئی اندر قیل و قال
خوب کی اس نفس کے تو بندگی — رائیگاں ہم رنگ تیری زندگی[1]

صاف:۔ میر جہات الدین نام اور صاف تخلص، حافظ شمس الدین فیض کے فرزند تھے۔ شاعری کے ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ اپنے باپ کے انتقال کے چھ سال بعد ہی جوانی کے عالم میں ۱۲۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ صاف کا مختصر دیوان ہے جو شایع ہو چکا ہے۔ ان کو اپنے باپ سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کے ہی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی بعض غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں لیکن اس سے ان کے کلام کی روانی اور شگفتگی میں فرق نہیں آیا ہے۔ اس سے ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

گل بنا ہے ساغر مل باغ میں — بیجئے مے بے تامل باغ میں

[1] تذکرہ اردو مخطوطات صفحہ ۶۳ جلد دوم

یہ چار دن کی ہوا ہے بہار خندہ گل | نہیں ہے باد صبا اعتبار خندۂ گل
یہی ہے گریہ شبنم کی وجہ اے بلبل | نہیں چمن میں ثبات و قرار خندۂ گل
امید امید میں بلبل نے دی قفس میں جان | ہزار حیف نہ دیکھی بہار خندۂ گل

چھوڑ کر جائیں کہاں صیاد کو | ہم قفس کو جانتے ہیں آشیاں

دکھ ہے الفت کے خریداروں کو | دیکھ آیا کرو بیماروں کو

کہتے ہیں ہم مست پی پی کر شراب | تا ابد آباد ساقی کی دکان

خاکساری میں کیا ملا ہے مزا | پوچھئے اپنے پائمالوں سے

نہ گل سے کام نہ بلبل سے کچھ غرض مجھ کو | میری بلا سے اگر موسم بہار آیا[1]

حیدر:۔ فقیر اللہ نام اور حیدر تخلص تھا۔ حافظ شجاع الدین کے مرید تھے ان کی دو مثنویاں مشہور ہیں "نادل" جو ۱۲۴۴ھ میں مرتب ہوئی ہے اور "نظم انور" ۱۲۴۷ھ میں لکھی گئی ہے۔ حیدر ایک صوفی بزرگ تھے ان کی زبان میں اس زمانہ میں بھی دکنی اثر ہے جبکہ تمام دوسرے شعرا کا کلام شمالی ہند کی زبان میں نظر آتا ہے۔

"نظم انور" دو ہزار سے زیادہ شعر کی مثنوی ہے۔ اس میں چار بھائیوں یعنی

---

[1] مرقع سخن صفحہ (۱۰۷) جلد اوّل

نرگس، سنبل، نسترن اور یاسمین کی داستان نظم کی گئی ہے
حیدر کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

رہے پہلے توصیف یزداں رقم | تصانیف پر تو کروں میں رقم
کہ محمود حامد ہے کل کائنات | او ہے ذات اوس کی عالی صفات

پانچویں دور کی نثر

اس دور کی نظم کی ترقی میں جس طرح مہاراجہ چندولال نے مربیانہ توجہ فرمائی اسی طرح نثر کی ترقی میں نواب امیر کبیر شمس الامراء ثانی کی سرپرستی یادگار رہے گی۔

شمس الامراء کے مورث اعلیٰ ابوالخیر خان تیغ جنگ ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں آپ شاہی ملازمت میں داخل ہوئے اور خانی کے خطاب سے ممتاز کئے گئے۔ آصفجاہ اول کے عہد میں کارہائے نمایاں انجام دے کر اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ اور منصب چہار ہزاری دو ہزار سوار عطا ہوئے۔ نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ کے عہد میں بھی آپ وفاشعارانہ خدمات برابر انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ میں بھی آپ کو اعلےٰ خدمت کے صلے میں امام جنگ کے خطاب کے ساتھ جاگیر اور منصب میں بھی اضافہ ہوا آخر ۱۱۶۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کے دو فرزند تھے بڑے ابوالبرکات خان امام جنگ اور دوسرے ابوالفتح خان تیغ جنگ۔ امام جنگ کا عالم جوانی میں انتقال ہو گیا۔ ابوالفتح خان کو باپ کی زندگی میں ہی ابوالخیر خان تیغ جنگ کا خطاب عنایت ہوا اور کچھ عرصہ بعد شمس الدولہ شمس الملک اور شمس الامراء کے خطابات سے سربلندی حاصل ہوئی لاکھوں کی جاگیریں سرفراز ہوئیں آپ اپنی شائستہ فوج کے ساتھ ہر وقت آصفجاہ

ثانی کے حضور میں حاضر رہا کرتے آپ کی یہ فوج جمعیت پائیگاہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ آصفجاہ ثانی نے آپ کو قلمدان وزارت سے سرفراز فرمانا چاہا مگر آپ نے اس کو قبول نہ کیا اور سپاہیانہ زندگی کو ترجیح دی۔ آپ کے حسب سفارش نواب ارسطوجاہ کو قلمدان وزارت ملا - ۵ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ کو آپ نے انتقال کیا۔

اگر ایک طرف آپ نے میدان ہائے جنگ میں شجاعت اور دلاوری کے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں تو دوسری طرف داد و دہش کی بھی بہت ساری مثالیں یادگار چھوڑی ہیں۔ صداقت اور راست بازی آپ کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھا

آپ کے فرزند محمد فخرالدین خان تیغ جنگ شمس الامراء ثانی امیر کبیر ہیں ۱۱۹۴ھ میں آپ کی پیدائش برہان پور میں واقع ہوئی والد کے انتقال کے وقت آپ نہایت کم سن تھے۔ اُس وقت سے نوازشات شاہی آپ پر مبذول ہوتی رہیں۔ دامادی کے اعزاز سے مشرف ہوئے۔ لاکھوں کی مزید جاگیریں عطا ہوئیں ۱۲۷۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ صاحبؒ (حیدرآباد) میں دفن ہوئے۔

آپ بہت بڑے علم دوست اور اہل علم وفن کے قدردان تھے اپنے صرفہ سے حیدرآباد میں بیسیوں مدرسے قائم کئے جن میں سے مدرسۂ فخریہ اب تک باقی ہے ان مدرسوں میں قابل مدرسین بیش قرار تنخواہ کے ساتھ مامور تھے۔ صدہا طلبہ نے علوم نقلی اور عقلی کی دستار فضیلت باندھی۔ ہر طالب علم کے لئے وظیفہ مقرر فرمایا تھا۔ علم وفن کی ترویج کے لئے شعراء اور مصنفین کی ہمت افزائی کا سلسلہ بھی لگ جاری تھا۔ تصنیفات پر صلہ اس طرح دیا جاتا کہ ان کی محنت و کاوش کا پورا معاوضہ ہو جاتا۔[۱]

۱؎ گلزار آصفیہ و تاریخ رشیدالدین خانی۔

مؤلفین و مصنفین کے نام پر منصب اور تنخواہیں جاری فرمائیں۔ فیض قیض۔ آفاق شہرت وغیرہ آپ کی اس سرکار سے معقول طور پر بہرہ مند تھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کا سب سے بڑا اور مہتم بالشان کارنامہ جو تاریخ اردو میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ یہ ہے کہ آپ نے ہی سب سے پہلے مغربی زبانوں سے سائنس کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ ۱۲۴۲ھ میں اس کام کا آغاز ہوا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ نہ تو علی گڑھ کی سائنٹیفک سوسائٹی قائم ہوئی تھی اور نہ کسی اور نے اس جانب توجہ کی تھی۔

ارباب کمپنی نے بمقام کلکتہ اردو نثر میں قصہ کہانیوں وغیرہ کی کتابیں مرتب کرائیں تھیں۔ یہ کارنامہ ان دونوں تاریخ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے لیکن نواب شمس الامراء امیر کبیر نے زبان اردو کی جو خدمت کی ہے اس کا مرتبہ ان قصہ کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سود مند ہے۔

شمس الامرا امیر کبیر نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں ان کی تعداد تقریباً پچھتر ۷۵ ہے "ستہ شمسیہ" کے دیباچہ میں آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ نقل کرنے کے قابل ہے۔

"نیازمند درگاہ ایزدی کا محمد فخرالدین خان المخاطب شمس الامراء اس طور پہ گذارش رکھتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں۔ یہ سب میلان طبیعت کے نسبت اس طرف شوق رکھتا تھا میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل ان کے ازبر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبان عرب و عجم میں بھی مشہور ہیں چنانچہ علم جرثقیل اور علم المناظر وغیرہ

مگر اس قدر سننے میں نہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے بلکہ بعض علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا چنانچہ علم آب اور ہوا اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ ہندیوں کے فائدہ کے لئے ایسی کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کے معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی۔ پس طالبین از خود ارادہ بلبوطی کتابوں کے دیکھنے کا کرلیں گے۔ چنانچہ ان دنوں میں بہ حسب مدعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے ریورنڈ جالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے بہم پہنچے۔"

نواب شمس الامرا کے دارالترجمہ کی بعض کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اصول علم حساب (۲) رسالہ کسور اعشاریہ

(۳) ستہ شمسیہ - اس کے چھ حصے ہیں جو چھ شعبوں سے متعلق ہیں۔

(۴) رسالہ علم اعمال کرہ (۵) رسالہ منتخب البصر

(۶) کمسٹری کا رسالہ (۷) رسالہ کمسٹری

(۸) رسالہ خلاصہ ادویہ (۹) نافع الامراض

(۱۰) ترکیب ادویہ (۱۱) رسالہ حیوانات مطلق

(۱۲) رسالہ مونی کے پرونگانے کا (۱۳) رسالہ ارمیری

(۱۴) شمس العلاج (۱۵) تعلیم الصبیان

(۱۶) فوائد الصبیان (۱۷) افضل الادب آصفیہ

(۱۸) شمس الہیئت (۱۹) رسالہ علم خراط

(۲۰) ہندسہ بانوتہ (۲۱) انوار بدریہ

(۲۲) تذکرہ رشدیہ

ان تمام کتابوں کی تفصیل اور نمونہ نثر ہم نے اپنی تالیف موسومہ شمس الامرا کے علمی کارنامے میں صراحت سے پیش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے شمس الامرا نے اردو زبان میں مغربی علوم کو منتقل کرنے کی ابتدا کی اور کئی بہترین کتابیں آپ کی وجہ سے اردو میں ترجمہ ہو کر طبع اور شائع ہوئی ہیں۔ اب بلحاظ سنہ اس دور کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے، اس دور میں نہ صرف سائنس کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں۔ بلکہ کئی فن کی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ تفسیر، فقہ، تاریخ، سوانح، فلسفہ، ریاضی، ہیئت منطق وغیرہ ہر ایک فن کی کتابیں مرتب ہوئی ہیں۔

مصباح الصلوٰۃ[1]:- مولوی نادر علی نے اس نام سے ایک کتاب عربی سے ترجمہ کی ہے جو ۱۲۳۲ھ کی مرتبہ اور فقہ حنفی پر مشتمل ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"انسان بالغ پر جاننا فرض کا فرض ہے اور جاننا واجب کا واجب ہے، اور جاننا سنت کا سنت ہے اور جاننا مستحب کا مستحب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

---

[1] کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

صاحب مفتاح الصلوٰۃ نے اپنے معتبر کتابوں سے لکھا ہے کہ جو شخص کہ فرائض اور واجبات نماز کی نہیں جانتا ہے نماز اس کی روا نہیں۔ شیخ ابو حفص کبیر فرمائے کافر ہوئے نعوذ باللہ . . . . . رکھنا ہاتھوں کا نیچے ناف کے سنت ہے۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ منکٹ کو باویں ہات کی سیدھے ہات کی انگوٹھی اور کن انگلی سے پکڑ لیوے اور تین انگلیاں اپر منکٹ کی رکھے اور باطن سیدھے ہات کا اپر ظاہر باویں ہات کی لاوے "

(۲) انوار سہیلی[1] - یہ بھی عجیب مقبول عام کتاب ہے - دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے - دکن میں بھی ۱۲۴۰ھ ۱۸۲۴ء میں یہ کتاب دکھنی زبان میں طبع ہوئی ہے - اس کے مترجم جن کو مؤلف کا درجہ دیا جا سکتا ہے میاں محمد ابراہیم ہیں -

ان کے ذاتی حالات خود انہوں نے اس کتاب کے دیباچہ میں ظاہر کئے ہیں -

"جب میں نے اپنا عجز و انکسار بتلایا تب حضرت دل سے خطاب مستطاب ہوا کہ اے میاں محمد ابراہیم بن ملک حسین خان بن شیخ محمد بیجاپوری جمعدار دکھنی ہزار سواری تو نے کہا کہ اگر کسو نے مجھ سا نفیر زبان اور کثیف دوران اس جہان بے پایان میں بغور تمام ملاحظہ کیجئے تو بھی اس کا دست ارادت دامن مقصود تک نہ پہنچے اور پنجۂ مطلب رشتہ امید کو نہ اینچے "

[1] یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے یورپ میں متعدد مخطوطات ہیں ان کی تفصیل "یورپ میں دکھنی مخطوطات" سے ہو سکتی ہے -

"چین کے ملک کے اورس چورس میں ایک بڑا بادشاہ تھا اس کا نام ہمایوں
فال ہور اسے ایک بڑا ایکا وزیر تھا اس کا نام خجستہ رائے ہمایوں فال ایک بار
خجستہ رائے کو سات لے کر شکار کو گیا وہاں سوا اُٹنے تو دھوپ پڑی تھی ایک پہاڑ
کی انی پو جھاڑاں تھے چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو سات لے کر اُس چھاؤں کے
تلے جا بیٹھا اور دیکھا تو کیا کہ ایک جھاڑ اس کا کھوڑ کا ہور بڑا ہو گیا ہے اس کے اندر
شہد کے مکھیاں پوتی بندنے اندر گھستے اور بہار نکلتے ہیں۔ ہمایوں فال خجستہ رائے
سوں پوچھا یہ کیا ہوں گا انے بولیا یہ شہد کی پوتی ہے بادشاہی عملا فعلا سگل ان کے
ہاں ہے جمشید نے بادشاہی کرناان سوں سیکھیا ہمایوں فال بولیا ارے میاں وزیر
دنیا بڑی کھٹ کھٹ کی ہے اس سوں بہتر ہے کہ سب چھوڑ دیکر کونا پکڑنا۔ خجستہ رائے
بولیا تمھارے سوں عالم کا بھلا ہوتا ہے تمنا کونا پکڑ کو کیا نفع۔ عدالت سوں بادشاہی
کرے تو دنیا میں ہور دین میں دو نو جگہ بھلائی ہے۔

قطعہ

خاک کو ہور گگن کو تم دیکھو تو — اس کو آرام ہے اور اس کو سفر
مال و دولت سفر سوں ملتی ہے — اور ملتا ہے کی سفر سیں ہنر
جھاڑ جلتا تو اپنی جاگہ سیں — اوسے کا جور اس پر ہور ندیر

بائیکو بھی بولی سو یہ بات سچ ہے جس کا حق اسے دے ڈالنا اچھا ہے۔ ہور
خدا پر بھروسا رکھنا سوں بھلا ہے اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ ہمنا دیگا۔

مرغوب الطبع[1]:۔ یہ کتاب فارسی قصہ" کامروپ" کا ترجمہ ہے۔ جس کو
سید حسین علی خان نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا ہے۔

---

[1] ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ موجود ہے ۱۲۷

سید حسین علی خان حیدرآباد کے طبقہ جاگیرداروں میں شامل تھے۔ اپنے لڑکوں کے لئے کئی ایک فارسی قصوں کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ وہ فارسی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے اور خوش نویس بھی تھے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"ہزارہا شکر، لکھو کھا حمد جناب حق تعالیٰ جل شانہ' ہیں کہ بشر کو زینت نطق سے آراستہ کیا۔ واسطے ادا کرنے حمد و ثنا کے۔ لیکن انسان کو کہاں طاقت ہے جو عہدہ برآ حمد کا ہووے۔ اور اوس کی حمد کے میدان میں قلم کے گھوڑے کو جولان دیوے . . . .

آغاز داستان کہا بولنے والے عجائب روزگار اور داستان لینے والے نادرہ زمانے کے ایسی نقل کرتے ہیں کہ بیچ شہر اودھ کے جو شہروں سے ہند کے ہے اور ثانی اوس کے کوئی شہر زمانہ میں نہیں تھا۔ زمانہ گذشتہ میں وہاں کا ایک راجہ تھا۔ راجہ راج بنسی اوس کا نام تعریف اوس کے بادشاہت کی اور دولت و حشمت کی ملکوں میں مشہور تھی، اور ویسا بادشاہ دوسرا کسی ملک میں نہیں تھا۔"

چہار درویش:- اس کو بھی سید حسین علی خان نے ۱۲۵۰ھ میں فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ اور اس امر کی صراحت کی ہے کہ اپنے فرزند ولایت علی کی خواہش اور فرمائش پر اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ عبارت کے نمونہ میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔

"بندہ کو پانچ فرزند تصدق پنجتن پاک عطا فرمائے ہیں۔ بندہ ان کو اپنے حواس خمسہ جانتا ہے۔ اور پنجگانہ میں جناب الٰہی سے اون کی صحت کی دعا مانگتا ہے . . . . .

غرض ان میں سے برخوردار ولایت علی خان اطال اللہ عمرہ و قدرہ تعریف قصہ چار درویش کی سنے اور نہایت مشتاق ہوا کہ کہیں سے قصہ چار درویش بہم پہنچے ....

پھر اس برخوردار نے کہا کہ بندہ چاہتا ہے کہ اس قصے کو زبان اردو میں آپ قلمبند فرمایئں کہ خواص و عام اور وضیع و شریف سمجھیں ....

ایک بادشاہ تھا ہمارا تمھارا خدا اور خدا کا رسول، بادشاہ، شہر روم اوس کا دار السلطنت تھا۔ عادل، دانا اور باذل، اوس کے عہد میں باز کا مقدور نہ تھا کہ صعوہ کو بد نظر دیکھے ....

وارث تاج و تخت کا کوئی اب تک پیدا نہ ہوا۔ جب اولاد نہیں تو اس دولت دنیا کو لے کر کیا کروں۔ یہ تخت و تاج تجھ کو مبارک ہو۔ میں اس حجرہ سے باہر نہ نکلونگا جب تک اللہ تعالیٰ مجھ کو اولاد سے سرفراز کرے۔ وزیر باتدبیر نے عرض کیا حق تعالےٰ سایہ دامن دولت کو خانہ زادوں کے سر پر قائم و دائم رکھے۔"

ہمیشہ بہار:- یہ بھی اسی مؤلف سید حسین علی خان کی کتاب ہے۔ بہار دانش کا ترجمہ ہے جو ۱۲۵۰ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اونہوں نے اس کتاب میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ انگریزوں کی فرمایش سے بہت سی کتابیں ہندی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ لیکن اب تک شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا ترجمہ نہیں ہوا ہے اس لئے اپنے دوستوں کی فرمایش پر یہ کام انجام دیا۔ اسی سلسلہ میں اونہوں نے نواب ناصر الدولہ آصفجاہ (رابع) کی مدح بھی کی ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

حمد ثنا زبان بشر سے ادا نہ ہو ۔۔۔ قاصر زبان ملائک ہفت آسمان کی ہے
اوس کی ثنا، قلم جو لکھے تاب ہے کہاں ۔۔۔ یہ دو زباں سے خواہش اوسے سو زبان کی ہے

حمد و ثناء جناب جہان آفرین کی زبان بشر کو قدرت نہیں جو بیان کرے۔ اور اگر قلم جرأت لکھنے کی کرتا ہے تو زبان شق ہو جاتی ہے ....

کتاب "بہار دانش" [۱] شیخ عنایت اللہ نے زبان فارسی میں بہوت عبارت رنگین و مسلسل و دقیق و نقلیں عجائب و کہانیاں نادر اور نصیحتیں جو وزیر و امیر و حکیم و ندیم و امرا و اعیان جہاندار سلطان کے تئیں بے وفائی عورتوں کی کی نقلیں لکھیں ہیں۔ اکثر اوقات مجلس میں شغل اوس کتاب کا رہتا تھا۔ اور سب اہل محفل کو جو بہرہ علم سے رکھتے تھے بشاشت حاصل ہوتی تھی۔ اور لا علم اوس کی فہم کی لذت سے محروم رہتے۔ کئی صاحبوں نے کہے کہ اگر اوس کا ترجمہ زبان ہندی سے ہو تو سب با علم و بے علم کی سمجھ میں جو یہ کہانیاں و نقلاں جو رنگین ہیں آئیں گی۔ اور کئی منشیوں نے بہوت سی کتابیں فارسی کی بموجب انگریزوں کے ترجمہ ہندی سے جو قریب الفہم ہوتا ہے کئے ہیں ....

عہد میں مسند نشین نواب کیوان جناب معلا القاب رستم دوران حاتم زماں

ہست کیواں جناب و انجم سپاہ	زیب بخش سریر و چتر و کلاہ
جانشین سکندر ثانی ؑ	ناصر الدولہ یعنی آصف جاہ

.... مترجم اس کا سید حسین علی خان جو زاد و بوم بھی شہر فردوس رشک ہے .... ہمیشہ بہار نام رکھا۔" ....

شاہزادہ بلا نصیب مجنوں کے مانند آوارہ جنگل چرانے کا ہو شوق وصال میں قدم مارتا ہوا بہوت مشکلیں اوٹھا ایک جائے آ پہنچا دیکھا کہ دریائے عظیم ہے اور پہاڑ سے موجیں مارتے ہیں اور کنارہ اس کا معلوم نہیں ہوتا اور وہ مشتاق وصال

---

[۱] ادارہ ادبیات اردو میں اس کا مخطوطہ موجود ہے (۱۳۰)

یاد جانا چاہتا تھا۔

سنہ شمسیہ:- یہ رسالے جو سائنس کے متعلق ہیں ۱۲۵۳ھ میں طبع ہوئے ہیں یہ وہی رسالے ہیں جو شمس الامرا امیر کبیر کے حکم سے انگریزی اور فرانسیسی سے ترجمہ ہوئے ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

کشش ثقل کے بیان میں۔

استاذ۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیت و حقیقت سے کلیہ عمدہ کی آگاہ کروں جس کو کشش ثقل کہتے ہیں۔ اور وہ ایک قوت ہے جس کے سبب اجسام بعیدہ باہمدگر تجاذب رکھتے ہیں اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے تمام اجسام ثقلیہ کے زمین پر"

"تلمیذ کلاں۔ گولی کا ہاتھ سے گرنا اور اینٹ کا چھت سے ساقط ہونا اور سیب کا جھاڑ سے زمین پر آنا یہ سب کیا سبب اسی قوت کے ہیں"

"استاذ۔ ہاں یہ سبب اسی قوت کے ہیں جس کو ثقل تعبیر کرتے ہیں۔ پس وہ اجسام جس میں کچھ بھی میل ہے۔ اگر ان کو کوئی تھامنے والا نہ ہو تو سطح زمین پر قریب عمود وار گریں گے اور اس میل کو جو نتیجہ اور حاصل ثقل ہے جسم کے اجزا سے وزن کہتے ہیں یہیں سے ہے کہ ثقل اور وزن متغادت ہیں کیونکہ وزن ایک جسم معین کا واسطے ناپنے وزن دوسرے جسم کے استعمال نہیں لاتے۔ جیسا وزن سنگ ترازو کا تھا برامتحان وزن غلے وغیرہ کے استعمال کرتے ہیں"

رسالہ اعمال کرہ:- یہ کتاب بھی امیر کبیر کے اہتمام سے ترجمہ ہوئی ہے۔ مگر ترجمے نے تالیف کی صورت اختیار کر لی ہے۔

اس میں جغرافیہ اور ہیئت کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ ۱۲۵۵ھ میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے چار باب میں کتاب منقسم ہے۔ پہلے مقالہ میں تعریفیات۔ دوسرے میں جغرافیہ تیسرے اور چوتھے میں ہیئت سے بحث کی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے:۔

"قطبین عالم دے دو طرفین محور کی ہیں کہ جہاں زمین کی سطح نے اس محور کو قطع کیا ہے۔ ان میں سے ایک شمالی ہی اور دوسرا قطب جنوبی اور مقابل ان ہی دو نقطوں کی آسمان کے دو قطب واقع ہیں۔"

"سوال۔ جون کی دسوین کو آفتاب کون کون مقام میں عمود وار رہتا ہی اور کون کون مقام میں طلوع اور غروب نہیں ہوتا۔"

جواب۔ سنار بلہ اور کلکتہ اور آوا اور مکاو جزیرہ چین وغیرہ میں آفتاب عمود وار رہتا ہی اور منطقۂ مبردۂ شمالی میں مکنزئی اور گرین لنڈ اور کیپ میں غروب نہیں ہوتا۔ اور منطقۂ مبردۂ جنوبی میں اس جگہ کو جہاں تمام بحور ہیں طلوع نہیں کرتا۔"

انیسواں زلزلہ ۱۷۴۶ء میں شہر کلواجو پیرو کے ملک سے متعلق ہی اور اس شہر میں پانچ ہزار سپاہی سکونت کرتے تھے اسی طرح سے ہوا تھا کہ ناگاہ دہاں کی زمین صدمہ کھانے لگی جو لوگ سوتے تھے اُن کو زمین کا صدمہ معلوم ہوا اٹھنے نہیں پائے کہ دریا اس طغیانی سے بلند ہوا کہ اس کی موجیں اس شہر پر سے گذریں تمام آبادی ڈوب گئی۔"

"زحل کا بیان۔ یہ سیارہ مدھم روشنی سے نظر آتا ہے اور آفتاب سے بہت دور ہے اور باستعانت بہتر آلہ دوربین کہ اہل علم کو اس سیارے کی پٹی کے دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے اور یہ پٹی اس سیارے کی اطراف تمامہ ایک حلقہ روشن ہے اور

اس حلقہ کے باہر سات قمر گردش کرتے ہیں اوران اقمار میں سے ایک قمر اس حلقہ کی سطح پر حرکت کرتا ہے۔"

بہار دانش کی حکایتیں:۔ بہار دانش کی کئی ایک حکایتوں کا اُردو میں ترجمہ ہوا ہے یہ دوسرا ترجمہ ہے اسکے مترجم محمد اسمٰعیل ہیں جن کو انگریزی فوج سے تعلق تھا۔ اور انگریزوں کو تعلیم دیا کرتے یہ ترجمہ بھی اسی غرض سے ہوا ہے کہ انگریزوں کو اُردو کی تعلیم دی جائے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"قدیم دنوں میں بیچ ملک ہند کے ایک سوداگر بہوت بڑا ھور عمدہ تھا ادسے چہار بیٹے تھے تین لائق ھور یک بڑا نالائق کہ تمام دن ھور تمام رات بیچ نشہ شراب کے مست رہتا و جشن یاری میں مشغول۔

" بہوت پیسی باپ کی اس بدکام میں خراب کیا باپ اوس کا اس نالائقی کو دیکھ کر بہت نصیحت زیادہ حد سیں کیا ہور دوسری لوگاں کی موں سے سنی کہنی فرمایا آخر اس کی دل میں ہرگز یہ نصیحت ماں باپ کی ہور خوشی اقرباء کی سر مو برابر اوس کی خاطر نالائق میں جا لگا نہ لی۔"

ایسا کہتی ہیں کہ گیلان کی سرحد میں ئیک جہاڑی بہوت بری تھی اور اس جہاڑی میں ئیک تالاب بہوت عظیم تھا اکثر کبی اوس تالاب کی قافلی اوترتی تھی بقضای الہیٰ ئیک روز اس تالاب پر ئیک قافلہ بہوت برا کہ ہزاروں اونٹ اور خچر اور گھوڑی تھی اس اونٹوں میں سے یک اونٹ سفید زخمی ہوکر چلنے سے رہ گیا تھا قافلہ والی لاچار ہو کر اوس اونٹ کو چھوڑ کر جنگل میں چلی گئی۔"

خاتمہ:۔

"اور اونت کو حکم کیا کہ بموجب آگی کی تمام دن چرکر رات کون دیوری پر حاضر رہو اور بادشاہ اپنے محل میں پہنچ عیش عشرت میں مشغول ہورہا۔"[1]

ترجمہ گلستان:۔ اس دور میں گلستان کے بعض ترجمے بھی ہوئے ہیں ان کے مترجم مختلف اصحاب ہیں افسوس ہے ہم ان کے ناموں سے واقف نہیں۔ یورپ[2] میں ان ترجموں کے مخطوطات موجود ہیں۔ بطور نمونہ کچھ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

"کہ عاقلاں کہی ہیں جو کوئی بات جان سیں دھو دی جو کچھ کہ دل میں آوی سو کہی جب عاجز ہوتا ہے آدمی لمبی ہوتی ہی زبان اس کی کہ عاجز بلی پھلنگ مارتی ہی اوپر کتی کے بادشاہ پوچھا کہ کیا کہتا ہی یک وزیروں سیں نیک خصلت کا کہا ایصاحب اُن کہتا ہی غصیکوں کہانیوالی ہور تقصیر معاف کرنے والی ہور احسان کرنے والی لوک کتیں خدا تعالیٰ دوست رکھتا ہے۔ بادشاہ کون اوپر اوس کی رحم آیا ہور ارادی سیں اوس کی خون کے گذر یا۔

اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

جہان ای بہائی نا رہی سات کسی کی دل بیچ جہان کون پیدا کرنی بار یکی بند کہ بس یہی مت دی ٹیکا ہور بیت اوپر ملک دنیا کی کیا واسطی۔

بعض اور قصّے:۔ یورپ[3] میں انار رانی اور قصہ بند گانعالی کے نام سے دو مخطوطات ہیں اگرچہ ان کے مترجم کے نام معلوم

[1،2،3] یورپ میں دکھنی مخطوطات ص ۳۰۲

نہیں مگر بلا شک و شبہ یہ بھی اس زمانے کی نثر کا نمونہ ہے۔ اس لئے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"کہنے ہارے خبروں کے ہور عاقلاں آگے کے کہے ہیں کہ بیچ ملک ہندوستان کے ایک باوشاہ تھا کہ سخاوت اور جوانمردی اور عدالت میں مانند اس کے دنیا میں کم اور خزانے اور سونا روپا اور زر و جواہر اور اسباب و سپاہ حد سے زیادہ تھے۔"

"لاکن اوس بادشاہ کو سوای اولاد کی کچھ دل میں آرزو نہیں تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہمیشہ واسطے اولاد کی بیچ درگاہ خدا تعالٰی کی دست بدعا تھا اور رات ہور دن یاد میں اللہ کے رہتا۔"

"جو شخص کہ اس باغ کو آتا اوس باؤلی کی طرف گزرتا اوس پھول کو دیکھ کر توڑنی کی خاطر قصد کرتا لاکن وہ پھول کسے کی ہات نہیں پڑتا ایسے طرح سے یہ بات تمام شہر میں مشہور ہوئی اور رفتہ رفتہ ان چاروں شاہزادوں کون خبر ہوئی واسطی سیر کے اس باغ کون چاروں شہزادی ملکو گئے۔"

"انار رانی کو دیکھ کر بہوت خوش ہوی اور چھ مہینے رات اور چھ مہینے دن کی شادی بڑی دھوم سے کئے بعد ازاں شہزادہ اور انار رانی باقی عمر بیچ عشق اور عشرت کی گذادی۔"

تاریخ رشید الدین خانی[1]:۔ یہ ایک ضخیم تاریخ ہے جس کو غلام امام خان نے شمس الامراء امیر کبیر ثالث کے حکم سے مرتب کیا ہے۔ ۱۲۷۷ھ میں طبع ہوئی ہے یہ کتاب بڑی سائز کے (۷۰۹) صفحات پر مشتمل ہے

[1] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ راقم الحروف کے پاس بھی اس کا نسخہ ہے۔

ایک مقدمہ تین دفتر اور خاتمہ پر کتاب تقسیم کی ہے مقدمہ میں راجگان ہند کے حالات دفتر اول میں سلاطین دہلی کے حالات دوسرے دفتر میں اسلامی سلاطین دکن کا ذکر کیا گیا ہے تیسرے دفتر میں مشاہیر کے حالات مندرج ہیں اس دور کے آخر انگریزوں کا دکن میں آنا اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے جنگ کے مفصل واقعات بیان کئے ہیں اگرچہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی چنانچہ بہادر شاہ کے حال میں لکھا ہے "سلطنت دہلی کو بہادر شاہ وقت کے جلوس سے ان اوراق کے تحریر تک کہ آخر ذی حجہ ۱۲۳۸ھ ہے سولہ برس چھ مہینے پچیس دن ہوتے ہیں"

اس تاریخ کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ آصف جاہ اول کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

"نواب چونکہ بہ نفس نفیس جمیع مقدمات مالی اور ملکی کا انصرام فرماتے تھے مگر بعض ندمانے فی الجملہ ان کے آرام کا خیال کر کے ایک معتمد علیہ مقرر کرانے کے لئے عرض کیا نواب نے خدمت دیوانی کے لئے امرائے کبار میں سے ایک معتمد علیہ متدین کو تجویز کر کے جن کا نام راقم کو تحقیق نہیں ہوا اس عہدہ کا مژدہ ان کو پہنچایا۔ محمد ابوالخیر خان بہادر جو ایک دور اندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے انہوں نے اس کو نامناسب جانا اور شب کے وقت جس کی صبح کو کار خدمت ان کے سپرد ہونے والا تھا۔ ابوالخیر خان ورد دولت پر حاضر ہوئے اور نواب کو اطلاع کرائی نواب باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ ناوقت آنے کا کیا سبب ہے؟ عرض کیا جناب والا کل دیوان کیا چاہتے ہیں میں اس بات کا خیال کرتا ہوں شاہ جہان آباد میں جب بادشاہ سلامت کو اس تقرری

کا علم ہوگا تو وہ یقین کریں گے۔ آصف جاہ کبیر سنی کی وجہ سے آرام طلب ہو گئے ہیں اور یہ بات نامناسب ہو گی تو نواب ۔نے فرمایا میں تو حکم دے چکا ہوں ابوالخیر خان نے عرض کیا کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ دربار کے وقت بجائے عرض بیگی کے بندہ کو اعلام کا حکم ہو فدوی اس وقت کچھ حکمت عملی کر گذرے گا۔ صبح کو جب اعلام کا حکم خان موصوف کے لئے ہوا تو خان موصوف نے اس معتمد علیہ کا نام زبان فارسی میں ندا کی کہ از خدمت صوبہ داری برہان پور فلاں شخص سرفرازی یافت ہر چند ناواقف لوگ معتمد الملک کہتے رہے نہیں اعلام دیوانی کا حکم ہے مگر چوبدار نے حسب ایماء خان موصوف جلد مجرا ادا کر دیا اور نذر پیش کرا دی ''

اس دفتر کو عفران منزل نواب ناصر الدولہ کے حالات پر اسی طرح ختم کرتے ہیں۔

''واضح ہو کہ سنہ جلوس سے ۱۲۶۹ھ کے اسی ماہ کے آخر تک نواب صاحب کی مدت سلطنت (۲۵) سال ایک ماہ گیارہ روز ہوتی ہے۔ سن حضرت کا (۵۱) سال کا ہے''

تذکرہ و انوار بدریہ:۔ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے شمس الامراء امیر کبیر ثالث بھی ایک علم دوست امیر تھے۔ آپ کے علمی کارنامے آج تک زندہ ہیں۔ نواب صاحب کو علم ریاضی سے خاص شغف تھا اور اس میں مہارت تامہ حاصل تھی یہی شوق ان کتابوں کی تصنیف کرانے کا باعث ہوا یہ دونوں کتابیں باہمی سے متعلق ۱۲۸۱ھ میں مرتب ہوئی ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

تذکرہ:۔ ایک روز جناب اقتدار مآب اقتدار الملک اقتدار الدولہ محمد رشید الدین

خان نواب امیر کبیر شمس الامرا نے ایسا فرمایا کہ علم ہندسہ میں کوئی نسخہ ایسا نہیں کہ جس کی تعلیم سے ہندیوں کو فی الجملہ بصیرت حاصل ہو اور پائے شوق دراز اگر کوئی لکھے تو کیا بہتر ہے اور یادگار زمانہ نظر بریں اس ذرہ بے مقدار شاہ علی متوطن قلعہ ادھونی نے چند اشکال ہندسی کو اس مختصر میں جمع کر کے موسوم بہ تذکرہ پیش کیا۔"

علم ہندسہ وہ علم ہے کہ اس میں بحث ہے احوال مقادیر ثلثہ سے یعنے خطوط سطح و جسم تعلیمی کہ مشترک ہیں متصلہ قار الذات ہیں جو ان کی جنس ہیں بلکہ موضوع بھی اس علم کا اور یقینیات کو پہنچا یا جلی دیا۔"

اس رسالہ میں اقلیدس کی (۴۸) شکلیں ثابت کی گئی ہیں۔

نمونہ انوار بدریہ:۔ "جاننا چاہیئے کہ وے نسبتیں جو اقلیدس میں مذکور ہیں اگرچہ کثیرۃ فواید ہیں بہتر از شکل عروس ہیں لیکن معانی میں باوجود نزاکت ایسی قلیل ان کا الفاظ کہ جن کا سمجھنا ہندیوں کو بغایت دشوار بلکہ منتہیوں کو بھی اس لیئے ان کو اس ذرۂ بے مقدار شاہ علی ساکن قلعہ ادھونی نے زبان ہندی میں بعبارت سلیس مع امثلہ عددی ترجمہ کیا۔"

"مقادیر دو نصف کی جو مراتب میں برابر اور نسبت میں ایسے ہوں کہ وہ مقدار میں ایک صفت کے وہ نسبت ہو جو ہر دو مقدار میں صف آخر کی ہے پس اطراف ہر صفت کے نسبت دینے کو اوساط نسبت مساوات کہتے ہیں۔"

تاریخ خورشید جاہی:۔ شمس الامراء نواب رشید الدین خان امیر کبیر ثالث کے فرزند تیغ جنگ نواب محی الدین خان سر خورشید جاہ امیر کبیر رابع بھی اپنے والد ماجد کی طرح علم دوست تھے۔ آپ کے حکم کی بناء پر

غلام امام خان نے تاریخ خورشید جاہی مرتب کی گویا اسے تاریخ رشید الدین خانی کا تتمہ کہنا چاہیئے اگرچہ اس کی ترتیب جداگانہ ہے کیونکہ بجائے سلاطین کے حالات کے صوبہ داروں کے حالات اور ان کی فتوحات کا ذکر ہے اس کے علاوہ اولیاء اللہ اور شاہان ایران وغیرہ کے سوانحات بھی شامل کر دئے ہیں چہاردہ سالہ کیفیت کا من ابتدائے ۱۲۷۰ھ لغایتہ ۱۲۸۴ھ مفصل بیان ہے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی ایک جداگانہ تاریخ ہے۔ مقدمہ میں علم تاریخ کے فوائد بیان کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد مورّخ کے اوصاف ظاہر کئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس کو تعصب سے پاک اور واقعات بے کم و کاست بیان کرنا ضروری ہے۔ مدح و ذم میں افراط و تفریط نہ کرنی چاہیئے بلکہ خیر الامور اوسطہا پر عمل کرنا چاہیئے۔ طرز عبارت سلیس تکلفات سے منزہ، سہل الماخذ، قریب الفہم ہونا چاہیئے۔ مورخ کو ضروری ہے کہ دیانت آثار و امانت شعار ہو اس کا کلام سراپا صداقت ہو۔ اس کے افعال میں راستبازی ہو واقعات میں عموماً اور حالات سلاطین میں خصوصاً اس کے بیان پر لوگ پورا اعتماد کر سکیں۔

جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے کہ صوبہ جات کے حالات سے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ صوبہ جات ہند کو (۲۷) صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے صوبہ کا محاصل مخارج ذکر کیا گیا ہے پھر اس کی مفصل کیفیت قلم بند کی گئی ہے مثلاً صوبہ خجستہ بنیاد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

"اس صوبہ کو ملک مرہٹہ کہتے ہیں پس زمانہ میں نظام شاہیہ کے صوبہ احمد نگر قرار پایا۔ صاحب نسخہ جدید لکھا ہے کہ زمانہ سابق میں نام اس کا دیوگڈہ تھا اور عہد میں

راجہ بھوج کے دہار اکہا کرتے تھے۔ جب فخر الدین جونا شاہ دہلی نے تمام دکن پر قبضہ کیا تو قلعہ دیوگڈھ کا نام دولت آباد رکھا اور دار السلطنت اپنا فرمایا۔ بعدہٗ جب نوبت فتوحات دکن کی اورنگ زیب عالمگیر کو پہنچی۔ نزدیک ہمایوں موضع کھڑکی میں ۱۰۶۶ء میں ایک شہر کمال لطافت و استحکام کے ساتھ آباد کر کے نام اس کا خجستہ بنیاد اورنگ آباد رکھا۔ وہاں میوہ ہر قسم کا ہوتا ہے مگر نیشکر کمال نازک اور شیریں اور بزرگ ہوتا ہے اور کیلا اور ناریل اور کیوڑا اور پان ترنج بکثرت ہیں۔ واضح ہو کہ دولت آباد ایک سنگ ہے۔ تراشیدہ سر بفلک کشیدہ اور اس کو ایسا تراشا ہے کہ اس کی صفائی سے پاؤں پھسلتے ہیں ارتفاع اس کا (۱۴۰) گز ہے۔ خندق اس کی عمیق تیس گز ہے۔ سنگ خارا میں پانی پہنچا ہے کسی نے تعریف میں کہا ہے ؎

حصارے کہ مثلش ندیدہ است کس — بود قلعۂ دولت آباد و بس"

علمی و طبی رسائل:۔ اس دور میں اشاعت علوم کے لئے اردو میں رسالے شایع ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۲۷۵ھ میں ایک طبی رسالہ جاری ہوا اس میں یونانی اور ڈاکٹری مضامین اردو میں شائع ہوتے تھے یہ رسالہ مدرسہ طبیہ کی زیر نگرانی شائع ہوا کرتا تھا۔ اس طبی رسالہ میں مریضوں پر عمل جراحی کرنے اور ان کے اس سے صحت یاب ہونے کی رپوٹیں اور مفید طبی معلومات وغیرہ شائع ہوتی تھیں نمونہ کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

"ایک عورت[1] قوم سے اہل اسلام کے کہ عمر اس کی قریب پچیس سال کی ساکن قصبۂ بیڑ کی نام اس کا پاپا بی شہر شوال المکرم ۱۲۷۷ھ کو نزدیک اس نادوی کے

[1] رسالہ جلد (۲) نمبر (۱) ماہ صفر ۱۲۷۸ھ از کتب خانہ والدم مرحوم۔

آئی اور ایسا بیان کی کہ یہ رسولی مجھے تین سال سے ہے اور دن بدن ترقی پر ہے القصہ اس فدوی نے اول اس بیچارہ کو بے ہوش کر کے یومرل آئری ٹریکنٹ سے باندھ کر ایک اسکپاسپل سے بیضاوی شکل کی مانند چیر کر پوست کو تشریح کر کر اس رسولی کو امانت نکال لیا اور ذرا بھی مادہ اس رسولی کا رہنے نہ دیا بعد از آئری وغیرہ کو باندکر لب زخم کو ملا کر ٹانکے دے کر اوڑی زف پلاسٹر کے تسمے لگا دیا اور انٹی فلوجسٹک ٹریٹمنٹ کے حال پر رکھا۔ چند روزہ میں عنایت الٰہی سے وہ بیچارہ درست ہو گئی اور وہ رسولی دہ اونس چار ڈرام تھی" (فلیمنگ)

"فاسفیورہیٹڈ رجن۔ یہ بھی بیرنگ اور شفاف گاس ہی اور حیوانی مادوں کی سڑاوٹ سے پیدا ہوتا اور اس کی بو ایسی ہے کہ جیسا کہ بوسیدہ مچھلی کی بو ہی یہ گھاس بھی انسان کی جان کو اور صحت کو بہت مضر ہے اور اہل کیمیا اس کو ایسی پاکی سے تیار کر سکتے ہیں کہ تیار ہوتے ہی فوراً سلگ کر جل جاتا ہے"[1]

رسالہ مخزن الفوائد:۔ مولوی سید حسین بلگرامی نواب عماد الملک بہادر نے ۱۲۹۱ھ میں اس نام سے ایک رسالہ شائع فرمایا تھا جو علمی و اخلاقی مضامین پر مشتمل تھا۔ تاریخ۔ فلسفہ۔ سائنس ادب و اخلاق وغیرہ کے اچھے اچھے مضمون شائع ہوتے تھے۔ اس کے مضمون نگار نواب محسن الملک نواب سرور جنگ مولوی مشتاق حسین وغیرہ اصحاب تھے۔ رسالہ جلد اول نمبر ۹ ماہ ذی حجہ ۱۲۹۱ھ ہجری کے مضامین کی فہرست نمونتاً درج کی جاتی ہے:۔

---

[1] جلد سوم نمبر (۴) ماہ رجب ۱۲۷۹ھ ہجری۔

مضمون	مضمون نگار
حفظ صحت	سید باقر علی خان بہادر
پانی اور ہوا کا بیان	مولف (سید حسین بلگرامی)
اردو معلا	مرزا قربان بیگ سالک
امام مہدی جعلی	مشتاق حسین
داستان نہم نیرنگ زمانہ	آغا مرزا بیگ
سلطنت اسلامیہ	سیّد مہدی علی

یہ رسالہ سرکاری دار الطبع میں شایع ہوا کرتا تھا۔ مضامین کا انتخاب نمونہ کے طور پر درج ہے :۔

"میرا گمان ہے کہ یہ زبان ابتدا ہی میں اچھی طرح مروج ہو جاتی مگر خاص لوگوں کی اس طرف توجہ نہ ہوئی فقط لشکری لوگ اس کے محتاج الیہ رہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ زبان اکبر کے زمانہ میں نکلی۔ بعض جہانگیر کے لشکر کو اس کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ فلر صاحب نے تاریخوں سے لے کر شاہ جہان کا زمانہ لکھا ہے۔ شکسپیر صاحب اور آلیٹ صاحب سکرنز نے اپنی اپنی تالیفات میں اکبر سے پہلے ثابت کیا ہے بعض یہ کہتے ہیں کہ اردو زبان عجموں کی نکالی ہوئی ہے یہ بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ اس لئے کہ لشکروں میں تنہا عجم ہی نہ تھے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ طریقہ عجمیوں نے نکالا۔ اپنی زبان میں عربی کی لفظ اور جملہ ملائی۔ اس صورت میں عجمی لوگ اس طریقے کے موجد ہو سکتے ہیں نہ زبان اردو کے" (اردو معلا۔ سالک)

"یہ تو معلوم ہو چکا کہ ابخروں کے ٹھنڈے ہو کر بھاپ کی شکل میں جانے سے

ابر پیدا ہوتا ہے جب تک انجرے کم کم اور آہستہ آہستہ جمتے رہتے ہیں۔ اس وقت تک ابر ہی ابر ہی پیدا ہوتا ہے مینہ نہیں برستا مگر جب آمد انجروں کی زیادہ ہوتی ہے اور سرعت کے ساتھ تہ پر تہ جمنے شروع ہوتی ہے اس وقت پانی کے ذرے جن سے یہ ابر مرکب ہے دوسرے سے مل مل کر بڑے قطرے بننے لگتے ہیں اور اپنے بوجھ سے زمین پر گرنے لگتے ہیں اور مینہ برسنے لگتا ہے ؛؛

(پانی اور ہوا کا بیان) (سید حسین بلگرامی)

تبصرہ:۔ اس دور کی نظم و نثر کا نمونہ پیش ہوچکا ہے اور کلام کا جو انداز بیان اور طرز ادا تھا اس کو بھی واضح کیا جاچکا ہے۔ اس دور میں سب سے اہم تغیر یہ ہوا کہ دکھنی زبان تحریر کے لئے بالکل معیوب سمجھی جانے لگی اور اس کے بجائے دہلی اور لکھنو کی زبان نظم و نثر میں استعمال ہونے لگی۔ استادان دہلی اور لکھنو کے اہل کمال کے یہاں جمع ہوجانے کے باعث عام طور سے اسلوب بیان میں فرق ہوگیا۔ زبان میں صفائی کے ساتھ ساتھ تکلف زیادہ ہوگیا۔ تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا جانے لگا۔ کلام میں مبالغہ ہونے لگا۔ الفاظ کے استعمال میں بھی تغیر ہوا۔ مثلاً بلبل کو سودا نے کہیں مذکر اور کہیں مونث باندھا ہے۔ لکھنو کے متاخرین یعنی آتش اور رند مذکر باندھتے ہیں[۱]۔ سودا کہتا ہے۔

سنے ہے مرغ چمن کا تو نالہ اے صیاد بہار آنے کی بلبل خبر لگا کہنے

آتش:۔

سیر چمن کو چلئے بلبل پکارتے ہیں

۱؎ مقدمہ گلشن ہند۔

رندؔ:۔

جانور کا جو ہوا شوق تو پالے بلبل

اہلِ دکن ایک زمانہ دراز تک اکثر مونث باندھتے ہیں، مثلاً، ولیؔ کہتے ہیں۔
میرے سخن کو گلشنِ معنی کا بوجھ گل عاشق ہوئی ہے بلبل رنگین بیان آج
مگر اس دور میں کبھی مذکر باندھتے ہیں اور کبھی مونث مثلاً خاموشؔ کہتے ہیں۔

بیٹھ اک جائے تو بس کر کے تصورِ گل کا
کیوں اُڑے پھرتی ہے ہر جھاڑ کی ڈالی بلبل

فیضؔ کہتے ہیں۔

رتبہ معراج دیتا ہے ہر اک گل جب کو
آشیاں تک بلبل اُڑ جاتی ہے بال و پر سمیت

خاموشؔ:۔
گل ہنسا تو ہنسا دیا کس نے رو با بلبل رولا دیا کس نے

دورِ سابق میں غزلوں میں تصوف کا رنگ زیادہ تھا حقایق اور معارف کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر اب عشق و عاشقی کی طرف طبیعتیں زیادہ مائل ہوئیں معشوقِ حقیقی سے سروکار نہ رہا۔ گو بعض شعراء مثلاً شاداںؔ فیضؔ اور خاموشؔ وغیرہ کی شاعری تصوف سے ہی مملو ہے مگر عام طور سے اس طرف رجحان باقی نہیں رہا۔

اس دور میں لوگ نثر کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے۔ دور سابق میں صرف تصوف اور فقہ کی کتابیں لکھی جاتی تھیں تو اب تاریخ، فلسفہ ریاضی، ہندسہ، ہیئت کیمیا، طبیعات سب کچھ نثر میں لکھا جانے لگا۔

اس زمانہ میں شمالی ہند میں ہنوز مقفیٰ عبارت کا دستور تھا۔ اگرچہ غالب نے اپنے خطوط سے جدید طرز کی ایجاد شروع کی تھی مگر عام طور سے اس کا رواج نہ تھا اس کے برخلاف دکن میں عام طور سے مقفیٰ عبارت کا قاعدہ متروک ہو چکا تھا۔

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انگریزی زبان سے فنون کی کتابوں کا ترجمہ ہونے لگا اور اس سے اردو کا سرمایہ زیادہ ہونے لگا۔ سنہ ۱۲۵۳ء میں اس قسم کی کتابیں طبع ہوئی ہیں اور سائنس کا ذخیرہ پہلے پہل اردو میں آیا گو کہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے بعد یہ کام شروع ہوا مگر سائنس کی کتابوں کا ترجمہ ہونا درحقیقت ایک کامیاب کوشش تھی۔

اس دور میں علمی رسالوں کی اجرائی سے اردو کی ترقی میں اضافہ ہوا اور بیش بہا مضامین عام فہم زبان میں استفادہ عام کے لئے رسالوں میں شائع ہونے لگے۔

طبی تعلیم نہ صرف اردو زبان میں ہونے لگی بلکہ اس کے متعلق ایک رسالہ بھی شائع ہونے لگا۔

غرض کہ اس پانچویں دور میں اُردو کو خاص ترقی ہوئی اور گویا سن رشد کے قریب پہنچ گئی۔ اب ہم اس دور کو ختم کرتے ہیں۔

چھٹا دور

از ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۶ھ

اب ہم زبان اردو کی ترقی کے اس دور میں پہنچ چکے ہیں جبکہ یہ زبان عالم شباب کے ابتدائی مراحل طے کرنے میں مصروف تھی۔ اس دور کے بڑے حصہ میں اعلیحضرت میر محبوب علی خان غفران مکان آصفجاہ سادس کی حکمرانی تھی اور ۱۳۲۹ھ میں ان کے انتقال کے بعد اعلیحضرت سلطان العلوم آصفجاہ سابع نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی مگر جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔

اس دور کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جبکہ سرکار آصفیہ کے دفاتر کی زبان مکمل طور پر فارسی کے بجائے اردو قرار دی گئی۔ دکن کی اس دور کی کشش مقناطیس نے اطراف ہند کے اساتذہ اردو کو اپنے دامن عاطفت میں کھینچ لیا اور حیدرآباد علم و فن کا مرکز بننے لگا۔

زبان اردو کو جو ترقی اس دور میں نصیب ہوئی اس کے اسباب مختلف ہیں مثلاً اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا۔ دوسرے بیرونِ ملک کے اردو کے باکمال شعراء اور مصنفین کی سرپرستی ہونا۔ تیسرے دکن کے باکمال شعراء کا اپنے کمال فن سے باغ اردو کی آبیاری کرنا۔ چوتھے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا تالیف و تصنیف ہونا

پانچویں دفتر علوم و فنون کا قیام اور سلسلۂ آصفیہ کا آغاز چھٹے اخبارات اور رسائل کی اجرائی ساتویں علمی انجمنوں کا قیام۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن کے باعث اُردو کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی۔

اُردو کا سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان قرار پانا:۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ کسی زبان کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ زبان اس ملک کی کاروباری زبان کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان بھی نہ ہو۔ چنانچہ انگریزی زبان ہی کو لیجئے اس کو اس وقت تک ترقی نصیب نہیں ہوئی جب تک کہ فرانسیسی زبان کے بجائے انگریزی کا تفوق نہ قائم ہوگیا۔ زبان اردو کی یہ خوش قسمتی تھی کہ سلطنت آصفیہ نے عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کی طرح اس کو اپنے دربار کی سرکاری زبان قرار دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ اولاً ۱۲۸۰ھ میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور اس وقت صرف اتنی اجازت دی گئی کہ نظماء عدالت کی رائے ہو تو وہ گواہوں یا اہل معاملہ سے اظہار اردو میں قلمبند کریں۔ اس کے بعد ۱۲۹۳ھ میں ایک قدم اور بڑھایا گیا اور نظماء عدالت کی رضامندی کی قید اٹھادی گئی اور یہ لازم کر دیا گیا کہ اُردو میں اظہار قلم بند ہوا کرے مگر اہل مقدمہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی درخواست خواہ اردو میں پیش کریں خواہ فارسی میں۔ عدالت کے ساتھ اسی زمانہ میں دفاتر مال اور بندوبست اردو میں کر دئے گئے۔ ۱۲۹۵ھ میں اس گشتی کے مطالب اور زیادہ وسیع کئے گئے اور حکم دیا گیا کہ فیصلوں میں بھی اظہارات بجنسہ اردو میں لکھے جائیں اور جب کبھی تمہید فیصلہ یا تجویز میں ان اظہارات اور عبارتوں پر استدلال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو بجنسہ وہی عبارت نقل کرنی چاہیئے جو مظہرین کی زبان سے اظہار میں لکھے گئے ہوں۔

سنہ ۱۳۰۱ھ میں جب دیکھا گیا کہ دفاتر میں دو عملی ہوگئی ہے اور امسلہ میں فارسی اور اُردو مخلوط ہو جاتی ہے اور کوئی دفتر فارسی میں مراسلت کرتا ہے اور کوئی اُردو میں کسی ناظم عدالت کا فیصلہ تمام تر اردو میں ہوتا ہے تو کسی کا فارسی اور اردو سے مخلوط۔ اس دو عملی کو دور کرنے اور نقائص کو مٹانے کے لئے ایک خاص گشتی سنہ ۱۳۰۱ھ[1] میں جاری ہوئی اور اس میں تفصیل کے ساتھ تمام امور کا اظہار کیا گیا اور اب تمام دفاتر مکمل طور سے اُردو میں منتقل ہو گئے۔

۲۔ بیرونِ سلطنت آصفیہ کے شعراء اور مصنفین کی سرپرستی

اس دور میں سلطنت آصفیہ نے اُردو کی سرپرستی اس طرح بھی فرمائی کہ ہندوستان کے مشہور شعراء اور مصنفین کو اپنے ملک میں طلب کر لیا یا ان کو ماہوار و منصب جاری فرما دی تاکہ یہ ارباب کمال اردو کے خزانہ کو مالا مال کرتے جائیں۔ اس زمرہ میں سب سے پہلے جہاں استاد فصیح الملک بلبل ہندوستان مرزا داغؔ دہلوی ہیں جو دربار رام پور کو خیر باد کہہ یہاں متوطن ہو جاتے ہیں۔

اعلیحضرت غفران مکان آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علی خان کی استادی کی عزت حاصل ہوئی اور خطاب فصیح الملک بلبل ہندوستان جہاں استاد سے بجا طور پر مفتخر و ممتاز کئے گئے۔ دو ہزار روپیہ ماہوار قرار پاتی ہے۔

داغ کے کلام کی سادگی اور عام مذاق میں اثر پیدا کرنے والی غزلیں ہندوستان میں عام طور پر مقبول ہوئیں اور حقیقت یہ ہے کہ سادگی میں ادائی کلام وہ مزا دے جاتا ہے

---

[1] جریدۂ غیر معمولی سرکار عالی مورخہ ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۳۰۱ھ

جو داغ اور صرف داغؔ کا حصہ ہے۔

شاہ نصیر کی طرح داغؔ بھی یہیں پیوند زمین ہو گئے۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ داغ نے یہاں بسر کیا۔ اس لئے میرا مضمون نامکمل ہو گا اگر کچھ نمونہ ان کے کلام کا پیش نہ کیا جائے۔

دل لے کے اس کی بزم میں جایا نہ جائیگا
یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا

دونوں دشمن ہیں بشر کے آسماں ہو یا زمیں
فتنہ گر بالائے سر ہے، تو ستمگر زیر پا

مجھ سا نہ دے زمانہ کو پروردگار دل
آشفتہ دل فریفتہ دل بے قرار دل

عرصہ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو
اور پھر ڈھونڈھتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغؔ نام نہیں

دی موذن نے شب وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

دست ہوس بڑھا کر کیوں مرتبہ گھٹایا
سمجھی نہ یہ زلیخا دامن ہے پارسا کا

مدت سے لگ رہی تھی لب بام ٹکٹکی
تھک تھک کے گر پڑی نگہ انتظار آج [1]

---

[1] دیوان داغ

داغ کی طرح امیر کو بھی حیدر آباد کی خاک کھینچ لائی۔ رام پور سے یہاں پہنچے لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا سے منہ پھیر لیا۔ قالب بے جان سپرد خاک ہو گیا۔ روح پاک نے فردوس بریں کا راستہ لیا۔

امیر کا اصلی مذاق صوفیانہ تھا۔ آپ کا کمال غزلوں اور قصیدوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے اردو شاعری میں نعت کا جس قدر مرتبہ آپ کے کلام کو حاصل ہے کسی کو میسر نہیں۔ عشق رسول میں ڈوبا ہوا آپ کا مسدس اپنا آپ نظیر ہے۔

آہوں سے سوز عشق مٹایا نہ جائے گا آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

وہ بیکس ہوں نہیں ہے کوئی میرے غمگساروں میں
فقط اک دل ہے سو وہ بھی تمہارے جاں نثاروں میں

حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا
لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا

دی گئی منصور کو سولی ادب کے ترک پر تھا انا الحق حق مگر اک حرف گستاخانہ تھا

مو باف کھل گیا ہے کسی گلعذار کا انچل لٹک رہا ہے عروس بہار کا

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں

لاش پر غربت یہ کہتی ہے امیر آئے تھے دنیا میں اسی دن کے لئے[1]

[1] دیوان امیر۔

سرشار

داغ اور امیر کی طرح اُردو کے مشہور ناولسٹ پنڈت رتن ناتھ سرشار پر بھی حیدرآباد کی کشش نے کام کیا۔ سرشار کا مدتوں یہاں قیام رہا۔ کئی سال تک رسالہ دبدبۂ آصفی[1] کی اڈیٹری کرتے رہے۔

پنڈت سرشار کی تصنیفات اردو کے بہترین ناول یا فسانے خیال کئے جاتے ہیں۔ مختلف طبقوں کی بول چال اور معاشرت کا دلچسپ خاکہ ہو بہو کھینچنا آپ ہی کا حصّہ تھا۔

اسی طرح ہندوستان کے زبردست انشاپرداز ناولسٹ مولوی عبدالحلیم شرر کی زندگی کا بہت بڑا حصہ حیدرآباد میں بسر ہوا۔ اردو ہی کی خدمت کے ضمن میں انہوں نے یہاں کے دائرۂ ملازمت میں بھی شرکت کی۔

ان اصحاب کے علاوہ ہندوستان کے مشہور یگانہ آفاق مرثیہ نویس انیس اور ان کے قابل جانشین ہر سال محرم میں آتے اور اپنے جاں سوز مرثیے سناتے رہے۔[2]

رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے مشہور مضمون نگار نواب محسن الملک مولوی میر مہدی علی۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین۔ مولوی چراغ علی المخاطب نواب اعظم یار جنگ اور مولانا نذیر احمد حیدرآباد سے وابستہ تھے اور مدتوں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں یہ مایۂ ناز بزرگ حیدرآباد میں اقامت گزیں رہے۔

شمس العلماء مولوی سیّد علی بلگرامی نے "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" کا

---

[1] رسالہ دبدبۂ آصفی مہاراجہ بہادر کی سرپرستی میں جاری ہوا تھا۔ [2] ایشیائی شاعری

یہیں ترجمہ کیا۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی اسی سرزمین میں عمر بسر کرتے رہے اور یہاں ہی انتقال فرمایا۔

علامہ شبلی نعمانی ایک زمانہ تک حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون رہے ان کی اکثر کتابیں مثلاً الغزالی۔ الکلام۔ علم الکلام۔ موازنہ انیس و دبیر وغیرہ یہیں عالم وجود میں آئیں۔ ان کی تقریباً تمام تصنیفات و تالیفات دولت آصفیہ کی علم پروری اور معارف نوازی کی مرہون منت اور ان کا بڑا حصہ سلسلہ آصفیہ میں داخل ہے۔

مولوی ظفر علی خان نے خیابان فارس اور معرکہ مذہب و سائنس وغیرہ کا یہیں ترجمہ کیا۔ مولوی عزیز مرزا نے سالہائے دراز یہاں زندگی بسر کی۔

نواب وقار نواز جنگ مولوی وحید الزمان نے احادیث کی کئی ایک کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مولوی محی الدین علی خان نے تاریخ الخلفاء وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ غرض ہندوستان کے ان مشہور و معروف مصنفین اور ممتاز انشا پردازوں کی زندگی اس طرح دکن میں بسر ہوئی تو کیا ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا جنوبی ہند کی اردو کے ساتھ کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا؟

ان کے علاوہ سلطنت آصفیہ نے بڑے بڑے اداروں کو گراں قدر امداد دی ہے مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ندوۃ العلماء دیوبند۔ اسلامیہ کالج لاہور وغیرہ۔

اعلیحضرت سلطان العلوم کے زمانہ میں ۱۳۳۶ھ تک جن ارباب علم کو ماہوار مقرر ہوئی یا سابقہ ماہوار میں اضافہ ہوا ان کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

مدیر پیسہ اخبار لاہور کو سالانہ ایک ہزار۔ تصانیف امیر خسرو کی طباعت کے لئے

پندرہ ہزار۔ شفقت علی خان شاہجہان پوری کو دو سو روپیہ صلہ تصنیف حبیب احمد خان صاحب کو تصنیف کتب کے صلہ میں پانچ سو۔ عبدالرؤف صاحب شوق کو مثنوی مرقع رحمت کے لئے پانچ سو روپیہ یکمشت اور پانسو جلدوں کی خریدی کا حکم۔ سیّد سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ کی بیوہ کے لئے پانسو کلدار۔ فرید احمد صاحب عباسی کو بصلہ تصنیف پانسو۔ بنگلور انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس کو دس ہزار سالانہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کو سالانہ چھ ہزار آمدنی کے لئے یکمست (الہ عثمانی ۱۹۱۱ء) ایک لاکھ اکھتر ہزار پانسو روپیہ۔

محب الحق صاحب بانکی پوری کو پانسو یکمشت اور پچاس روپیہ ماہوار۔ عبداللہ خان صاحب کی کتابوں کے لئے پانسو یکمشت۔ سیّد یٰسین علی صاحب مصنف تفسیر کو پچاس روپیہ ماہوار۔ سیّد محمد حسین صاحب اغلب موہانی کو تصنیفات کے صلہ میں پچاس ماہوار۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کو پانسو ماہوار ظفر علی خان کو چھ سو اور ان کے لڑکے اختر علی کو ماہانہ دو سو روپیہ عبداللہ خان صاحب کمنڈوی کو دو سو روپیہ ماہوار۔ انجمن ترقی اردو کو وضع اصطلاحات کے لئے سالانہ تیس ہزار روپیہ کی امداد دی گئی۔[1]

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ اس دور میں کس طرح شعرا اور مصنفین کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی گئی ہے۔

(۳) اس عہد کے شعراء اور ان کا کلام :- اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے۔

---

[1] عہد عثمانی میں اردو کی ترقی

کہ سلاطین عادل شاہی اور قطب شاہی کی طرح اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان نے بھی اردو میں طبع آزمائی فرمائی۔ آپ کا تخلص آصف تھا حضرت داغ کو آپ کی استادی کا فخر حاصل تھا۔

آپ کو جملہ اصناف نظم پر قدرت حاصل تھی۔ علاوہ غزلیات وغیرہ کے "تعلیم فوج" "اصلاح فوج وغیرہ کے متعلق آپ کی مختلف اور متعدد اخلاقی نظمیں ہیں رعایا کے مختلف فرقوں کے سپاس ناموں کے جواب میں آپ نے اپنی سالگرہ کے موقع پر نہایت عمدہ و بے مثل نظمیں اکثر و بیشتر سنائی ہیں۔ ذیل میں آپ کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

طاعت کے بعد جو ہے اطاعت کا پائے بند[1]
دنیا و دین میں وہ نہ کبھی ہوگا شرمسار

ماتحت مانے حاکم اعلیٰ کے حکم کو — یوں اہل روزگار کی ہو طرز روزگار
مالک سے کام رکھے نہ رکھے کسی سے کام — اس کا اسی میں نفع اسی میں ہے افتخار
لغزش نہ ہو وگرنہ گرے گا وہ سر کے بل — تھامے رہے عنان اطاعت کو استوار
اس کو بھی ہو یقین عنایت اسی طرح — سرکار کیے ہے جیسے سپاہی کا اعتبار

رہیں ساز و سامان سے اپنے درست — جو ہو تیغ بجلی تو گھوڑا پری
کرے مشق اس فن کی جس فن میں ہو — یہی آدمی کی ہے دانش وری
ہنر ور سے ہے سلطنت کا نمود — ہنر ہی سے ہوتی ہے نام آوری

---

[1] تزک محبوبیہ جلد اول

بنایا حکیموں نے تھا آئینہ ۔۔۔ ہوی شہرت صنع اسکندری
جو ہوں گے قواعد میں چالاک و چست ۔۔۔ تو پھر کیا نہ ہو گی ہنر پروری
تمہاری طرف سے وفاداریاں ۔۔۔ ہماری طرف سے کرم گستری

دعا یہ ہے آصف کی اس فوج پر
رہے سایۂ دامن حیدری

طلبہ کو علم کے متعلق جو توجہ دلائی ہے اس کے بعض شعر بھی ملاحظہ ہوں :۔

علم کی قدر کرو قدر کرو قدر کرو ۔۔۔ تم کو اللہ نے بخشی ہے اگر طبع سلیم
سمجھو سمجھو وہ نکات اور وہ اسرار رموز ۔۔۔ دیکھو دیکھو وہ کتب جو ہیں جدید اور قدیم
علم ہے اس کی دوا اور دوا بھی اکسیر ۔۔۔ کہ جہالت بھی ہے منجملہ امراض سقیم
طالب علم ذکی اور ہو استاد شفیق ۔۔۔ کیوں پسندیدہ نہ ہو ایسی تعلم تعلیم
فہم و دانش کی ترقی کا یہی باعث ہے ۔۔۔ علم کی وجہ سے تھے حضرت لقمان بھی حکیم
قابل صحبت شاہان و سلاطیں ہے وہی ۔۔۔ عزت اس کی ہے جو کہلائے زمانہ میں فہیم
دین و دنیا میں جو پھیلی تو اسی کی خوشبو ۔۔۔ مشک اذفر کی نہ یہ عنبر سارا کی شمیم
ایسی دولت کے لئے کوشش و محنت ہے ضرور ۔۔۔ گرچہ تقدیر عطا جس کو کرے رب کریم
یہ جو آصف نے کہا غور سے اس کو سمجھو ۔۔۔ علم وہ شئی ہے کہ اللہ کا ہے نام علیم[1]

ایک نظم کا مطلع ہے ۔

مجھ کو مبارک اور میرے دوستوں کو بھی ۔۔۔ سامان جشن عیش ہے فرحت کے واسطے

---

[1] نزک محبوبیہ

اسی نظم کا آخری شعر خصوصیت سے قابل ملاحظہ ہے۔

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

اخلاقی نظموں کی طرح آپ کی عاشقانہ اور دلکش غزلیات بھی قابل داد ہیں۔ اشعار کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ لطف زبان۔ ترکیب کی خوبی فصاحت مضمون۔ محاورات روزمرہ ہر پہلو سے لائق صاد ہیں داغ ہی کی طرز میں آپ غزل کہتے رہے اور اس میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ آپ کی غزل استاد کے ٹکر کی غزل ہوتی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر کلام الملوک ملوک الکلام ہوتا ہے۔

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہاتھ
واہ واہ دزد حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے سمیٹے دامن — جب میرا دست ہوس قبر سے باہر نکلا
مل گئیں خاک میں کیا میری وفائیں ظالم — حرف انکار زباں سے ترے کیونکر نکلا
واہ کیا لطف ہوا وصل کی شب ان کے قریب — غیر سے وعدہ کا کاغذ سر بستر نکلا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصف
وہ شاہ حسن سہی شہریار ہم بھی ہیں

واہ اے شان کریمی ترے صدقے قرباں — جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا
لیجئے غیر سے دو دن بھی نباہی نہ گئی — آپ کے ذہن میں آصف تو وفادار نہ تھا

لائے تھے وہ رقیبوں کو میرے مزار پر　　اُڑ کر غبار سامنے دیوار ہو گیا

لو اور سنو کہتے ہیں وہ دیکھ کے مجھ کو　　یہ شخص بلا شبہ ہے دیوانہ کسی کا
آصفؔ کا ہے یہ قول بسیں صاحب غیرت　　احسان نہ لے ہمت مردانہ کسی کا

وصل میں تلخ بھی دشنام مزا دیتے ہیں　　کوسنے والوں کو ہم دل سے دعا دیتے ہیں
ایسے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نہ کریں　　مرد جو کہتے ہیں وہ کر کے دکھا دیتے ہیں
ان حسینوں سے کوئی خون کا دعویٰ نہ کرے　　خوں بہا دیتے نہیں خون بہا دیتے ہیں

رہے ہر دم میں ہر دم یاد تیری　　جدھر دیکھوں ادھر بس تو ہی تو ہو
مقابل یوں ملے جب حسن کی داد　　ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

یہ دل آشنا اور وہ نا آشنا ہے　　بھلوں سے بھلا اور بروں سے برا ہے
نہیں ہے اگر تو ہمارا تو کیا ہے　　زمانہ میں کوئی کس کا ہوا ہے
پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزہ ہے　　یہ شیشہ دھرا ہے یہ ساغر دھرا ہے
کریں بت کدہ سے عبث قصد کعبہ　　یہاں بھی خدا ہے وہاں بھی خدا ہے
کہاں جائے انسان ان سے نکل کر　　زمیں فتنہ گر ہے فلک فتنہ زا ہے
یہ کافر حسیں اک جگہ جمع ہوں گے　　جہنم میں بھی اک طرح کا مزہ ہے
بہت دور ہے منزل دوست اے دل　　جو یہ طے ہوئی پھر خدا ہی خدا ہے

ہمارے بھی ہے امتحاں میں یہ آصفؔ
لگانا ہی دل کا سراسر خطا ہے

محشر میں کون دوست ہو مجھ داد خواہ کا　　دل اپنی راہ کا ہے جگر اپنی راہ کا
پانی بہا سکے نہ زمیں جذب کر سکے　　قاتل چھپیگا خون نہ مجھ بے گناہ کا
جب آئے وہ خیال میں آئے نہ خواب میں　　دشوار نازکی سے ہوا پھیر راہ کا
یہ ہاتھ سے چرائے تو وہ آنکھ سے چرائے
دزد حنا سے چور ہے بڑھ کر نگاہ کا

چھٹے دور کی نظم:- جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے کہ اس دور میں ۱۳۲۹ھ تک مرحوم اعلیحضرت غفران مکان کی حکمرانی رہی۔ اور ۱۳۲۹ھ میں اعلیحضرت سلطان العلوم نے عنان حکومت کو سنبھالی۔

اس دور کے شعراء کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں سے ایک حصّہ تو ایسے شعراء کا ہے جن کا انتقال ۱۳۲۹ھ یا اس سے قبل ہوا۔ اور دوسرے شعراء وہ ہیں جنہوں نے یا تو ۱۳۲۹ھ کے بعد انتقال کیا ہے۔ یا وہ ساتویں دور میں بھی زندہ ہیں ہم دونوں کی تفصیل علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔

شعرائے عہد محبوبی:- اولاً ان شعراء کا کلام پیش کیا جاتا ہے جن کا انتقال ۱۳۲۹ھ کے قبل یعنی مرحوم اعلیحضرت غفران مکان کے عہد میں ہوا۔ یا ان کی زندگی کا بڑا حصّہ اس زمانہ میں گزرا ہے۔

اقبال:- معین الدین نام اقبال تخلص اور اقبال یار جنگ خطاب تھا۔ ایک عرصہ تک کمشنر انعام کے معزز عہدہ سے ممتاز رہے۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع اور اعلیحضرت سلطان العلوم کی اتالیقی کا فخر بھی حاصل ہوا تھا

علمی قابلیت مسلّمہ تھی۔ شعروسخن کا خاص مذاق تھا۔ ۱۳۲۱ھ میں انتقال ہوا۔

دیکے جان لعل لب یار کا بوسہ لیں گے — اتنی قیمت پہ بھی سودا یہ بہ مشکل ٹھہرا
باغ جنت میں بڑے لطف سے کٹ جائیگی — اپنا معشوق جو وہ حور شمائل ٹھہرا
ناتواں قیس میں اب طاقت رفتار نہیں — اپنا ناقہ کہیں اسے صاحب محمل ٹھہرا
بڑھ گئی حد سے شب وصل میں گستاخی شوق — روکا ہر چند ادب نے نہ مرا دل ٹھہرا
اشک آنکھوں سے جو بہ جاتے تو طوفاں ہوتا — جوش سیلاب مگر تا لبِ ساحل ٹھہرا

اپنا دل مشق صفا سے ہو منور آئینہ — اون کا عکس رخ ہوا آئینہ کے اندر آئینہ
دیکھے گر ساق بلورین کو نگاہ صاف سے — بالیقیں ہو جائے خود حیراں و ششدر آئینہ
بوسہ جب اقبال نے مانگا تو اک انداز سے — ہنسکے فرمانے لگے ہوگا مکدر آئینہ

حیف یاروں نے پس مرگ رفاقت چھوڑی — ساتھ ہیں اپنے فقط حسرت و ارماں اب تک
سرکشوں کے لئے راحت نہیں دنیا میں کبھی — نہ تھا ایک جگہ گنبدِ گرداں اب تک

ہے دم مرگ بھی دل میں ترے الفت کا خیال
گھر میں مہمان کے موجود ہے مہماں اب تک[1]

باقی:۔ گردھاری پرشاد المتخلص بہ باقی۔ راجہ محبوب نواز ونت بہادر خطاب تھا۔ خاندانی امیر تھے شاعری کا خاص مذاق تھا۔ فیض کے شاگرد تھے[2] اردو اور فارسی کلام شائع ہو چکا ہے۔ اردو دیوان جو "بقائے باقی" کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ مختصر ہے مگر کلام کی خوبی کے باعث ممتاز ہے۔ دیوان کے

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم۔ [2] تزک محبوبیہ و تذکرۂ شعرائے دکن ملکاپوری۔

علاوہ آپ کے کئی تصانیف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :-

توشۂ آخرت - کیشو نامہ - لغت افضل التصحیح - قصائد باقی کلیات، یادگار باقی - دیوان بقائے باقی - مثنوی صنائع البدائع - بہار عام - پرنس نامہ - مکتوبات منظوم ضرب الامثال - آئینۂ سخن - پیرایۂ عروض - کنوز التواریخ - تنبیہات باقی وغیرہ -

۱۳۱۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے شستگی سلاست، برجستگی، ان کے کلام کے جوہر ہیں، ان کے کلام میں لکھنو کے شعراء و متاخرین کا رنگ نظر آتا ہے - محاورہ اور روز مرہ کو بہت خوبی سے ادا کیا ہے -

کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

آگ دیتا ہوں جگر کو دل سے　　حق ہمسایہ ادا کرتا ہوں

آہ سوزاں ہو اگر شعلہ فگن پانی میں　　آگ کی طرح سے پیدا ہو جلن پانی میں

نئے صدمے اسے دیتے رہیں گے　　ابھی دل کا کریں گے امتحان ہم

بوسے اوس لب کے لیا کرتا ہوں　　مرض دل کی دوا کرتا ہوں

ایک گل میں بھی نہیں بوئے وفا باقی　　ان دنوں گلشن عالم کی ہوا بدلی ہے

گوشۂ عزلت میں رہتا ہوں میں عنقا کی طرح　　خلق میں شہرہ ہے گمنامی سے میرے نام کا

اشہر :- مرزا غلام سجاد نام اشہر تخلص، ان کے اجداد قطب شاہی عہد میں طہران سے آئے تھے، آصفی عہد میں بھی جاگیر سے سرفراز کیئے گئے - اشہر

کی پیدائش حیدر آباد میں ۱۲۵۶ھ میں ہوئی۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق گھر پر عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ اوائل عمر سے شاعری کا شوق ہوا، منشی تفضل حسین عطا کے شاگرد ہوئے، عطا حضرت فیض کے ہم عصر اور بلند پایہ شاعر تھے۔ اشہر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے۔ جملہ اصناف سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے تاریخ گوئی میں بھی مہارت تھی۔ مرثیہ گوئی کی خاصی مشق تھی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہوں کشتۂ رفتار کسی آفت جاں کا ۔۔۔ دینا مرے لاشہ کو کفن آب رواں کا
اس ماہ کی فرقت نے کیا ہے مرا دل چاک ۔۔۔ احباب کفن دیں مرے لاشہ کو کتاں کا
رہنے دے مجھے کوچۂ دلدار میں واعظ ۔۔۔ مشتاق ہیں حوروں کا ہوں نے باغ جناں کا
سینہ پہ لحد میں بھی کئی من کا ہے پتھر ۔۔۔ آرام پس از مرگ بھی قسمت میں کہاں کا

پھر فصل بہار آئی ہے اے بلبل شیدا ۔۔۔ پھر لطف ہے اب نوحہ و فریاد و فغاں کا
ابرو پہ نہ بل آئے اگر دل پہ لگے زخم ۔۔۔ تیر و تبر و خنجر و شمشیر و سناں کا
وہ سو گئے جا کر لحد تنگ میں آخر ۔۔۔ شکوہ جو کیا کرتے تھے تنگئ مکاں کا
دل نے مجھے رسوائے جہاں کر دیا کمبخت ۔۔۔ بیٹھا میرے پہلو میں تھا دشمن یہ کہاں کا
جنت میں پہنچتے ہی جواں ہو گئے اشہر ۔۔۔ اللہ رے تشوق تمھیں حوران جناں کا

مرثیہ کا کچھ نمونہ یہ ہے:۔

سجادہ سے ابھی نہ اُٹھے تھے شہ امم ۔۔۔ مشرق سے مہر کا چمکنے لگا علم
فرمایا غازیوں سے یہ شہ نے بصد حشم ۔۔۔ کمریں کسیں مجاہد راہ خدا بہم
مشتاق جنگ اسلحہ تن پر سنوار لیں ۔۔۔ غافل بھی کوئی ہو تو صدا دیں پکار لیں

جس وقت ہو چکا علم پاک جلوہ گر — گردن اٹھا کے فوج پہ حضرت نے کی نظر
دیکھا کہ دست بستہ جوانان پر جگر — باندھے سلاح جنگ کھڑے ہیں ادھر ادھر
اپنے مقام خاص پہ حق کا ولی نہیں — موجود ساری فوج ہے لیکن علی نہیں[1]
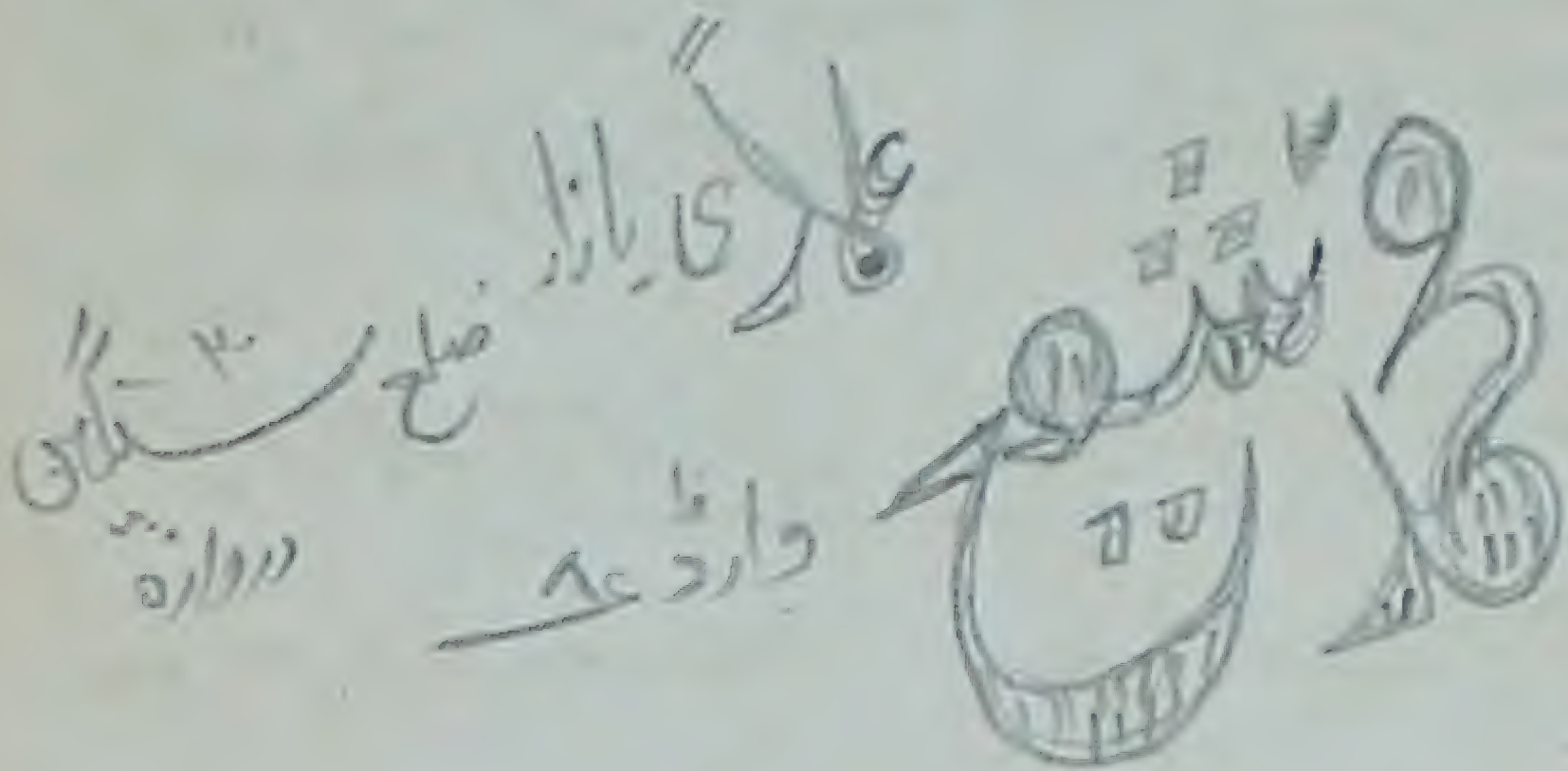
---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۱۲۷ تا ۱۳۲)

پاسؔ[۱]:- محمد حفیظ الدین نام پاسؔ تخلص، حضرت فیضؔ کے شاگرد تھے، سرکار عالی کے سلک ملازمت میں شامل تھے۔ تحصیلداری کی خدمت کے بعد وظیفہ پر علیحدہ ہوئے، اپنے وقت کے بہت اچھے شاعر تھے استاد کے رنگ میں طبع آزمائی کرتے۔ مطالب سے زیادہ الفاظ اور طرز ادا پر زور دیتے تھے۔ تشبیہ اور استعارہ کو شاعری کی جان قرار دیتے ہیں، بڑے پر گو شاعر تھے۔ سنہ ۱۳۳۱ھ میں انتقال ہوا۔

جنت میں کب نصیب ہیں دنیا کی لذتیں ۔۔۔ زاہد کی بندگی کو ہمارا اسلام ہے

اے پاسؔ علم شعر تو دشوار ہے مگر ۔۔۔ موزوں طبیعتوں میں ہمارا بھی نام ہے

ہے دل میں بے شمار غم و حسرت و الم ۔۔۔ اس مختصر مکان میں کیا اژدہام ہے
دہاں قید ایک دل تھا یہاں سینکڑوں پھنسے ۔۔۔ زلفوں سے بڑھ کے حضرت ولعظ کا دام ہے

اس مہر وش کے حسن نے وھبّہ لگا دیا ۔۔۔ جاتا ہے داغ بھی لیکن رخسار ماہ سے
کشتہ کیا نگاہ نے آنکھوں کے سامنے ۔۔۔ ثابت ہوا ہے قتل مرا دو گواہ سے
ہم مثل نقش پا جو زمیں پر گرے تو کیا ۔۔۔ وہ دیکھتے نہیں کبھی نیچی نگاہ سے
بدلی کو دیکھتے ہی بدل جائے گا مزاج ۔۔۔ کب تک بچیں گے حضرت زاہد گناہ سے

قتیل تیغ تبسم تو ہم ہوئے لیکن ۔۔۔ کسی نے ہنس کے نہ پوچھا کہ سر یہ کس کا ہے[۲]

---

[۱] تزک محبوبیہ

[۲] تزک محبوبیہ جلد دوم

جوشؔ[1] :- حکیم وزیر علی جوش تخلص اور سلطان الحکماء خطاب تھا۔ جس طرح طب میں ماہر تھے اسی طرح شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ شہید دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا دیوان اور ایک مثنوی شائع ہوئی ہے ۱۳۲۷ھ میں انتقال ہوا۔

میں ہوں مدت سے آشنا تیرا　　جان و دل سے ہوں مبتلا تیرا
ہاتھ پائی ہوئی کسی سے مگر　　چاک ہے دامن قبا تیرا
مجھ کو دیتا ہے گالیاں ناحق　　سچ تو کہہ کیا برا کیا تیرا
تو نے تو اک بار بھی نہ یاد کیا　　جوش بھرتا ہے دم سدا تیرا

غیروں پہ کرو لطف و عطا اور زیادہ　　یہاں اوس کے عوض ہم پہ جفا اور زیادہ
ضد اوس کی سمجھتے تھے لڑکپن کا ہے باعث　　وہ شوخ جوانی میں ہوا اور زیادہ
سمجھا تھا تسلی تیرے نظارہ سے ہوگی　　دیکھے سے ہوا شوق مرا اور زیادہ
میں نے جو وفا اپنی بیاں کی تو وہ بولا　　اسے جوشؔ نہ حق اپنا جتا اور زیادہ

خرمؔ :- سیتل پرشاد نام اور خرم تخلص تھا۔ کایستہ سکینہ قوم سے تھے۔ آپ کے اجداد کرامانک پور سے آئے تھے۔ ۱۲۳۸ھ میں ولادت ہوئی۔ فارسی میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ حضرت فیض کے شاگرد تھے۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۳۰۰ھ کے اوائل میں انتقال ہوا۔

جس کو دیکھو آشنا ہے دولت و اقبال کا　　بیکسی میں کون ساتھی ہے کسی کے حال کا

---

[1] تزک محبوبیہ۔

میں شرابی ہوں لب میگوں کا بوسہ دیجئے | کیا میں افیون ہوں جو دیتے ہو بوسہ خال کا
میں تو سر دیدیا دل دیدیا اور جان دی | تم بھی کچھ دیدو تصدق حسن کے اقبال کا

مجنوں چلا گیا یونہی لیلے کے شہر تک | حال فراق کہتا ہوا سار بان سے

قبر میں بھی لخلخہ ہے یار کا | خاک پتھر دوں فرشتوں کو جواب

بگولہ میری مٹی کا اوڑا جاتا ہے گردوں تک
کہ بعد مرگ بھی مجھ کو تلاش نام دلبر ہے

خجالت سے ہوا خورشید کا رخ زرد اے خرم | لگایا اس بت مہوش نے جب ماتھے پہ کوکو

چلاتے کیوں ہو مجھ پر آپ ہر دم تیغ ابرو کو
نہ ماریں ناتواں پر لٹ پلیٹیں اپنے گیسو کو

نہ دل دیجئے گا غیروں کو بہت پچتاؤ گے پیارے
یہ بھیے پر کی چتریاں ہیں یہ شکر کے ٹکوڑے ہیں[1]

رنج:- میر محمد علی المتخلص بہ رنج[2]۔ میر عالم بہادر کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ حضرت داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ عربی فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ سالار جنگ ثانی

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم (دفتر ۷ صفحہ ۵۰) [2] تزک محبوبیہ دیادگار ضیغم

وزیر اعظم کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے

کرتے ہیں اب وہ غم مرے غم کا　　شکر پروردگار عالم کا
دل نے بھی مجھ سے بے وفائی کی　　کیا کریں کوئی ایسے ہمدم کا
جس کو حب ابو تراب ہے رنج　　خوف اس کو نہیں جہنم کا

ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہے ہم کو　　جدائی کسی کی لڑکپن کسی کا
مجھے اپنے رونے کا رونا یہی ہے　　کہیں تر نہ ہو جائے دامن کسی کا

عیش کے لطف میسر مجھے اس دن ہوتے　　دو نو پہلو میں مرے دو بت کمسن ہوتے

راحت و آرام دنیا میں کہاں　　قید خانہ ہے یہ مومن کے لئے

کوچۂ یار کی ہے وہ عظمت　　بادشاہوں نے بھی گدائی کی

دل اور جگر دونوں تڑپے جو شب فرقت
کچھ اس کو سنبھالا ہے کچھ اس کو سنبھالا ہے[1]

رمز:۔ بہاری لال المتخلص بہ رمز۔ ان کے اجداد دہلی سے آئے تھے۔ رمز کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی۔ حضرت فیض سے تلمذ حاصل تھا۔ فیض کے انتقال کے بعد مجذوب ہو گئے۔ مگر پھر ایک زمانہ آیا کہ حالت جذب ختم ہو گئی۔ کیونکہ آپ نے چھیاسٹھ سال کی عمر میں اپنے استاد فیض کے حالات

---

[1] دیوان رنج۔

نظم بند کئے تھے۔ ۱۳۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ تزک علی شاہ تزکی نے ان کے انتقال کے متعلق لکھا ہے کہ فیض کے عرس میں مشاعرہ ہو رہا تھا اور رمز اپنا کلام سنا رہے تھے جب ذیل کا شعر پڑھا گیا اس وقت رمز کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ؎

چو دل شد مستقل کن ہر چہ خواہی — کنوں گویم چہ رمز ایں کن کہ آں کن

رمز اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کلیات طبع نہیں ہوا ہے۔ سات ہزار سے زیادہ شعر ان کے طبع زاد ہیں۔ کلام سے واضح ہوگا کہ ان میں بے ساختگی ہے۔ تصنع اور آورد نہیں ہے۔ کہتے ہیں بعض مرتبہ ایک رات میں سو سو شعر موزوں کر دیتے تھے۔

عاشق نہیں دنیا میں کسی رشک چمن کا — گل خوردہ ہوں میں عارضِ سبزانِ دکن کا

جواہر ہیں نکلے گا یہ فسانہ عشق کا میرے — چھپے گا بعد میرے قصہ بن کر لعل و گوہر کا

خلاقِ لامکاں میرے دل میں مکیں ہوا — بیت الحزن مقابل عرشِ بریں ہوا

ہیں جذب میں اور حال ہے مستانہ ہمارا — لبریز مئے عشق سے ہے پیمانہ ہمارا

پھری آنکھ ہم سے جب اے یار تیری — تو چشمک زدن میں گیا پھر زمانہ
تری بے وفائی سنے کی یہ نصیحت — کسی سے نہ زنہار دل کو لگانا

ہے شام و سحر یوں مجھے تقدیر سے جھگڑا
جیسا کہ ہو دیوانے کو زنجیر سے جھگڑا

یار تو محفل سے اٹھ کر کیا گیا — شمع کے اوپر اندھیرا چھا گیا

شعلہ:- میر[1] کاظم علی خاں شعلہ۔رجب ۱۲۵۲ھ میں آپ نے حیدرآباد میں ولادت پائی۔مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔انگریزی میں بھی مہارت تھی۔اپنے والد میر احمد علی خاں شہید سے ہی تلمذ حاصل تھا۔شہید مہاراجہ چندولال کے زمانہ میں امیرالشعراء سے ملقب ہوئے تھے۔

شعلہ کا کلام فصاحت و بلاغت اور لفظی و معنوی صنائع اور بدائع سے مرصع ہوتا تھا۔سرکار عالی کی سلک ملازمت میں داخل تھے عدالت فوجداری سے تعلق تھا۔۱۳۰۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا آپ کے دو فرزند تھے سید نوازش علی لمعہ اور سید نادر علی رعد جن کا حال آگے آتا ہے۔

---

[1] تذکرۂ شعرائے دکن ملکاپوری۔تزک محبوبیہ۔یادگار ضیغم

سا گر وصل بھی ہو جاتا تو اک بار تو کیا ہوتا
دامن مجھے قاتل کا دامان قضا ہوتا

وہ شوق شہادت ہے سو بار اگر مرتا
قاتل ہی کی جانب کو لاشہ بھی پھرا ہوتا

کیوں رشتہ محبت کا توڑا ہے عبث ظالم
یوں قتل کیا ہوتا کچھ تسمہ لگا ہوتا

پائی نہ شہادت جب دعوی ہے دیت کا کب
گر خون بہا ہوتا تب خون بہا ہوتا

اے ابر کرم گر تو رحمت سے برس جاتا
یہ مشت غبار اپنا ہرگز نہ اڑا ہوتا

سننے کہ نہ سنتے وہ کہنا تھا ہمیں لازم
آتے کہ نہ آتے وہ شکوہ تو کیا ہوتا

اس شعلہ بھبوکہ کی شب کو جو کہیں زلفیں
سورہ کو دخان کی دم اے شعلہ کیا ہوتا

ہوس ہیں بوسۂ لب کی اگر مروں گا میں
تو بعد مرگ رہے گا کھلا کفن میں دہن

جو شب کو چہرہ میرے رشک ماہ کا چمکا
چھپایا ماہ نے اپنا دہن گہن میں دہن

زبان خمسہ نظامی کی ہو گئی شعلہ
ہوا جو بار مرا وصف پنجتن میں دہن

سنگدل میرے گل اندام کو کہتے ہیں جو لوگ
ان کے ہو جائیں زبان اور دہن پتھر کے

شایق:- میر اعظم علی نام اور شایق تخلص تھا۔ حیدرآباد کے امیر اور مولویانہ گھرانے سے تھے۔ عمدۃ العلماء نواب محبوب نواز الدولہ کے نواسے تھے۔[1] ایک عرصہ تک عدالت دار القضاۃ کے ناظم رہے۔ عربی اور فارسی میں ید طولی رکھتے تھے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کا پورا دیوان لغت سے معمور اور عشق النبی میں ڈوبا ہوا ہے۔ عام طور سے آپ کی نعتیہ غزلیں مقبول تھیں۔ عموماً نعت خوان

---

[1] تزک محبوبیہ

آپ ہی کا کلام پڑھتے تھے۔ آپ نے ٹھمریوں میں بھی نعت کہی ہے۔
مائل سے آپ کو تلمذ تھا۔ ۱۳۱۵ھ میں انتقال ہوا۔ حیدر آباد میں مدفون ہیں
کلام کا نمونہ یہ ہے :-

آشنائی کا تو اس عہد میں دیکھا ہے یہ رنگ
منہ پہ ہے صبح وطن شام غریباں دل میں
وہ تو اک آپ کا دیوانہ ہے بھولا بھالا
آپ کیا سمجھیں ہیں شایق کو میری جاں دل میں

زلف کس سے دیکھی بھالی جائے گی — ہم سے یہ ناگن نہ پالی جائے گی
اک نہ اک دن ہو گا ظالم بھی خراب — آہ مظلوموں کی خالی جائے گی
حسن کی دولت پہ اتنا خوش نہ ہو — بات سچ ہے آنے والی جائے گی
شایق اتنی فکر کیوں ہے عمر کی — چیز جو ہے جانے والی جائے گی

محبت بڑھتے بڑھتے عشق ہو جائے — یہی دانہ بنے خرمن خدا کا

دیکھ کر طاق حرم تھام کے دم بیٹھ گیا — غم ابروئے احبب قبلۂ من یاد آیا

ہے درد کبھی آہ و فغاں اور کبھی نالا — اے ہجر نبی ان سے پڑا ہے مجھے پالا

سازو حدت آئینہ بنے لگا سامنے — نور احمد حبیب مرے دل میں چمکتا جائیگا

نہ کیوں بسمل ہو ہر سر تیغ ابروئے محمد کا — لیا ہے پہلے بسم اللہ کہہ کر درس ابجد کا

دعا شایق کی ہو مقبول بہر پنجتن یا رب — مدینے میں بنوں جا کر مجاور پاک مرقد کا

ہوں وہ دکھنی کہ دکن ناز سے یہ کہتا ہے — کرسی ہند پہ کوئی ترا بازو نہ ہوا ہوا

دل مرا تو نے لیا ہے مجھے دے دل اپنا — فیصلہ یوں ہو تو کچھ حاجت ضامن ہی نہیں

سوئے طیبہ جو چلے راہ حرم بھول گئے — دیکھ کر تری گلی باغ ارم بھول گئے

اے لباس زہد و تقوی آخری تسلیم ہے — ان گناہوں سے ہماری خوب عریانی ہوئی

مرمٹوں اس طرح اے شایق غم شبیر میں
بے نشانی خود نشاں بن جائے نام ایسا تو ہو[1]

فیاض:- محمد فیاض الدین نام فیاض تخلص، مشرف جنگ خطاب۔ امرائے دربار آصفی سے تھے۔ رفیض سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کو فطری طور سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے اور بہت ساروں نے آپ کی شاگردی کی۔ صاحب تصنیف تھے۔ ۱۳۲۶ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے فرزند محمد عزیز الدین خان عزیز کا ذکر آگے آتا ہے۔ فیاض کا کلام سادہ اور انداز بیان دلچسپ، نزاکت تخیل بھی قابلِ داد ہے۔[2]

نہیں ہے جب تمھارے کام کا دل — تو میرے سر پہ دے مارو مرا دل

---

[1] دیوان شایق مطبوعہ   [2] تزک محبوبیہ

تصور ہر گھڑی رہتا ہے تیرا — کبھی خالی نہیں رہتا مرا دل
عجب عالم ہے قاتل کی گلی میں — پڑے ہیں جا بجا سر جا بجا دل
نئی بیداد وہ کرتے ہیں ہر دم — کہاں سے لاؤں میں ہر دم نیا دل
نہیں وزد حنا مٹھی تو کھولو — مرا دل ہے مرا دل ہے مرا دل
کہاں دبتے ہیں دل لے کر کسی کا — مجھے معلوم ہے سرکار کا دل

جیتا نہیں ہے یاں کوئی زخمی کٹار کا — مارا ہوا ہوں میں بھی تو مژگان یار کا
ناقدر دانیوں سے زمانے کے آج کل — لیتا نہیں ہے نام کوئی روزگار کا
ہوتا نہیں ہے بیکسی میں کہاں کوئی آشنا — بیگانہ خود ہے سبزہ بھی اپنے مزار کا
اک جام اور دے کہ چڑھا جاؤں ساقیا — آتا چلا ہے وقت پھر اب کچھ اتار کا

شوکت:۔ غلام رسول نام اور شوکت تخلص۔ ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام کی خوبیوں نے آپ کے دل پر اثر کیا اسلام سے مشرف ہوئے۔ علمی قابلیّت بہت اچھی تھی۔ شعلہ سے تلمذ رکھتے تھے۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے۔ کلام میں دلچسپی اور اثر ہے۔

دوپٹہ گر ملے اس گلبدن کا — نزدہ کیوں کریں اپنے کفن کا
دل مضطر سے میرے ڈر تو یہ ہے — نشاں خالی نہ ہو ناوک فگن کا
آگاہ مجھے کر دے تو اسرار نہاں سے — راز ایک نہ پوشیدہ رہے کون و مکاں کا
کونین سے کھویا ہے مجھے عشق بتاں نے — افسوس رہا میں نہ یہاں کا نہ وہاں کا
شوکت ہے تو کس فکر میں کر یاد الٰہی — دم بھر کا بھروسہ نہیں اس جسم میں جاں کا

اعلیٰ بنتے ہیں اسفل بنے ہیں اعلیٰ — بیداد ہو رہے ہیں شاہ زمن زمن ہیں
معشوق بے وفا ہیں اے نل تو ہوش میں آ — کیوں جان کھو رہا ہے ذکرِ دمن دمن ہیں

جھگڑا ہو صاف کیجئے اقرارِ وصل کا — فتنہ ہر اک طرح کا تمھاری نہیں ہے
دیکھا جسے اوٹھا کے نظر بے خبر کیا — جادو بھرا ہوا نگہ نازنین میں ہے

آئینہ ہے آپ کے مقابل — اچھی ہے لڑائی دوبدو کی
ہے جامہ وری سے کس کو مہلت — فرصت ہے کسے یہاں رفو کی[1]

شوق:۔ غلام محمد عرب المتخلص بہ شوق۔ آپ کا خاندان آصفجاہ ثانی کے عہد میں یمن سے آکر رائچور میں مقیم ہوا۔ جاگیر و منصب سے سرفرازی ہوئی۔ شوق کی پیدائش ۱۲۶۲ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی، عربی اور فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ فارسی میں عبدالعلی دولہ اور اردو میں عافل دہلوی سے تلمذ تھا۔

مرض عشق کی شدت ہی سہی — عوض مرگ اذیت ہی سہی
ہم بھی فریاد کریں گے سرِ حشر — ہاں قیامت میں قیامت ہی سہی
اے فلک غم نہیں کر دے برباد — شوق ناکام کی تربت ہی سہی

اون سے شب ملنے کا پھر پیغام ہے — صبح سے بہتر ہماری شام ہے
کیوں بگڑتے ہو سوال وصل پر — یہ بھی کیا گالی ہے کیا دشنام ہے

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ۶ صفحہ (۸۷ و ۸۸)

کیا چھپانے سے کہیں چھپتا ہے عشق　　شوق تیرا حال طشت از بام ہے[1]

صحو:- آغا محمد داور ابو العلائی، حیدر آباد کے مشہور صوفی بزرگ تھے آپ کی ذات مرجع رشد اور ہدایت تھی۔ شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، ۱۲۵۳ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۲۴ھ میں رحلت فرمائی۔

حضرت صحو نے بالارادہ کبھی شعر نہیں کہا بلکہ حالت کیف میں جو زبان سے موزوں الفاظ نکل گئے وہی اشعار ہوئے۔ اکثر محفل سماع کی پر اثر کیفیات سے متاثر ہو کر وجدانی کیفیات کے تحت آپ کی شاعری ہوتی تھی۔ جو تمام تر تصوف سے مملو ہے۔ آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ جس میں غزل اور کچھ نظمیں ہیں۔ نمونۂ کلام پیش ہے:-

بے خیالی خیال ہے میرا　　لا ابالی، کمال ہے میرا

صحو محتاج در پہ حاضر ہے　　زور پر بخت نارسا ہے آج

پردۂ میم میں چھپے ہیں حضور　　ہم سے نزدیک ہیں نہیں کچھ دور

مضطر ہے تن میں دل میرا سیماب کی طرح　　مرتا ہوں یار ماہئ بے آب کی طرح

میرا حال دل ہے سنانے کے قابل　　کروں کیا نہیں ہے چھپانے کے قابل

مجھے ظاہر کیا ہے آپ چھپ کر　　خدایا خاک میں مجھ کو ملا دے

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ۷ صفحہ (۹۱ - ۹۲)

لبریز جام محفل مستاں میں رہ گیا
عالم نشہ کا دیدۂ حیراں میں رہ گیا

ہاں جستجو میں اوس کی ہر اک صبح و شام تھے
مخزن کسی کا خانۂ انساں میں رہ گیا

پہچانتے نہیں ہیں ابھی تک وہ آپ کو
جھگڑا یہی تو گبر و مسلماں میں رہ گیا

وحشت کو میری دیکھ کے گھبرا گیا ہے وہ
دست جنوں بھی چاک گریباں میں رہ گیا

ہرگز یقیں نہ ہوگا مری بات کا اوسے
کیا ہو گیا صحو کو ہہیں ہاں میں رہ گیا[1]

صاف:۔ میر حیات الدین المتخلص بہ صاف۔ حضرت شمس الدین فیض کے فرزند تھے۔ باپ سے تلمذ حاصل تھا۔ باپ کے انتقال کے صرف چھ سال بعد ۱۲۸۹ھ میں عین جوانی کے عالم میں رحلت فرما گئے۔ صاف نے بعض غزلیں نہایت مشکل زمینوں میں لکھیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کلام میں روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ فیض کے شاگردوں کی طرح آپ کا کلام دبستاں فیض سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی کلام سہل ممتنع ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔[2]

دکھ ہے الفت کے خریداروں کو
دیکھ آیا کہ بیماروں کو

خاکساری میں کیا ملا ہے مزا
پوچھئے اپنے پائمالوں سے

ہے جب سے خیال ابروؤں کا
مانند ہلال جھک رہا ہوں

گل نیا ہے ساغرِ ل باغ میں
بیچئے مئے بے تامل باغ میں

امیدامید میں بلبل نے دی قفس میں جان
ہزار حیف نہ دیکھی بہار خندۂ گل

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۱۲۱ تا ۱۲۶) [2] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۱۰۷ تا ۱۱۰)

روتے دم جب شمع رویوں کا تصور آگیا
آ گئے مجھ کو نظر سرو چراغاں آب میں

چھوڑ کر جائیں کہاں صیاد کو
ہم قفس کو جانتے ہیں آشیاں

نہ گل سے کام نہ بلبل سے کچھ غرض مجھ کو
مری بلا سے اگر موسم بہار آیا

نہ کر سکے کبھی اس بت سے عرض حال فراق
رہی زباں مری اختیار سے باہر

کوئے بتاں ہیں کون خدایا ہے دادرس
فیاض اب گلہ جو کرے روزگار کا

بہے جب آنسوؤں کے ساتھ لخت دل ہوا ثابت
غم فرقت لہو پانی ہمارا ایک کرتا ہے
نکل آتا ہے جب مذکور ان کی سرد مہری کا
تو بیمار محبت ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے
زباں پکڑے کوئی کس طرح سے فیاض پھر اس کی
ٹھکانے کی نہیں اک بات کہتا ہے مکرتا ہے[1]

مائل:۔ ڈاکٹر احمد حسین[2] المتخلص بہ مائل۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے شمالی ہند کے مشہور شعراء۔ میر۔ سودا۔ انیس۔ جرات۔ امیر اور داغ وغیرہ کے جواب پر ان کی طویل غزلیں قابل ملاحظہ ہیں۔ وصفی کے شاگرد تھے۔ نظم میں کئی کتابیں شایع کی ہیں۔ بقول مولف تزک محبوبیہ جس مشاعرہ میں آپ شریک ہوتے

---

[1] دیوان صاف
[2] تذکرۂ شعرائے دکن و تزک محبوبیہ

اس میں جان پڑھ جاتی تھی۔

مائل کے کلام سے ان کے استادفن ہونے کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ بلندی خیال۔ صفائی زبان۔ رنگینی مضمون اور تاثیر وغیرہ کے لحاظ سے قابل تحسین ہے ۱۳۳۳ھ میں مائل کا انتقال ہوا۔ حیدرآباد میں مدفون ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

تھام کر دل وہ بھی روئیں ایک بار اتنا تو ہو
میرے نالوں میں اثر پروردگار اتنا تو ہو
لامکاں پر چھت بنے اونچا غبار اتنا تو ہو
خاک ہوتی ہے عروج خاکسار اتنا تو ہو
ہنس پڑے وہ دیکھ کر پروردگار اتنا تو ہو
آنکھ سے ٹپکے محبت دل میں پیار اتنا تو ہو
نالہ آتش فشاں کب تک یہ ٹھنڈی گرمیاں
جل بجھے کون و مکاں تو شعلہ بار اتنا تو ہو
خدا مجھ کو بنا دے اب تصور غیر کا
ان کے دل میں جا کے آؤں اختیار اتنا تو ہو
وہ ادھر بیخود رہے اور میں ادھر بےخود رہوں
لطف اے مائل دم بوس و کنار اتنا تو ہو

وحدت کی ہر ادا میں کروڑوں بناؤ ہیں
کثرت ہے سلسلہ تری زلف دراز کا

دوزخ کو دیکھتے ہی ترے مست خوش ہوئے
سمجھے یہاں بھی گرم ہے بھٹی کلال کی

ساری دنیا کے گنہ میں نے کیے وارے ہیں
پھر بھروسہ مجھے اللہ کا اللہ دے ہیں

دل میں آکر نقاب اٹھائی ہے　　　خود نمائی خدا نمائی ہے

نزاکت میں غضب کی ہاتھا پائی ہوتی جاتی ہے
کہ دم چڑھتا ہے پھر زور آزمائی ہوتی جاتی ہے

منصور کی آواز مرے لب پر گر آئے　　　قطرہ میں دریا کا تماشا نظر آئے
مستانہ جوانی تری اے فتنہ گر آئے　　　ہر بات میں ہو گھاٹ نظر میں اتر آئے
کیا صبر ہو کیا چین ہو جب وہ نظر آئے　　　دل تھام لیا جان چلی اشک بھر آئے

مزا دیتا ہے مائل کو ترا سینہ ترا چہرہ　　　یہ کچھ کافر جوانی کا وہ کچھ بھولے لڑکپن کا

مائل خدا سے مانگنے کی خو نہیں گئی　　　پیدا ہماری قبر سے دست دعا ہوا

محبت نے مائل کیا یہ کسی کو　　　کسی پر کسی کو کسی پر کسی کو

وہ کافر ہوں رہوں محشر میں بھی کفر پر قائم
خدا کے سامنے سجدہ کروں تصویر جاناں کو[1]

وزیر:۔ صاحبزادہ[2] میر وزیر علی نام اور وزیر تخلص۔ خاندان آصفیہ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ برقرار جنگ آصف یار الدولہ آصف یار الملک

---

[1] کلیات مائل　[2] تزک محبوبیہ و تذکرہ شعرائے دکن

خطاب تھا۔ ۱۲۶۶ھ میں تولد ہوئے۔ نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس کی دامادی کا آپ کو شرف حاصل تھا۔ شوال ۱۳۲۹ھ میں انتقال ہوا۔ شاعری کا خاص شوق تھا اولاً فیض بھر "عصر" کے شاگرد ہوئے۔ آپ کا کلام صوفیانہ ہوتا تھا۔

پہنچے کنار گور کے ہم جاں بلب صنم
پورا کیا قرار نہ بوس و کنار کا

دیکھا ہوں خود ہی میں خدایا ترا جلوہ
ظلمت میں بنا مجھ کو ملا آب بقا کا

وہ دیکھ لے جا کر بت سفاک کا کوچہ
جو عمر میں دیکھا نہ ہو میدان قضا کا

کھاتا ہوں ہوا کوچہ جاناں کی ہمیشہ
بھوکا نہیں رضواں تری جنّت کی ہوا کا

کیونکر نہ مجھ کو دے زر مضمون نذر فکر
سلطان ہوں میں وزیر سخن کے دیار کا

کرتا ہوں ذکر زلف میں اوصاف روئے یار
کعبہ کو جا رہا ہوں شوالہ کی راہ سے

صورت پرست رہتے ہیں معنی سے بیخبر
واعظ ہو دور کیوں نہ حقیقت کی راہ سے

پیش نظر لحاظ ہے افشائے راز کا
قاصد کا نام لیتا ہوں تار نگاہ سے

کب ہاتھ میں ہے باگ میرے اختیار کی
ہے جب سے انتظار کسی شہ سوار کی[1]

---

[1] تذکرۂ شعرائے دکن

مزاج:- حکیم محمد مظفر الدین خان، مزاج تخلص، حضرت فیض کے شاگرد تھے سنہ ۱۲۳۱ھ میں تولد ہوئے۔ سنہ ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ بڑے پرگو شاعر تھے۔ چار دیوان مرتب کئے تھے۔ ان کے کلام میں سادگی، صفائی، سلاست پائی جاتی ہے۔ نیز یاس و حرماں نصیبی بھی موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

جان گئی عشق میں کچھ غم نہیں | حق محبت تو ادا ہو گیا

موت سر پر ہے گور میں ہیں پاؤں | لے کے پھر تخت و تاج کیا کیجئے

لو خوشی سے میں جان دیتا ہوں | تم نہ رنجیدہ ہو خدا کے لئے

عشق میں ہم کو خیال اپنا کبھی آیا نہیں | آپ کو کھویا نہ جب تک یار کو پایا نہیں

اس بحر کم ثبات میں ہوں ہمدم حباب | ساحل کی آرزو نہ سفینے کی آرزو

پیدا بتوں کے عشق سے عشق خدا ہوا | آئینہ مجاز حقیقت نما ہوا

کیا خاک منہ دکھائیں خدا کو ہم اے مزاج | ہم سے نہ کوئی کام یہاں کام کا ہوا

صیاد تفرقہ ہو تجھے بھی یہی نصیب | بلبل کہیں ہے باغ کہیں آشیاں کہیں

کام کر لو مزاج کرنے کے | زندگی کا کچھ اعتبار نہیں[۱]

---

[۱] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۱۰۱ تا ۱۰۶)

معلی:- محمد مظفر الدین نام اور معلی تخلص، آپ کے اجداد عالمگیر کے زمانہ میں دکن میں آکر بس گئے معلی کی پیدائش ۱۲۵۵ھ میں ہوئی۔ عربی اور فارسی کی بڑی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شیخ حفیظ کے فرزند حیدر سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے۔

عشق ہے دل میں ہمارے احمد بے میم کا　　داغ اپنا پھول ہے گلزار ابراہیم کا

خاکساروں کو ہے راحت سربلندوں کو ہے رنج
ہے زمیں آرام سے اور آسماں گردش میں ہے

دنگ ہیں آئینہ میں اپنے لقا کو دیکھ کر
بت بنے بیٹھے ہیں وہ صنم خدا کو دیکھ کر

نہ غم سے نالہ و فریاد کرنا　　ہے لازم خاطر صیاد کرنا
نہیں پوچھا کبھی بھولے بھی ہم کو　　بت کافر تجھے کیا یاد کرنا[1]

مہر:- محمد وزیر الدین نام مہر تخلص۔ حیدرآباد میں ۱۲۷۹ھ میں تولد ہوئے، آپ کے اجداد آصفی عہد میں منصب و جاگیر سے سرفراز تھے۔ پرگو شاعر تھے، کئی دیوان مرتب کئے تھے۔ ۱۳۲۵ھ کے بعد انتقال ہوا۔

کلیجہ ٹکڑے ہو ہو کر لب فریاد سے نکلا　　تڑپ کر جب کوئی نالہ دل ناشاد سے نکلا
نہ حسرت کم ہوئی دل کی نہ زاری چشم گریاں کی　　وہی ہے جوش دل کیا حوصلہ فریاد سے نکلا

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ۱۷، صفحہ ۱۵۷ و ۱۵۸)

نہ ملتی کشتگان عشق کو منزل قیامت تک — بنا راہِ اجل کا خنجر جلاد سے نکلا
وہ بسمل ہوں کہ مرنے تک رہا مرنے پہ ثابت ہیں — جز اک اللہ زبان خنجر فولاد سے نکلا
جہاں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے ہر سو لوگ وحشت کو
پتا آخر کو مہر خانماں برباد سے نکلا

یہ سینہ وہ نہیں جس میں تمنا آ کے بھر جائے
یہ حسرت وہ نہیں اپنی کہ اپنے دل سے نکلے گی
وہ پردے میں ہیں جب تک آرزو بھی دل میں ہے مخفی
وہ جس دن گھر سے نکلیں گے تمنا دل نکلے گی

مے پی رہے ہیں طاق پہ شیشے دوا کے ہیں — خواہاں نہیں شفا کے مریضاں می فروش
یہ سب فساد ایک دل مبتلا کے ہیں لے — آنکھوں کی ہے خطا نہ ترے حسن کا قصور

ناجی:- سید اصغر حسین المتخلص بہ ناجی ۱۲۵۶ھ میں ولادت ہوئی عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ تفضل حسین عطا سے تلمذ حاصل تھا۔ تاریخ گوئی میں اچھا ملکہ تھا۔ مرثیہ، سلام وغیرہ کہا کرتے۔ ۱۳۳۰ھ میں وفات پائی، ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ ناجی کے کلام میں واقعہ نگاری کے ساتھ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے، نوحہ کا نمونہ ملاحظہ ہو

اے یارو کیسی چل گئی صرصر چمن چمن — لوٹا گیا ریاض پیمبر چمن چمن

لے تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ا ے، صفحہ (۱۶۱، ۱۶۲)

ہر عندلیب پیٹتی ہے سر چمن چمن ——— برپا ہے ماتم گل حیدر چمن چمن
بہلاتی تھی بہشت میں اصغر کو یوں بتول ——— پھرتی ہوں تم کو گود میں لے کر چمن چمن
بھوکے ہو تین روز کے پینے نہیں ہو کیوں ——— جاری ہیں نہریں دودھ کی اصغر چمن چمن

دادی سے گر خفا ہو تو دادا کے پاس جاؤ ——— لے کر پھریں گے ساقی کوثر چمن چمن

کہتے تھے شب قتل یہ مشتاق شہادت ہوئے گی سحر کب
یارب ہمیں مرنے کی تمنا ہے نہایت ہوئے گی سحر کب
بیٹھے ہیں تری راہ میں لٹا دینے کو گھر بار ہیں دوش پہ سر بار
کب دیکھیں گے سیر چمن گلشن جنت ہوئے گی سحر کب
کب شمر و عمر کو نہ شمشیر کریں گے کب خون میں بھریں گے
کم حشر کے دن سے نہیں اس شب کی طوالت ہوئیگی سحر کب
کیسی یہ شب آئی ہے کہ کٹتی ہی نہیں گھٹتی ہی نہیں ہے
اس شب کی ہے اک ایک گھڑی ہمکو قیامت ہوئیگی سحر
دنیا کی تمنا نہیں جینے سے ہیں بیزار مرنے پہ ہیں تیار
پیاسے ہیں بہت چشمہ کوثر کی ہے چاہت ہوئیگی سحر کب
ناجی شب عاشور سحر تک رہے خنداں کہتے تھے یہ ہر آن
انصار دل و جان شہنشاہ رسالت ہوئے گی سحر کب [۱]

---

[۱] مرقع سخن جلد اول صفحہ (۲۱۷ تا ۲۲۸)

نامی:۔ عبدالغفور خان المتخلص بہ نامی۔ حیدرآباد میں ۱۲۸۲ھ میں تولد ہوئے دس سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ اردو، عربی اور فارسی میں شعر کہتے تھے اردو میں حضرت داغ اور فارسی اور عربی میں سناد الملک سید علی شوستری سے شرف تلمذ رہا۔ طب اور علم جفر کا اچھا ملکہ تھا۔ خوش نویس بھی تھے۔ نظم و نثر کی تیس اکتیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔

نامی کے کلام میں معاملہ بندی، سلاست، شیرینی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ نازک خیالی اور حسن ترتیب، مضمون آفرینی کے جوہر بھی موجود ہیں۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

ہوئیں ہیں غصہ سے لال آنکھیں غضب کے تیور بدل رہے ہیں
بھویں تنی ہیں کھنچا ہے خنجر یہ مرے ارمان نکل رہے ہیں

لگی ہے اب آگ کچھ انھیں بھی جو غیر سے بے وفائی دیکھی
خدا کی قدرت کا ہے تماشا جلانے والے بھی جل رہے ہیں

میں کسی ایک کا تو ہو جاؤں　　کوئی میرا ہوا، ہوا، نہ ہوا

آہ کرتا ہوں مگر آہ میں تاثیر نہیں　　اور تقدیر سے بنتی کوئی تدبیر نہیں

دل جل کے خاک سوز محبت سے ہو گیا　　اب آہ بھی کروں تو نکلتا دھواں نہیں

آخر جلا جلا کر نامی کو مار ڈالا　　ارمان جی کا نکلا منت بر آئی تیری

کٹی عمر جس کی وفاداریوں میں وہی بے وفا بے وفا جانتا ہے

حال وہ حال ہے جو قابل اظہار نہیں درد وہ درد ہے جو لائق تحریر نہیں

جس دن سے نری دھن ہے لو تیری لگی جب سے
ہے وصل سے بھی بڑھ کر مجھ کو میری تنہائی
ہم کہتے نہ تھے نامی چاہو نہ حسینوں کو
بدنامی ہوئی کس کی کس کی ہوئی رسوائی

حضرت دل آپ کیا آئے قیامت آگئی یہ بلا ہے میرے سر پر آپ کی لائی ہوئی

لگائیں جس سے دل وہ اک بت پرفن نکلتا ہے
سمجھتے دوست ہیں جس کو وہی دشمن نکلتا ہے

آئینہ دیکھ کے زلفیں تو بناؤ اپنی آج دیکھو تو میں لیتا ہوں بلائیں کیونکر

بھروسہ کرتے ہو پھر اس کی بات کا نامی کہ ایسا وعدہ تو اس نے ہزار بار کیا[1]

واصل:- محمد احمد اللہ نام واصل تخلص۔ ۱۲۷۰ھ میں تولد ہوئے، حیدرآباد میں نشوونما ہوا، وصفی لکھنو سے تلمذ حاصل تھا، حیدرآباد میں داغ کے پہلے وصفی کی ہی شہرت تھی، واصل نے مثنوی کے سوا تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لطف زبان، تخیل کی بلندی ان کے کلام کے جوہر ہیں، بیان کی

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۲۱۱ تا ۲۱۵)

نزاکت اور معنی کی لطافت کے لحاظ سے بھی ان کا نعتیہ کلام مزین ہے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

عشق احمد کے سوا باقی جو کچھ ہے ہیچ ہے   عالم فانی میں سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

جلوہ رحمت عالم ہے یہ کچھ طور نہیں   دیکھ موسیٰ ہمہ تن چشم تمنا بن کر

مدح شہ دیں سے یہ ملی نعمت عظمیٰ   باتوں میں ہے تاثیر زباں میں ہے اثر آج

مری وحشت سے عالم یہ ہے یثرب کے بیابان کا
کہیں ٹکڑا ہے دامن کا کہیں پرزہ گریبان کا

جنہیں عشق سرور دیں ہوا انہیں ہر بلا میں مزا ملا
کوئی دل کے داغ سے شاد ہے کوئی اپنے زخم جگر سے خوش

کیوں بجھ نہ جائے دل کہ ہے پروانہ نگاہ
گنبد کے ہر چراغ سے دور اور شکستہ پر

اسے مارا، اسے تاکا ادھر دیکھا ادھر گھورا
عجب شوخی ہے کیا کہنا تمہارے چشم پرفن کا

مانا کہ تم سے کھل نہیں سکتے قبا کے بند   اچھا جو دست شوق ہمارا مچل گیا

بے نیازی ہو چکی بندہ نوازی کیجئے   اک ذرا ہنس دیجئے عاشق کو نالاں دیکھکر

ہم ناتواں کہیں کیسا کیونکر اڑے ہوا پر ‏ ‏ ‏ ‏ اڑ کر گرے زمیں پر گر کر اڑے ہوا پر[1]

ولا:- احمد عبد العزیز نام ولا تخلص اور شمس العلماء عز یز جنگ خطاب تھا۔ اہلِ نوائط سے تھے۔ حیدرآباد کے پرگو شاعر اور نثاری کے لحاظ سے مشہور ہیں چوبیس ۲۴ سے زیادہ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ۱۲۷۲ھ میں ولادت اور ۱۳۴۴ھ میں انتقال ہوا۔ فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں کلیات مرتب ہوا ہے۔ اور دونوں زبانوں میں آنحضرت کا سراپا قلمبند کیا ہے۔ کئی استادانِ سخن سے تلمذ رہا جن میں راقم، سنجر طہران، داغ اور جلیل بھی شامل ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:-

ہم لو رہے تھے بزم میں جب چل رہا تھا دور ‏ ‏ ‏ ‏ اشکوں کو دل نے بادہ احمر بنا دیا

غم سے بھر آئی آنکھ تو پینے لگے ہم اشک ‏ ‏ ‏ ‏ ضبط الم نے آنکھ کو ساغر بنا دیا

جو بزم میں تیری خدا خدا کر کے ‏ ‏ ‏ ‏ سنبھلنے پائے نہ تھے کہدیا خدا حافظ

بوسہ لب میں ہے تکرار ‏ ‏ ‏ ‏ لینا ایک نہ دینا دو

مستی میں تری نرگس مخمور کا ہمسر ‏ ‏ ‏ ‏ محفل میں کبھی ساغر جم ہو نہیں سکتا

منصوبہ ہائے دل تو بہت کچھ تھے رات دن ‏ ‏ ‏ ‏ کرنے کا تھا خیال مگر کچھ نہ کر گئے

بہنے جو لگی سیل مرے اشک رواں کی
پانی پہ بنا نقش جہان گزراں کا[2]

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۱۵۹ تا ۱۶۸) [2] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۲۰۳ تا ۲۰۷)

شعرائے دورِ عثمانی

اب ہم اس دور کے ان شعرا کا تذکرہ کرتے ہیں جو ۱۳۲۹ھ کے بعد انتقال کئے یا ہنوز بقید حیات ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اسی دور میں مشہور ہوئی۔

ان شعرا کو بھی تخلص کے لحاظ سے بیان کیا جاتا ہے۔

امجد:۔ اس دور کے زبردست اور باکمال صاحب فن شاعر حضرت سید احمد حسین امجد ہیں۔ اگرچہ رباعیات کے باعث آپ عام طور سے شہرت رکھتے ہیں مگر درحقیقت دیگر اصناف سخن بھی بہترین خیالات اور اعلیٰ جذبات کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں۔

آپ کی پیدائش حیدرآباد میں غالباً ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد صوفی رحیم علی تھے جن کا انتقال آپ کی کم سنی کے زمانے میں ہی ہو گیا والدہ محترمہ نے آپ کی پرورش فرمائی۔

مدرسہ نظامیہ۔ مدرسہ دارالعلوم میں امجد کی تعلیم ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی اس کے بعد استاد فلسفہ مولانا سید نادرالدین مرحوم سے جو علامہ عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے تعلیم کی مزید تکمیل کی۔

طغیانی رود موسیٰ ۱۳۲۶ھ میں آپ کا سارا کنبہ جو والدہ، بی بی اور دختر پر مشتمل تھا دریا برد ہو گیا صرف ایک ذات امجد اس طوفانِ بلا سے بچ گئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں مدرسی کی خدمات پر آپ کا پہلا تقرر ہوا۔ اس کے دفتر صدر محاسبی میں منتقل ہوئے اور بعد تکمیل پچپن سالہ وظیفہ حاصل کیا۔

چودہ سال کی عمر سے امجد کی شاعری کی ابتدا ہوئی ابتداً چندے حبیب کنتوری اور "ترکی" کو اپنا کچھ کلام بنایا ملا اس کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی چونکہ آپ فطرتی شاعر ہیں اس لئے بھی کسی استاد کی ضرورت نہ تھی۔

نظم و نثر کی کئی کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں جو حسب ذیل ہیں:۔

ریاض امجد حصہ اوّل و دوم۔ رباعیات امجد حصہ اوّل و دوم۔ خرقۂ امجد۔ نذر امجد۔ سج امجد۔ جمال امجد۔ حکایات امجد۔ گلستان امجد۔ پیام امجد۔

اڈیٹر صاحب رسالہ معارف نے آپ کے کلام کی حکمت اور معرفت کے مدنظر حکیم الشعراء سے آپ کو ملقب کیا ہے۔ آپ کے کلام پر ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی ایک دوسری تالیف[1] میں روشنی ڈالی ہے۔

حضرت امجد کی شاعری حسن و عشق۔ گل و بلبل کے جھوٹے تذکروں اور بے سر و پا خیالی کرشموں سے خالی ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

نہ ذکر بلبل و گل ہے نہ داستان بہا ر   نہ وصف سنبل و ریحان نہ مدح باد شمال

نہ کوئی لطف زباں ہے نہ خوبیٔ مضموں   نہ حسن و عشق کا قصہ نہ شاعرانہ خیال

مگر تیسرا مصرع صرف مصنف کا خیال ہے اور ان کا مشرقی انکسار ہے ورنہ مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ حضرت امجد کا کلام نہ صرف لطف زبان کی حیثیت سے واجب التعظیم ہے بلکہ خوبیٔ مضمون کے اعتبار سے بھی قابل تحسین ہے۔

کلام امجد کو چار دور میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے دور کا کلام جو رباعیات پر مشتمل تھا اب ہم دست نہیں ہوتا دوسرے دور میں نظمیں اور تضمین زیادہ لکھی ہیں تیسرے

---

[1] حضرت امجد کی شاعری

دور میں نظموں کے علاوہ غزلیں بھی موزوں فرمائیں اور چوتھے دور میں یہی چیزیں لکھیں رباعیات تو ہر دو میں لکھی ہیں۔ آپ کے کلام کی امتیازی خصوصیت تصوف ہے گویا قرآن کی تفسیر آپ نے رباعیات میں فرمائی ہے۔

امجد کی نظمیں مختلف عنوان پر لکھی گئی ہیں اور ان کو۔ واقعہ نگاری وصف نگاری۔ اخلاق اور تصوف پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ یوں تو آپ کی تمام نظمیں اپنی طرز میں لاجواب اور بے مثل ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ جوش رحمت۔ دنیا اور انسان۔ ماں اور بچی۔ میری قمری۔ اسنو ہتا جنت کی ڈاک۔ قیامت صغرا۔ دعائے یتیم یاد شوہر۔ تصویر غم۔ ایک بکس کا خواب۔ صدائے درویش۔ نوٹی کہے سو کون رحمتی وسعت۔ کل شئی۔ مرا رام کہاں ہے۔ مکالمہ جان و تن۔ سہ رنگی تصویر۔ وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل آفریں و قابل داد ہیں۔

حضرت امجد کی شاعری تین امور کے لحاظ سے قابل قدر ہے۔ سادگی نازک خیالی اور تاثر۔ اور بہترین کلام کے یہی تین جوہر ہیں جو امجد کی شاعری میں خصوصیت سے نظر آتے ہیں۔

دنیا اور انسان ایک طویل نظم ہے جس میں دنیا اور اہل دنیا کی حرص و ہوا۔ طمع زر بغض و حسد کا نقشہ پاکیزہ روزمرہ میں نہایت خوبی اور عمدگی سے کھینچا ہے اس نظم کے بعض بند حسب ذیل ہیں۔

اب سنو غور سے اے مال پہ مرنے والو　　جھوٹ سچ بول کے اس پیٹ کے بھرنے والو
بلبلا پانی کا بن بن کے ابھرنے والو　　ناک چوٹی میں گرفتار سنورنے والو

آپ بیتی ہے یہ سب غیر کا افسانہ نہیں

[illegible]

وہ مسافر نظر آیا جو تمہیں صحرا میں سمجھو وہ تم ہی جو آئے ہو اس دنیا میں
شیر پھر دیکھا اچانک جو اسی اثنا میں نقشہ خوف کھچا مردِ تک بنیا میں
چڑھ گیا شاخ پہ جس ڈر سے مسافر مضطر
اور یہ منہ کھولے ہوئے بیٹھ رہا زیرِ شجر

آپ کچھ سمجھے بھی کیا چیز ہے وہ شیرِ زیاں قبر سمجھو کہ جو ہے منتظرِ ہر انسان
شیر سا قبر بھی ہے کھولے ہوئے اپنا دہاں کہ کسی روز تو آئے گا یہ جائے گا کہاں
اس کا سب ناز و تبختر نہ بھلا دوں تو سہی
ہڈیاں پیس کے چورا نہ بنا دوں تو سہی

عمر سمجھو اسے جس شاخ پہ اس نے جا لی ملک الموت ہے وہ سانپ جناب عالی
رات دن چوہے جو ہیں کاٹ رہے ہیں ڈالی شہد کا جھنڈ ہے دنیا سبب پامالی
وائے بر شامت اعمال مگس کے مانند
طمع شہد میں ہم ہو گئے بالکل پابند

نہ لحد کا کبھی بھولے سے خیال آتا ہے نفس بد کار نہ اعمال سے شرماتا ہے
حلق تک صبح و مسا لقمہ تر کھاتا ہے چھوڑ کر دین کو دنیا کی طرف جاتا ہے
پھنس کے دنیا میں زر و مال کا ہو رہتا ہے
طلب جاہ میں کیا کیا غم و ہم سہتا ہے[۱]

نظم قیامت صغریٰ امجد کی شاعری کا ایک زبردست نمونہ ہے یہ نظم طغیانی رود موسیٰ ۱۳۲۶ھ کے واقعہ پر لکھی گئی ہے جس میں حضرت امجد مع اپنے

۱۔ ریاض امجد

خاندان کے گرفتارِ بلا ہوئے تھے۔ سوائے ذاتِ امجدؔ کے ان کے خاندان کا کوئی دوسرا فرد اس طوفانِ بلا سے جانبر نہ ہو سکا۔ ان واقعات نے اس نظم میں عجب کیفیت پیدا کر دی ہے۔

وہ رات کا سنّاٹا وہ گھنگھور گھٹائیں   بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں   وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

دم لینے کی طاقت نہ تھی ستانے کی تاب آہ   تھی زندگیٔ خرد و کلاں نقش بر آب آہ
کرتی تھی الگ سیلِ رواں خانہ خراب آہ   طوطے کی طرح آنکھیں بدلتے تھے حباب آہ
جان لینے کو ہر متنفس کے بڑھی تھیں
بے وجہ نہیں تیوریاں موجوں کی چڑھی تھیں

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا   سیلاب فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا   آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا
شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند

مادر کہیں اور میں کہیں با دیدۂ پُر نم   بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم   کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیّرِ اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
حیرت تھی دن کو نظر آنے لگے تارے

آپ کی ایک نظم جو تصوف میں ہے سہ رنگی تصویر سے موسوم ہے

(۱) پہلا رنگ نہایت ہلکا غنچۂ ناشگفتہ کی طرح پاک اور برف کی طرح بے داغ تھا۔

سُن کتھا میری اچھی سہیلی　　رات میں سو رہی تھی اکیلی
آئی خوشبو مجھے عطر کی سی　　چھو گئی سانس مجھ کو کسی کی
چھا گئی مجھ پہ بدلی کرم کی　　بند آنکھوں میں بجلی سی چمکی
ہو گیا فضل باری تعالیٰ　　آیا گھر میں مرے عرش والا

(۲) دوسرا رنگ نہایت شوخ مگر کچا دھوپ میں اڑ جانے والا میری انتہائی مسرت اور اس کے معنی خیز تبسّم پر شامل تھا۔

محو دیدِ رُخِ یار ہوں میں　　خواب میں ہوں کہ بیدار ہوں میں
اب جلے آگ میں میری سوتن　　میں تو باندھوں گی دامن سے دامن
اب کہیں اس کو جانے نہ دوں گی　　غیر کو منہ دکھانے نہ دوں گی
غم کدے میں مرے عید ہو گی　　اب تو آٹھوں پہر دید ہو گی

(۳) تیسرا رنگ نہایت گہرا اور پختہ دھونے سے بھی نہ ڈھلنے والا خون کی طرح جسم کی رگ رگ میں دوڑنے والا تھا۔

میں اس وجد میں جھومتی تھی　　اپنی قسمت کا منہ چومتی تھی
ناگہاں اک ذرا آنکھ جھپکی　　کڑکڑا کر گری غم کی بجلی
ہائے تقدیر نے رنگ بدلا　　پھر یہ دیکھا کہ اس کو نہ دیکھا
اس نے جلوہ دکھایا ہی کیوں تھا　　جانے والا پھر آیا ہی کیوں تھا

بیٹھے بیٹھے مراجی جلایا　　چھپنے والے نے کیوں منہ دکھایا
اب وہ ہم ہیں نہ وہ ہم نشیں ہے　　ہائے سب ہو کے پھر کچھ نہیں ہے

ایک تضمین ملاحظہ ہو:۔

فرقت میں جان برباد ہے آیا ہے اب آنکھوں میں دم
جا کر سنائے کون انھیں افسانہ بیمار غم
پیغامبر ملتا نہیں بیچارہ و بے کس ہیں ہم
ان نلت یا ریح الصبا یوماً الی ارض الحرم
بلغ سلامی روضۃ فیہ النبی المحترم

کیا شکل کھینچی واہ وا قرباں ترے دست قضا
پڑھتے ہیں جس کو دیکھ کر حور و ملک صلِّ علیٰ
کیا رنگ ہے کیا روپ ہے کیا حسن ہے نام خدا
من وجھہ شمس الضحیٰ من خدہ بدر الدجیٰ
من خدہ نور الھدیٰ من کفہ بحر الھمم

کیا پوچھتے ہو ہمدمو ہم سے محبت کا مزا
دل چاک ہے ٹکڑے جگر تن زخمی تیغ جفا
سنسناہٹ زخم سے رہ رہ کے آتی ہے صدا
اکبادنا مجروحۃ من سیف ھجر المصطفیٰ
طوبیٰ لاھل بلدۃ فیہ النبی المحترم

پیراہن دل چاک ہے ٹکڑے ہے جیب و آستیں

جینے سے جی بیزار ہے ہونٹوں پہ ہے جان حزیں
اچھے مسیحا بے رخی بیمار سے اچھی نہیں
یا رحمۃ للعالمین ادرکلزین العابدین
محبوس اید الظالمین فی الموکب والمزدحم

معشوق سے راز و نیاز کا نام غزل ہے اور ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ حضرت امجد کی شاعری جھوٹے عشق و محبت سے پاک ہے۔ بقول حضرت ممدوح وغزل کو ہزل قرار دیتے ہیں۔اس لئے آپ کی غزلوں کی مقدار اول تو نہایت کم ہے اور پھر ان تمام حشو و زوائد سے پاک ہے جن سے وہ عام طور پر مملو ہوتی ہیں۔

آپ کی غزل بھی تصوف و فلسفہ کا معدن حقیقت اور اصلیت کا خزانہ ہوتی ہے۔ ہر شعر میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر ہوتی ہے ان سے وہ راز نہانی جلوہ نما ہوتے ہیں جن تک رسائی اور پردہ دری ہر ایک کا کام نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی اس راز کو افشا کر سکتے ہیں جو دیدہ بصیرت رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام میں جہاں اصلیت ہے وہاں ان میں سادگی اور عام فہمی بھی ہے وہ ایسے نہیں ہیں جن کے سمجھنے کے لئے کلام غالب کی طرح شرح کی ضرورت ہو۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ عام فہم اور صاف ہیں اور پھر فلسفہ اور تصوف کے مشکل ترین مسائل کے حامل بھی، وہ تخیل کے لحاظ سے بلند سے بلند درجہ رکھتے ہیں اور اس کے باوجود اصلیت سے دور نہیں اور رنگینی اور لطف زبان سے خالی نہیں۔ آپ نے اس امر کو بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ معمولی بول چال زبان کس طرح غزل کا بار امانت اٹھا سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا
کوئی تم سا نظر نہیں آتا

ڈھونڈھتی ہیں جسے مری آنکھیں
وہ تماشا نظر نہیں آتا

جیتے جی اپنے اس کو دیکھوں گا
مجھے ایسا نظر نہیں آتا

ہو چلی انتظار میں عمر
کوئی آتا نظر نہیں آتا

جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے
جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں
دینے والا نظر نہیں آتا

زیر سایہ ہوں اس کے اے امجد
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

نالۂ جان خستہ جان عرش بریں پہ جائے کیوں
میرے لئے زمین پر صاحب عرش آئے کیوں

زخم کو گھاؤ کیوں بناؤ درد کو اور کیوں بڑھاؤ
نسبت ہو تو توڑ کر کیجئے ہائے ہائے کیوں

جس نے چڑھائیں تیوریاں نام سے میرے عمر بھر
اب وہ میرے مزار پر پھول چڑھانے آئے کیوں

امجد خستہ حال کی پوری ہو کیونکر آرزو
دل ہی نہیں جب اس کے پاس مطلب دل بر آئے کیوں

دل کی شکستگی نے آج جوڑ دیا کسی کے ساتھ
دیکھ لیا رخ حسیں اس در نیم باز سے

جبلہ ہاتھ آتا ہے خوب ہم کو پائے بوسی کا — رکھ دیا قدم پر سر جب انہیں خفا پایا

بندگی ہیں یہ کبریائی ہے — خیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجدؔ
ہر پردے کے بعد اور ایک پردہ نظر آتا ہے

وہ کرتے ہیں سب چھپکر تدبیر اسے کہتے ہیں
ہم دھر لئے جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

اب ہم امجدؔ کی رباعیوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لئے ہمیشہ زیادہ موزوں اور اصناف شاعری میں اہم چیز رباعی تصوّر کی گئی ہے۔ شیخ ابوالخیر ابوسعید۔ امام غزالی۔ سحابی۔ عمر خیام نے ہمیشہ رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فلسفی و اخلاقی نکات کے بیان کرنے کے لئے کوئی موزوں چیز سوائے رباعی کے نہیں ہے جس خوبی و عمدگی کے ساتھ شاعر اپنے مافی الضمیر کو ادا کر سکتا ہے وہ رباعی کا ہی حصّہ ہے مگر صاحب فن اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ رباعی میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کوئی آسان امر نہیں ہے بلکہ فن شعر میں نہایت مشکل اور دشوار ترین امر ہے کیونکہ چار مصرعوں میں مضمون کو ادا کرنا اور پھر چوتھا مصرع ایسا ہونا ضرور ہے جو تینوں مصرعوں کا نچوڑ ہو درحقیقت رباعی کا کہنا سنگلاخ زمین سے جوئے شیر کا لانا ہے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ امجدؔ دنیائے سخن کی اس (رباعی) اقلیم کے بادشاہ ہیں۔ حضرت گرامی نے خوب کہا ہے:۔

امجدؔ بہ رباعی ست فرد امجدؔ — ملک امجدؔ کلید گنج سرمد

گفتم کہ بود جواب سرمد امروز
روح سرمد بگفت امجد امجد

رباعیات کے چند نمونے پیش ہیں :۔

صنعت تری ہر خار دکھاتا ہے
ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصول معرفت ہے یا رب
پتہ پتہ ترا پتہ دیتا ہے

۲

ضائع فرمانہ سرفروشی کو مری
مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری
آتا ہوں کفن پہن کے اب رب غفور
دھبّہ نہ لگے سفید پوشی کو مری

۳

پیک اجل خانہ خراب آتا ہے
برباد کن شیب و شباب آتا ہے
اے ملک عدم کے جانے والو ٹھیرو
اک آبلہ پا بھی ہم رکاب آتا ہے

۴

رخ مہر ہے قد خط شعاعی کی طرح
ہے گلہ امت میں وہ راعی کی طرح
اس خاتم انبیا کا آخر میں ظہور
ہے مصرع آخر رباعی کی طرح

۵

ہر گام پہ ٹھکرا کے گرا جاتا ہوں
نقش کف پا بنکے مٹا جاتا ہوں
تو بھی سنبھال میرے دینے والے
میں بار امانت میں دیا جاتا ہوں

۶

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو
حضرت آتم سے دیا سلائی اچھی

۷

گردش میں یہ گرد باد آخر کب تک
طرح کون و فساد آخر کب تک
ٹوٹے گا طلسم مادیت اک دن
اضداد میں اتحاد آخر کب تک

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں ۸ پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

کچھ وقت سے اک بیج شجر ہوتا ہے ۹ کچھ روز میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور ترا ہر کام کچھ دیر ہی ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو ۱۰ منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

امیر[1]:- سید حسین علی خان امیر ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں تولد ہوئے۔ اولاً محمد سرفراز علی وصفی سے اصلاح لیا کرتے تھے اس کے بعد داغ کے شاگرد ہوئے۔ آپ کا کلام اپنے استاد کے رنگ میں ہی ڈوبا ہوا ہے۔ صفر ۱۳۵۴ھ میں انتقال ہوا۔

ہمیشہ ہم ٹھہر سکتے نہیں ہیں دیر و کعبہ میں وہیں جانا پڑے گا ہم کو رہتے تھے جہاں پہلے

روکے سے نہیں رکتے ہیں اولوالعزم دریا میں سڑک بن گئی موسیٰ کے قدم سے

اٹھو امیر بت نے دیا ہے کہیں جواب کیا میٹھی باتیں کرتے ہو پتھر کے سامنے

دن گذرتا ہے بے قراری میں رات کو کب قرار آتا ہے

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم

جوش مستی میں محتسب سے ہم　　پوچھتے ہیں کدھر ہے میخانہ

رخ پہ چلمن نقاب کی دیکھو　　ان کی سوجھی حجاب کی دیکھو

رندوں کی پھر کشاکش رندانہ دیکھئے　　بند ایک دن اگر در میخانہ رہ گیا
جنگل ہو کوئے یار ہو یا ہو کوئی مقام　　دل لگ گیا جہاں وہیں دیوانہ رہ گیا
لیلیٰ رہی نہ قیس نہ شیریں نہ کوہکن　　دنیا میں حسن و عشق کا افسانہ رہ گیا
ساقی نے خالی جام عطا جب کیا مجھے　　بھر ریز ہو کے عمر کا پیمانہ رہ گیا
صبح شب وصال گیا کوئی اسے امیر　　شیشہ بغل میں ہاتھ میں پیمانہ رہ گیا

کعبہ کی جو عظمت ہے مرے دل کی وہی ہے
اس گھر کا مکیں اور نہ اُس گھر کا مکیں اور[1]

آزاد:- محمد حسین آزاد بھی حیدر آباد کے باشندے ہیں ۱۲۹۷ھ میں تولد ہوئے مدرسہ دار العلوم میں تعلیم پائی منشی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ شاعری میں حضرت امجد سے آپ کو تلمذ ہے۔

آپ کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہے جو شوخی اور ظرافت سے مملو ہے اور اکبر الہ آبادی سے ملتا ہے۔ مگر جیسا کہ حضرت امجد نے تحریر فرمایا ہے۔ "اگر اکبر مرحوم کی شاعری عالم وجود میں نہ آتی تب بھی ہمارے آزاد صاحب اسی طرح آزادانہ اور ظریفانہ شعر کہا کرتے ان کی تمام نظمیں اپنے خاص رنگ ظرافت میں ڈوبی

---

[1] دیوان امیر

ہوئی ہیں"[۱]

خیالات آزاد کے نام سے آپ کے کلام کے دو حصے شائع ہوئے ہیں اس مجموعہ میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ موجودہ زندگی کے اخلاقی معایب کو محسوس کرنے اور اصلاح معاشرت کے لئے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ بالک لوربان، مسدس آزاد وغیرہ آپ کی دوسری تصانیف ہیں،

یہ مس ہے نہ ہوگی کبھی ٹس سے مس

غضب کا ہے جوبن بلا کا ابھار ۔۔۔ مس فتنہ زا کے یہ سولہ برس
یہ سب کچھ سہی اس سے لاحاصل و لا ۔۔۔ عبث تجکو اس کی ہوئی ہے ہوس
تو کس برتے پر اس کا عاشق ہوا ۔۔۔ نہ ہوگی یہ مفلس کی فریاد رس
تو دیتا ہے دل اور وہ لیتی نہیں ۔۔۔ کہ دل اس کی نظروں میں ہے خار و خس
نہ دلدار ہے یہ نہ ہے دلربا ۔۔۔ یہ زر دار ہے زر ربا ہے یہ بس
یہ مس ہے نہ پگھلے گی زر کے بغیر ۔۔۔ یہ مس ہے نہ ہوگی کبھی ٹس سے مس

سفارش

یہاں سے اپنی گاڑی ہم بچا کر کیسے لیجائیں
جدھر دیکھو ادھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا
لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت

---

[۱] خیالات آزاد حصہ دوم

لگادو زور سے تم اس کے اک کوڑا سفارش کا
سفارش کا اسے تم بھول کر ٹٹو نہیں کہنا
ہوا سے باتیں اب کرنے لگا گھوڑا سفارش کا
ترقی کا نتیجہ قابلیت سے نہ نکلے گا
لگاؤ گے نہ تا وقتیکہ تم جوڑا سفارش کا
سفارش نے تو اونچے اونچوں کو نیچا دکھایا ہے
بڑا ہی سورما ہے جس نے منہ موڑا سفارش کا
یہ دل گردہ ہمارا دیکھو پیش داور محشر
قیامت میں بھی دامن ہم نے کب چھوڑا سفارش کا

بازغ:۔ عبدالحی نام اور بازغ تخلص صیغہ مالگزاری میں ملازم تھے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام پاکیزہ ہوتا تھا۔ رسالہ صحیفہ میں مدتوں ان کا کلام شائع ہوتا اور خراج تحسین حاصل کرتا رہا۔

خود فراموشی کا عالم مجھ پہ تھا چھایا ہوا   اس طرح سے میں تری محفل میں تھا گویا نہ تھا

وہ چوچلے سخن کے جو تھے لازم سخن   بازغ نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے دیواں میں رکھ لئے

موت کا مجھ پہ ہے احسان کہ آئی شب وصل   غم سے میں چھوٹ گیا فکر سحر ہی نہ رہی

اثر کا میرے نالوں نے نشان تک بھی نہیں پایا
گئے عرش بریں تک اور ساتوں آسماں ڈھونڈے

خیال یار کو ہم ڈھونڈھتے تھے وقت خواب ایسا
پرندہ جیسے رات آتے ہی اپنا آشیاں ڈھونڈے

خواب میں بھی کبھی راحت کی نہ صورت دیکھی
رنج سہنے ہی کو پیدا میں ہوا ہوں شاید

ہم نے لب ساحل جو کبھی اشک بہائے — یہ حال ہوا چھپ گیا دریا نہ دریا
پوشیدہ مرے سینے میں یوں ہیں دُرِ مضموں — جس طرح صدف میں دُرِ یکتا تہ دریا

یورش فوج یاس سے ہو گیا ملک دل تباہ — تیغ الم سے گر پڑا کٹ کے نشان آرزو

باوفا و مجبور عاشق میں ؟ کہ تو ؟ — بے وفا سفاک قاتل تو ؟ کہ میں ؟

اُبھر کر ان کا سینہ کہہ رہا ہے — یہ نخل حسن کے پھل ہیں رسیلے

تمھارے چشم میگوں کے اثر سے — لڑیں گے خم سے خم ساغر سے ساغر

تصویر شاعری

یہ ماحصل الفت و عشق شعرا ہے — خاصے ہیں تنومند مگر حال برا ہے
تمغائے تفاخر ہوی رسوائی عالم — اس عشق کی سرکار سے کیا رتبہ ملا ہے
مفروضہ ہیں اشکال تو الفت ہے کہاں کی — تصویر خالی ہے تو پھر عشق ہی کیا ہے
معشوق بھی پھر وہ کہ محالات کا مجمع — ہر عضو میں ہر جنس کا اک جوڑ لگا ہے

فندق لب و پستہ دہن و سیب زنخداں — میوے کا ہے انبار کہ یار شعرا ہے
ابرو ہیں کماں تیر مژہ اور نگہ تیغ — وصف رخ جاناں ہے کہ سامان وغا ہے
غنچہ دہن و گلبدن و سرو سہی قد — ولہ با کا سراپا ہے کہ اک باغ لگا ہے[1]

آصفی:۔ میر اسد علی خان نام آصفی تخلص، نظام یار جنگ حسام الدولہ حسام الملک خانخانان خطاب، امرائے دربار آصفی سے تھے، آصفجاہ اوّل کے ہمراہ آپ کے اجداد دکن میں آئے اور جاگیر و مناصب سے سرفراز ہوئے شاہ نواز خان صمصام الملک جو مولف ماثر الامرا کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہیں گے آپ کے اجداد میں شامل ہیں۔ ۱۲۷۱ھ میں آصفی کی ولادت ہوئی اور ۱۳۴۵ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے کلام میں مرثیہ، سلام اور قصیدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ پند و نصیحت بھی آپ کے کلام میں موجود ہے۔

ایک دن خاک میں ملنا ہے ضرور — شوکت و شان نہ دکھلائیے گا

اے غافلو نہ سمجھو رہنے کی جا ہے دنیا — ہم اس میں میہماں ہیں مہماں سرا ہے دنیا

نہ آیا کبھی آصفی دل بتوں پر — کٹی عمر میری خدا کہتے کہتے

اپنے عصیاں پہ ہمیں چاہیئے رونا دن رات — دیر تو ہوگی دعاؤں کا اثر ہونے تک

مست مئے ولائے جناب امیر ہوں — عالم ہے دل میں آنکھ میں شیشے کا جام کا

مدد میں غیر سے کس طرح آصفی چاہوں — بجز علی کوئی مشکل کشا نہیں ہوتا

---

[1] رسالہ صحیفہ حیدر آباد

گھر سے جب بہر سفر حضرت شبیر چلے — سر کٹانے کے لئے مالک تقدیر چلے

آئے گا چین مجھے ہجر پدر میں کیونکر — جی لگے گا میرا کیا جانئے گھر میں کیونکر

عزیز قتل ہوئے اُس جناب سے پہلے — ستارے ڈوب گئے ماہتاب سے پہلے[1]

آزاد:۔ یہ دوسرے آزاد ہیں گورسرن بہلی نام، اور آزاد تخلص، قوم کے کائستھ اور ایک مشہور خاندان کے فرد ہیں، آپ کے دادا توکل تخلص اور والد اوج تخلص کرتے تھے چچا انور تھے۔ اس طرح آزاد خاندانی شاعر ہیں۔ آزاد کو ضامن کنتوری سے تلمذ حاصل تھا۔ جملہ اصناف سخن میں اونھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر تصوف میں خیال آرائی کی ہے۔

ہر فدۂ کونین ہے گھر ذات خدا کا — قبلہ ہے مگر نام فقط قبلہ نما کا

پھر نہ پلٹی وہ صدا اس گنبد دوار سے — نعرۂ منصور کا بہ ہمتِ مردانہ تھا

دعوے جنہیں آزاد تھے یاں نام ونشاں کے — عالم میں نظر آتے ہیں بے نام و نشان آج

تعلق دو جہان سے اُٹھ گیا ہو — دم آخر لگی ہو لو خدا سے

زبان زد ہے سب کے فسانہ ہمارا — وہاں ذکر ہے غائبانہ ہمارا

ممکن نہ تھا کہ چیر کے دکھلائیں دل تمہیں
قطرہ لہو کا اک سرِ مژگان بنا دیا

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ ۱۷۱ تا ۱۷۶

پتلیاں آنکھوں میں ٹھریں ہو کے محو حسن یار
نقش حیرت ہو گئیں تصویر جانان دیکھ کر

راضی کس طرح پہ کریں گے ہم اپنا دل
وعدہ ملے جو چین کا ہم کو قضا کے بعد

آئے ہیں تیرے در پہ کریں کیا سوال ہم
ہم آپ عرض حال ہیں صورت سوال ہے[1]

توفیق[2] :- سیّد جلال الدین توفیق ۔ سادات مہدویہ سے تعلق رکھتے تھے ۱۲۸۲ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے ۔ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ حاصل تھی عروض معانی اور بیان سے پوری طرح واقف و ماہر تھے ۔ خطاطی میں کمال حاصل تھا نستعلیق ۔ نسخ ، شفیعہ اور شکستہ میں پوری مہارت تھی ۔ اپنے باپ سیّد ابراہیم تصدیق سے تلمذ حاصل کیا تھا ۔ غالب اور مومن کی طرز کے مقلد تھے ۔ ۱۳۳۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔

دنیائے شاعری میں توفیق کا ایک خاص درجہ ہے ان کی غزلیں اپنی رنگینی خیال و عاشقانہ مضمون آفرینی و لطف زبان ۔ شوخیٔ بیان اور حسن و ادا کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہیں ۔

توفیق نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا کلام زیادہ تر غزل پر مشتمل ہے اور یہ غزلیں تمام تر تصوف اور فلسفہ سے مملو ہیں ۔ اردو شاعری میں خواجہ میر درد کا کلام تصوف کے لحاظ سے سب سے بلند و بالا ہے اس کے بعد کسی نے غزل میں ان کا رتبہ حاصل نہیں کیا مگر توفیق کا کلام ان کے نقش ثانی کی حیثیت سے

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ ۳۱۳ تا ۳۱۷)　[2] تزک محبوبیہ

پیش کیا جا سکتا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

ازل سے ناز پروردہ ہوں خرام ناز پرور کا　　میری ہستی بھڑکتی ہے دمِ آشوب محشر کا
یہ بخشی خیرگی تاب جمال روئے ساقی نے　　بنا ہر نقش می ساغر میں پردہ چشم ساغر کا

لئے پھرتا ہے ساتھ اپنے غبار خاک کی صورت
مرے سینہ میں ہر جوش نفس جھونکا ہے صرصر کا

رہے سلامت جو خاکساری کبھی تو اپنی ہوا بندھیگی
کبھی تو اٹھیں گے گرد بن کر کبھی تو اونچا غبار ہوگا

تیرہ کامی کی بدولت کج ادائی بڑھ گئی　　پیچ کھا کر لب پہ نالہ زلف پر خم ہو گیا
ولئے رسوائی کہ بعد مرگ بھی لاشہ مرا　　میرے ہی دامان رسوائی میں کفنایا گیا
رونے والا کون تھا توفیق میری قبر پر　　ابر آکر چار قطرے اشک کے برسا گیا

قطرہ دریا میں تو دریا ہے نہاں قطرہ میں　　میں اک عالم میں ہوں مجھ میں ہے اک عالم پیدا

گرایا بار غم نے اسی طرح خاک مذلت پر　　نہ اٹھے ہم زمیں سے بیٹھ کر دیوار کی صورت

وہ زار ہوں کہ کسی کو نظر نہ آؤں گا　　نہاں خود اپنی نگاہوں سے ہوں نظر کی طرح

تن زار پر مرے داغوں کا کچھ عجب طرح کا ہجوم ہے
کچھ عجب طرح کی بہار ہے کئی گل شگفتہ ہیں خار پر
میں خیال خنجر ناز سے نہ مرے بچ گیا تو بھی خیر کیا

تری یاد قامت دلربا مجھے کھینچ ڈالے ہے دار پر

بلاکش ہوس و بدروے یار ہوں میں — اسیر گیسوئے شبہائے انتظار ہوں میں
حجاب ناز ہے ان کو مجھے حجاب عدم — سر مزار ہیں وہ اور نہ مزار ہوں میں
سبک ہوں خاک میں ملکر بھی اس قدر توفیق — اٹھوں کبھی جو زمیں سے تو اک غبار ہوں میں

وہ شکستہ حال ہوں میں کاتب تقدیر نے — حرف بھی لکھے شکستہ نامہ تقدیر میں

زبان زخم سے پوچھو زبان درازیٔ تیغ — مرے بیان کا گر تم کو اعتبار نہیں

سر محشر کسی کی یاد قامت لے کے جاتے ہیں
قیامت ہے قیامت میں قیامت لے کے جاتے ہیں
عزیز گردش وحشت ہوں اے توفیق مر کر بھی
بگولے سر پہ میری خاک تربت لے کے جاتے ہیں

سر میں چکر پاؤں زخمی بال و پر ٹوٹے ہوئے
دام سے صیاد کے یوں آئے ہم چھوٹے ہوئے
پاؤں میں گردش ہو اور گردش میں ہو لطف خلش
آبلے ہوں آبلوں میں خار ہوں ٹوٹے ہوئے
اب کہاں توفیق وہ فریاد بے تابی کا زور
دم بھی الجھا ہوا نالے بھی ہیں ٹوٹے ہوئے

جو مانگتے ہوں غیر کے جینے کی دعائیں کیا وہ مرا مرنا بھی گوارا نہ کریں گے

ناتوانی سے جھکایا ہے جنوں اس قدر پاؤں کی زنجیر مدت سے گلے کا ہار ہے

زبان حال سے کہتی ہے بربادی مزار کی عدم کا راستہ اجڑی ہوئی منزل سے ملتا ہے

کچھ نہیں کھلتا کہ کیا ہوں خواب گاہ دہر میں
خواب بے تعبیر ہوں یا خواب کی تعبیر ہے

شب وعدہ نہ آئے وہ تو آخر موت ہی آ گئی ہماری جان نکلی پر نہ نکلی آرزو دل کی

مرے پہلو پر آج ان کی نظر ہے چرالیں دل نہ میرا مجھ کو ڈر ہے

داغ دل عاشق پہ نظر تیز نہ ڈالو پائے نگہِ ناز میں پڑ جائیں گے چھالے

قتل کر کے جو مرے سر پہ رکھا ہے احساں قاتل اب دیر نہ کر لاش کی تشہیر میں بھی

وہ عالم بے ہوشی وہ ماتم خاموشی فرقت تری گویا جینا مرا مرنا تھا

تقاضائے وحشت دیکھ کر میرا بیاباں در بغل ہر ایک ذرہ ہے بیاباں کا

دیکھو تو نگاہوں سے مری آنکھ ملا کر دیکھوں تو مزاج آپ کا کیوں کر نہیں ملتا

حجاب دل میں داغ شوق بے ساماں نکلتا ہے کہ شعلہ پردۂ فانوس میں عریاں نکلتا ہے

خیال بے خودی تک بھی نوید مرگ حسرت ہے　　　مرا غم پردۂ مشکل میں بھی آساں نکلتا ہے

ملی ہو فطرت توام نہ دونوں کو کہیں یارب
نکل آتا ہے دل بھی ساتھ جب ارماں نکلتا ہے
کہاں پہنچی ہے مشق امتحاں ناوک حسرت
جگر میں ڈوب کر دل سے سر پیکاں نکلتا ہے [1]

تجلّی:- سید منتجب الدین تجلی میر سیادت علی خان بہادر کے فرزند تھے۔ ۱۲۹۲ھ[2] میں حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ مدرسہ دارالعلوم مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ سررشتۂ مالگذاری میں ملازم ہوئے۔ ۱۳۴۶ھ میں بمقام گلبرگہ انتقال ہوا۔

تجلی فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ فارسی میں ترکی اور اردو میں داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا دیوان ہنوز شایع نہیں ہوا ہے۔ تجلی کے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

کیا ہوا اگر کوئی دوسرا ہوا اپنا　　　اپنا جب نہ ہوا اپنا غیر ہو گا کیا اپنا
ضبط عشق ہم میں ہے غیر کو سلیقہ کیا　　　موتہہ پہ کہدیا ان کے حال بر ملا اپنا
سن کے یار کے تیور ہم سے ہو گئے کچھ اور　　　ہائے ہم نے کیوں اس سے حال دل کہا اپنا
ہر گھڑی ستاتا ہے آپ کو تجلّی یہ　　　پھر بھی آپ کہتے ہیں دل کو لاڈلا اپنا

---

[1] فانوس خیال
[2] آپ کے حالات اور کلام آپ کے فرزند سید تمکین کاظمی سے حاصل کئے گئے۔

ہمارے حق میں ہے یثرب کا کانٹا پھول سے بہتر
ہمارے حق میں صحرائے مدینہ باغ جنت ہے

چلے آنا کبھی ٹہلتے ہوئے دو قدم پر مزار ہے میرا

جواں ہوتے ہو جتنے اس قدر جوہر نکلتے ہیں
تمہارے پاؤں کیا کیا پیٹ سے باہر نکلتے ہیں

حلم:[۱] - محمد جمال الدین نام حلم تخلص اور صادق جنگ خطاب تھا۔ نیر الدین خان صادق جنگ ثانی کے فرزند تھے۔ مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی طبقہ امراء میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے مڈل کا امتحان درجہ اعلیٰ میں پاس کیا چونکہ اس زمانہ میں طبقہ امراء کے لئے یہ ایک نایاب امر تھا اس لئے سر آسمانجاہ مدار المہام کی جانب سے جریدہ میں اس پر اظہار خوشنودی فرمایا گیا۔ آصفجاہ سابع کے مصاحبوں میں داخل تھے۔

شاعری کا خاص مذاق تھا مائل سے تلمذ رکھتے تھے۔ ہندی سے خوب واقف تھے۔ شایق کی طرح انہوں نے بھی ٹھمریاں لکھی ہیں اور اس کا مجموعہ "پیت کی ریت" کے نام سے حال میں آپ کے فرزند نے شایع کیا ہے۔ ان کی زبان شستہ اور صاف ہے۔

سنہ ۱۳۴۶ھ میں حلم کا انتقال ہوا۔ حیدر آباد میں مدفون ہیں۔

---

[۱] تزک محبوبیہ

کلام کا نمونہ یہ ہے :۔ غزل

چشم ساقی کی بدولت اک جہان بدہوش ہے
میکدے سے مدرسے تک شور نوشا نوش ہے
بزم میں ساقی کی مستی کا کچھ ایسا ہے اثر
عقل کی ہے عقل گم اور ہوش بھی بے ہوش ہے
ہو یقین چشم بصیرت سے اگر دیکھے کوئی
پردے ہیں اسی مسمیٰ اس میں خود روپوش ہے
دیکھنا ہے کچھ اگر تو بند آنکھیں کیجئے
بات کرنا ہے تو اس قابل لب خاموش ہے
زندگی ہوتی بسر ہے حلمؔ کی کس لطف سے
شاہد مقصود سے دن رات ہم آغوش ہے

ٹھمری دھناسری (سہ پہر دن)

دور نہیں میں پاس ہوں سب کے میرے کو کوئی ڈھونڈو تو
بھید جدھر مکھ سامنے ہوں میں کھول کے آنکھیں دیکھو تو
حلمؔ نہیں میں اور ہی کچھ ہوں جانو بوجھو سوچو تو

شاہانہ (دو پہر رات)

یہ کام کسو کی یاری ہے میں اور مورا یار بھلا

سانچ کہت ہوں سن ری مائیں — ہر پل مورے سنگ ہے سائیں
ہر گھٹ میں واکی پرچھائیں — خلوت سے بازار بھلا
ہتی گھوڑا اونٹ چڑھت ہوں — دھن دولت سب پاس رکھت ہوں
بھولی کب جگ دھندے میں — علم کو اپنا کار بھلا

دل:- محمد حیدر نام اور دل تخلص، فلاطون جنگ لقمان الدولہ اشرف الحکما خطاب تھا، ۱۲۷۷ھ میں تولد ہوئے اور ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی حیدرآباد ہی میں ڈاکٹری کی تعلیم پائی ۱۲۹۹ھ میں اس کا امتحان پاس کیا۔ اولاً شمس الامراء کے یہاں ملازم ہوئے پھر خانگی طور پر علاج کرتے رہے اس کے بعد حضرت غفران مکان کے اسٹاف سرجن مقرر ہوئے۔ بیشقرار تنخواہ خطاب اور اعزازات سے ممتاز ہوئے۔ شاعری کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ حفیظ الدین پاس[1] سے تلمذ حاصل کیا تھا تصوف کا خاص شوق تھا اسی شوق نے شاعری کی طرف مائل کیا ہے۔ سوانح جامی، نماز دل وغیرہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔

دل کا آنا جی کا جانا ہو گیا — آنکھ لڑ جانا بہانا ہو گیا
تذکرے ہوتے ہیں اب تو جا بجا — یار کا میرا فسانہ ہو گیا
پھنس گیا زلفوں میں دل اچھا ہوا — بے ٹھکانے کا ٹھکانا ہو گیا

مے خانہ میں کرنا مجھے دفن اے میرے ساقی — مٹی سے میری ساغر و پیمانہ بنانا

---

[1] پاس، فیض کے مشہور شاگرد تھے۔

بیکسی حسرت و ارماں کا ہے ہمراہ ہجوم
دیکھو کس شان سے نکلا ہے جنازہ دل کا

دل کو جلا دیا ہے مشعل بنا لیا ہے
دل ہی کی روشنی سے پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں

کوئے قاتل ہیں چلو جو ہو سو ہو
جان ایک دن جانے والی جائے گی

دل کو انداز نظر نے نظر انداز کیا
آنکھ صبح سے نہ بدل آنکھ بدلنے والے[1]

ذہین:۔ سید غلام مصطفےٰ ذہین بھی اس دور کے ایک نام آور اور مشہور شاعر تھے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کا کلام بھی عشق و عاشقی گل و بلبل کے افسانوں سے پاک ہے۔ عموماً اخلاقی مضامین آپ نظم کرتے تھے۔ کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ الفاظ صاف و شستہ۔ ترکیبیں دل نشیں ہوتی ہیں مسلسل نظمیں جن میں قوت فکر کا پورا امتحان ہوتا ہے۔ بہت اچھے لکھتے تھے اخلاقی نظموں کے ساتھ معرفت اور تصوف میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔

ذہین پرگو شاعر تھے۔ حیات طفلی کے ہر ایک پہلو پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے قصہ اور واقعہ کے پیرایہ میں اخلاقی باتیں بیان کی ہیں۔ بچوں کی روزمرہ ضروریات پر ان کی اچھی اچھی نظمیں ہیں۔

انسان

او بشر او خاک کے پتلے تجھے اتنا غرور
تیرے ہم جنس اور پھر تو ہی رہے ان سے نفور

[1] دیوان دل مخطوطہ

نشہ زر نشۂ زر کی طرح کیوں چڑھ گیا ہو گئی الٹی سمجھ کیوں کیا ہوا تیرا شعور
کر خدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہو گیا جو ہے کرنا آج کر لے کل تو ہے روز نشور

ہو کے انسان پھر کرے تو ہی جفا انسان پہ
کیا یہی ہے آدمیت کا شعار اے بے شعور

شیریں کلامی

عجب چیز ہے تو بھی شیریں کلامی کہ شیدا ہے تجھ پر ہر اک خاص و عامی
مٹاتی ہے رنج و غم تلخ کامی بناتی ہے دنیا میں لوگوں کو نامی

بن آتے ہیں سب کام تجھ سے جہاں کے
تجھی سے ہے دل شاد خرد و کلاں کے

ترے دم سے دنیا میں خلق و مروت ترے خلق سے لطف و اکرام و راحت
ترے لطف سے فیض وجود و عنایت ترے فیض سے رحم و انسان و رحمت

تری رحمتیں سایہ گستر جہاں پر
ترا سایہ ظل ہما سے ہے بڑھ کر

غزل کا نمونہ :-

سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں
اک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں

کرتی ہے عیب و ہنر کو آشکارا گفتگو جوہر انسان کا ہے آئینہ گویا گفتگو

زندگانی کے زمانے میں بھروسہ کیا ہے جز فنا ہونے کے انسان میں رکھا کیا ہے

بھلائی کیئے جا شرافت یہی ہے اطاعت یہی اور طاعت یہی ہے
نکوئی میں کر نام شہرت یہی ہے بھلائی کیے کر کام راحت یہی ہے

سخت دشوار ہے انسان کی پہچان ذہین دوست کہتے ہیں کسے آپ نے سمجھا کیا ہے
چشم کرم بشر سے ذلت کا سامنا ہے اللہ سے طلب کر جو تجھ کو مانگنا ہے

عطا کر قناعت کی دولت کریم نہیں مجھ کو قارون کا زر چاہیئے
ہر اک کام میں کیجے پہلے سعی پھر اس کا خدا سے ثمر چاہیئے
حیات و خرد کی سی نعمت ملی پھر اب کیا تجھے اے بشر چاہیئے

سنتے تھے لامکاں ہے یارب مکان تیرا ڈھونڈا جو اپنے دل میں پایا نشان تیرا
شمس و قمر ہیں تیرے اور بحر و بر ہیں تیرے ہے یہ زمیں تیری یہ آسماں تیرا

شاد:- راجہ کشن پرشاد نام مہاراجہ یمین السلطنت بہادر کے، سی، ایس، آئی خطاب۔ مہاراجہ چندو لال کے پوتے نریندر پرشاد کے آپ نواسے ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۲۸۱ھ میں تولد ہوئے۔ مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ عربی فارسی اور انگریزی میں کافی مہارت پیدا کی۔ خوش نویسی میں ید طولیٰ حاصل کیا۔ نانا کے جانشین اور جاگیرات پیشکاری سے سرفراز ہوئے۔ سنہ ۱۳۱۰ھ میں پیشکاری کے ساتھ معین المہام فوج بھی بنائے گئے۔ سنہ ۱۳۱۹ھ میں مدار المہامی سرفراز ہوئی۔ سنہ ۱۳۳۰ھ میں اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کی مگر پھر سنہ ۱۳۴۵ھ میں صدارت

عظمیٰ کی جلیل القدر خدمت پر سرفراز ہوئے۔

شاعری کا خاص مذاق تھا۔ داغ اور آصف کی شاگردی کی ہے۔ آپ کے دربار میں شعرا اور مصنفین کا ہمیشہ جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ایک زمانہ تھا امیرؔ۔ جلیلؔ۔ ظہیرؔ دہلوی۔ سرشار وغیرہ آپ کے زمرہ مصاحبین میں شامل تھے اور پھر فانیؔ بدایونی ہوشؔ۔ بیگمؔ۔ محویؔ۔ غبارؔ۔ ثاقبؔ، صغیر وغیرہ آپ کے دربار میں رسائی رکھتے تھے شادؔ کا کلام صوفیانہ خیالات سے مملو ہے۔ ہندو اوتاروں کی شان میں صوفیانہ نقطہ نظر سے جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اردو میں ایک جدید اضافہ ہے۔

اب تک آپ کے کلام کے کئی ایک مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہو چکے ہیں۔ شادؔ کے کلام سے معلوم ہوگا کہ کیا بلحاظ نزاکت خیال و لطف زبان اور کیا بلحاظ ندرت جذبات و پاکیزگی حسیات قابلِ تعریف ہے۔ ۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا۔

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی ۔۔۔ شیدائے محمدؐ ہے وہ شیدائے مدینہ

احمد کے در پہ اس لئے ہیں جبہ سا رہا ۔۔۔ سجدے کے لائق اور کوئی آستاں نہ تھا
معراج میں حضور جو مدعو خدا کے تھے ۔۔۔ خلوت تھی کوئی اور وہاں میہماں نہ تھا

کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی ۔۔۔ رنگ شادؔ اب عاشقانہ ہو گیا

بال کھولے ہوئے لئے گیسوؤں والے آجا ۔۔۔ آجا آجا مجھے دامن میں چھپالے آجا
خوف یہ ہے کہ نہ ہو نوح کا طوفاں برپا ۔۔۔ رونے سے پہلے مجھے یار منالے آجا

گزرتے ہیں جی سے گزر جانے والے
بہت یاد آتے ہیں مر جانے والے
کسی کا یہاں حال کیا ہو رہا ہے
خبر بھی ہے او بے خبر جانے والے

مرا اور تیرا افسانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
وہی دو دل ہیں یارانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
مبارک شاؔد زاہد کو یہ جھگڑا کفر اور دین کا
مرا مشرب فقیرانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

ہوا نہ حال یہ وہ شوخ مہرباں فریاد
الٰہی یوں ہی گئی میری رائگاں فریاد
ستم رسیدہ ہوں ایسا کہ میری حالت پر
زمین آہ کرے اور آسماں فریاد
زمیں پہ آہ جو کھینچی فلک پہ جا پہنچی
خدا کی شان کہاں سے گئی کہاں فریاد
جفائیں لاکھ سہیں اور سہے ہزار ستم
نہ آئی ضبط محبت سے تا زباں فریاد

تجھے الفت نہیں مجھ سے یہ تم نے کیا کہا مجھ سے
گلہ مجھ کو ہے تم سے جیسے ہو تم بے وفا مجھ سے
خموشی کس لئے ہے بات کیوں مجھ سے نہیں کرتے
قسم ہے میرے سر کی سچ کہو روٹھے ہو کیا مجھ سے
ادھر سے باغباں دشمن ادھر سے تاک میں صیاد
ہے اک گل کے لئے بدلی زمانے کی ہوا مجھ سے
میں اپنا آپ عاشق ہوں میں اپنا آپ ہوں معشوق
حقیقت میری کیا جانے کوئی میرے سوا مجھ سے

طلب کرتا ہوں جو اس سے عطا کرتا ہے وہ مجھ کو
بحمد اللہ راضی شاؔد ہے میرا خدا مجھ سے

مثنوی

ساقی دے جام ارغوانی — جس سے ہوا منگ پر جوانی
لا جلد پلا دے دیر کیا ہے — رندوں کے لئے سبھی روا ہے
طاقت نہیں مجھ کو کر توانا — خم منہ سے لگا نہ کر بہانا
اس وقت وہ صبح دل کشا ہے — پھولوں کی بہار جانفزا ہے
نکہت ہے گلوں کی روح پرور — ہے آج مشام جاں معطر
آمادہ ہوں آج کچھ لکھوں میں — مدح خواجہ میں کچھ کہوں میں
لازم ہے مجھ کو نغمہ سنجی — رکھتا ہے یہ آرزو مرا جی
ممدوح کی مدح لکھ رہا ہوں — مداح حبیب مصطفیٰ ہوں

چند رباعیات پیش کی جاتی ہیں جو بلحاظ حسن و خوبی اپنی آپ نظیر ہیں۔

پانی جو یہ برس رہا ہے یہ رحمت ہے — کیا شان ہے معبود کی کیا قدرت ہے
دھوتا ہے گنہ گاروں کے سارے اعمال — یہ بندہ نوازی ہے عجب حکمت ہے

گھر سے جو چلے جا کے لحد میں پہونچے — ہم ہو کے فنا دار ابد میں پہونچے
دریا سے نہیں شاؔد جدا کچھ یہ حباب — چلتے چلتے سب اپنی حد میں پہونچے

ہرگز نہیں ہم رنگ بدلنے والے — ہیں مرد نہیں بات سے ٹلنے والے

حساد کو کیوں رشک نہ ہوگا اسے شادؔ　　جلنے کے لئے آئے ہیں جلنے والے

جیساکہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے مہاراجہ کو تاریخ نویسی کا بھی خاص ملکہ ہے۔ طوالت کے خیال سے صرف ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے جس کو آپ نے اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کی تخت نشینی کے موقع پر موزوں فرمایا تھا۔

سلامت رہیں میرے آقا آلٰہی　　بقا جن کے دم سے ہے ملک دکن کی

وہ آقا جو ہیں مسند آرائے دولت　　شہ ذی فتوت مہ کامگاری

سعید جہاں میر عثمان علی خان　　امیروں کے سلطاں غریبوں کے والی

ہوے جلوہ آرا جو تخت پدر پر　　تو سب نے کہا جان میں جان آئی

یہی شاہ محبوب کے جانشیں ہیں　　انھیں سے ہے خستہ دلوں کی تسلی

خدا کے کرم سے ہے امید ہم کو　　کہ یہ نونہال گلستان شاہی

اب وجد کے نعم البدل ہوں گے ثابت　　رہے گا جہاں ہو کے ان کا فدائی

رعایا کے دل کو مسخر کریں گے　　بصد دل نوازی بصد چارہ سازی

خلایق کے محبوب ہو کر رہیں گے　　پدر کی طرح سے بہ تائید باری

ہوا خواہ خرم ہوں بدخواہ پر غم　　بڑھے عمر اور اقبال میں ہو ترقی

یہ تاریخ دے نذر اے شادؔ چل کر

مبارک ہو سرکار مسند نشینی

رسا:۔ غلام مصطفیٰ نام اور رسا تخلص، حیدرآباد میں تولد ہوئے اور یہاں ہی تعلیم و تربیت ہوئی، کم عمری سے شعر گوئی کرنے لگے، حضرت داغ سے تلمذ تھا، ممتاز تلامذہ میں ان کا شمار تھا، جملہ اصناف سخن میں مہارت تھی

ضخیم دیوان غیر مطبوعہ ہے، رسا کے کلام میں تخیل کی بلند پروازنہیں ہے مگر پراثر ہوتا ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

شوخی سے بچا دل تو پھنسا دام حیا میں　　سو طرح کے انداز ہیں ظالم کی ادا میں
کس منہ سے کروں میں ستم و جور کا شکوہ　　وہ دیکھتے ہیں میری وفاؤں کو جفا میں
میں وصل کا خواہاں وہ مری مرگ کے طالب　　اب دیکھئے ہوتا ہے اثر کس کی دعا میں

ناکام محبت کو تدبیر سے کیا حاصل　　پہلو سے مرے بچ کر تقدیر نکلتی ہے
افسردہ رسا ہم ہیں اس درجہ شب فرقت　　جو آہ نکلتی ہے دیگر نکلتی ہے

ناامیدی سے تباہی خانۂ دل کی ہوئی　　ورنہ ارمانوں سے کیا آباد یہ ویرانہ تھا

وصل کی کوئی تدبیر نکالی ہوتی　　میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں

ایسا مٹا کہ نام و نشان تک نہیں رہا　　کیوں اے فلک میں مظہر شان ظہور تھا

نہ مارا تیغ سے تم نے ادا سے کر دیا بسمل　　کوئی تلوار کیسی ہے کوئی تلوار کیسی ہے[۱]

رعد:۔ میر نادر علی نام، رعد تخلص، خاندانی شاعر ہیں، آپ کے والد شعلہ کا تذکرہ ہو چکا ہے، عربی اور فارسی کی اچھی قابلیت تھی سناد الملک سید علی شوستری سے استفادہ کیا تھا، حکمت کرتے تھے، اولاً اپنے باپ اور پھر نظم طبا طبائی سے تلمذ رہا۔ نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں، جملہ اصناف سخن میں مشق سخن تھا، استاد سخن

---

[۱] مرقع سخن جلد اول صفحہ ۲۲۹ تا ۳۰۴)

بن گئے تھے، اردو کے مشہور اساتذہ کے رنگ میں کلام موزوں کرتے اور کامیاب رہتے تھے، درد، مومن، غالب، ریاض وغیرہ کے رنگ میں ان کا کلام قابلِ قدر ہے
سنہ ۱۳۶۳ھ میں انتقال ہوا۔

طالب تو بے شمار ہیں میرے سوا مگر　　مطلوب دوسرا نہیں تیرے سوا مجھے

حالِ دل سے وہ مرے واقف ہے　　حاجت نامہ و پیام نہیں

باوفا ہو کہ بے وفا لیکن　　دوست آخر عدو سے بہتر ہے

دل گیا جان گئی سب ہوئے مہماں رخصت　　نہ گئی پر نہ گئی تو شبِ فرقت نہ گئی

نہ کر خیال کبھی رعدؔ آشنائی کا　　اگر کیا ہے تو صدمہ اٹھا جدائی کا

حالتِ یاس میں تسکینِ دلِ زار تو ہے　　نہ سہی وصل مگر وصل کا اقرار تو ہے

ہوں بے خودیٔ شوق سے رسوائے محبت　　کرتا ہوں نہاں راز تو ہوتا ہے عیاں اور

اہلِ دلا پہ گرتی ہے برق بلائے ناز　　لیکن متاعِ صبر طلب گار دیکھ کر

رعدؔ اپنی بات کی کیا بات ہے　　وہ نہیں سنتے کہے جاتے ہیں ہم

میں نے مانا کہ تم مسیحا ہو　　یہ تغافل تو زہرِ قاتل ہے[1]

---

[1] مضمون راقم رسالہ آجکل اکتوبر سنہ ۱۹۴۵

سعید:۔ میر تراب علی خان نام سعید تخلص اور تراب یار جنگ خطاب، ۱۳۰۲ھ میں حیدرآباد میں ولادت ہوئی۔ میر داور علی خاں بہرام الدولہ کے فرزند ہیں۔ تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی۔ حکومت آصفیہ کی مختلف خدمات کو انجام دے کر وظیفہ حاصل کیا۔ سعید کا کلام صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ عموماً غزل گوئی کرتے ہیں۔ البتہ اس کے ساتھ سلام اور مرثیہ بھی موزوں کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

لذت درد نہیں، لذت فریاد نہیں ۔۔۔ اب وہ پہلی سی جفا اے ستم ایجاد نہیں

خدا کا شکر ہے آنسو ٹپک پڑتے ہیں آنکھوں سے
مصیبت ٹوٹتے جب دیکھتا ہوں اپنے دشمن پر

تری تیغ ادا کے اے ستمگر ۔۔۔ کھلے جوہر ہمارے امتحاں سے

نہیں اب آہ کرنے کی تمنا ۔۔۔ ملیں وہ لذتیں ضبط فغاں سے

سعید ان کے تیور یہ بتلا رہے ہیں ۔۔۔ ستم آج ہیں نا روا ہونے والے

مری تقدیر کے جتنے ستم تھے ۔۔۔ ملے کچھ آپ سے کچھ آسماں سے

دیکھا گیا نہ آپ سے یہ اور بات ہے ۔۔۔ بسمل کا حال دید کے قابل ضرور تھا

شہ کے سینہ پر سکینہ مدتوں سوتی رہی ۔۔۔ ایک دن آیا کہ سب خواب پریشاں ہو گیا

ناتوانی عابد مضطر کی اور منزل کڑی کس قیامت کی تھی حسرت دیدۂ زنجیر میں

ایک پیاسے کی لڑائی نے یہ ظاہر کر دیا کس شجاعت کا اثر تھا فاطمہ کے شیر میں[1]

حسرت:- مولوی عبدالقدیر المتخلص بہ حسرت، حیدر آباد کے مشہور مدرسہ دار العلوم میں تعلیم پائی، پنجاب یونیورسٹی سے امتحانات مولوی فاضل اور منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی مدرسہ دار العلوم میں مدرس کی حیثیت سے ملازمت کی ابتدا ہوئی اور جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ دینیات کی خدمت سے وظیفہ حاصل کیا۔ صاحب حال بزرگ ہیں، ارشاد اور ہدایت کے ساتھ شاعری بھی فرماتے ہیں۔ کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ۱۲۸۸ھ میں ولادت ہوئی ہے عربی، فارسی، اردو اور ہندی میں کلام موزوں کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

یاد نگہ مست میں تھا بے خبر ایسا بیکار رہے ساغر و مینا مرے آگے

آدمی آدمی سے ملتا ہے تم ملو گے تو کیا برائی ہے

تیر نگاہ بے پناہ خنجر غمزہ جاں ستاں مجمع عاشقاں میں آ مشق فنون ناز ہو

ساقی میں تیرے دست کرم پر نثار ہوں اک جام اور دے میں ابھی ہوشیار ہوں

عشق ہے دل لگی نہیں کھیل نہیں ہنسی نہیں
دل کو خود اپنے ہاتھ سے دیکھے یہ ہائے ہائے یوں

---

[1] مرقع سخن جلد اول صفحہ (۳۵۵ تا ۳۶۰)

عشق کرنے کو کلیجہ چاہیئے | جان دینے کا محبّت نام ہے

آج تک طے یہ مسئلہ نہ ہوا | ہوں بھی میں یا نہیں ہوں اے حسرت

بے نشانی ہے نشانی میری | نیستی میں ہوں نہ ہستی میں ہوں

چاہتے کیا تھے مگر کیا ہو گئے | جستجو میں ان کی ہم خود کھو گئے[1]

شباب:۔ میر معین الدین علی خاں نام اور شباب تخلص تھا، خاندان آصفی سے تعلّق رکھتے تھے۔ صاحبزادہ کہلاتے تھے۔ ۱۲۹۸ھ میں تولد ہوئے۔ مدرسہ اعزہ میں جو اس زمانہ میں صاحبزادوں وغیرہ کی تعلیم سے متعلّق تھا تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہو گیا۔ حبیب کنتوری سے تلمذ حاصل کیا، حبیب کنتوری کے انتقال کے بعد ضامن کنتوری سے اصلاح لینے لگے۔ پھر خود ہی استاد سخن بن گئے۔ دیوان مرتب ہو چکا تھا مگر اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ شباب کا کلام زبان کی لطافت، سادگی اور طرزِ ادا کے لحاظ سے قابلِ ستایش ہے۔

یا خدا ہو برا محبّت کا | ہم کو دونوں جہان سے کھویا

میں کوہِ طور پر اے حضرت موسیٰ نہیں جاتا | کسی کا جلوہ دل کے آئینہ میں دیکھ لیتا ہوں

لو آج آفتاب گہن سے نکل گیا | کہتے ہیں اپنے چہرے سے سرکا کے زلف کو

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۲۳۹ تا ۲۴۴)

ہم اور سخنم شعار کہیں، سر بسر غلط
یہ آپ کی زبان ہے ہماری زبان نہیں

آپ اف اف جو کر رہے ہیں شباب
کیا کلیجے کے داغ جلتے ہیں

اللہ رے شوق دید میں قبلہ نما بنا
آنکھیں اسی طرف کو پھریں تم جدھر گئے

وہ بغداد ہو کے چلے آئے میرے گھر
نہ دیکھ نارسائی آہ رسا نو کی

اس کے اٹھ جانے سے برہم ہو گیا سامانِ عیش
شمع جل کر بجھ گئی اور خاک پروانہ ہوا

دن نکل آئے جو اٹھے شب کو وہ رخ سے نقاب
گیسوئے مشکیں بکھر جائے جو دن میں شام ہو[1]

شہید:۔ میر مہدی علی المتخلص بہ شہید، شہید یار جنگ خطاب، ۱۳۰۳ھ میں تولد ہوئے۔ آپ کے دادا سید زین العابدین ہمدم طباطبائی شیراز سے آئے تھے اور مہاراجہ چندو لال کی استادی کا شرف حاصل کیا تھا۔ شہید کو شاعری کا ذوق ورثا ملا۔ اولاً نوحہ اور سلام موزوں کرتے اور پیارے صاحب رشید لکھنو سے اصلاح لیتے رہے۔ پھر نظم طباطبائی سے بھی مشورہ سخن لیا۔ مرثیہ، رباعی کے ساتھ غزل بھی موزوں کرتے رہے مگر کچھ عرصہ بعد غزل گوئی چھوڑ دی۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

بجھا گیا ستم ایجاد شمع تربت بھی
ہمارے غم میں کوئی اشکبار نہ تھا

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ ۲۵۷ تا ۲۵۹)

بہت آج کل آئینہ دیکھتے ہو تمہیں ہو گی اپنی نظر دیکھ لینا

نکلتا نہیں دم عجب کشمکش ہے خدا جانے کیا دل میں اب آرزو ہے

کیا ہے ابر نے چھڑکاؤ صحن گلشن میں جو خاک چھانئے ملتا نہیں ذرا سا غبار
گلوں کا رنگ جو کٹتا ہے سرخ ہے پانی ہے نہر باغ کی گردن پہ آج خون بہار
ہوئی ہے صحن گلستاں میں آج طغیانی بہا ہے پھوٹ کے نرگس کی آنکھ کا پانی
گلوں کی پتیوں پر قطرہ ہائے شبنم ہیں خدا کی شان کہ ٹھیرا ہے آگ پر پانی
نمو کا جوش زلیخا کا ہاتھ بن کے رہا کہ صحن باغ سے ظاہر ہے چاک دامانی
کثرت گل کا اثر یاد رہے عمر بھر ایک اٹھائیں اگر پھول اٹھ آتے ہیں چار

بے کار کی جستجو سے کیا ملتا ہے دل میں الفت ہو پھر پتا ملتا ہے
اقرار تو کر لے اپنی نادانی کا بندہ ہو جا تو پھر خدا ملتا ہے[1]

صفی :- محمد بہاء الدین نام لیکن بہبود علی سے مشہور ہیں۔ صفی تخلص ہے۔ اورنگ آباد ان کا مولد ہے جہاں ۱۳۱۰ھ میں ولادت ہوئی۔ عربی و فارسی کی تعلیم پائی۔ ایک آزاد اور سیدھے سادھے مسلمان ہیں۔ کچھ غزلیں ضیاء کچھ کلام فروغ کو بتایا پھر چند غزلیں کیفی کو بتائیں۔ اس لئے کیفی کے شاگرد مشہور ہیں۔ ضخیم دیوان مرتب ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات زبان کی شستگی، خیالات کی ہمواری اور روانی ہے، کیفی داغ کے شاگرد تھے۔ اور صفی نے

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۳۳۹ تا ۳۴۴)

کیفی کی شاگردی کی۔ اس لئے داغ کا رنگ بھی ان کے یہاں سے ملتا ہے۔ مگر چونکہ گویا چھن کر پہنچا ہے اس لئے بہت لطیف اور نازک ہو گیا ہے۔ ان کے بیان میں بلند پردازی نہیں ملتی۔ روزمرہ اور محاورہ بندی میں نفیس شعر ملتے ہیں۔ حسن بیان ہے ان کا زیادہ کلام سہل ممتنع ہے، تشبیہہ اور استعارہ کی ندرت بھی پائی جاتی ہے۔

صفی نے نظمیں بھی موزوں کی ہیں مگر غزلوں کے مقابلہ میں ان کی مقدار نہایت قلیل ہے یہ غزل گو شاعر ہیں۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔ اور رسالوں میں بھی اپنا کلام شایع کرنے نہیں دیتے۔ ان کی خودداری اور قناعت پسندی مشہور ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا ۔۔۔ دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی

قیامت آئی یا اس فتنہ قامت کو شباب آیا
جفا آئی، غرور آیا، ادا آئی، حجاب آیا

صفی کی جان بچ جائے تو بس ہے اس کے کوچے میں
وہاں سے زندہ آیا تو سمجھ لو کامیاب آیا

ادا پیدا نظر سے شان رُخ سے آن تیور سے
ترے قربان آخر دل ہے کس کس کیلئے ترسے

وہ چھیڑ بھاڑ کے دیتا ہے" سنتے ہیں" وہ کب دیگا
جب آنکھیں لگ گئیں چھپ کے تو کیا امید چھپر سے

وہ کونسا صدمہ ہے جو ہم پر نہیں ہوتا لیکن نہیں ہوتا نہیں باور نہیں ہوتا

آفتیں ڈھائیں غضب برپا کیا خیر تم نے جو کیا اچھا کیا

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے کانوں کانوں مجھے خبر نہ ہوئی

گریۂ اشک سے یاں رخصت بینائی ہے اور وہ پوچھتے ہیں "آنکھ تیری آئی ہے"

معشوق کو بدنام بھی کرنا نہیں آتا لوگوں کو برا کام بھی کرنا نہیں آتا

دوستی عاشقی نہیں ہوتی عاشقی دل لگی نہیں ہوتی

خدا سے دولت دنیا صفی میں کیا مانگوں غضب ہوا جو مرا کام بے بہانہ ہوا

تیرا خیال کیا ادھر آیا ادھر گیا جیسا ہوا کے گھوڑے پہ کوئی سوار تھا

ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جیتے جی بھی ہوتے ہیں انسان پر لاکھوں عذاب کیا بتاؤں ان کی گنتی کیا کروں ان کا حساب
ایک ان میں قرض، وہ بھی قرض سودی کی بلا جس کو یہ لپٹی ہوا پھر اس کا گھر کا گھر خراب
چیز پر، تنخواہ پر، جائداد پر قرضہ ملا وہ بھی جس کی تین میں گنتی نہ تیرہ میں حساب
سو میں ستر ہاتھ آئے تو بڑی دولت ملی کم ہوگیا اب سر کا سودا اور دل کا پیچ و تاب
ایسے پیاسے کی طرح مقروض کی حالت ہوئی دوڑے جو پانی سمجھ کر اور وہ نکلے سراب[1]

[1] مرقع سخن جلد اول صفحہ (۳۶۰ تا ۳۷۰)

عزیز:۔ محمد عزیز الدین خان، عزیز تخلص اور عزیز یار جنگ بہادر خطاب مشرف جنگ المتخلص بہ فیاض کے فرزند تھے، ۱۲۹۰ھ میں تولد ہوئے اور ۱۳۶۸ھ میں انتقال ہوا، عربی فارسی اور انگریزی کی تعلیم مدرسہ عالیہ میں حاصل کی۔

باانداق شاعر تھے داغ سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ کلام دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے۔ کلام کی صفائی اور شستگی قادر الکلامی کے شاہد ہیں ایک تک دو ضخیم دیوان شایع ہو چکے ہیں۔ استاد کے رنگ میں آپ کا کلام رنگا ہوا ہے۔ ۱۳۶۸ھ میں انتقال ہوا۔

حسن پر روز ازل سے دل مرا دیوانہ ہے
پھول پر بلبل ہے شمع بزم پر پروانہ ہے

بادہ وحدت پر دل کا مرے پیمانہ ہے
نعرہ اللہ اکبر نغمۂ مستانہ ہے

گر و کلفت سے معرا شست و شو سے بے نیاز
میری عریانی بھی گویا خلعت شاہانہ ہے

یا الٰہی ہو نہ جائے حشر کا دن مختصر
سرگزشت عمر کا میری بڑا افسانہ ہے

ساقی پیماں شکن پر میکشوں کا زور کیا
گردش تقدیر گویا گردش پیمانہ ہے

برق کا بھی خوف مجھ کو باد صرصر سے بھی ڈر
آڑے بیدھے چار تنکے نام کا کاشانہ ہے

منتظر ہیں بادہ کش باران رحمت کے عزیز
سامنے شیشہ دھرا ہے ہاتھ میں پیمانہ ہے

اضطراب دل و جگر دیکھو
لوٹتے ہیں ادھر ادھر دیکھو

دل مرا دیکھ کر جگر دیکھو
اس کی اس کو نہ ہو خبر دیکھو

دھجیاں ہیں مری گریباں کی
جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھو

راز غیروں پہ آشکار نہ ہو
میں ادھر دیکھوں تم ادھر دیکھو

بے وفا کون باوفا ہے کون ذرا تم دل میں سوچ کر دیکھو
دیکھتا ہوں نگہ ناز کو میں تم ادھر دیکھو یا ادھر دیکھو
بت کدہ سے اٹھو عزیز چلو دوسرا اور کوئی گھر دیکھو[1]

عظمت: عظمت اللہ خان کے والد نعمت اللہ خان صاحب دہلی کے باشندے تھے وہ جس وقت حیدرآباد آئے عظمت اللہ خان کی عمر صرف پانچ سال کی تھی اس طرح عظمت اللہ خاں کی پرورش اور تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی اور حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔ ۱۸۸۷ء سنہ پیدائش ہے اور ۱۳۴۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ علی گڈھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور مددگار ناظم تعلیمات کی خدمت پر مامور تھے۔

عظمت اللہ خان کا عین عالم جوانی میں مرض دق سے انتقال ہوا۔ ان کے عالم جوانی کی طرح ان کے ادبی کارنامے بھی شباب کے عالم میں تھے ان کی شاعری اور انشا پردازی ان کے مذاق اور کردار کے مظہر ہیں ظرافت اور شوخی ان کے لوازمہ زندگی تھے۔ اردو شاعری میں ان کا خاص درجہ ہے کیونکہ انہوں نے اردو شاعری کے لئے پھر قدیم ہندی بحروں کا انتخاب کیا اور ان کے بعد ہی لوگوں نے اسی طرف توجہ کی اور اب عام طور پر ایسی نظمیں بھی مقبول ہیں۔

مرحوم کی نظمیں گو تعداد میں مختصر ہیں مگر اپنی خوبیوں کے لحاظ سے گراں قدر قرار دی جاسکتی ہیں۔

مجھے پیت کا باں کوئی پھل نہ ملا مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

[1] دیوان عزیز

مرے تایا کے پوت تھے تم سبھی ہم — رہے ایک جگہ پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم — انھیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی — کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی — مری باتوں نے گھر ہی کو موہ لیا

تھے تو بالے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا — مرا دھیان کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا — مجھے کھیل میں بھی تو کیا نہ دکھی

مرے سر میں تمھارا ہی دھیان بسا — مری چاہ کے راج دلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا — مری بھولی سی آنکھوں کے تارے بنے

مرا جیوا ابھی سے ہے اس پہ فدا — یہ بھولی ہے موہنی میری بہو
یہ چچی کا کہا مرے دل نے لکھا — وہیں دوڑ گیا مرے منہ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے — سبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دلہن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے — کئی بار کہا مری پیاری دلہن

ہوئے بڑھ کے پنڈت تو عہدہ ملا — ہوا گیان کا گن کا جو شہر میں نام
یہ مزے کا نیا ہی شگوفہ کھلا — لگے مینہ کی طرح سے برسنے پیام

مرے تایا بڑے تھے زمانہ شناس — بڑے اونچے گھرانے میں ٹھہرا پیام
گیا ٹوٹ سا جی گئی ٹوٹ سی آس — مری چاہ کا ہو گیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمھاری دلہن　　بیں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جنی
کوئی اور نھی گو مری پیاری دلہن　　کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

مرا آخری وقت ہے آن لگا　　کوئی اور تمھاری ہے پیاری دلہن
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان بسا　　نہ بنی پہ رہی ہوں تمھاری دلہن

مجھے جینے جی پیت کا پھل یہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

سندر صورت سندر رہی ہے رنگت گوری یا کالی

اندھرا دیس کی سندر پتری کالی کوئل سی کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور اڈاہت میں لالی
دانت وہ اجلے موتی کی جلا

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پتلی بھونرا سی کالی
خمار اک مستانہ چھپایا
وہ من موہنی مقناطیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لبھایا

اور سراپا گدرا گدرا سانچے میں ڈھلا چکیلا

جوش جوانی پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلایا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن

اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اتراتی لہراتی
وہ گردن کا نفیس ڈھلاؤ
سینہ مستی کا جوالا کھ کمر لچکتی بل کھاتی
وہ ہوش ربا اتار چڑھاؤ

سندر صورت سنار رہی ہے رنگت گوری کالی
فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈالی
فطرت کے لئے حسن یہی ہے سچ دھج گرمانے والی
جان کی گھیتی جوتنے والی[1]

لمعہ :- سید نوازش علی نام اور لمعہ تخلص ۔ میر کاظم علی شعلہ کے فرزند ہیں ۱۲۸۷ھ میں حیدر آباد میں تولد ہوئے ۔ عربی و فارسی اور انگریزی کے علاوہ علم طب میں بھی مہارت پیدا کی ۔ آپ نے باپ سے تلمذ حاصل کیا اس کے بعد نظم طباطبائی سے بھی اصلاح لی ۔ کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ایک کتاب " اخلاقی شاعری کے اصول " پر لکھی ہے ۔

---

[1] رسالہ اردو ۔

لمعہ بھی ذہین کی طرح اخلاقی شاعری کی طرف مائل تھے۔ کلام صاف اور عیوب شاعری سے پاک ہوتا تھا۔

انھیں اس روز سے مشق ستم ہے　　نہ تھی جب ابتدا لوح و قلم کی
ترے کوچے کو جب مسکن بنایا　　زیارت کر چکے دیر و حرم کی

بھریں آہیں تو شعلے اور بھڑکے قلب سوزاں میں
بہے آنسو تو روغن پڑ گیا سرو چراغاں میں
نہ کیوں ہو خال سے حسن ملیح یار کی شورش
یہی تو کنکری اک رہ گئی ہے اس نمک داں میں
اڑے گا رنگ روئے گل بر رنگ بوئے گل آخر
ہم اے لمعہ سبق عبرت کا پڑھتے ہیں گلستاں میں

زنگی اور آئینہ

کسی زنگی نے اک آئینہ رستے میں پڑا پایا　　نظر آئی جب اس میں شکل زشت اس کی تو گھبرایا
وہ چپٹی ناک وہ نتھنے کشادہ ہونٹ وہ موٹے　　وہ چوڑے دانت جن پر ہو گماں غول بیاباں کا
ہوئیں یہ دیکھ کر غصے سے اس کی لال لال آنکھیں　　تھا کالا کوئلہ پہلے بنا اب سرخ انگارا
لگا مار سیہ کی طرح کھانے پیچ و تاب اس دم　　برائی اپنی صورت کی قصور آئینہ کا سمجھا
رہی بالکل نہ تاب ضبط جب اس کو تو جھنجلا کر　　زمیں پر آئینہ ٹپکا چڑھا کر ناک بھوں بولا
اسی سے تو کسی نے راستے میں اس کو پھینکا ہے　　نظر آتی ہے اس میں کیا تیری ہیئت بڑا اچڑا

جو اپنے عیب سے غافل ہیں ان کی ہے یہی حالت
خفا اے لمعہ ہوں اس سے بتائے عیب جو ان کا

کیفی:۔ سید رضی الدین حسن کیفی اس دور کے ایک مشہور اور نامور حیدر آبادی شاعر تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں تولد ہوئے اور رجب ۱۳۳۸ھ میں بمقام اجمیر انتقال کیا۔ کیفی ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید نظام الدین حسن آپ کے والد تھے جن کا چند سال قبل مدینہ منورہ میں انتقال ہوا۔

کیفی کی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں ہوئی منشی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ اس کے بعد کوئی اور امتحان نہیں دیا مگر ذہن رسا تھا جو کچھ پڑھا اس کو جلا دیا۔

کم عمری سے شاعری کا شوق تھا داغ کی شاگردی کی اور ان کے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کیفی کو حیدر آباد کا حالی قرار دیا جا سکتا ہے۔ حالی کی طرح کیفی نے قومی اسٹیج پر نغمہ سنجی کی ہے۔ اور ہمارے کانوں میں ہنوز وہ نغمہ سنجی گونج رہی ہے۔ جو مختلف قومی جلسوں میں ان کے خاص انداز میں ہم سنا کرتے تھے وہ سماں اور وہ جوش کبھی بھلایا نہیں جا سکتا جو مرحوم کی ولولہ انگیز، حیات بخش اور روح پرور نظموں کے سننے سے پیدا ہو جاتا تھا۔ اگرچہ کیفی دار فانی سے گزر گیا مگر اس کا کلام جب تک زبان اردو اس صفحہ روزگار پر باقی ہے زندہ رہے گا۔

کیفی کی غزلیں اپنے استاد کے رنگ میں ہیں۔ جو شوخی بیان۔ لطف زبان۔ حسن ادا۔ رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے لبریز ہیں۔

آؤ دیکھیں کیفی نے اس گلشن اردو کی سرسبزی اور آبیاری میں کیا کیا گل بوٹے

کھلائے ہیں اور کیسے کیسے نئے پودے لگائے ہیں کیفی کی تمام نظمیں اپنی فصاحت و بلاغت جدت و حسن تخیل۔ واقعہ نگاری روزمرہ غرض کہ ہر خوبی سے ممتاز ہیں۔

ان بے شمار نظموں کے منجملہ جو شائع ہو چکی اور مقبولیت عامہ حاصل کر چکی ہیں چند یہ ہیں۔

تاثیر محبت۔ جاہلیت کی انسانیت۔ وفائے عرب۔ بے فکری کا کرشمہ۔ سچا دوست۔ شکر نعمت۔ سفر وطن۔ قرض حسنہ۔ تعلیم نما۔ جاپان تلمیذ یورپ۔ چشمہ حیات۔ جام حیدری۔ ثمرہ وغیرہ۔

یہ تمام نظمیں بہمہ صفت موصوف اور شاعر کے کمال شاعری کا بہترین ثبوت ہیں۔

جاہلیت کی انسانیت میں امراء القیس اور سموائل کے مشہور قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے اور سموائل کی وفاداری کو کیا خوب ادا کیا ہے۔

ایک نوخاستہ فرزند سموال پے صید ۔۔۔ اتفاقاً جو کہیں گھر سے گیا تھا باہر
گھر کو واپس جو ہوا وشت سے وہ صید افگن ۔۔۔ دست صیاد اجل سایہ فگن تھا سر پر
یعنی اس بچہ کو حارث نے گرفتار کیا ۔۔۔ اور سموال سے کہا غیظ و غضب میں آ کر
دیکھ! ہے خبر اسی میں کہ وہ دے دے ہتیار ۔۔۔ ورنہ یہ تیغ ہے یہ ہے ترے فرزند کا سر
اس جوانمرد نے خاطر میں نہ لا کر اس کو ۔۔۔ غیر کی ملک کو فرزند سے سمجھا بڑھ کر

باپ کے سامنے بیٹے کو تہ تیغ کیا
پھر بھی ناکام پھرا گھر کو وہ ظالم کا پسر

آخری زمانہ میں کیفی کی توجہ غزلوں کی پرانے اور فرسودہ ڈھب کی شاعری سے

زیادہ جدید طرز کی شاعری کی طرف تھی۔ حیدرآباد کا کوئی ایسا قومی مجمع نہ ہوتا تھا جہاں کیفیؔ اپنی نغمہ سنجی سے جوش نہ پیدا کرتے ہوں۔ شکر نعمت۔ قرضہ حسنہ۔ تعلیم نما۔ جام حیدری ثمرہ اور صدا حافظ وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں جو مختلف قومی مجامع میں سنائی گئی ہیں۔

شکر نعمت والی نظم حجاز ریلوے کے افتتاح کی خوشی کے جلسہ میں۔ اور قرضہ حسنہ انجمن معین المسلمین کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی "تعلیم نما" اور جام حیدری۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے جلسہ میں سنائی گئی تھی۔ تعلیم نما اگرچہ تعلیم اور حصول علم وغیرہ کے متعلق مناسب حال کانفرنس لکھی گئی ہے اور اس قسم کی بکثرت نظمیں لکھی گئی ہیں مگر جو خاص کیفیت اس نظم میں ہے وہ ملاحظہ ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح دوسری نظم "جام حیدری" میں علم کی تشبیہ شراب سے دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ کوئی جدید ایجاد نہیں ہے لیکن جو خاص لطف اس "جام حیدری" میں ہے اور کسی جام میں نظر نہیں آتا۔

لمن اسمی الثنا حمد علی ما علم الاسماء
که آدم را شرف بخشید از تشریف کرمنا

وتسلیم علی من قال للناس اطلب العلم
که آدمی بود در علم و عرفان ریخت بر دینا

پس از حمد خدائے پاک و نعت احمد مرسل
مسلمانو! بزرگو! بھائیو سننا میری سننا

یہ میں کہتا نہیں تعلیم میں ہیں خوبیاں یہ یہ
میں یہ کہتا نہیں ہے بہتری تعلیم سے کیا کیا

میں یہ کہتا نہیں ہے لکھنے پڑھنے کی ضرورت کیوں
نہ یہ کہتا کہ ہے انداز تعلیم دکن کیسا

نہ میں قرآن سے ثابت کروں گا علم کی خوبی
نہ میں دوں گا حوالہ اب بخاری اور مسلم کا

نہ لاؤں گا دلیل ایسی ہیں اقوال آئمہ سے
نہ تاریخوں سے یہ ظاہر کروں گا علم ہے ایسا

نہ میں بغداد یونیورسٹی کا تذکرہ کرتا — نہ میں قصہ سناتا ہوں نظام الملک طوسی کا

نہ یہ کہتا گزشتہ دور میں تعلیم کیسی تھی — نہ یہ کہتا کہ چرچا علم کا اگلوں میں کیسا تھا

کہ پہلے تو نہیں ہے خود مجھی کو اتنی آگاہی — اگر ہو بھی تو ان باتوں سے اس وقت مطلب کیا

یہ باتیں سنتے سنتے بھر گئے کان اک زمانہ سے — ہزاروں ایسے لکچر ایسی اسپیچیں سنیں صدہا

اثر ان ایسی تقریروں میں ڈھونڈو تو نہ پاؤ گے — بجز درد اور دریغا ہائے حیف افسوس وا ویلا

تمھیں معلوم ہے دنیا ہے عزت کون انساں کو — غذا کپڑا؟ حویلی؟ ہاتھی گھوڑا اور یہ پیسا

نہیں ہرگز نہیں انسان کی اس سے نہیں عزت — کہ ہے انسان کی عزت کا باعث شان استغنا

اگر تحصیل علمی سے غرض تحصیلداری ہو — تو سمجھو ایسے عالم کو ہوا تعلیم میں دھوکا

غرض تعلیم سے یہ ہے کہ اطمینان خاطر ہو — بھروسہ آپ اپنی ذات پر انساں کرے پیدا

وہی تعلیم ہے تعلیم انسان جس سے انساں ہو — وگرنہ پیٹ بھرنے کے لئے جیتا ہے اک کتا

بس اب کیفی بہت کچھ کہہ چکے آؤ ادھر آؤ

متی اماتلق من تھوی دع الدنیا واھملھا

کیفی کی ہمہ گیر طبیعت جو ہر صنف میں مساویانہ قادر الکلامی کے جوہر رکھتی تھی چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

ہر چند گناہوں سے کنارا نہ کیا — پر تو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا

ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر — لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

تقدیر نے تدبیر کا دل توڑ دیا — پیمانۂ صہبائے طرب پھوڑ دیا

دنیا تو کبھی ہم سے نہ چھوٹی کیفی — صد شکر کہ دنیا نے ہمیں چھوڑ دیا

اب غزل کا رنگ ملاحظہ ہو جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ کیفی کی غزلیں شوخی بیان۔ لطف زبان۔ حسن ادا۔ رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے لبریز ہیں۔ ملاحظہ ہو

اسیر دام زلف یار چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا — طلسم عشق ہے کیفی نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا
نہ یہ سر محتسب کا ہے نہ یہ رندوں کا ساغر ہے — یہ میرے دل کا چھالا ہے نہ پھوٹا ہے نہ پھوٹے گا

اب بھی شیدا ہے زمانے کا زمانہ تیرا — ہائے دن سن وہ ترے اف وہ زمانہ تیرا
ضد لڑکپن کی گئی اب ہے جوانی کا غرور — نہ رہا وہ نہ رہے گا یہ زمانہ تیرا
یہ شب وصل ہے اے شمع تو ہو جا خاموش — کہہ نہ دے سوز جگر ان سے زمانہ تیرا
میں ہوں دیوانہ یہ ویرانہ ہے تو کیوں آیا — کیا یہاں دفن ہے اے شیخ خزانہ تیرا
کس سے شکوہ ہے شکایت ہے یہ کس سے کیفی — کوئی بیگانہ یہاں ہے نہ یگانہ تیرا

جی کڑا کر کے رکھو صحن گلستان میں قدم — دل نہ غنچوں کے چٹکنے کی صدا سے ڈھلے

نزاکت کا برا ہو وہ سنورنے بھی نہیں پائے — بڑی مشکل سے زلف عنبریں تک شانہ آتا ہے
خوشامد اور پھر اتنی خوشامد اس ستمگر کی — تجھے کچھ بھی خیال اے ہمت مردانہ آتا ہے
یہ مستی اور پھر یہ بت پرستی حضرت کیفی — بھلے مانس اسی پر دعوئے اسلام کرتے ہیں

لاکھ تو چھپ چھپ کے پردوں میں ہماری جان لے — جانتے ہیں ہم بھی تجھ کو تو بھی اتنا جان لے
تیرے وعدے کا بھروسہ کیا ہے اے پیمان شکن — اعتبار آتا نہیں سر پر اگر قرآن لے
یہ سماں یہ چاندنی اے مطرب عاشق نواز — جی پھڑک جائے ہمارا ایسی کوئی تان لے
مار ڈالا مار ڈالا لٹ گئے ہم لٹ گئے — تان لے پھر تان لے منہ پر دوپٹہ تان لے

دہاں تو بزم میں دشمن چلے آتے ہیں دشمن پر
یہاں فریاد پر فریاد ہے شیون ہے شیون پر

حسینوں کے جوش میں ثابت گریباں رہ نہیں سکتا
مرا احسان رہتا ہے ہمیشہ میری گردن پر

تمنّا اور پھر کیسی تمنّا ان کے آنے کی
بر آئے گی مگر کب؟ بعد میرے میرے مدفن پر

دل بیتاب کو تسکین دیتے جاؤ رہ رہ کر
کہیں سبقت نہ لیجائے تمھارے چلبلے بن پر

وہی کیفی وہی رستہ ہے آندھی ہو کہ بارش ہو
چلے آتے ہیں حضرت میکدے سے ایک ہی کن پر

گنہگار اور پھر مجھ سا خدائی میں نہیں کوئی
وہ عاصی ہوں کہ مجھ پر مغفرت کو ناز ہوتا ہے

عجب کچھ گومگو ہے داستان عشق بھی یا رب
نہ مخفی بات رہتی ہے نہ افشا راز ہوتا ہے

عزلت گزین کوئے ملامت کو ہر طرح
آسایش وطن بھی ہے لطف سفر بھی ہے

کیفی بلا رہا ہے انہیں تو جو اپنے گھر
اے خانماں خراب کہیں تیرا گھر بھی ہے

فکر معاد ہے نہ تلاش معاش ہے
کھویا گیا ہوں میں مجھے اپنی تلاش ہے

کیفی کے حال سے ابھی واقف کہاں ہیں آپ
ہم خوب جانتے ہیں بڑا بدمعاش ہے

ترک الفت کا ارادہ قصد روپوشی بھی ہے
اور دل میں تمنّائے ہم آغوشی بھی ہے
شیخ صاحب پی بھی لو اک بار کہکر یا غفور
زہد کا یہ زہد ہے نوشی کی مے نوشی بھی ہے

کس کے دل میں کھپ گئی کس کی نظر میں کھچ گئی
میرے دل سے شئے خدا معلوم کس تو بچ گئی
لے گئی سارے حواس اب نقد جاں پر دانت ہے

عرش تک آہ رسا کب میسری بے لا لچ گئی
اب تو میخانہ میں کیفی ایک سناٹا سا ہے
وہ جھمیلا میکشوں کا اور وہ کچھ مچ گئی

وہ نہ آتے ہیں نہ آئیں گے نہ آ سکتے ہیں
ہم بھی کس وعدہ فراموش کی راہ تکتے ہیں

بگڑ کے حضرت دل آپ کیا بنا لیں گے　　انھیں تو زعم ہے ہم روٹھ کر منا لیں گے

سر آرائش دستار و ذوق شانہ رکھتے ہیں
طبیعت دار عاشق وضع معشوقانہ رکھتے ہیں

کام غیروں سے کوئی بنتا ہے　　جس کا روٹھا اسی سے بنتا ہے

بہت سے کام ہیں اور ہے حیات تھوڑی سی
سوانگ حد سے زیادہ ہیں رات تھوڑی سی

دل گم گشتہ کو ڈھونڈا کہیں پایا نہ گیا　　وہ یہ کہتے ہیں یہاں کوئی تو آیا نہ گیا
ہائے ہم بھی کوئی انسان ہیں انسانوں میں　　ہم سے روٹھا ہوا معشوق منایا نہ گیا
صدمۂ ہجر بھی اک طرح کا احسان ہے مگر
وضعداروں سے نرے وہ بھی اٹھایا نہ گیا

محب:- محب حسین محب تخلص "حامی حقوق نسواں" کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں یہی پہلے شخص تھے جنہوں نے حقوق نسواں اور پردہ کے دور کرنے کے متعلق توجہ کی اور اپنے لکچروں اور کتابوں سے سالہا سال مسلسل کوشش کرتے رہے۔ خواتین کے لئے ایک علیحدہ نصاب کے لئے متعدد کتابیں نظم و نثر میں بھی لکھیں اور وہ آج سے بہت زہریلی غزلوں اور فحش نظموں کو مدرسوں کے درس میں سے نکال ڈالنے کے بانی تھے۔

محب ایک کہنہ مشق شاعر تھے دیوان اور کلیات شایع ہو چکے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنے غزلوں میں کن مضامین کو نظم کیا ہے۔ اور زمانہ کے رنگ کے خلاف کس طرح درد دل اور قومی نوحہ کو وہ غزلوں میں بیان کرتے ہیں۔ تصوف سے بھی خاص لگاؤ تھا خطوط محب ان کے خیالات کا آئینہ ہیں۔

۱۳۴۸ھ میں محب کا انتقال ہوا۔ حیدرآباد میں مدفون ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے

ہماری قوم بھی ضدی بڑی ہے — پرانی ریت رسموں پر اڑی ہے
عجب مشاطہ ہے تعلیم نسواں — یہی سرمہ ہے مسّی کی دھڑی ہے
ہمارے حال پر روتا ہے بادل — ہمیں بارش یہ اشکوں کی جھڑی ہے

علم کا ہندوستاں میں قدرداں ملتا نہیں — فلسفی کا اس جگہ نام و نشاں ملتا نہیں
جس کو دیکھو وہ مثال آسیا چکر میں ہے — چین اک دم بھی بزیر آسماں ملتا نہیں

لہو کا جام ہے یہ ساغر شراب نہیں — بھڑکتی آگ کا شعلہ ہے آفتاب نہیں
بیوہ کو وصل مرگ کا ارماں نہ ہو تو کیا — دنیا میں کوئی عیش کا ساماں نہ ہو تو کیا

عورتیں کہتی ہیں گھٹ گھٹ کے یہ زندانوں میں ‌ ‌ ‌ ‌ کیجئے کس سے بیاں حال پریشاں اپنا

درد ہمدردی نسواں کو دکھا ہی دیتے ‌ ‌ ‌ ‌ ہوتا ممکن کسی پہلو سے دکھانا دل کا

رواج و رسم پہ اچھے برے کا سب ہے مدار ‌ ‌ ‌ ‌ رہ ثواب نہ سمجھا نہ ہیں خطا سمجھا

پہن کے جامہ تہذیب گو بنیں انگریز ‌ ‌ ‌ ‌ چھپائے سے نہیں چھپتی گنوار کی صورت

عبادت تو بہت کی حور و جنت کے لئے زاہد ‌ ‌ ‌ ‌ کیا ہے بے غرض احساں بھی تو نے انساں پر

بڑھاپے ہیں یہ کمسن بیویاں کیا زیب دیتی ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ مسلط ایک بوڑھا دیو ہے گویا پرستاں پر

انھیں کی عصمت ہے قابل فخر جو ہیں آزاد بند سو

وہ خاک عفت ہے ہو جو حاصل اسیر قید فرنگ ہو کر

سخت جانی کا لکھے بیوہ کا کیا حال قلم ‌ ‌ ‌ ‌ اس مصیبت پہ تو پتھر کا کلیجہ بھی ہے شق

گیا ہے تا بفلک درد آہ بیوۂ ہند ‌ ‌ ‌ ‌ یہ اس کے دل کے بخارات ہیں سحاب نہیں

سر کر جائیں اعدائے تعلیم نسواں ‌ ‌ ‌ ‌ ہم اب سوئے سیف قلم دیکھتے ہیں

جب خدا نے ترجیح دی بیٹی کو بیٹے پر محب

کیوں نہ ہوں مردوں سے پھر بالا و برتر عورتیں

لئے جاتے ہیں جب صناع یورپ کھینچکر دولت

تو پھر خوشحال یہ عسرت زدہ ہندوستاں کیوں ہو

ازل سے دشمنی قائم ہے حق و باطل میں
جہاں رشوت مسلط ہو عدالت پھر وہاں کیوں ہو

گوری گوری یہ عورتیں جاہل — بت گھروں میں ہیں سنگ مرمر کے

سینہ زنی کو بیوہ کی تو دیکھتا رہا — اے سنگدل فلک تری چھاتی نہ پھٹ گئی

جہالت عورتوں کی زہر ہے اولاد کے حق میں
مگر نافہم اس کو بھی کوئی اچھی دوا سمجھے[1]

مسرور:- میر محمد علی المتخلص بہ مسرور، عربی فارسی میں بڑی اچھی مہارت تھی علوم مذہبی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ چودہ سال کی عمر سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ مرثیہ، سلام، نوحہ کے علاوہ رباعیات اور قصیدہ کی کافی مشق تھی کلام میں سلاست اور بلاغت پائی جاتی ہے۔

دنیا میں یتیموں کو رلایا نہیں کرتے — سہمے ہوئے بچوں کو ڈرایا نہیں کرتے
مہمان کو دیتے ہیں صدا راحت و آرام — پانی کے عوض خون بہایا نہیں کرتے
بازاروں میں بے برقع و بے مقنع و چادر — اک رات کی بیاہی کو پھرایا نہیں کرتے
زنجیر پہناتے نہیں بیمار کو تپ میں — دُرّے تن لاغر پہ لگایا نہیں کرتے

گو لاکھ عداوت ہو مگر تیر سہ پہلو
بے شیر کی گردن پہ لگایا نہیں کرتے

---

[1] دیوان محب

درود پڑھ کے یہ پوچھا کہ رہ گئی اک بات
ہیں ان میں ایسے بھی جو ان سے پہلے خلق ہوئے
کہا کہ یہ تو بہت صاف بات ہے حضرت
پسر کچھ اور ہے تصویر اور ہی کچھ ہے
کمی زیادتی ہوتی ہے باپ بیٹے ہیں
کہاں علی کی سب اولاد اور کہاں عباس

کچھ اور بھی تو ہیں فرزند شاہ خیبر گیر
وہ ہوں گے تیسرے پایہ ہنر بردنی توقیر
کہا ہے تیسرا بیٹا کہ تیسری تصویر
بہت لطیف ہے ہاں اس مقام کی تقریر
نظر میں اصل ہی آتی ہے دیکھ کر تصویر
ضرور چاند او وہ سب ہیں مگر یہ ماہ منیر

دکھایا حضرت عباس نے جمال پدر
علی نے پائی ہے آج اپنی تیسری تصویر[1]

بخوف طوالت اسی قدر نمونہ کلام پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ اس دور کے بیسیوں ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ملک سخن میں اپنے کلام سے چمن بندی کی ہے اور باغ اردو میں گل بوٹے لگائے ہیں بعض کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں۔

شاگردان فیض:۔

خواجہ محمود خان غیور، احمد علی قاضی، قطب الدین باطن، افتخار علی شاہ وطن، معروف علی شاہ فدا، نقش وغیرہ،

شاگردان داغ:۔

جہانگیر علی خان انفت، قادر محی الدین سلیم، محمد علی خان ناظم، نذیر علی رنگ وغیرہ،

دیگر شعراء۔ سید امیر اللہ امیر، بجرنگ پرشاد رمی، رشید الدین خان رشید،

---

[1] مرقع سخن جلد اول صفحہ (۳۰۹ تا ۳۲۰)

سید میراں سہا، شہامت علی خاں شہامت، سید ابراہیم عفو، رشید الدین عالی، صولت جنگ عابد، احمد یار جنگ فانی، سید غلام نبی نظمی، محمد عمر خاں وقار وغیرہ

اب بعض ان شعراء کا کلام پیش کیا جاتا ہے جو اگرچہ زاد و بوم کے لحاظ سے دکن کے نہیں کہے جا سکتے مگر بلحاظ اس اصول کے جو میں نے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔ دکھنی کہلانے کے ضرور مستحق ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے اپنی عمر کا بڑا حصّہ یہاں گزار دیا۔ ایسے شعرا بھی بہت ہیں مگر ان میں سے بعض کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

نظم:- علامہ علی حیدر طباطبائی المتخلص بہ نظم۔ نواب حیدر یار جنگ بہادر خطاب تھا۔ ۱۲۷۰ھ میں آپ کی پیدائش لکھنو میں ہوئی اور ننھیال میں پرورش پائی۔ منشی بینڈولال زار نے آپ کو تعلیم دی۔ عربی کی تعلیم ملّا طاہر نحوی سے حاصل کی مگر اس کی تکمیل قائمۃ الدین سے کلکتہ میں ہوئی۔ شہزادے مرزا کام بخش کی تعلیم کے لئے آپ کا تقرر ہوا اور کلکتہ میں قیام رہا۔ ۱۳۰۵ھ میں جب نواب واجد علی شاہ کا انتقال ہوا تو آپ حیدرآباد آئے اور نظام کالج میں پروفیسر ہوئے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے آپ کا تعلق ہوا اور حضرت آصفجاہ سابع کے شہزادوں کی تعلیم بھی آپ کے ذمہ ہوئی۔ ۱۳۵۲ھ میں حیدرآباد میں آپ کا انتقال ہوا۔

نظم طباطبائی سے کون واقف نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کا کلام بھی شہرۂ آفاق ہے۔ روانی و برجستگی کلام سے جوش طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ الفاظ کی تازگی سے کلام میں نگینے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں آپ کے قصاید مشہور ہیں ان میں سے زیادہ تر سیرت النبی سے متعلق ہیں مثلاً بعثت، فتح مکہ۔ معراج ہجرت

وغزدہ بدر و غیرہ۔

ان قصائد میں بلاغت تشبیہ و استعارات کا استعمال جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ اردو میں میر انیس کے بعد کسی نے نہیں لکھا ہے حقیقت میں وہ اعجاز ہے

قصیدہ بعثت میں تلوار اور گھوڑے کے متعلق تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

لکھوں ہر تیغ کی خوبی کہ ہر رہوار کی شوخی — جو آفت اس نے برپا کی قیامت اس نے بھی ڈھائی
کرشمے و راشارے ابرو معشوق کے اس میں — دل عاشق کی اس میں بیقراری ناشکیبائی
چلی وہ ناز سے بن کر تو یہ انداز سے تن کر — اڑایا اس نے سر کافر کا اس نے لاش ٹھکرائی
وہ بجلی کی طرح کوندی یہ شعلہ کی طرح بھڑکا — دم پیکار اس نے خون اس نے خاک برسائی
بہایا اس نے جوں جوں خون اس کے سم ہوئے رنگیں — اڑائی اس نے جوں جوں خاک اور اس نے جلا پائی

حرارہ جب لیا اس نے یہ کوندے کی طرح لپکا
ترارہ جب بھرا اس نے تو وہ بجلی سی لہرائی
جو اس کی آنچ تھی آفت تو اس کی چال تھی آندھی
لگائی آگ اس نے رزم گہ میں اس نے بھڑکائی
پسینہ میں جو یہ تر ہے تو اُس کے دامِ جوہر ہے
گہر ریزی جو اس میں تو اس میں گوہر آبائی

ابر کی تشبیہات قصیدہ ذکر جاہلیت و جہاد آنحضرتؐ میں ملاحظہ ہو ؎

اودی اودی یہ گھٹائیں ہیں کہ لیل الیل — بن گئی یا شب دیجور سمٹ کر بادل
ابر کہسار میں بال و پر شاہیں کا ہے رنگ — کہ جھکا پڑتا ہے وہ سبزہ سمجھ کر ہیریل

یوں کسی ہونٹ پہ چمنی نہیں دیکھی مستی
یوں کسی آنکھ میں گھلتے نہیں دیکھا کاجل
کر دیا مشک تتاری نے ہوا کو تاریک
بھر دئے ابر بہاری نے برس کر جل تھل

ہے ابر یا دیو سیہ سرشار و مست و خشمگیں
خنداں رخ و گریاں مژہ روشن دل و تیرہ جبیں
آتا ہے وہ قطرہ لئے پانی سمندر سے پئے
گرزا جدھر بکھرا دئے گلہائے در و یاسمیں
گریہ کناں گوہر فشاں قطرہ زناں دامن کشاں
مانند زلف مہوشاں تاریک و تار عنبریں
دل میں طرب لب پر فغاں سر پر کف و کف بر لباں
انداز میں پیل دماں آواز میں شیر عریں
باطن میں ہے فیض حاتم ظاہر میں ہے طرز ستم
دل میں چھپا ذوق کرم تیور سے پیدا خشمگیں
اٹھتا ہوا سر سے دھواں آب اور آتش درمیاں
کھینچے ہوئے رنگیں کماں جادو گر مندل نشیں
سنا سبھوں کی طرح سے روئے ہوا اڑتا پھرتا ہے
کہف و جبل میں یوں جیسے گزرے ہیں ایام دلنشیں

اعلیحضرت آصف جاہ سابع کی مدح کا قصیدہ جو بہ تتبع ذوق دہلوی لکھا ہے قابلِ تعریف ہے اس کے بعض بند ملاحظہ ہوں۔

عطارد تیرے اورنگ حکومت کا ثنا گر ہو
مگر خنجر کا تیرے شعلہ مریخ جوہر ہو
ضیاء میں بڑھ کے زہرہ سے ترے طالع کا اختر ہو
قمر فنجان شیر اور مہر تاباں مے کا ساغر ہو
یہ تیرا دور دور مشتری ہو بلکہ بہتر ہو
تیرے زیر نگیں مانند کیواں ہفت کشور

ترا حکم محکم بڑھ کے ہو سد سکندر سے
جہاں کے خشک و تر پہ تیرا باران کرم برسے
ترے انصاف و عدل و رافت مظلوم پرور سے
فلک کانپے زمیں لرزے جفا بھی ستم ترسے
دہائی تیری ہو عالم میں اور تو داد گستر ہو

سدا ڈنکا بجے بال ہما کا چتر سر پر ہو

تجھے اے آصف سابع ملے اوج سلیمانی ۔ دکن کو تیرے دم سے ہو سدا دعوی کنعانی

رہے مجرائیوں میں شان فغفوری و خاقانی ۔ در دولت پہ تیرے فخر ہو دارا کو دربانی

یہ چوکھٹ سجدہ گاہ تغلق و محمود سنجر ہو

یہ گھر وہ ہو جہاں آئینہ داروں میں سکندر ہو

انگریزی نظموں کے ترجمے بھی مولانا کی ایک خاص چیز ہیں ۔

یوں تو انگریزی نظموں کے اکثر و بیشتر ترجمے ہوئے ہیں مگر مولانا علی حیدر صاحب حیدر یار جنگ طباطبائی نے جو کمال اپنے ترجموں میں دکھلایا ہے واقعی یہ کہ وہ مولانا ہی کا حصہ ہے ۔

مولانا نے جس خوبی و عمدگی سے اکثر مشہور و معروف اعلیٰ درجہ کی نظموں کو بہترین اردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے ۔ اس کے استادان فن معترف و مداح ہیں ۔ چند نظموں کے انتخاب ملاحظہ ہوں ۔

"گرے ، انگلستان کا ایک نامور شاعر گزرا ہے جس کی شاعری کا مایۂ ناز اس کی مشہور و معروف "اِلے جی" یعنے مرثیہ ہے " اِلے جی کا اردو ترجمہ انتہائی خوبی و کمال کے ساتھ مولانا نے "گور غریباں" کے نام سے کیا ہے ۔

وداع روز روشن ہے گجر شام غریباں کا ۔ چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے

قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا ۔ یہ ویرانہ ہے میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے ۔ جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا عالم ہے

مگر لیکن کسی جا بھر دیں بے وقت گاتی ہے ۔ جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کبھی ایک گنبد کہنہ پہ بوم خانماں ویراں — فلک کو دیکھ کر شکوؤں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشہ عزلت میں ہوں پنہاں — کوئی پھر کیوں قدم اس کنج تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی — وہاں قبریں ہیں کچھ مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نمبر کے بس دو گز کفن گز بھر زمیں پائی — بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے — چراغاں اور صندل اور گل و ریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں نمگیرہ اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے — جو خوش آہنگ کوئی قاریٔ قرآں نہ ہو تو کیا

بناتے ہو بہو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو — پلٹ کر اس سے کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دعا ہو فاتحہ ہو مرثیہ ہو آہ و زاری ہو — کوئی آواز ان کے کان ہی تک جا نہیں سکتی

الگ ہر نیک و بد سے دور دنیا کے مکائد سے — گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسد سے — قدم راہ توکل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت — اور اس کے ساتھ ہی کچھ زیر لب کہتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھائے منہ بنائے رنج کی صورت — کہ جیسے دل پہ صدمہ ہے زباں جس سے ہے بیگانا

خدا بخشے اُسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا — تو نکلا دوست اک آخر خداوند کریم اس کا
اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا — کہ روشن ہے خدا پر عالم امید و بیم اس کا

زمزمہ فصل بہار (مضمون ناتمام ہے)

جدھر سے قافلہ گزرا ہو اندر کی سواری کا — وہ نسریں پوش لشکر انجم صبح بہاری کا

سبب تھا لالہ و ریحاں کی جو امیدواری کا　　جگایا جس نے جادو فصل گل کی لالہ کاری کا

جہاں بلبل کلیجہ توڑ کر فریاد کرتے ہوں　　جو قمری کو کتی ہو رقص سب شمشاد کرتے ہوں

وہیں مجھ کو بھی مل جائے کوئی گوشہ جو عزلت کا　　کوئی پتھر ہو تکیہ اور سبزہ فرش راحت کا
کنارہ نہر کا ہو وقت ہو جوشش طبیعت کا　　سبق اہل جہاں کے حال پر حاصل ہو عبرت کا

کہ ادنیٰ اوج پر چڑھتے جاتے ہیں اب عرش معلیٰ پر　　جو ہیں اعلیٰ جھکے پڑتے ہیں وہ تحصیل دنیا پر

ذرا اسننا انہیں میں سے کوئی ہنسکر یہ کہتا ہے　　خبر اپنی تو لے ناصح کہ تو بھی اک پتنگا ہے
اکیلا آیا تو دنیا میں اور اب تک اکیلا ہے　　نہ ہو جب شمع محفل میں تو کاشانہ اندھیرا ہے

کہیں ڈھونڈے نہ اب پائیگا طاؤس جوانی کو　　لب بام اب سمجھ لے آفتاب زندگانی کو[1]

جلیل:۔ جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل جانشین حضرت امیر مرحوم کو ایک زمانہ جانتا ہے کہ آپ کا کلام کسی تعریف یا تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ۱۳۶۵ھ میں آپ کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ آپ کی شاعری نے دکن میں اردو کی ترقی میں جو کام کئے ہیں ان کے مدنظر آپ کے ذکر خیر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

جب ترے عشق کا پھندا مری گردن میں رہا　　پھر برابر ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
قیس و فرہاد کا بھرتے رہے بہروپ جلیل　　یہی سودا تھا یہی کھیل لڑکپن میں رہا

---

[1] از نظم طباطبائی۔

رات دل سے مرے اس درد کے نالے نکلے　　گھر سے اپنے وہ کلیجے کو سنبھالے نکلے

فتوٰی دیا ہے مفتی ابر وبہار نے　　توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں　　کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ　　برہمن کیا ہم اسے پیش خدا کہنے کو ہیں
ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل　　جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی　　کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانہ کا
صحبت پیر مغاں میں یہ کھلا راز جلیل　　خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا

آج سنتا ہوں کہ دشمن سے گلے مل آیا　　اب مرے کام کا تو خنجر براں نہ رہا

کس کا سر سامنے قاتل کے نہیں خم ہوتا　　جھک کے تلوار بھی آداب بجا لاتی ہے

موت بھی روٹھ کے بیٹھی ہے مسیحا کی طرح　　کس سے پوچھوں کہ علاج شب فرقت کیا ہے
جلوۂ حسن ترا ہوش اڑا دیتا ہے　　یہی صورت ہے تو دیدار کی صورت کیا ہے

جو رات بھر تری محفل میں شمع جلتی ہے
زبان حال سے کہتی ہے داستاں میری

شرم عصیاں سے تلافی ہوئی مے نوشی کی　　غرق ہونے پہ بھی دامن نہ ہوا تر اپنا[1]

---

[1] دیوان جلیل۔

ضامن:- سید محمد ضامن صاحب ضامن عرصہ دراز سے آپ کا خاندان حیدرآباد میں متوطن ہے۔ آپ کا دیوان شایع ہو چکا ہے۔ رسالہ لسان الملک آپ ہی کی اڈیٹری میں شایع ہوا کرتا تھا۔

پیمانہ سے رندوں کا پیمان ارادت ہے ۔۔۔ ہر موج شراب ان کو محراب عبادت ہے
ہے مستحق رحمت زحمت کش محرومی ۔۔۔ زحمت جسے سمجھے ہو دیباچۂ رحمت ہے

دل میں طوفان تمنّا نظر آتا ہے مجھے ۔۔۔ قطرہ جولانگہ دریا نظر آتا ہے مجھے

رہ گئے دنیا میں بہر حال بسر کرنا تھا ۔۔۔ تھا ہلاک غم ہستی جو نہ شاداں ہوتا
حرف مطلب وہ جسے محو کیا ہے تو نے ۔۔۔ کاش میرے خط تقدیر کا عنواں ہوتا
موج مئے برق ہے اور برق ہے سامان حیات ۔۔۔ زندگی یہ تھی کہ پیمانہ سے پیماں ہوتا
دل میں ہوتے نہ اگر خار و خس دبیم و رجا ۔۔۔ رشک فردوس تمنّا کا بیاباں ہوتا

کیا کریں کس سے کریں شکوۂ قسمت ضامن
ہوتے کیوں قیدی زنداں اگر امکاں ہوتا

لارڈ ٹینی سن ملک الشعرائے انگلستان کی مشہور مثنوی "اینک آرڈن" کا نہایت عمدہ ترجمہ "شہید وفا" کے نام سے آپ نے لکھا ہے۔ اس کا کچھ نمونہ بھی ملاحظہ ہو:-

ڈھارس کی یہ گفتگو ہوا کی ۔۔۔ چپکی وہ غمزدہ سنا کی
دل کو ہر طرح سے سنبھالا ۔۔۔ امید پر غم کو اس نے ٹالا
لیکن جب اور ذکر آیا ۔۔۔ پلٹا کچھ گفتگو نے کھایا

اینک کرنے لگا نصیحت — جیسی ہے سپاہیوں کی عادت

اللہ کا آسرا بتایا — تعلیم و رضا کا ذکر لایا

خاموش رہی کہا نہیں کچھ — کچھ اس نے سنا سنا نہیں کچھ

جیسے کوئی گاؤں کی انیلی — بیٹھی ہوئی نہر پر اکیلی

رکھ کر خالی گھڑا تہ آب — خود بحر خیال میں ہو غرقاب

ہو پیش نظر وہ یار جانی — بھر کے اسے دیتا تھا جو پانی

حتیٰ کہ گھڑا بھرے چھلک جائے

لیکن یہ سنے بھی اور نہ سن پائے[1]

---

[1] رسالہ لسان الملک

چھٹے دور کی نثر

اس دور میں شاعروں کی طرح انشاپرداز اور مصنفین کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور ان کی تصانیف کی تعداد کئی ہزار تک پہنچی ہے اس دور میں مولفوں نے ہر قسم کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ سائنس، لسانیات، تاریخ۔ معاشیات۔ دینیات قانون۔ طب۔ ہندسہ۔ تعلیم اور زراعت غرض وہ کون علم و فن ہے جس پر کتابیں تالیف نہیں ہوئیں۔

جیسا کہ قبل ازیں واضح کر دیا گیا ہے کہ اس دور کے مصنفین ہیں ایک تو وہ اصحاب ہیں جنہوں نے مرحوم اعلیحضرت کے زمانہ میں بھی شہرت حاصل کر لی تھی اور اعلیحضرت سلطان العلوم کے عنان حکومت ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی اس دار فانی سے گزر چکے تھے۔ اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے اعلیحضرت سلطان العلوم کے زمانہ میں شہرت حاصل کی یا اس زمانہ میں انتقال کیا۔

اس زمانہ کے کئی انشاپرداز ایسے ہیں جن کا ذکر شعراء کی حیثیت سے ہو چکا ہے مگر وہ جہاں ایک طرف اقلیم شاعری میں ممتاز تھے تو دوسری طرف انشاپرداز کی حیثیت سے بھی امتیاز حاصل کیا ہے۔ لامحالہ ایسے ممتاز نثر نگاروں کی نثر کا نمونہ بھی پیش کرنا ضروری ہے۔ ایسے اصحاب حسب ذیل ہیں:۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر۔ حضرت امجد مدظلہٗ۔ نواب عزیز جنگ

مولوی غلام مصطفیٰ ذہینؔ مرحوم اور مولوی محبّ حسین مرحوم۔ مولوی عظمت اللہ خان مرحوم وغیرہ۔

بعض نثر نگار ایسے بھی ہیں جو بحیثیت نظم نگاری نظر انداز نہیں کئے جا سکتے تھے مگر محض بخیال طوالت اس کتاب کے حصّہ نظم میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ لیکن کتاب کے اس حصّہ میں ایسے افراد کا ذکر ناگزیر ہے۔ مثل ملا عبد القیوم۔ مولوی جمال الدین نورؔی۔ مولوی سید اشرف شمسیؔ۔ راجہ راجیشر راؤ اصغرؔ۔ مولوی انوار اللہ خان انورؔ مرزا مہدی خان کوکبؔ وغیرہ۔

ان دونوں طبقوں کے علاوہ بعض ایسے اصحاب ہیں جنہوں نے صرف نثر میں اپنے آرا و افکار کو قلم بند کیا ہے۔ مثلاً نواب سر امین جنگ بہادر۔ نواب قادر نواز جنگ مرحوم۔ مولوی عبد القادر صاحب مرحوم۔ مولوی مرتضیٰ مرحوم۔ مولوی سید خورشید علی صاحب۔ حکیم سید شمس اللہ قادری۔ عبد الجبار ملکاپوری۔ مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب۔ محمد سلطان صاحب۔ ملا عبد الباسط۔ مختار احمد صاحب امیر حمزہ صاحب۔ حافظ محمد مظہر صاحب۔ مولوی عبد السّلام مرحوم۔ نواب فرام جنگ مرحوم مسٹر بہرام جی کانگا صاحب وغیرہ۔

اولاً طبقہ اول کے اصحاب کی عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت امجدؔ مدظلہ: آپ کی نثر کے متعلق "مکتوبات امجد"[۱] میں تفصیل کی گئی ہے۔ نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

"کوئی کہتا ہے، کاش ہم مسلمانوں کو ایسی سادہ اور بے تکلف زندگی بسر

---

[۱] راقم کی ایک دوسری تالیف ہے۔

کرنے کی توفیق ہوتی، عورتیں مہمان آتیں ہماری خانگی زندگی اور طرزِ معاشرت سے حیران رہ جاتیں، نہ کھانے کی فکر، نہ پکانے کا خیال نہ بیوی کو میاں کا خوف نہ میاں کی بیوی پر بجا حکومت، اس پندرہ سال کی طویل مدت میں میاں نے بیوی سے کسی دن کھانا تک نہیں مانگا۔ نہ بیوی نے میاں سے کسی قسم کی کوئی بجا فرمائش کی دل میں ہر وقت خوشی کی لہریں اٹھتی تھیں، صرف ایک کا وجود دوسرے کے لئے باعث مسرّت تھا، ایک کی بات دوسرے کے لئے سوغات تھی۔"[1]

"وہ آیا اور اس طرح آیا کہ میں پہچان نہ سکی کیونکہ وہ رسمی لباس سے عریاں، گرد و غبار میں اٹا ہوا، سر سے پا تک خاک آلود تھا۔ وہ میری دہلیز پر سر جھکائے کھڑا تھا اور میرے رحم و کرم کا متمنی، میں پہچان نہ سکی کہ وہ کون ہے۔ لیکن اس کی تباہی اور شکستہ حالی کو دیکھ کر جی بھر آیا۔ میں نے کہا کہ اے شکستہ حال آ، اندر آ۔"[2]

"جلوے کی گھڑی تھی، اور رات کا وقت، دولہا دولہن آمنے سامنے سرنیوڑھائے دولہن تو اپنے دولہا کے بالمقابل ہو کر بھی نہ ہونے کے برابر، وجود میں نشان عدم دکھا رہی تھی۔ لیکن کشیدہ قامت، نوعمر، نوخیز، حسین، مہ جبین دولہا۔ اپنے توشاہانہ لباس میں پیشانی پر افشاں، پتلے اور نازک ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمائے جب جلوے کی چوکی پر جلوہ آرا ہوا، ایک بجلی تھی جو چمک گئی، ایک جگمگاتا آفتاب تھا جو سارے تماشائیوں کی نگاہوں کو خیرہ کر گیا۔

یہی نظارہ مجاز میں رنگ حقیقت دیکھنے کے لئے کیا کم تھا کہ میراسنوں کے دقتیہ گیت نے تو قیامت ہی قائم کر دی نظری توجہ سماعت کی طرف کھنچ گئی آنکھیں بند ہو کر

[1] جمال امجد۔ [2] جمال امجد

کان کھل گئے"۔[1]

(۲) یمین السلطنتہ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کی نثر کا نمونہ پیش ہے اب تک آپ نے کئی تصنیفات مختلف فنون میں فرمائی ہیں اور بکثرت آپ کے مضامین اکثر رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔

"زمانہ اپنی نیرنگی اور متلون مزاجی سے آئے دن کی تبدیلیوں کا اکھاڑا ہے اور اس کی دلفریب نیرنگیاں کل یوم ھو فی شان کی پوری مصداق ہوتی جاتی ہیں یہی تبدیلیاں اور نیرنگیاں دانشمند اور فیلسوفوں کی چشم دوربین کے منظر ہوکر زمانے کے تغیرات کا ثبوت عین الیقین کی حد تک پہنچاتی ہیں اور اسی درسگاہ عالم سے العالم متغیر کا سبق حاصل کرتے ہیں اور اس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکایا جاتا ہے ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرے پر کھل جاتا ہے اس کی قلابازیوں کی چپیٹ میں جو آتا ہے وہ اس کا ہو رہتا ہے۔ البتہ اہل بصیرت اس کی تبدیلیوں کو "ہرچہ دانی بدانکہ مظہر اوست" کی صورت میں دیکھ کر معرفت الٰہی کا سبق لیتے جاتے ہیں جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے نورات کے سارے علم و عمل باطل کر دیتا ہے۔ اور تمام عالم پر نور کا کافور بکھیر دیتا ہے سوتوں کو نیند سے جگا دیتا ہے۔ نکموں کو کام پر لگا دیتا ہے۔ طبیعتوں سے سستی کو دور کر دیتا ہے۔ موجودات عالم کی ہر چیز کو آفتاب کی روشنی میں ہماری نظر کے سامنے کر دیتا ہے تاکہ اس کی دلچسپیوں سے لطف اٹھانے کا موقع ملے جو لوگ اپنے دین کے پکے اور روشن دماغ ہوتے ہیں اور بصیرت

---

[1] حکایات امجد

کے چراغ نے جن کے دلوں سے تاریکی دور کر دی ہے وہ لوگ ۲ اللہ نور السمٰوات والارض کے ثبوت دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جعل النہار معاشا کی جستجو میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں [۱]

سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہینؔ :۔ ذہین صاحب کی نثر حسب ذیل ہے :۔

"کشور تن کا رئیس تخت صنوبری پر متمکن اعضائے حیات پر حکمران کہنے کو دو حرف کا نام مگر دو جہان کے کام تفویض ملک سیرت شریعت پر ثابت قدم طریقت پر راسخ دم بصیرت کی عینک لگائے انوار قدرت کو دیکھتا ہے۔ معرفت کا مزا پاتا ہے حقیقت کا لطف اٹھاتا ہے۔ مگر کوئی دل وفادار ہے کوئی بے وفا کوئی پاک ہے کوئی نجس کبھی غمگین ہے کبھی شاد، کبھی بامراد ہے کبھی نامراد ؎

گہے بر تارم اعلیٰ نشیند
گہے بر پشت پائے خود نہ بیند

اہل دل کے سینہ میں آفتاب ہے نااہل کی چھاتی میں داغ۔ عاشق کا دل عاشق سے بیزار اور معشوق کا طرفدار عاشق کے پہلو سے نکل کر اس کو بے دل کر دیا اور اہل باطن کے سینہ میں رہ کر صاحب دل بنا دیا۔ غرض دل کے ہاتھوں کوئی شادماں ہے کوئی نالاں کوئی کہتا ہے ؎

ہو جان بھی تو جا کے کچھ مداوائے دل کروں
کب تک میں دل پہ ہاتھ مرے ہائے دل کروں

[۱] رسالہ ذخیرہ

مولوی محب حسین مرحوم:- کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

کسی قوم وملک کی زبان پر جس قدر عورتوں کا اثر ہے اس قدر مردوں کا اثر نہیں۔ وہ زبان کی موجد۔ محافظ اور جلا دینے والیاں ہوتی ہیں۔ اسی اثر کی وجہ سے ہر ایک قوم کی خالص زبان اس کی زبان مادری کہلاتی ہے جس زمانہ میں قوم روم کا عروج تھا تو اس وقت اس قوم کی عورتیں اپنے بچوں کو مادری زبان کی تعلیم دیتی تھیں اور نکات فصاحت و بلاغت سکھاتی تھیں۔ رومی عورتیں زبان کے نئے نئے محاورے تراشتی تھیں اور ثقیل الفاظ کو کانٹ چھانٹ کے درست کرتی تھیں نوجوان اشخاص ان کی سوسائٹیوں میں بیٹھ کر زبان کے عمدہ محاورے اور شستہ الفاظ سیکھتے تھے اس وقت ہمارے زمانہ میں بھی محلات کی اُردو زبان مستند سمجھی جاتی تھی اور دلی اور لکھنو کی شریف عورتیں اس کی محافظ خیال کی جاتی تھیں۔ میں نے خود جناب نواب میرزا خان صاحب داغ فصیح الملک کو اپنی بیوی سے بعض محاورات دریافت کرتے ہوئے سنا ہے۔"

مولوی عظمت اللہ خان مرحوم:- عظمت اللہ کی نثر کا نمونہ یہ ہے۔

"باری تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت پیدا کرنا ہے، جب تک انسان کے دل و دماغ میں پیدا کرنے کی قوت موجزن نہ ہو یا دوسرے الفاظ میں جب تک انسان کا تخیل شاعرانہ نہ ہو، خالق کائنات کے حسن کا احساس ممکن نہیں، زندگی، نہ صرف پیدا ہونا ہے بلکہ پیدا کرنا بھی ہے . . . . تصوف کا تمام دار و مدار اسی پر ہے کہ محنت اور مصائب کی چوٹیں دل پر ایسی لگائی جائیں کہ دل

پکا پھوڑا، انتہائی صاحب احساس بن جائے، درد کی آگ میں دل کوڈالنے ہی سے انسان کے دل پر کا زنگ صاف ہوجاتا ہے۔ یعنی بے حسی دور ہوتی ہے۔"[1]

"اچھا اب ہم اٹوائی کھٹوائی کو لیتے ہیں، میاں شباب خان کی دلہن آئیں، ساس نے بہو کی چٹ چٹ بلائیں لیں، کیا کرتیں مجبور تھیں، مسہری کے مباحث، دمنازل طے کرنے کے لئے بیٹے اور بہو کو دو بدو چھوڑنا پڑا، جی کو یہی چاہتا ہے کہ ایسی بہو بیاہ لائیں جو بیٹے کی دلہن کہلائے، مگر مسہری کے پارلیمنٹ سے کوری رہے، مگر یہ ناممکن، اچھا بیٹے کی شادی کیوں کر نہ کرتیں اس کے گھر کا آباد ہونا اس کا سہرا دیکھنا اور پوتے کو گود وں کھلانا بھی بیچاری بڑی بی کا اب رہا سہا ارمان تھا، غرض صبر و شکر کر کے رات کاٹی، اپنی بیاہی، اور ان بیاہی بیٹیوں اور مصاحب خاص مغلانی سے حملہ اور مدافعت کا مشورہ کیا صبح ہی گربہ کشتن روز اول کے کارگر اصول پر پیش قدمی شروع کر دی۔"[2]

نواب عزیز جنگ مرحوم :-

نواب عزیز جنگ بہادر نے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن کا موضوع قانون۔ تاریخ۔ فلاحت۔ لغت ادب وغیرہ جیسے مختلف النوع علوم ہیں۔ آپ کو جو قابلیت اور ہمہ گیری تھی وہ بہت کم اشخاص کو میسر ہوتی ہے۔ آپ نے جہاں قانون مالگذاری و علمیات و حساب میں قلم کی جولانی دکھائی ہے وہیں تاریخ اور سیاست کو بھی نہیں چھوڑا ہے جہاں فلاحت و باغ بانی میں قابل قدر تصانیف مرتب کی ہیں وہاں عملی تجربہ کی خاطر بہت دلکشا باغ بھی تیار کیا تھا۔ اسی طرح کبوتروں کی پرورش پر بھی ان کو عملی توجہ تھی نوان کے متعلق دوسروں کی آگاہی کے لئے کتاب بھی لکھی

[1] خواجہ میر درد (رسالہ اردو)   [2] رسالہ شہاب

اس کے علاوہ آپ بڑے منتظم بڑے باضابطہ اور سلیقہ مند تھے آپ کی سلیقہ شعاری اور تنظیم کا آج تک شہرہ ہے۔ ربیع الاول ۱۳۴۳ھ میں حیدرآباد میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی اردو کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) تاریخ النوائط (۲) عطیات سلطانی (۳) سیاق دکن
(۴) ترکاری کی کاشت (۵) فلاحت النخل (۶) کاشت انگور
(۷) غرائب الجمل (۸) حیوۃ الحمام (۹) مصطلحات دکن
(۱۰) آصف اللغات (۱۱) التانیث والتذکیر (۱۲) کلیات ولا
(۱۳) تصویر نور (۱۴) حیات العزیز (۱۵) خزینہ حساب
(۱۶) اعظم العطیات (۱۷) صدر مجموعہ قانون و گشتیات مالگذاری۔
(۱۸) عمدۃ القوانین (۱۹) شیرازۂ دفاتر۔

ان کے علاوہ کئی کتابیں فارسی میں ہیں۔ آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

"مولوی قادر عظیم خان اپنی تصنیف گلستان نسب میں فرماتے ہیں۔ کہ نائط گفتن اینہا را بہ سبب نسبت فرزندی از وائط نبیرہ جعفر الطیار رضی اللہ عنہ است بہ سبب کثرت استعمال واؤ مبدل بنون شدہ۔ محمد قاسم ابن محمد ہاشم تذکرہ مشاہدہ الاصفیا نے بھی انھیں الفاظ کے ساتھ قوم نایط کی وجہ تسمیہ بیان فرمایا ہے۔ اتحاد لفظی سے پایا جاتا ہے کہ صاحب گلستان نسب نے اسی تذکرہ سے اپنی کتاب میں عبارت نقل کی ہے مصنف گلستان نسب نے آگے چل کر کتاب کشف الانساب سے استدلال فرمایا ہے جو فاضل متبحر علامہ شیخ جلال الدین سیوطی محدث شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے جس میں شیخ نے اس قوم کو بنو لوائط لکھا ہے اور عبداللہ الوائط کی

اولاد قرار دیا ہے۔ صاحب کشف الانساب ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اس قوم کا مقام مدینہ مطہرہ سے ہجرت واقع ہونے کے بعد موضع واسطیں رہا ہے جو بغداد سے تین دن کی راہ تھی۔ مؤلف کتاب کہتا ہے کہ اس موضع کا نام بھی قوم کی وجہ تسمیہ میں کچھ دخل رکھتا ہے۔"[1]

"متقدمین کے بعد متاخرین کا زمانہ آیا اور ان کے بعد متوسطین کی نوبت آئی۔ ہر زمانے میں ہر شخص کا ذوق طبیعت جدا رہا۔ جس استاد نے اپنے کلام میں جس لفظ کا استعمال چاہا کیا۔ اور جس لفظ کو چاہا ترک کیا۔ لیکن ترک الفاظ کی یہ دھوم نہ تھی اور نہ کسی نے کوئی رسالہ یا ہدایت نامہ ترک الفاظ کے متعلق شائع کیا وہ سمجھ رہے تھے یہ رنگ کچھ مستحسن اور سنجیدہ نہیں ہے کہ کسی اور کے ذوق کو ہم اپنے ذوق کا تابع بنائیں۔ اور کنایۃً استادان سلف کے نام پر دھبہ لگائیں۔"[2]

ملا عبد القیوم مرحوم:۔ ملا عبد القیوم کا نام حیدر آباد کے قومی کارکنوں کی فہرست میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ آپ کے اجداد کا وطن مدراس تھا۔ آپ کے دادا عارف الدین خان رونق حیدر آباد آئے۔ ملا صاحب کی پیدائش حیدر آباد میں ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دار العلوم میں تعلیم پائی۔ ۱۲۹۴ف میں مددگاری نظامت تعلیمات سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ آپ نے اپنے زمانہ میں اس سررشتہ کی جو خدمت کی ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ آپ نے اصلاح کی جو کوشش شروع کی اس کی بدولت اس سررشتہ کے اخراجات دو لاکھ سالانہ کے بجائے پانچ لاکھ ہو گئے۔ کتب خانہ آصفیہ کا قیام آپ کی سعی و کوشش کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ جبری

---

[1] تاریخ النوائط
[2] حیات العزیز

تعلیم کے مسئلہ پر بھی آپ نے کامل غور کیا تھا اور ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ "استدعاء تعلیم جبری" اس زمانہ میں مرتب ہوئی تھی جب کہ ہندوستان میں مسٹر گھوکھلے جیسے علم بردارانِ تعلیم جبری نے ابھی اپنا کام شروع بھی نہیں کیا تھا۔

مددگاری تعلیمات کے بعد آپ نے مختلف عہدوں پر ترقی پائی۔ ڈپٹی کمشنر انعام ہوئے۔ اور آخری زمانہ میں اول تعلقداری پر کارفرما تھے۔ وظیفہ حسن خدمت حاصل کرنے کے بعد رمضان ۱۳۲۴ھ میں انتقال کیا۔

حجاز ریلوے کی تعمیر کے زمانہ میں آپ نے اپنی حسن سعی سے لاکھوں کا چندہ فراہم کیا حیدرآباد کی علمی اور ادبی دنیا کے آپ روحِ رواں تھے۔ سیاسیات ہندوستان میں آپ نے ابتدائی زمانہ میں اہل کانگریس سے اتفاق رائے کر لیا تھا اور بڑے پرجوش کانگریسی تھے۔ غالباً آپ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے کانگریس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ بہت بڑا عملی حصّہ بھی لیا۔

ملا صاحب اپنی صلح پسندی اور حسنِ اخلاق کے باعث بہت ہر دلعزیز اور علم و فضل دیانت تقوی کے ساتھ زندہ دل بھی تھے۔ آپ کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔ شاعری بھی کی ہے۔ سلاؔ تخلص تھا۔

"علم سیاست مدن میں یہ امر مسلمہ و تصفیہ شدہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں محتاج معاش ہے اور وجوہ معاش انسانی بعض طبعی ہیں اور بعض غیر طبعی۔ ذرائع معاش فلاحت صناعت تجارت ہیں اور غیر طبعی ذریعہ خدمت ہے اس لئے پانچ ہزار سال سے یہ مثال زبان زد خاص و عام ہے" اوتم کھیتی مدھم بیپار" چاکری کنشٹ بھیک ندان" اوتم کھیتی اس واسطے ہے کہ انسان اپنی پہلے یا دوسرے درجہ کی ترقی سے جو کھوؤں اور جنگلوں سے نکل کر تمدنی

حالت کی طرف ترقی کرتا ہے تو زراعت پیشہ بنتا ہے اور یہ پیشہ انسان کا فطری وسیط اور سب سے مقدم پیشہ ہے اس لئے اس کو ابوالبشر آدم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور انہی کا ایجاد کردہ اور تعلیم دادہ سمجھتے ہیں اکثر صحرانشینوں اور بادیہ گزینوں کا یہی پیشہ ہے۔ صنائع اور حرفت چونکہ مرکبہ اور نظری و فکری ہیں اس سے متاخر اور دوسرے درجہ پر ہیں چونکہ ان میں سے اکثر علمی ہیں جو محتاج نظر و فکر و ممارست ہیں اس لئے اہل حضارت میں ان کا وجود پایا جاتا ہے نہ کہ اہل بداوت میں جب بداوت سے حضارت کے مرتبہ پر انسان ترقی کرتا ہے تو محتاج صنائع و حرفت ہوتا ہے لہذا اس کو انسان کی ترقی کے دوسرے درجہ میں شمار کیا جاتا ہے۔"

(رسالہ صحیفہ)

مرزا مہدی خان کوکب:۔ ان اصحاب میں سے ہیں جو حیدر آباد سے سب سے پہلے بغرض تعلیم انگلستان گئے۔ آپ کے کئی مختلف علوم سے متعلق مضامین اور تراجم علمی رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے تھے۔ بعض مستقل کتابیں بھی شایع ہو چکی ہیں۔ آپ کی تحریر کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ جو "فزیالوجی کے متعلق ہے":

"ہر چند یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ ہم حیوانات نباتات اور احجار (پتھروں) کے ناموں اور ان کی حقیقتوں سے واقف ہوں اور یہ کہ وہ کہاں اور کیونکر پیدا ہوتے ہیں کن امور میں وہ ایک دوسرے سے مشابہت یا مباینت رکھتے ہیں کس طرح پر وہ ہمارے لئے مفید و کارآمد یا مضر ہو سکتے ہیں اور پچھلی صورت میں ہم اپنے آپ کو ضرر سے کس طرح بچا سکتے ہیں اور یہ بھی نہایت دلچسپ امر ہے کہ اجسام بہ سبب قوۃ جاذبہ کے زمین پر کس طرح گرتے ہیں اور روشنی کس طرح منعکس ہوتی ہے اور

برق کو کیونکر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن جو چیز ان سب سے زیادہ اہم اور زیادہ دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ ہم خود کیونکر زندہ رہتے ہیں اور یہ کہ ہم اتنی عجیب و غریب چیزوں کے مشاہدہ کرنے اور بنانے پر کیونکر قادر ہوتے ہیں اور اس بات کا علم حاصل کرنا لازمی ہے کہ ان جانوروں کی تاریخ کیا ہے جو ہمارے اطراف میں ہیں جن کی زندگی ہماری زندگی سے بہت کچھ مشابہ ہے اور اپنے آپ کو پہچانیں کہ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہ صاف بتلا رہا ہے کہ ہم اپنے خدا کو نہیں پہچان سکتے جب تک کہ ہم اپنے آپ کو نہ پہچانیں پس فزیالوجی وہ علم ہے جس میں بظاہر حیات سے بحث ہوتی ہے۔ یعنے علم افعال ابدان سے اور یہ لفظ دو یونانی لفظوں سے مرکب ہے فزیس بمعنی فطرت یا طبیعت اور گولوس بمعنی علم یہ قول مشہور ہے۔ العلم علمان علم الابدان وعلم الادیان اس میں علم ابدان کو مقدم جاتا ہے جس سے اس علم کی شرافت ظاہر ہے

...... سانس اندر لینے کے اثناء میں ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ہماری پسلیاں بھر آتی ہیں اور سینہ چوڑا ہوتا ہے اور پیٹ پھولتا ہے جیسے ہی ہوا ناک یا منہ میں سے داخل ہو کر شش میں پہنچتی ہے اور تنفس خارجی میں یعنی سانس چھوڑنے میں اس کا عکس واقع ہوتا ہے پسلیاں وغیرہ اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہیں پیٹ چپٹا ہو جاتا ہے اور چو طرف سینے کی گنجائش گھٹ جاتی ہے اور سینہ میں سے ہوا اس طرح خارج ہوتی ہے جیسے بھٹے سے۔

اگرچہ بھتے کے ساتھ شباہت ہے لیکن وہ قوت جو کہ ہوا کو شش میں داخل کرتی ہے اور نکالتی ہے بالکل مختلف ہے"[1]

---

[1] رسالہ افادہ۔

مولوی جمال الدّین نوری :- بھی اسی دور کے شاعر اور انشاپرداز تھے۔ مدرسہ دار العلوم میں تعلیم پائی۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی تھی عرصہ تک نظام کالج میں پروفیسر رہے۔ کلام غالب پر آپ بسوط شرح قلم بند کر رہے تھے۔ ذیل میں اس کا انتخاب درج ہے۔ ۱۳۵۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے ہر امتحان میں اوّل آئے ہیں۔

غالب کا شعر ہے

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب　　اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

پہلے وہ گرد کے معنی واضح کرتے ہیں اور شعراء کے کلام سے ثبوت دینے کے بعد لکھتے ہیں :-

"طرح طرح کی مصیبتیں جب کسی پر ٹوٹ پڑتی ہیں تو رنج پر رنج دے کر آسمان کا رنگ دکھاتی ہیں اور انقلاب کا عالم نیرنگ انبساط کا رنگ اکھڑ جاتا ہے۔ اور بہار عشرت پر خزاں آتی ہے۔ دل پر غم چھاتا ہے اور شگفتگی پر اوس پڑ جاتی ہے۔ جگر بھی جل کر کباب ہوتا ہے اور تازگی خاک میں مل جاتی ہے۔ نہ دل میں خوشی رہتی ہے نہ کلیجہ میں ٹھنڈک رنج مصیبت کے ہاتھوں دل و جگر خون ہو جاتے ہیں۔ سینہ پرخون ہو جاتا ہے اور بہاؤ بڑھ کر دریائے جیحون شعر کا مطلب یہ ہے کہ آگے مصیبت کی صورت نہیں دیکھی تھی عیش و نشاط کا عالم تھا اور لطف زندگی کا زمانہ عشرت کے سامان مہیّا تھے۔ رنگ محلوں میں رنگ رلیاں سوجھتی تھیں دور جام چلتا تھا۔ انجام کا خیال نہ آتا تھا۔ خوات راحت میں عمر کٹتی تھی اور زندگی کا مزا آتا تھا اس کے بعد ایک

دم سے ہوا بدل گئی اور خوش دلی کا ورق اُلٹ گیا وہ بپتا مجھ پر پڑی کہ غم واندوہ کے بادل گرجنے اور درد والم کے پتھر برسنے لگے چوٹ پر چوٹ کھائی اور صدمے پر صدمے اٹھایا اس لئے دل خون ہوگیا۔ جگر لہولہان ہوگیا۔ ناسور سے چشمے ابلنے لگے اور خون کا ایک دریا امنڈ آیا اور لہر کر بہنے لگا اس لئے اب یہ گت بن گئی ہے کہ دل سے لے کر جگر تک دریائے خون کا ساحل ہوگیا ہے۔ روز و شب خون جگر پیتا ہوں اور غم کھا کر جیتا ہوں۔ غرض جس راہ گزر میں اب غم کا جوش طوفان خیز اور لہو کا شور انگیز ہے آگے اسی میں غضب کی دلکشا فضائیں اور روح افزا ہوائیں تھیں۔ غم سے فراغ تھا دل باغ باغ تھا اور جگر بے داغ گویا فصل بہار آئی تھی اور دل سے جگر تک تمام رہ گزر گلزار ہوگئی تھی۔ چمن کی شادابی اور گل کی سیرابی شہرۂ آفاق ہو کر ضرب المثل ہوگئی ہے۔ لیکن خوش حالی اور فارغ البالی نے وہ پھول باغ یہاں لگایا تھا کہ سینہ بے غم اور دل خرم کی شگفتگی نے لالہ زار میں آگ لگائی۔ گلستان ارم پر بجلی گرائی۔ ابر نوروز کی آبرو برباد ہوگئی تھی ہنگامۂ بہار سرو تھا اور جلوۂ گل گرد۔ مقصد اصلی اگرچہ یہی تھا کہ جلوۂ گل ناچیز اور بے حقیقت ہوگیا تھا لیکن مصنف نے جلوۂ گل کی گرد رہ گزر میں اڑا کر ایک لطف مضمون پیدا کیا ہے"[1]

مولوی سیّد اشرف شمسی مرحوم:-

رسالہ حسن کے مشہور مضمون نگار تھے آپ کے اکثر مضامین پر رسالہ حسن کی جانب سے اشرفیاں نذر کی گئی ہیں۔ صحیفہ ماہواری میں بھی آپ کے اکثر مضامین شایع ہوئے ہیں۔

---

[1] رسالہ ترقی

مدت تک آپ مدرسہ دار العلوم میں مدرس رہے۔ آخر زمانے میں عثمانیہ کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ محرم ۱۳۴۹ھ سنہ میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے جو حکیم الاشراق شیخ شہاب الدین کے حالات سے ماخوذ ہے۔

"شیخ الاشراق کے فلسفی تصانیف سے صاف یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو ارسطو طالیس کے اکثر اصول فلسفہ سے سخت اختلاف تھا۔ اگرچہ شیخ نے اپنی کتابوں میں ارسطو کے مسائل ترتیب وار ذکر نہیں کئے ہیں تاہم جس طور پر ان کا ذکر کیا ہے بغیر اعتراض و مواخذہ نہیں چھوڑا ہے۔ کلمۃ الاشراق اگرچہ بظاہر فلسفہ کی کتاب معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں یہ کتاب فلسفہ ارسطو کا رد ہے یا اس کے فلسفہ کو کمزور کر دینے والی ہے اگرچہ اصول منطقیہ میں شیخ نے ارسطو طالیس سے زیادہ اختلاف نہیں کیا ہے تاہم بعضے مسائل مثلاً مسئلہ تحدید و فصل وغیرہ میں ارسطو کی رائے سے بے حد مخالفت کی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ حقایق و انواع کی تحدید اُن کے اوصاف ذاتی و عوارض ذاتی سے ہو جاتی ہے لہذا تحدید اشیاء کے لئے فصول ذاتیہ کی ضرورت نہیں ہے جس جگہ شیخ ارسطو پر فصول اشیاء میں مواخذہ کیا ہے اس جگہ یہ بحث بھی کی ہے کہ یہ ضرورت نہیں ہے کہ جواہر کے فصول جواہر ہی ہوں بلکہ جائز ہے کہ اعراض ہوں چنانچہ سریر کی حقیقت چند لکڑی کے ٹکڑے اور ہیئت سریر کے سوا کوئی چیز نہیں ہے[۱]۔

راجہ راجیسور راؤ:۔ راجہ راجیسور راؤ بہادر بھی اس عہد کے ایک پُرگو مصنف ہیں۔ آپ نہ صرف ایک نثار کی حیثیت

---

[۱] رسالہ صحیفہ

سے پیش کئے جا سکتے ہیں بلکہ شاعری کا بھی خاصہ ملکہ تھا، اصغر تخلص کرتے تھے۔
اسٹیٹ دوم کنڈہ کے آپ والی تھے اسٹیٹ کے کاروبار کے ساتھ آپ کی
عملی مصروفیت قابل تعریف اور لایق ستایش ہے، اور پھر آپ کی تصانیف مختلف
فنون میں تقسیم ہیں جن سے آپ کی ہمہ دانی کا پورا ثبوت ملتا ہے فن لغت سے
آپ کو بڑی دلچسپی رہی علاوہ شایع شدہ لغتوں کے بلحاظ حروف تہجی عربی، فارسی
اور اُردو کی (۲۶) جلدیں مکمل ہیں جن کو ہنوز شایع نہیں کیا گیا ہے۔ آپ کی تصانیف
کی فہرست حسب ذیل ہے۔

محبوب الاخلاق۔ حدیقۃ الاخلاق۔ گلبن دانش۔ گلزار دانش۔ ریاض دانش
کشف الاسرار۔ ہدیۃ الملوک۔ تاریخ جہانگیری۔ معالجات الکلب، تشریح الفرس
گنجینہ امثال۔ کارنامہ، نجم اللغات۔ مفتاح اللغات۔ افسر اللغات، فرحت
کدہ آفاق۔ قرآن السعدین۔ مجمع البحرین۔ نغمۂ عنادل۔ تاریخ ہند۔ طبقات
اکبری۔ مجموعۂ ضرب الامثال۔ مجمع الالفاظ۔ فرہنگ فارسی جدید۔ گلدستہ
مصوری۔ رامائن۔ کشکول۔ بہا بھارت۔ القاموس الجدید الخط العثمانی۔ اس کے
علاوہ فارسی تصانیف علیحدہ ہیں اس طرح آپ کی جملہ تصانیف تالیف اور
تراجم کی تعداد (۳۵) سے زیادہ ہوگئی ہے۔ تصوف سے بھی آپ کو بڑی
دلچسپی تھی۔ آپ کا کتب خانہ بیشمار کتابوں کا حامل تھا۔ فلاحت اور زراعت
سے بھی آپ کو خاصی دلچسپی تھی۔ آپ کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

"دروپدی کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے رحم وکرم کے غمزدہ لہجہ میں التجا کی
اور کہا ارے! آج چھتریوں کا پاک دھرم برباد ہو رہا ہے۔ کوئی ہے جو میری

حفاظت کرے۔ درو پدی کو روتی ہوئی دیکھ کر پانڈو غصہ سے کانپنے لگے مگران کے منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ادھر کمینہ دشاسن درو پدی کی چوٹی پکڑ کر برہنہ کرنے کی کوشش کرتا ہوا ہنسنے لگا۔ اس وقت کرن نے بھی کہا کیوں درو پدی اب کہو یاد ہے کہ نہیں؟ سوئمبر کے وقت تم نے بھرے دربار میں سوت کا بیٹا کہہ کر میری بے عزتی کی تھی۔ یہ تمام اسی غرور کا نتیجہ ہے۔ دریودھن نے کہا کیوں درو پدی یاد ہے کہ نہیں جب کہ میں دربار محل دیکھنے کے وقت پانی میں گر پڑا تھا اس وقت تو بھی پانڈوں کے ساتھ کھل کھلا کر ہنسی تھی یہ تمام اسی نخوت کا ثمرہ ہے۔ تمہارے شوہروں نے تم کو جوے میں ہارا ہے اب تم ہماری باندھی ہو۔ آؤ یہاں ہماری بغل میں بیٹھو۔[1]

مولوی انوار اللہ مرحوم:۔ مولوی محمد انوار اللہ نام اور خان بہادر فضیلت جنگ خطاب تھا۔ قلمرو آصفی کے ایک قصبہ قندھار میں بتاریخ ۴ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے جو آپ کے اجداد کا وطن تھا۔ یہاں آپ کے اجداد کابل سے آکر مقیم ہوئے تھے۔ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے آپ نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی ۱۲۹۵ھ میں آپ مرحوم اعلیٰحضرت غفران مکان کی تعلیم پر مامور کئے گئے۔ اس کے بعد ۱۳۰۸ھ میں اعلیٰحضرت سلطان العلوم کی تعلیم کے لئے بھی متقرر ہوئے جس کا سلسلہ ۱۳۲۹ھ یعنی اعلیٰحضرت کی تخت نشینی تک قائم رہا۔ اعلیٰحضرت سلطان العلوم کے زمانہ میں پہلے آپ ناظم امور مذہبی بنائے گئے پھر صدر المہام امور مذہبی کی اہم خدمت

---

[1] مہابھارت صد ۴۳

تفویض ہوئی اپنے انتقال تک اسی خدمت کے فرائض انجام دیتے رہے اس کے علاوہ برادران والاشان کی تعلیم بھی آپ کے سپرد رہی ۔ ۱۳۳۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا ۔

مدرسہ نظامیہ آپ کی زندہ یادگار ہے ۔ علوم اسلامیہ میں آپ سند تھے ۔ سیر ۔ کلام ۔ فلسفہ اور مناظرہ وغیرہ میں آپ نے معرکتہ آرا کتابیں لکھی ہیں ۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے ۔

"کشف کے معنی مرزا صاحب یہ لیتے ہیں کہ اس میں صورت مثالی ظاہر ہوتی ہے ۔ اگر یہی معنی کشف کے ہیں تو چاہیئے کہ اگر کسی چیز کا خیال کر لیا جائے تو اس کو بھی کشف کہیں، اس لئے کہ اس میں بھی آخر صورت خیالی کا کشف ہوتا ہے ۔ اور دونوں میں اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ اور اگر بعد تغیر کے انطباق صورت مثالیہ کا صورت خارجیہ پر ممکن ہے تو بعد تحقیق کے صورت خیالیہ کا انطباق بھی صورت خارجیہ پر ممکن ہے، پھر ایسا کشف جس کو خیال پر بھی فضیلت نہ ہو سکے اس کو کشف کہنا اندھیر ہے ۔

تمام اہل کشف کا اتفاق ہے جس سے اولیاء اللہ کے تذکرے بھرے ہوئے ہیں کہ جس چیز کا کشف ہوتا ہے اس کو وہ کراۃ العین دیکھ لیتے ہیں اور جو کچھ وہ خبر دیتے ہیں برابر اس کا ظہور ہوتا ہے ۔ مگر مرزا صاحب اس کو کیوں ماننے لگے تھے"[1]

اب ہم بعض ایسے اصحاب کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے شاعری میں کوئی حصّہ نہیں لیا ہے ۔

---

[1] انوار الحق صفحہ (۵۹)

مولوی عبدالقادر مرحوم:- راقم کے والد مولوی عبدالقادر مرحوم نغلام محمد خان شرف الدولہ غالب جنگ کے فرزند اکبر تھے۔ شرف الدولہ کا تعلق ریاست ارکاٹ سے تھا۔ آپ کا خاندان ان اصحاب سے تعلق رکھتا ہے جو ابتداً تبلیغ اسلام کے لئے سواحل ہند پر تشریف لائے تھے۔ اور پھر گوا اور بیجاپور میں قضاءت سفارت وغیرہ مختلف ذمہ داری کی خدمت انجام دیں اور عالمگیر کے عہد میں مختلف ممالک دکن میں پھیل گئے پھر روساء ارکاٹ کے زمانہ میں ذمہ داری کے مختلف مناصب مثلاً دیوانی اور قضائت وغیرہ انجام دیئے ہیں۔

مولوی عبدالقادر مرحوم کی پیدائش ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں ہوئی۔ سالار جنگ مختار الملک اول کے حسب الطلب حیدرآباد آئے اور ۱۲۹۲ فصلی میں منصف جالنہ مقرر ہوئے۔ آسماں جاہ کے عہد وزارت میں رجسٹرار بلدہ ہوئے اور اپنے انتقال تک اسی خدمت پر مامور رہے۔

اڑتالیس سال کی عمر میں رجب ۱۳۲۴ھ میں آپ کا بمرض دق انتقال ہوا۔ مدراس کی مسجد والاجاہی میں مدفون ہوئے۔

حیدرآباد میں قومی زندگی کو نشوونما دینے میں آپ نے بہت بڑا حصّہ لیا ہے مختلف علمی اور معاشرتی اداروں کے قیام میں آپ نے خاصہ عملی حصّہ لیا ہے اور بعد قیام ان کے کاروبار کو بخوش اسلوبی چلانے میں آپ کے مخلصانہ مشوروں سے بڑی مدد ملتی تھی۔ حیدرآباد کا سن رسیدہ طبقہ آپ کی خدمات سے بخوبی واقف ہے۔ سلطنت آصفیہ پر بیرون ملک کے اخبارات جو بے بنیاد الزام عائد

کرتے تھے اس کا آپ دنداں شکن جواب دیا کرتے تھے۔ مولف قلمرو آصفی نے آپ کے متعلق اپنے دیباچہ میں حسب ذیل صراحت کی ہے۔

"اگرچہ حیدرآباد میں ان کے اخلاق وتدین کے مداح سیکڑوں نہیں ہزاروں ہیں مگر بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ انگریزی سے ناواقف رہنے اور مشرقی علوم میں بھی یدطولیٰ نہ رکھنے کے باوجود ان کو حیدرآباد کے تاریخی سیاسی، تمدنی۔ اقتصادی مسائل پر پورا عبور تھا۔ البتہ بے وقت موت سرکاری ملازمت حیدرآبادی خصوصیات کے لحاظ سے ان کو موقع نہ مل سکا کہ ملک کی اس قدر خدمت کرسکیں جس قدر کہ وہ کرسکتے تھے۔"

آپ کی تصانیف کی تعداد بیس سے زیادہ ہے مگر ان میں سے بہت کم شایع ہوئی ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"لارڈ کرزن اپنی اسپیچ میں ریاست کے مقروض ہوجانے کا باعث اس طرح ارشاد فرماتے ہیں کہ حیدرآباد حال میں قحط اور دیگر صدموں سے جیسا کہ اور ریاستوں میں ہوا ہے خزانہ کی ابتری کا صدمہ بھی اٹھا چکا ہے .... جبکہ قحط سالی کا دورہ ہر مدارالمہام کے عہد میں ضرور ہوتا رہا اور سلطنت نے اس کے روکنے کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کی باایں قرضہ کا بار اس قدر نہیں ہوا تھا، تو خود بخود یہ نظر آتا ہے قرضہ کی اصل وجہ قحط سالی نہیں بلکہ ملکی ضرورتوں سے ناواقف یوروپین نگرانی ہے، اگر مسٹر کرالی یوروپین اصول کے برخلاف اور مشرقی خیالات کی تقلید میں جس کی بدولت ہماری سلطنت پر یہ اعتراض ہو رہے ہیں فیاضی کا ہاتھ اس قدر نہ بڑھا دیتے اور مسٹر ڈنلاپ انتظام قحط سالی میں ان

عہدہ داران کو شتر بے مہار کی طرح نہ چھوڑ دیتے جن کی نالایقی و بددیانتی کی وجہ سے یورو پین نگرانی کی ضرورت بیان کی جاتی ہے، اور ان پر پوری نگرانی رکھتے تو ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اس قدر قرضہ کبھی نہ ہوتا، اور سلک موجودہ سے (لعلہ) زیادہ سلک موجود رہتی۔

اب ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ قحط سالی گذشتہ زمانہ میں بھی موجود تھی کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہماری رائے نامہ نگار لندن ٹائمز کی طرح محض خیالی نہیں بلکہ محض واقعات اور صحیح اعداد پر مبنی ہے"[1]

مولوی مرتضیٰ مرحوم:— مولوی مرتضیٰ مرحوم، مولوی صفی الدین مرحوم کے فرزند تھے۔ مولوی صفی الدین مرحوم کی خدا ترسی، صداقت اور حق گوئی سے جدید حیدرآباد بخوبی واقف ہے۔ مولوی مرتضیٰ کی پیدائش ۱۲۹۸ھ میں ہوئی۔ مدرسۂ دار العلوم میں آپ نے تعلیم کی تکمیل کی۔ سارے امتحانات نمایاں اعزاز کے ساتھ کامیاب کئے اور بعض امتحانوں میں کل پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے ہیں۔

بعد ختم تعلیم معتمدی عدالت میں آپ کا تقرر ہوا۔ بوقت انتقال مہتممی اوقاف کی خدمت پر مامور تھے۔ یکم رجب ۱۳۲۴ھ کو بعارضہ طاعون آپ کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔ درگاہ حضرت یوسف صاحب شریف صاحب رح میں مدفون ہیں۔

ملک کا تعلیم یافتہ وہ کون فرد ہے جس کو مولوی مرتضیٰ مرحوم کی قومی خدمات

---

[1] از مضمون لندن ٹائمز اور حیدرآباد۔ مطبوعہ مخبر دکن جنوری ۱۹۰۳ء

یاد نہ ہوں۔ معتمد ایجوکیشنل کانفرنس کی حیثیت سے انہوں نے تمام ملک میں تعلیمی شوق و ولولہ پیدا کرنے میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی اور کانفرنس کے فنڈ سے صدہا غیر مستطیع طلبہ کو بیش قرار مدد دی جس کے باعث وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے غرض حیدرآباد کی ترقی تعلیم ادر جامعہ عثمانیہ کے قیام میں ان کا عملی حصّہ تھا۔ مولف ”عہد عثمانی میں اردو کی ترقی“ نے تفصیل کے ساتھ آپ کے کارنامے بتائے ہیں۔ اور مولوی سردار علی صاحب نے آپ کے علمی کارناموں کی صراحت مشیر دکن میں کی ہے۔ مختلف اخبارات اور رسائل مثل معارف علی گڈھ صحیفہ حیدرآباد میں آپ کے بیسیوں مضامین شائع ہوئے اور نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے ارباب علم نے بھی ان کی قدر کی۔ ”روح ترقی“ اور ”تاریخ التاریخ“ دو رسالے آپ کی زندگی میں شائع ہوئے۔ تاریخ سے آپ کو خاص دلچسپی تھی مفصل تاریخ دکن ”حیات تمدن“ کے نام سے مرتب فرمائی تھی جس کا ایک حصّہ آپ کے انتقال کے بعد ”عہد سلف“ کے نام سے شایع ہوا ہے۔ آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

”روح ترقی کے مبارک سراپا حقیقت خواب کا جس نے بالآخر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تعبیری صورت اختیار کی، ایک جز نظام آصفی بھی تھا۔ بیداری کے لئے جس چیز کی ملک کو ضرورت ہے وہ اس کی تاریخ ہے۔ زندہ قومیں اپنی قومیت کا انحصار اسی پر سمجھتی ہیں کہ اپنی تاریخ بچہ کی گھٹی میں داخل ہو، قوم کا بچہ آنکھ کھول کر تاریخی سبق لے بڑا ہو کر اپنے کاموں کی بنیاد رجال قوم کے نقش قدم پر رکھے اور مرنے کے بعد اسی سلسلہ فہرست میں اس کا نام داخل ہو تاریخ ہی وہ تمام قوم کی زندگی کا محور ہے جس پر ملک کی عزت مبنی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

"ایسے وقت میں جب کہ فاطر السمٰوات والارض یا شاید ہستی مطلق کا جمال جہاں آرا کسی قوم میں بھی صاف نظر نہیں آتا تھا ایسے مقام میں جہاں ہر طرف پہاڑیوں کے جمے ہوئے قطار در قطار تودوں اور سخت زمین کے سوائے کوئی سرسبزی یا دل بھانے والی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ امین قوم نور دو عالم حسن مجسم باسم ربك الذی خلق کی مبارک تعلیم آغاز کرتا ہے اور تیرہ سال کی مسلسل کوشش کے بعد جب اُس کا صلہ یہ دیکھتا ہے کہ قوم دنیا کو اس کے وجود سے خالی کرنا چاہتی ہے تو صدیوں کے آبائی وطن سے چھپے چھپے جدا ہوتا اور اسی خطہ کی ایک سرزمین میں جہاں کسی قدر سرسبزی بھی ہے، ہجرت کرتا ہے اب (۶۰۰) قابل جنگ مردم شماری ہو جاتی ہے۔ قوم بزور شمشیر اس آواز توحید کو خاموش کرنا چاہتی ہے۔ بدر صدا قت (۳۱۳) جانبازان راہ توحید کی ضعیف جماعت میں یہی دعا کرتا ہے "او اللہ! اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج مار ڈالی گئی تو پھر کبھی زمین پر تری عبادت نہ ہو گی۔ محبت حق کی سرشار یہ چھوٹی جماعت اپنے سہ چند دولت اور رسم پرستیوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے"۔[۱]

عبد الجبار مرحوم:۔ مولوی عبد الجبار مرحوم ملکاپور (برار) کے باشندے تھے حیدر آباد میں اپنی عمر بسر کی مدت تک مدرسہ اعزہ کے مدرس رہے۔ آپ حیدر آباد کے ایک مشہور مورّخ تھے۔ تذکرۂ سلاطین دکن، تذکرہ شعرائے دکن (محبوب الزمن) اور تذکرۂ اولیائے دکن کے نام سے پانچ ضخیم جلدیں مرتب اور شائع کیں۔

آپ نے تاریخ دکن کے متعلق جو کچھ مواد فراہم کیا ہے وہ اگرچہ عصری معیار

---

[۱] عہد سلف

پر پورا نہیں اترتا لیکن جو ذخیرہ آپ نے فراہم کر دیا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قیمتی ہے۔ زمانہ حال میں تاریخ دکن پر کوئی کتاب آپ کی کتابوں سے مدد لئے بغیر لکھی نہیں جا سکتی۔ ۱۳۴۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

آصف جاہ اوّل کے حالات میں لکھتے ہیں :۔

"آپ کے والد ماجد میر شہاب الدّین خان المخاطب بہ غازی الدّین خان فیروز جنگ نے باپ کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ ہفت ہزاری تک ترقی کی اور غازی الدّین خان فیروز جنگ عالمگیری امراء میں اکبرالامراء شمار کئے جاتے تھے عالمگیر آپ کو بڑی عظمت و محبت سے دیکھتا تھا۔ دکن کے معرکوں میں آپ کی جان نثاری و عرق ریزی و دلیری دیکھ کر فرزندوں سے زیادہ چاہتا تھا جب آپ کی کوشش و جاں فشانی سے بیجاپور کی فتح حاصل ہوئی اس وقت آپ کے خطاب کے ساتھ فرزند ارجمند کا فقرہ اضافہ فرمایا۔ بیجاپور کے معرکوں میں دکھنیوں نے عالمگیری لشکر میں رسد کی آمد و رفت بند کر دی تھی۔ لشکر میں بہ سبب عدم غلہ و دانہ کھلبلی پڑی ہوئی تھی تمام بے قرار و جاں بلب ہو رہے تھے۔ عالمگیر رسد کے نہ پہنچنے کی خبر سے نہایت بے چین و بے قرار تھا۔ رات کے آٹھ بجے فیروز جنگ کو بلایا اور رسد پہنچانے کی بابت کہا۔ فیروز جنگ اسی وقت مستعد ہوئے۔ معہ جمعیت و رسد ہمراہ لے کر عالمگیری لشکر میں مخالفین سے قتال و جدال کرتے ہوئے قریب چار بجے صبح کے پہنچے و رسد لشکر میں تقسیم کر دی۔"[1]

---

[1] تذکرۂ سلاطین دکن۔

مولوی سید خورشید علی صاحب :-

مولوی سید خورشید علی صاحب سابق ناظم دفتر دیوانی

ومال وغیرہ حیدرآباد کے مشاہیر اہل قلم سے ہیں۔ ۱۳۰۴ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔
مدرسۂ عالیہ۔ سٹی ہائی اسکول اور نظام کالج میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ ابتدأ معتمدی
فینانس میں آپ کا تقرر ہوا۔ مسٹر گلانسی صدر المہام فینانس کے زمانہ میں آپ نے اپنی
کاروائی کی وجہ سے امثال و اقران میں امتیاز حاصل کیا۔ دفتر دیوانی ومال جیسے قدیم دفاتر
کی تہذیب آپ کی ہی سعی مشکور کا نمونہ ہے۔ حیدرآباد کی قومی زندگی کو حالات زمانہ
کے مطابق ڈھالنے میں آپ نے ابتدأ زندگی سے ہی سرگرمی اور انہماک کا ایک قابل
تقلید نمونہ پیش کیا ہے۔ تقریر اور تحریر دونوں میں آپ نے ایک خاص مرتبہ حاصل
کیا ہے ہندوستان اور دکن کے مشہور رسالوں مثلاً ادیب الہ آباد مخزن لاہور۔ زمانہ
کانپور۔ دکن ریویو۔ ذخیرہ۔ ترقی (حیدرآباد) میں آپ کے بیش بہا مضامین شایع
ہوئے اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے "جاپان" اور گو کھلے من حیثیت
انسان" آپ کی دو کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"بنی نوع انسان اسلام کی تمدنی اصلاحوں کے جس قدر زیر بار احسان ہیں محتاج
بیان نہیں۔ غیر اقوام اور غیر مذاہب تک کو اس بات کا اقرار ہے کہ تمدن کو ترقی
و تکمیل کے مدارج پر پہنچانے والے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں۔
اسری۔ ایرانی۔ مصری۔ یونانی اور رومی تمدن اپنے اپنے وقت میں اس زمانہ کی حالت
کے مطابق اپنی نظیر آپ تھے۔ مگر اب وہ سب گردروزگار ہیں۔ صرف ان کا نام ہی نام
رہ گیا ہے لیکن جو عظیم الشان تمدن پیغمبر عرب نے قایم کیا وہ آج تیرہ سو برس بعد بھی

اسی طرح کامل اور عدیم المثال ہے کہ اس کے سامنے نہ صرف نینوی بابل انتیس۔ صدور یمفس و تھیبس وغیرہ کے گزشتہ تمدن ہی ہیچ ہیں بلکہ موجودہ زمانہ کے دوسرے تمام شایستہ اور ترقی یافتہ اقوام و ممالک بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ازمنہ ماضیہ ہیں عورتیں انسانوں اور حیوانوں کے درمیان ایک قسم کی مخلوق سمجھی جاتی تھیں، لونڈیوں سے بھی بدتر حیثیت رکھتی تھیں ان پر مردوں کی جابرانہ حکومت قائم تھی اوران کا مصرف محض ترقی نسل اور مردوں کی ذلیل غلامی تھا۔ ہندو یونانی اور رومی قانون نے عورتوں کو ان کی مستقل شخصیت، سے ہمیشہ محروم رکھا۔ یونانی جن کی ترقی و تہذیب کا ایک زمانہ ثنا خواں ہے عورتوں کو ایک کم درجہ کی ذلیل مخلوق اور مردوں کی خدمت گزار سمجھتے تھے۔ محض ایک بچہ پیدا کرنے کی کل سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی ان کی بے قدری و ذلت کی انتہا یہ تھی کہ اگر کسی عورت کے ہاں ناقص الاعضاء بچہ پیدا ہوتا تو اس عورت کو مار ڈالتے تھے"[1]

حکیم سید شمس اللہ قادری:۔ حکیم سید شمس اللہ قادری بھی اسی عہد کے ایک مشہور مولف ہیں جنہوں نے اپنی تاریخی قابلیت کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کرلی ہے۔ اردوئے قدیم کے علاوہ آپ کی کئی کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ آپ کو آپ کی تصانیف اور علمی شغف کے باعث سرکار عالی سے بیش قرار منصب جاری ہوئی ہے۔ ہندوستان کے سر برآوردہ رسالوں ہیں آپ کے مضامین شایع ہوتے۔ اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

---

[1] رسالہ ذخیرہ۔

"جس زمانہ میں آل سبکتگین کا ظہور ہوا ہے وسط ایشیا میں، آفتاب علم و فن اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا قریب قریب اسی زمانہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابو نصر فارابی بوعلی سینا امام رازی ابو الفضل جوہری وغیرہ اسی سرزمین کی مردم خیز بستیوں میں پیدا ہوئے تھے وسط ایشیا میں اس وقت جو حکومتیں قائم تھیں ان سب کے حکمران عموماً صاحب علم و فن اور علوم و فنون کے مربی و سرپرست تھے ان حکومتوں میں ماوراء النہر کے سامانی حکمران سب سے زیادہ طاقتور اور ذی اثر تھے علمی سرپرستی کے لحاظ سے بھی ان کا پایہ بڑھا ہوا تھا۔ اس خاندان کا تیسرا فرمان روا نصر بن احمد (۳۰۱ھ ۹۱۳ء تا ۳۳۱ھ ۹۴۲ء) بڑا فیاض اور ہنر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ استاد ابو الحسن رودکی جس کو فارسی شاعری کا ابو الآباء کہتے ہیں اس کے دربار کے ملک الشعراء کے عہدے پر مامور تھا۔ بادشاہ کی فرمائش سے اس نے کلیلہ و دمنہ کی حکایات فارسی میں نظم کی تھیں اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار درہم کا عطیہ ملا تھا۔ عنصری اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش   عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور[1]

مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب:-

مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب حیدرآباد کے ایک قدیم خاندانی منصبدار تھے۔ آپ کی کئی مولفہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بستان آصفی جس کی سات جلدیں شائع ہوئی ہیں حیدرآباد کی مفصل تاریخ ہے۔ سلطنت آصفیہ کے متعلق۔ عام تاریخی حالات اور واقعات جس قدر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں درج ہیں وہ اور کسی کتاب میں درج نہیں ہیں اور کسی کتاب میں ایک جا نہیں مل سکتے۔ ۱۳۵۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

---

[1] رسالہ اردو۔

رائو صاحب کی عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"راجہ رام راج نے سلطان ابراہیم شاہ کے ملک کا کچھ حصّہ دبا لیا تھا اس لیئے خواہ مخواہ اسے بھی اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ یہ لڑائی دریائے کرشنا کے پار مشرقی جانب واقع ہوی تھی اس میں سلطان ابراہیم کو راجہ سے اس کا ملک واپس مل گیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایک زبردست فوج بھیجکر قلعۂ ورنگل بھی فتح کر لیا۔"

"سر جان شور گورنر جنرل اس زمانہ میں ہندوستان کے فرماں روا تھے۔ ان کی طبیعت کچھ ایسی صلح کل واقع ہوی تھی کہ وہ لڑائی کو مطلق پسند نہ کرتے تھے اس وجہ سے مرہٹوں کی ہمت بڑھی اور اُن کی طاقت دن بدن مضبوط ہونے لگی اُنہوں نے سرکار نظام سے جنگ کی ٹھانی چنانچہ نواب نظام علی خان ۱۲ شعبان سنہ ۱۲۰۹ ہجری کو قلعہ کھرڈلا میں صف آرا ہوئے اور جنگ چھڑی" [۵]

سہراب جی:- حیدر آباد میں اُردو کی خدمت ایسے اشخاص نے بھی کی ہے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے مگر حیدر آباد کی بود و باش کے باعث اردو بمنزلہ مادری زبان کے ہوگئی ہے ذیل میں اسی قسم کی ایک خدمت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ شکسپیر کے مشہور و معروف ڈراما میکبتھ کا ترجمہ ہے جو "تلاطم ایران" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس کے مترجم حیدر آباد کے قدیم پارسی خاندان کے بزرگ مسٹر سہراب جی پستنجی کا لگا سابق مددگار معتمد فینانس ہیں اولاً ترجمہ ایک دشوار گذار منزل ہے اور پھر ڈرامہ کا ترجمہ اور بھی خاص حیثیت رکھتا ہے مگر "تلاطم ایران" کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مترجم نے کس

---

[۵] بستان آصفی

محنت اور کامیابی سے اس کو انجام دیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب قابل قدر ہے جو آج سے پینتیس سال پہلے ترجمہ کی گئی ہے۔

ہمروئن اپنے آپ مخاطب ہے۔

"وہ کوا کس قدر بھاری آواز سے کائن کائن کر رہا ہے جو میری چھت کے نیچے جان کھونے والے فتح علی شاہ کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ انسان کے دلوں میں شیطانی خیالات پیدا کرنے والے اے دیو اور جنو آؤ اور اسی وقت میرے زنانے صفات کو بدل دو اور سر سے پاؤں تک مجھے وحشت انگیز بے رحمی سے بھر دو میرا خون گاڑھا کر دو اور رحم کے دروازے بند کر دو تاکہ کوئی خلش یا رحم آمیز خیال میرے خونخوار ارادے کو متزلزل نہ کر دے اور اس کی انجام دہی میں معترض نہ ہو۔ اے خونی عفریتو جہاں کہیں تم اپنے غیر مرئی جسموں میں دنیا کی تباہی کے لئے آمادہ رہتے ہو وہاں سے آکر میری نازک چھاتی میں داخل ہو جاؤ اور میرے دودھ کو زہر بنا دو اے اندھیری رات دوزخ کے کالے سے کالے دھوئیں سیاہ کفن پہن لے تاکہ میری آبدار اور تیز چھری اپنے کٹے ہوئے زخم کو نہ دیکھ سکے اور اے آسمان تو اپنی سیاہ چادر میں جھانک کر یہ نہ کہہ کہ ٹھیرو ٹھیرو یہ کیا کرتی ہو۔"

"امیر عبداللہ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے کان میری زبان سے ہمیشہ کیلئے نفرت نہ کریں کیونکہ وہ ان کو ایک ایسی بکر وہ خبر سنائے گی جیسی انہوں نے کبھی نہ سنی ہو گی۔ داؤد مرزا۔ ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔

امیر عبداللہ۔ آپ کے قلعہ پر دفعتہً قبضہ کر لیا گیا اور آپ کی بیوی اور بچوں کو

ظالمانہ طور پر مار ڈالا۔ یہ بیان کرنا کہ کس طرح پر ان کو قتل کیا ہے گویا ان بے گناہوں کے ساتھ آپ کی بھی جان لینی ہے۔"

سررشتہ علوم و فنون کا قیام:۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر زبان میں علوم و فنون کی ابتدا غیر زبان کے ترجمہ سے ہوتی ہے اور آگے چل انہی ترجموں سے جب معلومات میں وسعت خیالات میں بلندی پیدا ہوتی ہے تو نئی نئی کتابیں تالیف اور تصنیف ہونے لگتی ہیں اور ملک میں علماء فضلاء کے ساتھ ساتھ موجدین اور بانیان فن کا ظہور ہونے لگتا ہے اگرچہ سلطنت آصفیہ میں اس کام کی ابتدا پانچویں دور میں ہی ہو چکی تھی مگر وہ صرف ایک امیر کی ذاتی کوشش تھی اور ملک میں عام طور پر کوئی تعلیمی چل پل اور ذوق و شوق نہیں تھا اس لئے اس منزل میں چند کتابوں کے ترجمے سے آگے قدم نہ بڑھ سکا۔ اس دور میں اس کام میں بھی کافی وسعت و ترقی ہوئی۔ اسی غرض سے شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں ایک سررشتہ علوم و فنون کے نام سے قائم ہوا اور شائع شدہ کتابوں کو "سلسلہ آصفیہ" کے مبارک نام سے موسوم کیا گیا۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اس محکمہ کے ناظم مقرر ہوئے انہوں نے اس سلسلہ کے لئے بطور خاص چند کتابیں تالیف و تصنیف فرمائیں۔ علامہ شبلی کے بعد مولانا عبد الغفور خان صاحب اس دفتر کے انچارج رہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد یہ طے پایا کہ اعلیٰ تصنیف یا تالیف کے پیش ہونے پر صاحب تصنیف یا تالیف کو ایک معقول رقم امداد دے دی جائے اور وہ کتاب سلسلۂ آصفیہ میں داخل کر لی جائے۔ اس سلسلہ کی بعض کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

شمار	نام کتاب	فن	نام مصنف یا مترجم	کیفیت
۱	ترجمہ روزنامچہ بے یورنر فرانسیسی	سفرنامہ	عبدالغفور خان	سلسلہ آصفی جلد اول
۲	" " حصہ دوم	"	"	" دوم
۳	نظام اکبری	تاریخ	"	" سوم
۴	تاریخ دکن حصہ اول	"	"	" چہارم
۵	" " دوم	"	"	" پنجم
۶	الغزالی	سوانح	مولوی شبلی نعمانی	" ششم
۷	علم الکلام	فلسفہ	"	" ہفتم
۸	تاریخ دکن حصہ سوم	تاریخ	؟	" ہشتم
۹	الکلام	فلسفہ	مولوی شبلی	" نہم
۱۰	الفاروق	سوانح	"	"
۱۱	تاریخ عروج اسلام	تاریخ	مولوی عبدالغفور خان	

اخبارات اور رسالے:- زبان کی ترقی میں اخبارات اور رسالے بھی غیر معمولی مدد کا موجب ہوتے ہیں۔ زبان کی ترقی میں ان کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر امور ان کے ذریعہ انجام پاتے ہیں جس قدر ان کی تعداد زیادہ ہو گی زبان کی اسی قدر ترقی ہو گی۔ غیر اقوام اور غیر ممالک میں اپنی زبان شائع کرنے اپنے ہم وطنوں کو زبان کے متعلق نئی نئی باتیں معلوم کرانے نئی نئی ایجاد اور نئی نئی اصلاحات سے باخبر کرنے کا ذریعہ یہی

ہوتے ہیں۔

ذیل میں ایک فہرست روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات اور رسائل کی دی جاتی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ اس دور میں کتنے اخبارات وغیرہ شائع ہوئے:۔

روزانہ اخبار

شمار	نام اخبار	نام اڈیٹر	سن اجرائی	کیفیت
۱	۲	۳	۴	۵
۱	ہزارداستان	محمد سلطان عاقل	سنہ ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء	
۲	پیک آصفی	سید حشن	سنہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء	
۳	سفیر دکن	سید امجد علی اشہری	سنہ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء	
۴	مشیر دکن	کشن راؤ	سنہ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء	
۵	علم و عمل	محب حسین	سنہ ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۴ء	
۶	صحیفہ	اکبر علی	سنہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء	
۷	معارف	ملا عبدالباسط	سنہ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء	

ہفتہ وار اخبار

شمار	نام اخبار	نام اڈیٹر	سن اجرائی	کیفیت
۱	۲	۳	۴	۵
۱	آصف الاخبار	نارائن راو	سنہ ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء	

٢	شفیق	سید حسین رضوی	سنہ ١٢٩٧ھ / ١٨٨٠ء
٣	شوکت الاسلام	حاجی محمد کرمان	سنہ ١٣٠٠ھ / ١٨٨٢ء
٤	معلم شفیق	محب حسین	سنہ ١٣٠٢ھ / ١٨٨٤ء
٥	اخبار آصفی	سید محمد سلطان	سنہ ١٣٠١ھ / ١٨٨٥ء
٦	دکن پنچ	کشن راؤ	سنہ ١٣٠٤ھ / ١٨٨٧ء
٧	افسر الاخبار	مشتاق احمد	سنہ ١٣٠٤ھ / ١٨٨٧ء
٨	خیال محبوب	عبدالسلام عرشی	سنہ ١٣٠٧ھ / ١٨٨٧ء
٩	محبوب القلوب	"	سنہ ١٣٠٦ھ / ١٨٨٩ء
١٠	ملک و ملت	سید احمد ناطق	سنہ ١٣١٣ھ / ١٨٩٥ء
١١	نظارہ عالم	قدرت اللہ مضطر	سنہ ١٣١٤ھ / ١٨٩٦ء
١٢	جام جمشید	محمد ابراہیم خان	سنہ ١٣١٩ھ / ١٩٠١ء
١٣	عزیز الاخبار	عزیز جنگ	سنہ ١٣٢٠ھ / ١٩٠٢ء
١٤	دکھنی	عبدالرحیم	سنہ ١٣٢١ھ / ١٩٠٣ء
١٥	نظامی	امیر حمزہ	سنہ ١٣٣٠ھ / ١٩٠٥ء
١٦	محبوب گزٹ	پیارے لال	سنہ ١٣٢٣ھ / ١٩٠٥ء
١٧	المحبوب	محمد قاسم	سنہ ١٣٢٤ھ / ١٩٠٦ء

ماہوار رسالے

شمار	نام رسالہ	نام اڈیٹر	سن اجرائی	کیفیت
۱	ادیب	؟	۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۰ء	
۲	معلم شفیق	محب حسین	۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۲ء	
۳	فنون	مشتاق احمد صاحب	۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء	
۴	گلدستۂ مشتاق	"	۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء	
۵	مذاق سخن	"	۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء	
۶	داستان سیاح	سید ابراہیم عفو	۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء	
۷	ارم دکن	سید احمد زید بلگرامی	۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء	
۸	رفیق دکن	عزیز الدین	۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء	
۹	جوہر سخن	عبداللہ خان	۱۳۰۲ / ۱۸۸۵ء	
۱۰	گل و بلبل	الطاف حسین قابل، محمد عباس مہجور	۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء	
۱۱	حسن	حسن بن عبداللہ، عماد نواز جنگ	۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء	
۱۲	معلم نسوان	محب حسین	۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء	
۱۳	سحر بیان	مجیب احمد تمنائی	۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء	
۱۴	منتخب روزگار	سید علی رضا	۱۳۱۳ھ / ۱۸۹۵ء	

۱۵	افسر	محب حسین، عبدالحق	سنہ ۱۳۱۴ھ،	سنہ ۱۸۹۶ء
۱۶	دلگداز	عبدالحلیم شرر	" ،	"
۱۷	دبدبہ آصفی	پنڈت رتن ناتھ سرشار	سنہ ۱۳۱۵ھ،	سنہ ۱۸۹۷ء
۱۸	شمس الکلام	سید سلیمان	" ،	"
۱۹	پیام محبوب	غلام حسین واد	" ،	"
۲۰	میڈیکل جرنل	لقمان الدولہ	سنہ ۱۳۱۶ھ،	سنہ ۱۸۹۸ء
۲۱	جلوہ محبوب	غلام ہمدانی گوہر	" ،	"
۲۲	محبوب الکلام	جلیل حسن	" ،	"
۲۳	سفیر دکن	امجد علی اشہری	سنہ ۱۳۱۷ھ،	سنہ ۱۸۹۹ء
۲۴	نسیم دکن	نادر علی برتر	سنہ ۱۳۱۹ھ،	سنہ ۱۹۰۲ء
۲۵	دکن ریویو	ظفر علی خان	سنہ ۱۳۲۱ھ،	سنہ ۱۹۰۳ء
۲۶	افسانہ	"	" ،	"
۲۷	معیار الانشاء	سراج الدین احمد خان	سنہ ۱۳۲۲ھ،	سنہ ۱۹۰۴ء
۲۸	الہادی	غلام حسین واد	سنہ ۱۳۲۳ھ،	سنہ ۱۹۰۵ء
۲۹	صحیفہ	سید رضی الدین حسن کیفی	" ،	"
۳۰	ادیب	ظفریاب خان	سنہ ۱۳۲۶ھ،	سنہ ۱۹۰۸ء
۳۱	دکن لا رپورٹ	محمد اصغر	سنہ ۱۳۲۸ھ،	سنہ ۱۹۱۰ء
۳۲	گلدستہ نادرہ	حکیم نادر علی	سنہ ۱۳۳۰ھ،	سنہ ۱۹۱۱ء
۳۳	تاج	غلام محمد وفا	سنہ ۱۳۳۱ھ،	سنہ ۱۹۱۲ء

۳۴	شاہد سخن	گوبند پرشاد	۱۳۳۱ھ تا ۱۹۱۲ء
۳۵	افادہ	مرزا نظام شاہ لبیب	۱۳۳۴ھ تا ۱۹۱۴ء
۳۶	ذخیرہ	سید ناظر الحسن ہوش	؍؍ ؍ ؍؍

نامناسب نہ ہوگا اگر ان میں سے بعض اخبارات اور رسائل کے متعلق مختصر تصریحات بھی کر دی جائیں۔

اخبار سفیر دکن[۱]:- روزانہ اخبارات میں نہایت مقبول اور مشہور اخبار تھا۔ اس کے سیاسی مضامین ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ مولوی سید امجد علی اشہری جیسے مشہور ذی علم اس کے اڈیٹر تھے۔

مشیر دکن[۲]:- حیدر آباد کا مشہور اخبار ہے اپنی سلامت روی کے باعث زمانہ دراز سے اب تک برابر شایع ہو رہا ہے اولاً دکن پنچ کے نام سے ہفتہ وار شایع ہوا کرتا تھا۔ ۱۸۹۲ء سے مشیر دکن کے نام سے موسوم ہوا۔

رسالہ حسن[۳]:- حیدر آباد کا مشہور اور نامور رسالہ تھا اس کے پہلے شمالی ہند میں بھی کوئی رسالہ سوائے "تہذیب الاخلاق" کے اردو میں اس خوبی کا جاری نہیں ہوا۔ یہ باوقعت علمی ادبی رسالہ ولایتی ماہانہ پرچوں کے قدم بقدم چلنے کی کامیاب کوشش کرتا رہا۔ اس کے مضمون نگار ہندوستان و دکن کے نامور اور مشہور اہل قلم تھے عمدہ مضمون کے لئے ایک اشرفی نذر کی جاتی تھی۔ ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ سے ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ تک جاری رہا غرضکہ علمی دنیا میں اس رسالے نے

---

[۱] تا [۳] بستان آصفی وغیرہ۔

بڑی وقعت حاصل کرلی تھی۔

دکن ریویو:۔ یہ بھی حیدرآباد کا ایک مشہور رسالہ تھا جس کے اڈیٹر مولوی ظفر علی خان جیسے مشہور صاحب قلم انشاپرداز تھے اردو علم ادب کی جو خدمت اس رسالے نے انجام دی ہے وہ آج تک مشہور ہے۔ جس طرح رسالہ حسن اپنی خوبیوں کے باعث تمام ہند میں مشہور تھا اسی طرح "دکن ریویو" باوجود شمالی ہند میں رسالوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہونے کے مقبول اور ممتاز تھا۔

صحیفہ[1]:۔ اولاً مولوی سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم نے اس رسالہ کو شایع کیا۔ مگر چند ماہ بعد یہ بند ہوگیا اس کے بعد دوبارہ انجمن معارف کے زیر نگرانی مولوی محمد اکبر علی صاحب کی اڈیٹری میں شایع ہونے لگا۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تمام تر مضامین عموماً اہل دکن ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ علمی دنیا میں اس رسالہ کے علمی اور تاریخی مضامین نہایت شوق دلچسپی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اور اکثر مضامین اپنی خوبی اور دل آویزی کے باعث شمالی ہند کے بعض رسالوں میں نقل ہوتے تھے۔ سنہ ۱۳۲۸ھ تک ماہوار شایع ہوتا رہا اس کے بعد کچھ عرصہ تک موقوف رہ کر سنہ ۱۳۲۹ھ سے روزانہ اخبار کی شکل میں شایع ہو رہا ہے۔

ماہواری رسالوں میں "ذخیرہ" اور "افادہ" بھی قابل ذکر ہیں ان رسالوں میں نظم و نثر کے بہترین قابل قدر مضامین شایع ہوتے تھے دکن اور شمالی ہند کے مشہور منتخب مضمون نگاران رسالوں میں مضمون لکھتے تھے۔

---

[1] بستان آصفی۔

انجمنیں:۔ ترقی زبان کا ایک ذریعہ علمی انجمنوں کا قیام بھی ہے جس سے خیالات میں جولانی اور معلومات میں وسعت ہوتی ہے۔ یوں تو حیدرآباد میں متعدد انجمنیں قائم ہوئیں اور اپنی اپنی حد تک انہوں نے کامیابی سے کام بھی کیا لیکن اس وقت صرف چند مشہور انجمنوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انجمن ترقی اردو:۔ ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں زبان اُردو کی ترقی کے لئے[1] یہ انجمن قائم ہوئی اس کا مقصد زبان اُردو کی بقا اور اُس کی ترقی ہے زبان اُردو میں بذریعۂ تراجم و تالیفات علمی ذخیرہ کا اضافہ بھی اس انجمن کا ایک مقصدِ اعظم ہے۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ نے نہایت خوشی کے ساتھ اس کی سرپرستی قبول فرمائی تھی اولاً اس کے معتمد مولانا شبلی مرحوم مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن خان شروانی (صدر یار جنگ) اور پھر مولوی عزیز مرزا مرحوم اس کے معتمد ہوئے ان کے انتقال کے بعد مولوی عبدالحق صاحب اس کے معتمد بنائے گئے۔

انجمن آج تک قائم اور برابر ترقی کے زینے طے کر رہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش نے انجمن کی جانب سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں شائع کرائی ہیں انجمن کا ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری ہے جس کے بہترین مضامین ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انجمن کی مالی حالت بھی اچھی ہے مستقل آمدنی ہے بہرحال زبان اُردو کے بقاء و ارتقاء میں انجمن کی سعی باعث تشکر ہے۔ اس انجمن کا قیام بھی دکن میں ہوا اور نشو و نما بھی یہیں ہوئی۔

---

[1] بستان آصفی وغیرہ۔

ایجوکیشنل کانفرنس:۔ اس کانفرنس کا قیام ۱۳۳۲ھ میں ہوا اس کے مقاصد کے منجملہ ایک مقصد اصلاح تعلیم تھا۔

اس کے متعلق کانفرنس کا پروگرام حسب ذیل تھا:۔

الف۔ علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کئے جائیں۔

ب۔ حیدرآباد کی تاریخ اور جغرافیہ اردو میں مرتب کرائے جائیں۔

ج۔ ملک کی ترقی کے لئے ملکی زبان یعنے اردو میں ایک موزوں و مناسب حال نصاب تعلیم مہیا کیا جائے۔

د۔ اپنی تعلیم اپنے ہاتھ ہونے کے لئے ایک یونیورسٹی کا قیام" کانفرنس

کانفرنس اپنے نظام العمل میں کہاں تک کامیاب ہوئی وہ ابنائے وطن پر عیاں ہے وہ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کی جانب اول روز سے متوجہ ہوئی نہ صرف زبانی تحریکات سے اس نے اپنے قیام کے مدعاء کو پورا کیا بلکہ عملی حیثیت سے بھی توجہ کی۔

کانفرنس نے زبان اردو کی ترقی میں پہلے سالانہ اجلاس میں جس کے صدر رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر تھے حسب ذیل تحریکیں منظور کی تھیں۔

(۱) اس کانفرنس کو اردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس کے لئے یہ جلسہ سرکار عالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ مخففہ سررشتہ علوم و فنون کے اخراجات سالانہ عہ؎ بہترین تراجم علمی تصانیف اردو پر انعامات مرحمت کرنے کے لئے منظور فرمائے جائیں۔

ایک اور تحریک تعلیم صنعت و حرفت کے متعلق تھی جس کا آخری حصہ یہ ہے۔

(۲) کانفرنس کی رائے میں انجینئرنگ اسکول کو ترقی دے کر سول مکانکل الکٹریکل تعلیم کا ہائی اسکول بنایا جائے جس میں ورکشاپ اور سررشتہ برقی کے ذریعہ سے عملی تجربہ کا بھی بند و بست ہو اور عام فائدہ کی غرض سے تعلیم اردو میں ہونی چاہیے۔

(۳) ایک اور تحریک طبی تعلیم کے متعلق یہ تھی۔

کانفرنس کی رائے میں طبی تعلیم کی ترقی اور ملک کو کافی طور سے فائدہ پہنچانے کی غرض سے کم از کم سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم حسب سابق اردو میں ہونا مناسب ہے۔

کانفرنس نے اپنے دوسرے سالانہ اجلاسوں میں بھی ان امور پر توجہ دلانے کا سلسلہ قائم رکھا المختصر اُردو کی توسیع اور ترقی میں اس کا بھی حصہ رہا ہے۔ اور کانفرنس کی تحریکات کہاں تک بارآور ہوئیں یہ ارباب علم سے مخفی نہیں ہے۔

دیگر انجمنیں:۔ چند دیگر انجمنوں کا مختصر حال بھی نامناسب نہ ہوگا کیونکہ اردو کی اشاعت و ترقی میں ان مجالس کی علمی صحبتیں بھی ضرور کچھ نہ کچھ اثر پھیلاتی رہی ہیں۔

اقبال کلب[۱]:۔ حیدرآباد کی ایک مشہور انجمن تھی جو ۱۳۰۰ھ ف میں قائم ہوئی ہر جمعہ کو اس میں بڑی پابندی سے لکچر ہوا کرتے تھے ملک کے نوجوان اور عمر رسیدہ بزرگ پہلو بہ پہلو تبادلہ خیالات کرتے اور ایک دوسرے

---

[۱] بستان آصفی۔

سے استفادہ کرتے تھے۔ کامیاب مقرروں کی تمغوں سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی عرصہ دراز تک یہ انجمن کامیابی کے ساتھ قائم رہی اور اس کے سکرٹری افضل علی کے مرنے پر بند ہو گئی۔

عثمانیہ ریڈنگ روم[1]:۔ ۱۹۰۴ء میں یہ انجمن قائم ہوئی اس کے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے مہینہ میں ایک دو مرتبہ لکچر بھی ہوا کرتے ہیں یہ انجمن اب تک اپنا کام کئے جا رہی ہے۔

انجمن ثمرۃ الادب:۔ ۱۳۱۲ھ میں یہ انجمن مدرسۂ دارالعلوم میں قائم ہوئی۔ طلبہ میں عام معلومات کی توسیع کا خاص مقصد تھا انجمن کے متعلق ایک کتب خانہ اور دارالاخبار بھی قائم تھا۔ ہفتہ وار لکچرز بھی ہوا کرتے تھے۔ مولوی عبدالباسط مولوی اکبر علی مولوی سید رضی الدین حسن کیفی اور حافظ محمد مظہر جیسے اصحاب اپنے زمانہ طالب علمی میں انجمن کے روح رواں تھے اگرچہ مولوی محمد عبدالقدیر صاحب مدرس دارالعلوم انجمن کے معتمد تھے مگر دیگر اساتذہ کے دلچسپی نہ لینے اور اس کے روح رواں کے اپنی تعلیم ختم کر لینے کے باعث تقریباً تین سال کے بعد انجمن ٹوٹ گئی ۱۳۲۴ھ میں جب کہ مولوی حمید الدین صاحب بی۔ اے صدر دارالعلوم ہوئے تو پھر سے انجمن زندہ ہوئی حسب سابق کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم ہوا۔ کبھی کبھی طلبہ کی تقریریں بھی ہوا کرتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد انجمن کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ سرکار سے بھی ماہواری امداد مقرر ہوئی اس کے کتب خانہ میں اردو کے تقریباً کل مشہور و معروف مصنفین کی کتابیں جمع ہو گئیں

---

[1] بستان آصفی۔

دارالمطالعہ میں اخبارات اور رسائل کی ایک کثیر تعداد آنے لگی جو شاید حیدرآباد کی کسی اور انجمن میں آتے ہوں۔ اب انجمن کے دوسرے مقاصد کی تکمیل کے لئے عام لکچرز کا سلسلہ مقرر ہوا۔ مہینہ میں ایک مرتبہ عام علمی اور اخلاقی لکچرز ہوا کرتے تھے مقررین میں نہ صرف مشاہیر اہل ملک ہی ہوتے تھے بلکہ شمالی ہند کے مشہور و معروف اصحاب بھی تقریریں کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد حلقہ قرآن کے نام سے ہر ہفتہ ایک جلسہ ترتیب دیا جاتا تھا جس میں صرف قرآن شریف کے متعلق اردو میں تقریر ہوتی تھی۔ قیام انجمن کے چوتھے سال ایک علمی اور اخلاقی ماہوار رسالہ بنام ثمرۃ الادب بھی جاری ہوا۔ غرض پانچ سال کے عرصہ میں انجمن نے کافی ترقی کی تھی۔ لیکن اس کے بعض سرگرم ارکان کے سلسلہ تعلیم کے ختم ہو جانے کے سبب یہ انجمن ختم ہو گئی۔ اور اس کا کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کی "یونین" میں شامل کر لیا گیا۔

انجمن کے بار ثانی کے زمانہ حیات میں چار سال تک اس کی معتمدی کے فرائض راقم کے ذمہ تھے۔

تبصرہ:- ہم معلوم کر چکے ہیں کہ دکن میں اردو ادب کے پہلے زینے کا آغاز مثنویوں سے ہوا پھر غزل گوئی کا دور شروع ہوا۔ بعد ازاں دکھنی ادب پر دلی و لکھنو کی زبان نے اپنا نہایت زبردست اثر قائم کر لیا۔

جس دور پر اس باب میں روشنی ڈالی گئی ہے اس کی یہ خصوصیت ہے کہ دکھنی شعراء غزل کے میدان سے نظم و مثنوی کی جانب پھر رجوع ہوئے۔ غزل گوئی بھی متروک نہیں ہوئی لیکن یہ امر ضرور واقع ہوا کہ زبان اور اسلوب میں نمایاں اور

بیّن فرق پیدا ہو گیا۔

اگر ایک طرف قدیم طرز کی غزل گوئی میں باقیؔ، پاسؔ، شعلہؔ، شایقؔ، فیاضؔ، مائلؔ، شادؔ، امیرؔ، توفیقؔ، عزیزؔ اور کیفیؔ وغیرہم کا نام پیش کیا جا سکتا ہے تو جدید شاعری کے لئے محبؔ، کیفیؔ، امجدؔ، ذہینؔ، بازغؔ، لمعہؔ، عظمتؔ کا کلام نمونہ ہے۔ یوں تو دکن میں جدید شاعری کا آغاز پانچویں دور کے اواخر سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ عبداللہ بیگ ہوشؔ پہلے شخص ہیں۔ جو اپنی غزلوں میں عشق و محبت کے قدیم افسانہ کو چھوڑ کر اخلاقی مضامین نظم کرنے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہنوز مولانا حالیؔ نے اپنی جدید شاعری کی بناء نہیں ڈالی تھی۔

اُس زمانہ میں ہوشؔ کی پیروی نہیں کی گئی اور نہ اس قسم کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس دور میں مولانا محب حسین اور حضرت کیفی نے خاص طور سے جدید شاعری کی تعمیر میں حصّہ لیا اور ان کی پیروی میں کئی اصحاب اس کی طرف متوجہ ہو گئے، اور واقعہ نگاری اخلاق، فلسفہ اور تصوف سے اپنے کلام کو بھر دیا۔ نیچرل شاعری اور اس کے ساتھ قومی نظمیں بھی ان کی شاعری کے طغرائے امتیاز بن گئے۔

اگر ایک طرف داغؔ دہلوی، امیرؔ مینائی، مکینؔ تھانوی، ظہیرؔ دہلوی، انیسؔ و دبیرؔ وغیرہم کے شاگردوں اور متبعین کا سلسلہ جاری تھا۔ تو دوسری طرف فیضؔ کے شاگردوں، باقیؔ، پاسؔ، مائلؔ، فیاضؔ، عزیزؔ وغیرہ کے مشاعروں کی گرم بازاری تھی اگر ایک طرف کیفیؔ کی قومی نظمیں ہمارے جلسوں کو جوش میں لاتیں اور مجالس کو گرماتی تھیں۔ تو دوسری طرف حضرت امجدؔ کی تصوف کی نظمیں اور تضمین ارباب

حالی کے لئے جذب و وجد کا سامان بن گئیں۔ اسی زمانہ میں ایک طرف ذہین اور لمعہ کی اخلاقی شاعری چمکی تو دوسری طرف عظمت اللہ خان کی ہندی آمیز نظموں کو بھی فروغ ہوا۔ آزاد کی ظریفانہ شاعری کی بناء قائم ہوئی۔ نظم طباطبائی کے قصیدے ذوق کے قصیدوں کی یاد تازہ کراتے تھے تو توفیق کی غزلیں غالب کی مضمون آفرینی اور درد کی تصوف آمیزی کو پیش کرتی تھیں۔ عزیز اور جلیل کی شاعری قدیم طریقہ کی غزل گوئی کو یاد دلاتی تھیں۔

غرض کہ شاعری کے جملہ اصناف سخن کو اس دور میں ترقی ہوئی۔ اور جدید شاعری کا نہ صرف آغاز ہوا بلکہ ایک حد تک اس کا رنگ پختہ ہو گیا۔

نثر کے لحاظ سے جو ترقی اس دور میں ہوئی ہے اس کا اظہار تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ اور اس زمانہ کی انشاء کے نمونے بھی پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کی ترقی میں اہل دکن نے جو حصہ لیا وہ کتنا اہم اور کس قدر درخشاں ہے۔

ساتواں دور

سنہ ۱۳۳۶ھ تا سنہ ۱۳۶۹ھ
۱۹۱۸ء ۱۹۵۰ء

اب ہم ساتویں دور کا تذکرہ کرتے ہیں جس کی ابتدا سنہ ۱۳۳۶ھ سے قرار دیجاتی ہے۔ جبکہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے سلسلہ میں منشور خسروی ۶ر ذیحجہ سنہ ۱۳۳۶ھ کو نافذ ہوا، اور ادب کی ترقی کا ایک بالکلیہ جدید راستہ کھل گیا تھا۔

عصر گزشتہ میں دکن نے اردو کی ترقی کے لئے اپنے دماغی اور ذہنی قوی جس سرگرمی سے کام لائے اور مال و دولت کو بے دریغ طریقہ سے صرف کیا وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ اس دور میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا جس کا اختتام سنہ ۱۳۶۹ھ یا سنہ ۱۹۵۰ء میں ہو گیا۔

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت جامعہ عثمانیہ کا قیام اور بعض دوسری خصوصیتیں بھی ہیں۔ جن کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ:۔ ۲۲ر اپریل سنہ ۱۸۸۵ء (سنہ ۱۳۰۳ھ) وہ دن تھا جب کہ باغ عامہ میں عماد السلطنت سالار جنگ ثانی مدار المہام وقت نے "نظام یونیورسٹی" کی خیالی بنیاد ڈالی تھی جلسہ کے بعد چند دن تک تو

اس کا خیال تازہ رہا مگر بہت جلد وہ خیالی صورت صرف تصویر ہی تصویر ہو کر رہ گئی، اور اب جلسہ کی شان اور کارروائی اخباروں کی پرانی مسلوں میں دفن ہے۔

اعلیحضرت سلطان العلوم کی تخت نشینی کے بعد ملک میں عام طور سے ایک بیداری کی روح پیدا ہو گئی اور چند دردمندان قوم نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی، کانفرنس کا مقصد یہی تھا کہ حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ مولوی مرتضیٰ مرحوم نے جو اپیل اہل ملک کے سامنے پیش کی تھی اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ایک یونیورسٹی کے لئے مواد مہیا ہے مختلف امتحانات علمی، طبی، انجینرنگ سول سروس و دیگر سررشتہ جات متعلقہ سب یہاں ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ سب ایک سلسلہ میں رابطہ ہوں تمام امتحانات میں جہتِ جامعہ ملحوظ رہے کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے جبکہ نظام یونیورسٹی عملاً ہمارے نوجوانوں کی زندگی کا محور بنے۔"[1]

اس کے بعد جب کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو ملک کے عام رجحان کے مدنظر اس کے صدر رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا :-

"خدا نے چاہا تو چند سال میں دار العلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائیگا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہو گی، اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا۔ اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد

[1] رپورٹ کانفرنس سال اول

مرکز علوم و فنون بن جائے گا۔" [1]

رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر اس زمانہ میں معتمدی عدالت و تعلیمات کی کرسی پر متمکن تھے، آپ کی تعلیمی دلچسپی، انہماک اور سرگرمی قابل تقلید ہے۔ آپ کے بہترین خیالات اور جذبات کے نمونے حیدرآباد اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبات ہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد ۱۳۳۶ھ میں آپ نے اعلیحضرت خسرو دکن کی پیش گاہ میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں آپ نے تعلیم کی موجودہ حالت کی پوری کیفیت تحریر کرتے ہوئے ان نقصانات سے بحث کی جو غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دینے سے واقع ہوتے ہیں، آپ نے ان نقائص کو بتایا جو موجودہ طریقۂ تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان اعتراضات کو بیان کیا جو اُردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے ہو سکتے ہیں اور پھر ان اعتراضات کے جوابات نہایت مدلل اور تشفی بخش دیئے آپ نے عرض کیا تھا کہ:۔

"موجودہ طریقۂ تعلیم کی دورنگی اور بے اصولی کو مٹانے اور ان خطرناک نقائص کو رفع کرنے کے لئے جو موجودہ طریقۂ تعلیم نے پیدا کئے ہیں اور جو گھن کی طرح ہمارے نظام تمدن و معاشرت و قوائے دماغی و جسمانی کو اندر ہی اندر کھائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح اصول تعلیم، ملکی ضروریات اور قومی خصائص پر قائم ہو جس میں قدیم و جدید دونوں طریقوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی تالیف و ترجمہ کا کام بھی کر

[1] رپورٹ کانفرنس سال اوّل

اور جو ترتیب ذہن اور تحصیل علوم دونوں کے لئے اپنی ہی زبان یعنے اردو کو کام میں لائے۔"
اعلیحضرت خسرو دکن نے عرضداشت محولہ بالا کو منظور فرماکر اپنی سرپرستی کی عزت سے مفتخر و ممتاز فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حضرت اقدس و اعلیٰ کی ذات شاہانہ فیض گریانہ اور ہدایت خسروانہ اس تحریک کی رہنما نہ بنتی تو کسی قسم کی کوئی کامیابی ناممکن و محال تھی ارشاد خسروی و فرمان شاہی کی عبارت یہ ہے:۔

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالک محروسہ کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں قدیم مشرقی اور مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہو کر جسمی اور دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔

اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو قرار دی جائے۔ اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب العلم پر لازمی گردانی جائے لہذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے اس یونیورسٹی کا نام (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد ہوگا۔"

اس فرمان واجب الاذعان کی تعمیل میں محکمۂ تعلیمات نے عملی کام کا آغاز کیا

ماہرین فن کے مشورہ ورائے سے شعبۂ فنون و دینیات کے نصاب مقرر کئے گئے اور تعلیمی حلقوں میں گشت کرائے گئے۔

جامعہ عثمانیہ کے نصاب تعلیم کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ میٹریکولیشن کے امتحانی مضامین میں اس طرح تخفیف کی گئی کہ بعض مضامین کے متعلق افسران مدارس کا صداقت نامہ کافی قرار دیا۔ امتحان انٹرمیڈیٹ میں انتخاب مضامین میں بہ نسبت اور یونیورسٹیوں کے زیادہ وسعت رکھی گئی اور مضامین کو اس طرح سے مرتب کیا تھا کہ ایک طالب علم اپنے لئے ایک ایسا مجموعہ انتخاب کرسکتا ہے جس کے مضامین ایک دوسرے سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں مختلف مجموعوں میں مضامین کی تقسیم سے یہ فائدہ تصوّر کیا گیا تھا کہ بی۔ اے میں ایک طالب علم کسی خاص مضمون اور اس کے متعلقات کی تعلیم مکمل طریقہ پر حاصل کرسکے۔ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے اور اس کا وہی معیار ہے جو دوسری ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا ہے۔ اس کے ساتھ جملہ فنون کی تعلیم زبان اردو میں دی جاتی تھی۔

ایک اور بڑی خصوصیت اس جامعہ کی یہ تھی کہ دینیات یا اخلاقیات کی تعلیم لازمی کی گئی تھی تاکہ مشرقی اخلاق کو مغربی علوم تباہ و برباد نہ کردیں۔ بہرحال یہ ایک ایسی یونیورسٹی تھی جو مشرق و مغرب کے علوم و فنون کے امتزاج کا بہترین مرکز بن گئی تھی۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ:۔ تاریخ کے اوراق پر اگست ۱۹۱۹ئہ م ذیحجہ ۱۳۳۷ھ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا جب کہ سب سے پہلے اردو کا عظیم الشان کالج "کلیہ جامعہ عثمانیہ" کا افتتاح ہوا۔ جلسہ کا دن کبھی فراموش

نہیں ہوسکتا۔ حیدرآباد کے ایک بلند پر فضا مقام پر (آغامنزل واقع سانچہ توپ) صبح کے دس بجے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صاحب نے بہ حیثیت معین الامیر جامعہ (وائس چانسلر) کے اس دار العلوم کا افتتاح فرمایا۔ مسٹر ولنکر پروفیسر انگریزی نے انگریزی علم وادب پر اس جلسہ میں ایک لکچر دیا۔ اور دوسرے دن سے باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ طلبہ کا داخلہ ہمت افزا رہا۔ پہلا امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۹۲۱ء م ۱۳۳۹ھ میں ہوا (۱۱۹) امیدواران نے اپنے نام بھیجے مگر امتحان میں (۱۱۶) شریک ہوئے جن میں (۹۱) طلبہ کامیاب ہوئے جو طلبہ امتحان میں بیٹھے ان کے منجملہ (۹۷) کالج کے طلبہ تھے جن میں (۸۵) کامیاب ہوئے۔

امتحان میں باہر کے ممتحن بھی مقرر ہوتے ہیں ان کی رپورٹوں میں طلبہ کی تعلیمی قابلیت کا اظہار کیا گیا تھا تمام صاحبوں نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ طلبہ کو جو کچھ پڑھایا گیا ہے، اس کو انہوں نے خوب سمجھ کر پڑھا ہے اور ان کے جوابوں سے خیالات کی جدت اور تازگی ظاہر ہوتی ہے، کلیہ جامعہ عثمانیہ کی بہترین تعلیم کا اس سے اظہار ہوسکتا ہے کہ ہندوستان اور یورپ وانگلستان کی ممتاز یونیورسٹیوں میں یہاں کے طلبہ نے نام آوری حاصل کی ہے اور اپنی عمدہ قابلیت کا ریکارڈ چھوڑا ہے۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے بعد کچھ دن تک منصرم ناظم تعلیمات نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر کلیہ کا کام انجام دیتے رہے اس کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی۔ صدر کلیہ مقرر ہوئے جو مملکت آصفیہ کے تعلیم یافتہ

تھے ان کے دادا اور والد بھی سرکار آصفیہ کی سلک ملازمت میں داخل تھے۔

صدیقی صاحب کے بعد مولوی عبدالرحمن خان صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ صدر کلیہ مقرر ہوئے اور ع صہ تک آپ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ آپ کے زمانہ میں کلیہ نے بہت کچھ ترقی کی اور فرزندان کلیہ پروفیسری کی خدمات پر مامور ہونے لگے۔

خان صاحب کے وظیفہ لینے پر مسٹر میکنزی پروائس چانسلر بنائے گئے اور صدارت کا عہدہ تخفیف کر دیا گیا۔ پھر قاضی محمد حسین صاحب، محمد اعظم صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب یکے بعد دیگرے اس خدمت کو انجام دیتے رہے اور اب علی یار جنگ اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں

دیگر کلیات:۔ جامعہ عثمانیہ کے تحت دوسرے کئی "کلیات" ہیں۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ:۔ اردو یونیورسٹی کے لئے پہلا زینہ فراہمی کتب کا تھا۔ اس کے لئے ضرور تھا کہ عظیم الشان پیمانہ پر شعبۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جائے۔

اگرچہ حیدرآباد کے لئے یہ کوئی نئی تحریک نہ تھی اس کے پہلے دو مرتبہ ایسی تحریکیں بطور مناسب عالم وجود میں آئیں اور بہت کچھ کام بھی ہوا۔ پہلی مرتبہ شمس الامرا نے اس کی طرف توجہ فرمائی تھی جس کا ذکر پانچویں دور میں ہو چکا ہے، اس کے بعد چھٹے دور میں سید علی بلگرامی اور مولانا شبلی نعمانی کی سرکردگی میں یہ کام ہوتا رہا۔

مگر اب نہایت وسیع و اعلیٰ پیمانہ پر شعبۂ تالیف و ترجمہ کی بناء ڈالی گئی اور

معقول تعداد میں مترجمین و مولفین ایک ناظم کے ماتحت مامور کیئے گئے تاکہ بطور مستقل اس اہم کام کی تکمیل ہو۔

اس شعبہ نے قابل تعریف طور پر اپنا کام انجام دیا ہے۔ باوجود ان شدید مشکلات کے جو ترجمہ میں وضع اصطلاحات وغیرہ کی پیش آتی ہیں نہایت کامیابی کے ساتھ یہ کام جاری تھا۔ یہاں نہ صرف مستقل کئی مترجم مامور تھے بلکہ معقول اجرت پر بھی بیسیوں کتابوں کا ترجمہ کرایا جاتا تھا۔

اس بیت الحکمت نے جو کام اب تک انجام دیا ہے وہ ان تمام مضامین سے متعلق ہے۔ جن کی تعلیم اس وقت جامعہ عثمانیہ میں دی جارہی ہے۔

۱۹۴۷ء تک جس قدر کتابیں ترجمہ ہو کر اشاعت پاچکی ہیں ان کی تعداد (۲۱۹) ہے۔ (۶۷) کتابیں ایسی ہیں جو زیر طبع ہیں۔ (۹۳) کتابوں کی نظر ثانی ہو رہی ہے یا زیر ترجمہ ہیں، ان کتابوں کی فہرست بلحاظ فن درج ذیل ہے:۔

۱۔ فلسفہ (مابعد الطبیعیات، نفسیات، منطق اور اخلاقیات) (۵۹)

۲۔ تاریخ و جغرافیہ (تاریخ اسلام، تاریخ ہند، تاریخ قدیم، تاریخ یورپ) ۱۱۸

۳۔ عمرانیات، سیاسیات، معاشیات ۲۹

۴۔ قانون و دستور ۲۳

۵۔ ریاضی سائنس ۷۳

۶۔ سیول و میکانیکل انجینیری ۲۷

۷۔ طب (طب قانونی، طب عام، تشریح، جراحی، امراض چشم و امراض نسواں وغیرہ ۳۰

۳۶۹

یہ کتابیں شائع شدہ ہیں، جو شائع نہیں ہوئیں ان کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے مگر اب توقع نہیں ہے کہ وہ شائع ہوں۔

دار الترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق بی۔ اے مقرر ہوئے اس کے بعد مولوی عنایت اللہ بی۔ اے ایک عرصہ تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے ان کے بعد مولوی محمد الیاس برنی بی۔ اے۔ اور برنی صاحب کے بعد ڈاکٹر نظام الدین اور ڈاکٹر صاحب کے بعد مسٹر ٹوپا ناظم بنائے گئے ہیں۔

دار الترجمہ کے مترجمین میں خاص کر علامہ عبداللہ عمادی، مولوی مسعود علی محوی، قاضی تلمذ حسین، چودھری برکت علی مرحوم، سید ہاشمی فرید آبادی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شعراء:۔ جیسا کہ تذکرہ کر دیا گیا ہے کہ دکن میں اردو کے ارتقا کا یہ ساتواں دور ۱۳۳۶ھ سے شروع ہوا جب کہ جامعہ عثمانیہ کا منشور خسروی نافذ ہوا تھا، یہ دور اب ۱۳۷۰ھ (۱۹۵۰ء) کو ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں ہم اس دور کے شعراء کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ زمانہ اردو زبان اور ادب کے ارتقا کے لئے عام طور سے برطانوی ہند میں بھی سازگار ثابت ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہوتے ہی نئے خیالات، نئے رجحانات پیدا ہو گئے۔ انگریزی شاعری اور انگریز متفکرین کے ساتھ فرنچ، امریکن اور روسی شاعروں، افسانہ نگاروں، نقادوں کی تصانیف سے استفادہ کیا جانے لگا۔ اسی طرح ترقی پسند شعراء افسانہ نگار مقالہ نگار اور نقاد رونما ہوئے۔ ان کے افکار اور خیالات سے اردو کی دنیا میں ایک انقلاب عظیم آگیا، ادب برائے زندگی کی تحریک زور شور سے پھیلنے لگی۔

برطانوی ہند کے ساتھ قلمرو آصفی میں بھی اس کا اثر ہوا، جامعہ عثمانیہ کے سپوت مادر جامعہ سے فارغ التحصیل ہو کر میدان عمل میں آگئے۔ دارالترجمہ سے صدہا کتابیں ترجمہ ہو کر شایع ہوئیں۔ اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور سینما کے ذریعہ نئے خیالات کی نشر و اشاعت ہونے لگی۔ یہ تمام وجوہ تھے جس کے باعث جہاں برطانوی ہند میں اردو کو ترقی ہوئی وہاں قلمرو آصفی میں بھی عروج حاصل ہوا۔ اور ترقی کے نئے مدارج طے ہو گئے۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کی ذہنی تربیت اور شاعرانہ قابلیت کو پروان چڑھانے میں بعض اساتذہ جامعہ نے خاص حصہ لیا۔ ان میں مولانا سید علی حیدر طباطبائیؔ، مولوی وحید الدین سلیم، مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب پیش پیش ہیں۔ اور ان اصحاب کے بعد ڈاکٹر زورؔ اور عبدالقادر سروری نے بھی شعر و سخن کا اعلیٰ مذاق پیدا کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

قلمرو آصفی میں چھٹے دور سے جدید شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ حضرت کیفیؔ، ذہینؔ نظمؔ، لمعہؔ، عظمت اللہ خاں، امجدؔ وغیرہ اس کے معمار تھے۔ اونہوں نے اصناف شاعری میں تنوع پیدا کیا۔ تاریخی شاعری، واقعہ نگاری، وصف نگاری، سیاسی شاعری سماجی شاعری وغیرہ کو موضوع بنا کر خیال آرائی کی تھی۔ موضوع شاعری کو بڑی وسعت دے دی تھی۔

اس دور میں جنگ عظیم کے بعد مغربی تہذیب و تمدن زیادہ سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ ذہنی آزادی مل گئی۔ قوت گویائی میں آزادی کا دور دورہ ہوا۔ زر کی قیمت گھٹ گئی۔ ضروریات زندگی میں اضافہ ہو گیا۔ کھانے پینے کی چیزیں گراں ہو گئیں، افلاس، بھوک، قحط کی تکالیف عام ہو گئیں، اشتراکیت کی طرف لوگوں کی طبیعتیں

مائل ہونے لگیں ۔ قوم کی خستہ حالی اور زبوں حالت کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا ، رومانی شاعری کی طرف بھی توجہ مبذول ہوئی ۔ تاریخی شاعری میں وسعت ہوئی ، مزاحیہ رجحان ، طنز بہ زاویۂ نگاہ ترقی کرنے لگا ، فلسفیانہ خیالات مفکرانہ رجحانات پیدا ہوئے ، آزاد نظموں کی بنیاد پڑی ، دیہاتی زبان کی شاعری کا آغاز ہوا ، یہ تھے وہ رجحانات اور خیالات جو برطانوی ہند کے شعراء کی ذہنیت پر اثر انداز ہوئے اور جدید شاعری میں تنوع پیدا کر دیا ۔

اقبال ، جوش ، اکبر ، چکبست ، ظفر علی خان ، شبلی ، احسان دانش ، فراق ، اختر شیرانی ، مجاز ، فیض ، ساغر ، سلام ، حفیظ ، حسرت ، جگر ، اصغر ، بہزاد وغیرہ کا کلام نوجوان شعراء کے لئے نمونہ ثابت ہوا ۔ اور ان کی پیروی ہونے لگی ۔

دکن کے اس دور کے شعراء میں بعض تو وہ ہیں جو چھٹے دور میں موجود تھے اور ان کا انتقال اس دور میں ہوا ، مثلاً توفیق ، دل ، ذہین ، کیفی ، لمعہ ، رعد ، محب عظمت اللہ خان ، نظم ، باغ ، شاد ، جلیل ، اور عزیز وغیرہ ۔ چھٹے دور کے بعض شعراء ایسے ہیں جو بحمد اللہ اب تک بقید حیات ہیں اور اردو کی خدمت میں مصروف اور منہمک ہیں مثلاً حضرت امجد ، حسرت صدیقی ، آزاد ، ھمتی ، مزاج وغیرہ ۔

اس دور کے شعراء کو ہم چار گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں ، پہلے گروہ میں وہ شعراء شامل ہیں جو تولد کے لحاظ سے تو دکن کے نہیں ہیں مگر وہ بچپن یا عنفوان شباب میں دکن آ گئے اور اسی کو وطن بنا لیا ، اور یہاں ہی سے نذر اجل ہوئے یا اب بھی اردو کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں ۔ مثلاً سید امین الحسن بسمل ، حضرت فانی بدایونی ، نواب اصغر یار جنگ اصغر ، مرزا فرحت اللہ فرحت ، نواب ہوش یار جنگ

ہوشؔ بلگرامی، حضرت اخترؔ، مرزا یگانہؔ، مرزا عصمت اللہ بیگ عصمتؔ وغیرہ۔

دوسرے شعراء وہ ہیں جن کا وطن ہی دکن ہے، یا جن کے آباء اور اجداد نے صدیوں پہلے دکن کو وطن بنا لیا تھا، ایسے شعراء میں سے بھی بعض فوت ہو چکے اور بعض زندہ ہیں، مثلاً ۱۔ غلام دستگیر ثؔ، ۲۔ نصیر الدین اصغرؔ، ۳۔ مخدوم شاہ امیدؔ، ۴۔ عبدالرزاق بسملؔ، ۵۔ اللہ بخش توحیدؔ، ۶۔ سید علی نواز تصورؔ، ۷۔ مرزا جعفر علی جعفرؔ، ۸۔ راگونندر راؤ جذبؔ، ۹۔ بشن سنگھ خوشترؔ، ۱۰۔ رگوناتھ راؤ دردؔ، ۱۱۔ عبدالرزاق راشدؔ، ۱۲۔ ریاض الدین ریاضؔ، ۱۳۔ شرف الدین ساقیؔ، ۱۴۔ سیف الدین سیفؔ، ۱۵۔ کیپٹن اعجاز علی شہرتؔ، ۱۶۔ عبدالکریم خان شمشیرؔ، ۱۷۔ غلام پنجتن شمشادؔ، ۱۸۔ غلام شاہد شاہدؔ، ۱۹۔ عبدالرزاق شمیمؔ، ۲۰۔ سید زین العابدین عابدؔ، ۲۱۔ محمد حبیب الدین صغیرؔ، ۲۲۔ نرسنگ راج عالیؔ، ۲۳۔ محب اللہ عالیؔ، ۲۴۔ وحید الدین عالیؔ، ۲۵۔ غلام غوث عشقؔ، ۲۶۔ عبدالوہاب عندلیبؔ، ۲۷۔ احمد یار جنگ فانیؔ، ۲۸۔ سید ابوالحسن قیصرؔ، ۲۹۔ قدرت نواز جنگ قدرتؔ ۳۰۔ بدیع اللہ قیسؔ، ۳۱۔ لطف الدولہ لطفؔ، ۳۲۔ معین الدولہ معینؔ، ۳۳۔ مجاہد الدین مجاہدؔ، ۳۴۔ آفتاب علی مہرؔ، ۳۵۔ سید علی منظورؔ، ۳۶۔ ایوان شرف مجیدؔ، ۳۷۔ منیر الدین منیرؔ، ۳۸۔ میر محمد علی مسرورؔ، ۳۹۔ عبدالقیوم خان ناظمؔ، ۴۰۔ محمد علی خان ناظمؔ، ۴۱۔ حبیب اللہ وفاؔ، ۴۲۔ عمر خاں وفاؔ، ۴۳۔ غلام محمد وفاؔ ۴۴۔ وحید اللہ وحیدؔ، ۴۵۔ وزیر جنگ ہادیؔ وغیرہ۔

تیسرا طبقہ ان جوان شعراء کا ہے جو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ دوسری درس گاہوں سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔ اور فکر سخن میں مصروف

ہیں۔ ان میں سے بعض کی شاعری پختہ ہو چکی ہے۔ اگرچہ اونھوں نے اس دور میں شاعری کا آغاز کیا مگر سرعت کے ساتھ ان کی شاعری پروان چڑھی۔ افسوس ہے ان میں سے بھی بعض نے اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی ہے۔ اس طبقہ کے چند شعراء حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ تراب علی خان باد، ۲۔ فضل الرحمٰن، ۳۔ شمس الدین علم، ۴۔ میر کاظم علی خان کاظم، ۵۔ شاہد صدیقی، ۶۔ برق موسوی، ۷۔ اقدس، ۸۔ لمعہ، ۹۔ نظر، ۱۰۔ دہقانی، ۱۱۔ قاضی قطب الدین اختر، ۱۲۔ اکبر علی خان اکبر، ۱۳۔ عبدالغفار شاکر، ۱۴۔ رکن الدین وفا، ۱۵۔ جمشید جی آفت، ۱۶۔ حسن نواز جنگ حسن، ۱۷۔ محمد عباس علمی ۱۸۔ رشید ترابی، ۱۹۔ امام بیگ رونق، ۲۰۔ عابد علی سعید وغیرہ۔

چوتھا گروہ ان شعراء کا ہے جو جامعہ عثمانیہ کی پیداوار ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ غلام احمد شریف آرام، ۲۔ محمد جلال الدین اشک، ۳۔ اکبر وفا قانی، ۴۔ سلیمان ادیب، ۵۔ محمد امیر امیر، ۶۔ محمد عبد القیوم خان باقی، ۷۔ ڈاکٹر محمد بدر الدین بدر، ۸۔ محمد نصر اللہ برقی، ۹۔ محمد شعیب حزیں، ۱۰۔ محمد عبدالسلام ذکی، ۱۱۔ محمد حبیب اللہ رشدی، ۱۲۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور، ۱۳۔ سید علی حسین زیبا، ۱۴۔ صمد رضوی ساز، ۱۵۔ مہندراج سکسینہ، ۱۶۔ محمد نصر اللہ سروش، ۱۷۔ رگھو نندن راج سکسینہ، ۱۸۔ بدرالدین خان شکیب، ۱۹۔ سید نبی الحسن شمیم، ۲۰۔ شنکر مدھو لال ارمان، ۲۱۔ عزیز احمد عزیز، ۲۲۔ مخدوم محی الدین مخدوم، ۲۳۔ محمد علی خان میکش، ۲۴۔ سکندر علی وجد، ۲۵۔ غلام دستگیر رشید، وغیرہ ہیں۔

فرداً فرداً اس دور کے شعراء کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ کہن سال شعراء تو اپنی قدیم روش پر قدم زن رہے اور اپنے قدیم رنگ میں خیال آرائی کرتے رہے۔ مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد شاد تخلص اپنی غزلوں میں تصوف اور معرفت کا راگ سناتے رہے، ان کی زبان کی سلاست اور ماثر آفرینی باقی رہی، عزیز یار جنگ عزیز حضرت داغ کے شاگرد تھے۔ اپنے استاد کے رنگ کو زندگی بھر نبھایا اس طرح روزمرہ، زبان کی شیرینی و لطافت، کلام کی رنگینی اور شگفتگی کو قائم رکھا۔ حضرت امجد اپنی رباعیوں، نظموں اور غزلوں میں تصوف کے اسرار، تصوف کے رمز سناتے رہے۔ اپنے وجد آفریں کلام سے گرماتے رہے اسی عہد کے دوسرے معمر شعراء نے بھی اپنے قدیم طرز اور روش کو قائم رکھا۔ البتہ زمانہ اور ماحول کے مدنظر ان کی غزلوں میں بھی ترمیم ضرور ہو گئی، اردو کے مشاہیر شعراء یعنی میر تقی میر، خواجہ درد، غالب، مومن، اور اقبال کی پیروی ان کا طرہ امتیاز رہا، جو ان شعراء خواہ جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوں یا نہ ہوں۔ ان کے سامنے جو نمونے شمال اور دکن کے اساتذان سخن کے پیش نظر رہے اس کی انہوں نے پیروی کی تاریخی شاعری کے لئے اگر انہوں نے شبلی اور ظفر علی خان کو اپنا رہبر بنایا تو وہی کیفی کی واقعہ نگاری بھی پیش نظر رہی۔ سیاسی نظموں کے لیے ظفر علیخان چکبست شبلی اور اکبر کی نظمیں چراغ راہ ثابت ہوئیں۔ اشتراکی نظموں کے لئے اقبال جوش، مجاز، سلام، فیض، احسان دانش وغیرہ کی شاعری موثر ثابت ہوئی۔ اختر شیرانی کی رومانی شاعری مقبول ہوئی۔ جس طرح دوسرے شعراء شمال مثلاً حفیظ، راشد، وغیرہ کے کلام نے ماڈل کا کام دیا تو اسی طرح عظمت اللہ خاں مرحوم کی ہندی

آمیز شاعری اور ہندی بحریں مقبول ہوئیں اور اپنا مقام حاصل کر لیا۔

غزلیات میں جہاں غالب، میر، درد، وغیرہ کے کلام کو رہبر بنایا گیا وہاں اقبال، جگر، حسرت موہانی، فراق، یگانہ، فانی، کیفی اور توفیق کو استاد سخن جان کر پیروی کی گئی۔

حضرت اکبر کے مزاحیہ یا طنزیہ رنگ نے جو مقبولیت حاصل کر لی وہ آزاد عصمت، شکور، وغیرہ وغیرہ نے اپنے لئے پسند کر لیا۔ اسی زمانہ میں دیہات کی زبان میں شاعری کا آغاز ہوا۔ اور کئی شعراء اس میں حصہ لینے لگے۔ خصوصیت سے دہقانی نے دیہاتی زبان میں سیاست کی جو موشگافی کی وہ یادگار رہے گی۔

ہزل گوئی یا عریاں نگاری کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف الحق مرحوم، غلام جیلانی عاجز اور شمشاد نے اس نوع کا کافی ذخیرہ پیش کیا ہے، کلیات عریاں تو دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوا ہے۔

یورپ کی دوسری عالمگیر جنگ عظیم کے بعد جو حالات بدل گئے اس سے شعراء خصوصاً جوان شعراء میں ایک عظیم الشان تبدیلی ہو گئی ان کو حالات نے انقلاب کی طرف زیادہ مائل کر دیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے آخری چند سالوں میں نئی نئی تحریکیں رونما ہوئیں۔ اور انقلابی تصورات کی بڑی فراوانی ہوئی۔ بیرونی اثرات کے ساتھ ساتھ شاعروں کے تخیل کی پرواز اور ان کے اسلوب بیان پر شاعروں کی خداداد طبیعتوں نے بھی حصہ لیا۔ ان دونوں امور کے باعث شاعری میں جو اصلاحیں ہوئیں وہ شعر کی معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں پر مشتمل ہیں۔ ادب برائے زندگی کے نظریہ نے جو مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ محتاج بیان نہیں اس عالمگیر اثر نے

شاعری کی ہر نوع میں ایک انقلاب کی صورت پیدا کر دی ۔ مزید برآں ہندوستان، پاکستان اور قلمرو آصفی میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی ۔ ہزاروں بے گناہ معصوم جانیں جس بے دردی سے ہلاک ہوئیں جو مصیبت اور تباہی آئی ۔ ہزاروں شریف عصمت مآب خواتین کی عصمتیں لوٹی گئیں اور نقصان عظیم برداشت کرنا پڑا ۔ اس کا اثر شعراء کے دل اور دماغ پر ہوا ۔ اور اس اثر اور احساس سے متاثر ہو کر شعراء نے جو نقش صفحۂ قرطاس پر منقش کئے ہیں وہ افلاس، تنگ دستی، بھوک، قید و بند، امراض کسان سرمایہ دار کے علاوہ ظالموں کی خونی تلواروں کی نوحہ خوانی خون افشانی کی مذمت، مظلوموں کے آنسو بن کر ظاہر ہوئے ہیں ۔ انہوں نے ظلم کی مذمت اور مظلوموں کی حمایت کی ہے ۔ سفاکی اور بے دردی پر دل کھول کر لعنت ملامت کی اور امن امان، شانتی سے زندگی بسر کرنے، انسان بن کر رہنے کی تلقین کی ہے۔

اس کے ساتھ عشق و محبت کا جادو کم نہیں ہوا ۔ بلکہ شاید سر چڑھ کر بول رہا ہے البتہ عشق محبت کی فرضی داستان کے بجائے اب زندگی کے مشاہدات بیان ہونے لگے ہیں، عشق و محبت کے جذبات قدیم طرز پر رمزیت، اشاریت اور استعاروں میں بیان کرنے کے بجائے اب پردہ چاک کر دیا جا رہا ہے ۔ اور راز درون پردہ کی جھلک نظر آنے لگی ہے ۔ اس خصوص میں خود خواتین شعراء نے کیا طرز اختیار کیا ہے وہ ہم علیحدہ بیان کریں گے ۔

بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے شعراء کے کلام میں نئے نئے شعری تجربوں کیطرف طبیعتیں مائل نظر آتی ہیں اور اظہار کے سانچے بھی بدلنے لگے ہیں ۔ اس تفصیل کے بعد ہم بطور نمونہ چند شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام کا نمونہ پیش

کرتے ہیں۔

اس دور میں کئی سو شعراء ہیں سب کے کلام کو پیش کرنے کا مقصد نہیں ہے باورچی دیگ کا حال معلوم کرنے کے لئے کفچہ میں تھوڑا سا کھانا نکالتا ہے اور اس سے اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ اس اصول کے تحت میں نے یہی کیا ہے۔ چاروں گروہوں سے چند شعراء کو منتخب کیا گیا ہے۔ جن کا تذکرہ سلسلہ وار کیا جاتا ہے۔

ان تمام شعراء کے قطع نظر خود اعلیٰحضرت سلطان العلوم بھی شعر و سخن کے تاج دار ہیں، اور بعض شہزادگان نے بھی داد سخن دی ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم کے کلام نے دنیائے ادب میں جو رتبہ حاصل کر لیا ہے۔ وہ اب ایک حقیقت ہے، حضور کے کلام کو ملوک الکلام کہنا ہر طرح بجا ہے۔

حضرت عثمان کا کلام حسب ذیل ہے:۔

غزل

نہاں نظر سے ہوا روئے یار مشکل ہے
اب اپنے دل پہ ہمیں اعتبار مشکل ہے

کسی کے غمزہ و انداز ناز نے دل پر
کئے وہ ظلم کہ جن کا شمار مشکل ہے

ہزار بار تمھیں آزما کے دیکھ لیا
تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے

نگاہ ناز اک آفت ہے مرغ جاں کیلئے
یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے

غم رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی
ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے

میں اس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں
ترا گذر بھی نسیم بہار مشکل ہے

پڑی ہے بادۂ تر کی جو چاٹ اے عثمان
بہار گل میں یہ جائے ہزار مشکل ہے

دیگر

کیا محفل ہستی کا نقشہ متغیر ہے ساقی ہے نہ مطرب ہے شیشہ ہے نہ ساغر ہے

غم سے نہ فراغ اس کو سودے سے نہ وہ خالی دل ہے تو عجب دل ہے سر ہے تو عجب سر ہے

سونے سے جب اٹھے گا اک حشر بپا ہوگا وہ فتنۂ خوابیدہ جو فتنۂ محشر ہے

تلوار جو کھینچی ہے حاضر ہے گلا میرا دل میں بھی وہی میرے جو آپ کے لب پہ ہے

انداز ترے قاتل سب جان کے دشمن ہیں چتون ہے کہ ناوک ہے غمزہ ہے کہ خنجر ہے

جو برق گراتی ہے وہ ہے نگہ جانان جو دل کو پھنساتی ہے وہ زلف معنبر ہے

اب چشم عنایت سے پیاس اس کی بجھا دیجئے

بیتاب بہت عثماںؔ یا ساقیٔ کوثر ہے

دیگر

پی کے مئے ساقی نہ یوں مدہوش رہنا چاہیئے

کچھ خیال خاطر مے نوش رہنا چاہیئے

تیرے غمزے کو ادا کو ناز کو انداز کو

میرے ارمانوں سے ہم آغوش رہنا چاہیئے

دیکھ کر صہبا کو زاہد کی نہ لگ جائے نظر

ان خموں پر ساقیا سر پوش رہنا چاہیئے

درد دل آمادۂ فریاد کرتا ہے مجھے

ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہیئے

نغمۂ بلبل جو سنتا ہے تو اے اہل چمن

مثل گل ہر دم سراپا گوش رہنا چاہیئے
تیغ قاتل نے سبکدوشی کا ذمہ لے لیا
اب کسی سر کو نہ بار دوش رہنا چاہیئے
موسم گل جا چکا عثمان مگر کہتا ہے دل
اور بھی کچھ دن جنوں کا جوش رہنا چاہیئے

دیگر

دیکھ کر چہرۂ تابانِ درخشاں کی قسم
پھنس گئے دام میں ہم زلف پریشاں کی قسم
اور ہوں گے گہر و لعل پہ مرنے والے
ہم مٹے لب پہ ترے لعل بدخشاں کی قسم
مثل پروانہ بنے دیکھ کے صورت تیری
جل کے ہم خاک ہوئے شمع شبستاں کی قسم
موسم گل کا نیا تو بھی دکھا دے نقشہ
ڈی لے لے تیغ تجھے سبزۂ وریحاں کی قسم
پس کے سو بار رہِ عشق بتاں میں اکسیر
بن گئی خاک ہماری درجاناں کی قسم
دیکھ اے قیس اسے جامہ دری کہتے ہیں
تار باقی نہ رہا جیب و گریباں کی قسم
ہو گئی ختم نبوت جو نبی پر عثمان
ہے یہ ایماں ازل سے مرا قرآں کی قسم

نوحہ

یہ کرنا عرض اے باد صبا سبط پیمبر سے
کہ غم میں آپ کے دریا رواں ہے دیدۂ تر سے
کہو اشک و فغاں سے ذکر ہوتا ہے شہیدوں کا
گرجنا ہو جسے گرجے برسنا ہو جسے برسے

خدا کی شان یک قطرہ نہ پہنچا حلق تک شہ کے
مگر ہے تیغ کا پانی کہ اونچا ہو گیا سر سے

جو دل کے سخت ہیں وہ بھی غم سرور میں گریاں ہیں
عجب تاثیر ہے پانی نکل آتا ہے پتھر سے

مئے حب نبی میں رات دن ہم مست رہتے ہیں
نہ غم سے ہے غرض ہم کو نہ شیشے سے نہ ساغر سے

قیامت ہو گی برپا اور میدان قیامت میں
اوٹھیں گے ہم جو آنسو پونچھتے دامانِ محشر سے

وہ ہیں اشک عزا اپنے بدولت جن کو اے عشق
چکھایا ساقیٔ کوثر نے ہم کو جام کوثر سے

دیگر

محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و تواں باقی
ابھی حصہ میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی

گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغاں باقی

خدا ہی کشتیٔ دل کا ہے حافظ بحر الفت میں
نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادباں باقی

سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یارانِ رفتہ کا
غضب یہ ہے کہ ہے اب نہ کچھ نشاں کارواں باقی

زبان شمع سے سنتا ہوں قصہ سوز الفت کا
شب آخر ہو چکی لیکن ابھی ہے داستاں باقی
شب دوشنبہ کی بدمستیاں کیا کہوں ساقی
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گراں باقی
سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذر اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

سرزمین طیبہ کا رتبہ میں عثمان کیا کہوں
سنگ ریزے جس کے ایماں کے ستارے ہو گئے

پوچھنا ہے ملک الموت سے اک دن مجھ کو
آپ کا کوچۂ قاتل میں گزر ہے کہ نہیں

تری آنکھ غیروں سے کیا مل رہی ہے — گلے ہم سے گویا قضا مل رہی ہے
جگر میں تپش دل میں ہے سوز عثماں — محبت کئے کی سزا مل رہی ہے

اوراق گل کو رشکِ صحنِ ارم کروں — پڑھ کر اگر میں سورۂ اخلاص دم کروں
قدسی بھی آئیں لینے کو عثمان مرے قدم — میں سر کے بل جو عزم طوافِ حرم کروں

حضرت عثمان کے کئی فرزند شاعری کا اچھا ذوق رکھتے ہیں یہاں ہم صرف شہزادہ معظم جاہ المتخلص بہ شجیع کے کلام کا کچھ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اپنے وعدہ پہ کب وہ آتے ہیں — شکوہ کیجے تو مسکراتے ہیں

گرد پھر پھر کے بزمِ عشاق
شمع محفل انہیں بناتے ہیں
کاش آ کر کہے کوئی قاصد
چلئے وہ آپ کو بلاتے ہیں

ابتدا تھی ابھی کہانی کی
پھروں آنکھوں نے خوں فشانی کی
آتشِ شوق کو تھا بھڑکانا
یہ ضرورت تھی لن ترانی کی
مرتبہ میرا پوچھ کچھ نہ تشنجیح
در سید پہ پاسبانی کی

بالیں پہ دمِ نزع جو وہ آئے ہوئے ہیں
بیتاب ہیں بے چین ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
رکھ لے دل خوددار کی تو لاج خدایا
ہم یار سے ملنے کی قسم کھائے ہوئے ہیں
منظور سرِ قبر جو تھا حشر اوٹھانا
ساتھ اپنے رقیبوں کو بھی وہ لائے ہوئے ہیں
آئینے میں کیا تھا جو اسے دیکھتے پہروں
خود اپنی ہی صورت پہ وہ للچائے ہوئے ہیں
دیکھا میری تربت کو تو کس ناز سے بولے
ایسے کئی مدفن مرے ٹھکرائے ہوئے ہیں

کیوں بڑھے ہاتھ نہ قاتل کا قضا سے پہلے
چارہ گر دیکھتے ہیں نبض دوا سے پہلے
ہیں یہ الفت کے کرشمے کہ مرے حصہ میں
زیست ایسی ہے کہ مرتا ہوں قضا سے پہلے
ایسی توبہ تری کس کام کی توبہ ہے تشنجیح
ٹوٹ جاتی ہے جو ساون کی گھٹا سے پہلے

اس تفصیل کے بعد اب دوسرے شعراء کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

فرحت:۔ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم اردو زبان کے مشہور مزاحیہ نگار۔ آپ کا تفصیلی تذکرہ نثر نگاروں میں کیا جائے گا۔ بحیثیت شاعر بھی آپ کا خاص مقام تھا بقول غلام یزدانی صاحب فرحتؔ دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ فرحت نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، فرحت کے کلام میں زبان کی لطافت، مضامین کی رنگینی، جدت خیال حسن بیان کے ساتھ اثر بھی موجود ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ظرافت اور شوخی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اونہوں نے میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ سب کے رنگ میں اپنے خیالات کی جولانی بنائی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں فرحت کا حیدر آباد میں انتقال ہوا۔

کلام کا نمونہ پیش ہے۔ فرحت کی نظموں میں "جمنا کا کنارا" والی نظم جو یادِ وطن کے نام سے لکھی گئی ہے زیادہ مقبول ہوئی اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

اے اہل وطن پوچھ نہ یہ مجھ سے خدارا — دلی کا بھی ہے یاد تجھے کوئی نظارا

ہے یادِ وطن ہی مرے جینے کا سہارا — اس شہر کا ہر گوشہ ہے یوں تو مجھے پیارا

آنکھوں میں سدا پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ چاندنی رات اور وہ فضا نور سراپا — رہ رہ کے وہ پھر بادِ سبک سیر کا جھونکا

پانی کا وہ اندازِ روانی کہ کہوں کیا — اس منظر خاموش میں گھاٹوں کا وہ نقشہ

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اس عکس رخ ماہ میں پانی کا وہ دھارا — پگھلی ہوئی چاندی تھی کہ بہتا ہوا پارا

اور سطح کو کچھ موج ہوا نے جو ابھارا — پھر لہروں کا اٹھ اٹھ کے بلانے کا اشارا

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور سامنے ہی قلعہ کا وہ منظر مایوس — وہ شمع زباندانی کا ٹوٹا ہوا فانوس
اک حسن کہ ہے چادر ویرانی میں ملبوس — تھا ہند کا پہلے جو کبھی مرکز ناموس

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

مشرق میں افق کے وہ چمکدار کنارے — اور ان میں وہ کرنوں کے پر از نور شرارے
مغرب میں اترتے ہوئے وہ ماند ستارے — دریا کی وہ بیداری وہ موجوں کے طرارے

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہر گھاٹ پہ وہ دلی کے حسینوں کا وہ جھرمٹ — وہ ساڑھیاں ہر رنگ کی وہ ہاتھ کے گھونگھٹ
وہ حسن خداداد نہیں جس میں بناوٹ — قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

پھر گھاٹ کے نزدیک وہ ڈبکی کا لگانا — گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑھی میں بدن کا وہ چرانا — جھک جھک کے وہ جل ہاتھوں سے سورج کو چڑھانا

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ بیلے کے ہر کونہ سے موروں کی جھنکاریں — اور آموں پہ کوئل کی وہ کوکو کی پکاریں
وہ ابر کے رنگوں کے بدلنے کی بہاریں — ان اودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ قسمت بیداد کے دن اور وہ راتیں — وہ کشمکش دہر کے جھگڑوں سے نجاتیں
اور لطف جوانی کا اٹھانے کی وہ گھاتیں — فرحت کو نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی وہ باتیں

یاد آئے گا ہر وقت وہ جمنا کا کنارا

ایک اور نظم

کیا اسی واسطے پیدا ہوئے سنسار میں ہم — کہ دھرے جائیں سدا عشق کی بیگار میں ہم
اس بری طرح پھنسے مجمع اغیار میں ہم — گھٹ کے دم مر ہی گئے کوچہ دلدار میں ہم
شکل تو ایسی ہے واللہ کوئی منہ نہ لگائے — کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم
ہم نے مانا کہ سنہ انیس کی ہی فورڈ سہی — کہیں جاتے ہیں تو جاتے ہیں ٹمکہ کار میں ہم
چھیڑ خانی سے حسینوں کی نہ باز آئیں گے — کیا ہوا اگر کہیں پٹ بھی گئے بازار میں ہم
مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں — کچھ برے بھی نہیں یوں دیکھو تو وہ چار ہیں ہم
لوگ سمجھیں کہ بھئی یہ تو بڑے عالم ہیں — بیٹھے رہتے ہیں کتابوں کے لیے انبار میں ہم
شوق میں ڈانٹ تو لیتے ہیں پٹھانو نکا لباس — ہاں نظر آتے ہیں کچھ ریچھ سے شلوار میں ہم

کیا غضب ہے کہ عدو رولز ذرائس میں پھریں
اور گھسٹتے پھریں ٹوٹی ہوئی اک کار میں ہم

ریختی کے ایک دو شعر ملاحظہ ہوں۔

میری ہمسائی یوں تو کالی ہے — پر بوا کیا سلیقہ والی ہے

رستہ میں دن دہاڑے فرحت نے مجھ کو چھیڑا — میں نے بھی غل مچا کر سر پر اٹھائی بستی

غزلوں میں میر اور غالب کا رنگ :۔

شب ہجران گذر گئی لیکن — دل میرا بے قرار ہے اب تک
ہے خزاں اور دل کے زخموں سے — میرے گھر میں بہار ہے اب تک

موت آ چک کہ غیر کے غم میں　　دیکھ وہ سوگوار ہے اب تک
اس کے وعدے کو ہو گئے برسوں　　اور مجھے انتظار ہے اب تک
کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا　　جس کا فرحتؔ خمار ہے اب تک

دل مرا روز ازل سے بیقرار نغمہ ہے　　ہر نفس اس کے لئے آوازۂ تار نغمہ ہے
ہر مصیبت کیا، گزشتہ راحتوں کی یاد ہے　　نوحہ بھی دیکھو تو گویا یادگار نغمہ ہے
ساز کی حاجت نہیں نغمۂ جاں سوز کو　　گوش اہل ذوق کو ہر ساز عار نغمہ ہے
جل بجھے پہلو میں دل وہ چیز ہے سازو شرر　　درد کا اس میں جو پردہ ہے شرار نغمہ ہے
انقلاب دہر میں جب رنج و غم کا بھی ہے دور　　کیوں دل راحت طلب کو انتظار نغمہ ہے

کچھ اور کلام :-

جس کی تلاش میں ہیں سارے جہان کے رہرو
اس بے نشاں کا میں بھی دھندلا سا اک نشاں ہوں

کیا نزاکت کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے　　تیری صورت پر یہ قدرت کو کیا کیا ناز ہے
ہر نگاہ ناز گویا تیر بے آواز ہے　　اس کی ناوک افگنی میں یہ غضب کا راز ہے
بے نیازی اور تیرا ناز کچھ ہیں ایک سے　　فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز اس میں ساز ہے

فرحتؔ کی طبیعت بھی اک راز ہے سربستہ　　میکش تو نہیں لیکن کچھ رنگ ہے رندانہ

رنج کے بعد ملتی ہے راحت　　انقلاب انقلاب لاتا ہے

قسمت سے مل گیا ہے تجھے اس کا آستاں
مرنا کہیں ضرور ہے زاہد یہیں سہی

منتظر ہیں ہم ان کے آنے کے
یہ بہانے ہیں جان جانے کے

کس شان کے ساقی نے میخانے بنا ڈالے
جو ٹوٹے ہوئے دل تھے پیمانے بنا ڈالے
دل کس کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دیدی
اس کعبے میں لاکھوں ہی بت خانے بنا ڈالے
یہ راز حقیقت کیا اوروں سے نہ چھپ سکتا
تو نے جو یہ ہم جیسے دیوانے بنا ڈالے
مذہب کے یہ سب جھگڑے بس اس لئے برپا ہیں
سمجھے نہ حقیقت کو افسانے بنا ڈالے
اے پیر مغاں ہم ہیں قائل تری جدت کے
مسجد کے نمونوں پر میخانے بنا ڈالے
میں کچھ نہ سہی فرحتؔ اس قوم کا ہوں لیکن
فغفوروں کے سر جس نے پیمانے بنا ڈالے

اختر:- علی اختر نام اور اختر تخلص، آپ کے والد حیدرآباد آکر بس گئے۔ اختر کی نشو و نما حیدرآباد میں ہوئی، اپنے والد حضرت باغ سے تلمذ حاصل کیا۔ اختر زیادہ تر نظم لکھا کرتے ہیں۔ مگر غزل گوئی میں بھی آپ کو پوری مہارت ہے۔ مگر غزل کے قدیم طریقہ کی پابندی نہیں کرتے بلکہ آپ کی غز

بھی اس کی محدود دائرہ سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہوتی ہے ۔ اختر کی نظمیں مختلف اقسام پر تقسیم کی جا سکتی ہیں ، واقعہ نگاری ، وصف نگاری ، نیچرل شاعری کے بڑے اچھے نمونے دستیاب ہوتے ہیں ۔ اختر کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی حد بندی کی پابندی نہیں کرتے ۔ وہ شعر کو غیر محدود فضا کی دلآویزیوں سے لبریز کرتے ہیں ۔ جدید رجحانات سے ان کی شاعری مملو ہوتی ہے ۔ اختر کی غزلوں کا مجموعہ "انوار" کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو نے شایع کیا ہے ۔ نظموں کا مجموعہ ہنوز شائع نہیں ہوا ۔ آپ کا کلیات نہایت ضخیم مرتب ہو چکا ہے ۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :-

کم نہ تھی قیامت سے صبح آفرینش بھی ۔۔۔ میری مضطرب نظریں اور انتخاب اُن کا

ثنا کے سرمایۂ جوانی اسے عطا کی ہے زندگانی
عروس ہستی کے خال و خد میں جھلک رہا ہے شباب میرا

درد کو جاوداں کیا حسن کو دی ستم کی خو ۔۔۔ لذت غم سے کیا ملا ، ذوق نظر کیا کیا

پھر دل میں جنوں ، سلسلہ جنباں نظر آیا ۔۔۔ شیرازۂ کونین پریشاں نظر آیا

پھر بہار آئی نشاط روح کا منظر کھلا ۔۔۔ ساز جاگے ، جام چھلکے ، میکدے کا در کھلا

نہ دیار غیر میں چین ہے نہ وطن کے دشت و دیار میں
کہ ہزاروں ذرے ہیں مضطرب مری ایک مشت غبار میں

نہ محدود جلوے نہ محرم نظریں — مرے دل کو ناحق پریشانیاں ہیں

آپ کے حسن تغافل کی قسم — ہے فقط آپ کی حسرت دل میں

اِدھر ڈوبا ہوا میں فکر تعمیر نشیمن میں — فلک تیار بیٹھا ہے اِدھر بجلی گرانے کو

فنائے ذات میں ہے راز ہستی سرمد — جو ڈوبتا ہے وہ دریا کے پار اترتا ہے

اب نظم کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

حیات

اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

مجھے یہ دھمکیاں نہ دے حیات کوئی چیز ہے — وہ کوئی چیز ہو نہ ہو مگر مجھے عزیز ہے
سمجھ سکوں یہ راز میں ابھی تو یہ تمیز ہے — ڈرا نہ دام و آز سے فریب امتحان نہ دے

اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

حجاب دہر اٹھا گئی گرفتگی خیال کی — مآل غم سے مٹ گئی خلش غم مآل کی
یقیں نے توڑ دیں حدیں طلسم احتمال کی — حیات پھر حیات ہے مثال رفتگاں نہ دے

اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

تلاش راز دہر میں کہاں کہاں پھرا ہوں میں — نفس نفس بجھا ہوں میں چمن چمن کھلا ہوں میں
قریب انتہا میں تھا اب اپنی ابتدا ہوں میں — جو منزلیں گزر چکیں انھیں کا پھر نشاں نہ دے

اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

اجل سے بھیک مانگنا یہ کار زندگی نہیں — خزاں کے رحم پر ہوں جو وہ پھول پھول ہی نہیں
تجلیات وہم ہیں جو حسن سرمدی نہیں — حدیث شوق کیا اگر لطافت بیان نہ دے

اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ہوائے سرد سرد ہے نشاط جاں لئے ہوئے سرور موج موج ہے جوانیاں لئے ہوئے
حجاب گرد کارواں ہے کارواں لئے ہوئے یہاں فغاں کا ذکر کیا یہ دعوت فغاں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ازل سے گرم کار ہے وہ فطرت عظیم تر دیار نور و نار میں سر بساط بحر و بر
اسی کی صبح و شام ہیں اسی کے لالۂ و گہر متاع سود مند کو یہ تہمت زیاں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

چمن کے راز داں ہیں جو انہیں غم خزاں نہیں چمن بھی سرمدی نہیں خزاں بھی جاوداں نہیں
مگر وہ روح زندگی کہاں رواں دواں نہیں دیار عقل و ہوش میں پیام گمرہاں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

فنا مآل وہم ہے نہ منزلیں نہ کارواں حیات نقش منتقل حیات حسن جاوداں
کہیں سکوں کہیں خلش کہیں عیاں کہیں نہاں یقیں کی بارگاہ میں یہ تحفہ گماں نہ دے
اب اے تصور اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

عصمت:۔ مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب کا وطن دہلی ہے مگر بچپن میں حیدرآباد آ گئے۔ کیونکہ ان کے خاندان کے بیسیوں افراد حیدرآباد کو وطن بنا چکے تھے۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول میں ان کی تعلیم ہوئی۔ مرزا صاحب کو ظرافت فطرتاً عطا ہوئی ہے۔ وہ بچپن سے اسی رنگ میں رنگے ہیں۔ شاعری کا شوق ان کو ورثہ میں ملا ہے۔

قوم کی اصلاح کے لئے حضرت اکبرؔ مرحوم نے مزاحیہ رنگ اختیار کیا۔ اکبرؔ

ہی کی پیروی میں عصمت نے بھی اسی رنگ میں شاعری شروع کی اور اب ان کا رنگ پختہ ہو گیا ہے۔ ان کی شاعری میں بلا کی آمد ہے۔ اور فطری ظرافت پائی جاتی ہے پھر زبان کی صفائی بھی قابل داد ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

جو گھر چلتا رہے عصمت یہی ہے ہوم رول اپنا
نہ کچھ ہو ہاتھ کی تنگی یہ مطلب ہے فریڈم کا

جو اصحاب یورپ سے یورپین بیویاں لاتے ہیں ان کے متعلق ایک نظم کے شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہے تمہاری زندگی بھی زندگی غواص کی — ہے تمہاری راہ بھی اندیشہ ناک و پرخطر
قعر دریا میں جو غوطہ مارتا ہے غوطہ زن — ایک تو وہ ہے کہ جو لے آتا ہے اصلی گہر
دوسرا وہ جو کہ چن لاتا ہے تہ سے سیپیاں — بعض میں ہوتے ہیں موتی اور خالی بیشتر
تیسرا وہ جو کہ غوطہ مارتا ہے آب میں — بند وہ آنکھیں کئے پھرتا ادھر سے ادھر
ڈھونڈ کر لاتا ہے ایک دریا سے وہ سیپی بڑی — دیکھتا ہے اس کو جب خشکی میں باہر ڈال کر
ایک بڑا کچھوا دکھائی دیتا ہے چلتا ہوا — جس کو وہ سیپی سمجھتا تھا وہ کچھوا ہے مگر

تم سمندر پار سے کچھوا نہ لے آنا کہیں
لے کے تم جو کچھ چلو اس کو سمجھ لو پیشتر

لے گئے یورپ کو اپنے ساتھ بھر کر تھیلیاں
آئے خالی ہاتھ واپس خرچ کر کے مال و زر

اس پہ دعویٰ یہ کہ لاکھوں کا ہے یہ خالی دماغ
باتیں کرنے کا موقع ملے تو کھا جاتے ہیں سر

گڈے گڑیا کا بیاہ

جو سنتا ہے کہتا ہے سمدھن سڑن ہے
جو سمدھی ہیں ان میں بھی دیوانہ پن ہے
کبھی ان کا دولھا نو ان کی دلہن ہے
تلوّن ہے دونوں میں چرچا یہی ہے

خدا جانے جھگڑے کے اسباب کیا ہیں
یہ روٹھے ہیں ان سے یہ ان سے خفا ہیں
کبھی یہ ہیں ملتے کبھی یہ جدا ہیں
زبردست گڑبڑ گھٹالا یہی ہے

بیاں کی وہ سمدھن نے گڈے کی صورت
کہ سب سننے والوں کو ہوتی ہے حیرت
مگر کچھ نہ فرمایا گڑیا کی نسبت
کہ یک طرفہ ڈگری میں ہوتا یہی ہے

ہماری نظر میں ہے دونوں کا نقشہ
یہ بندی خدا کی وہ بندہ خدا کا
ہمیں بھی مروت کا کچھ پاس آیا
کہ آدم سے آدم کا رشتہ یہی ہے

بناتے ہیں دونوں کی ہم شکل و صورت
دکھاتے ہیں دونوں کی ہم سب کو ہیئت
کہ شاید نکل آئے شادی کی صورت
سخن کا ہمارے خلاصہ یہی ہے

وہ صورت میں ہیں ایک سے ایک اعلیٰ
وہ ہیئت میں ہیں ایک سے ایک زیادہ
اک آلو ہے ان میں اک آلو بخارا
کہ بچوں کا پہلا نمونہ یہی ہے

نہ گڈے کی ابرو نہ مونچھیں نہ ڈاڑھی — نہ گڑیا کی پلکیں نہ زلفیں نہ چوٹی
نہ لب ہیں نہ دنداں زباں ہے نہ ٹھوڑی — بہر شکل صورت کا خاکہ یہی ہے

طویل نظم ہے آخری دو بند ملاحظہ ہوں:۔

لو کر ڈالی عصمت نے گڈے کی شادی — بی ہمجولی پلّے سے کھولو اشرفی
یہ قاضی کو اب نذر دینی پڑے گی — کہ ہم سب میں صدقہ کا بکرا یہی ہے

پکاؤ ولیمہ میں شب دیگ سمدھن — چڑھیں ہنڈکلیاں پکے اب متنجن
مزیدار اور چٹ پٹے سب ہوں سالن — کہ نعمت کی ماں کا کلیجہ یہی ہے

غزلوں کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

مریض غم کی شدید حالت عیاں ہے چہرہ کا رنگ ہو کر
اب اس کی قسمت پہ اس کو چھوڑا جو چارہ سازوں نے تنگ ہو کر
اٹھائی ذلت ہوئے پشیماں کہیں کا رکھا نہ مفلسی نے
چلے ہیں محروم شیخ پیر مغاں کی باتوں سے تنگ ہو کر
ہزار ہوں دست و پا شکستہ مگر نہ ہمت کو ہاتھ سے دو
ہزار مشکل کو کیجئے آساں امیر تیمور لنگ ہو کر
تباہ غفلت میں کی جوانی یہ دیکھو اعمال کی نشانی
خضاب بالوں پہ چڑھ رہا ہے سیاہ کاری کا رنگ ہو کر
نہیں ہے تعلیم کا یہ مقصد کہ نوکری کا ہو شوق بے حد
کلر تو ہے کوٹ پر نمایاں مگر غلامی کا رنگ ہو کر

دل میں یاد ابروئے خمدار رہنے دیجئے
اپنے دم کے ساتھ یہ تلوار رہنے دیجئے

شیخ جی رندوں میں یہ گفتار رہنے دیجئے
اپنے گھر میں آپ استغفار رہنے دیجئے

کچھ تو دل میں نیرے دل دار رہنے دیجئے
کھینچئے دو چار تو دو چار رہنے دیجئے

رند سب سر پہ رکھیں گے یہ تبرک آپ کا
میکدہ میں شیخ جی دستار رہنے دیجئے

گو کہ عصمتؔ آپ سے ہے دور اکلکوٹ میں
بزم میں اس کے مگر اشعار رہنے دیجئے

ایک سہرا کا نمونہ ملاحظہ ہو - جو امین کروڑگری (کسٹم) کی شادی پر لکھا گیا ہے

کس دھن میں لکھ گیا میں نیرا خلیل سہرا
چلتے ہیں گانے کو اس ابن السبیل سہرا

لاکھوں سے بھی سوا ہے اس کی کروڑگیری
اک لال بے بہا ہے بے قال و قیل سہرا

مہر حیا لگی ہے نوشاہ کے دھن پہ
کر دیتا ہے لبوں پر الفت کی سیل سہرا

ہے لاجواب طرہ اور بے مثال بدھی
ہے بے نظیر نوشہ اور بے عدیل سہرا

قاضی کو تر نوالہ اور قورمہ کا پیالہ
دو چار روز تک ہے سب کا کفیل سہرا

تھے فاختہ اڑاتے اکثر خلیل خان تم
اب آپ پھنس گئے ہیں دیگانہ ڈھیل سہرا

اکبر، محمد، احمد، سلطان اور شرافت
ہاتھوں پہ ہیں سنبھالے نیرا طویل سہرا

مضمون مہک رہے ہیں لکھا خوب عصمتؔ
مشہور ہے دکھن سے تا اردبیل سہرا

ایک اور نظم کے چند بند:-

بڈھا دولہا

حد سے زائد بڑھ گیا ہے آج خفقان چمن
چل گیا یکسر دماغ نوجوانان چمن ؎

اپنے جامے سے ہے باہر سارے ارکان چمن   فصل گل گلزار میں پہلے تھی خاقان چمن
اب جو سچ پوچھو بڑی بیگم ہیں سلطان چمن
اور ہیں لفظ سعد کے مفعول دیوان چمن

روز و شب جلسے ہوئے کھانا ہوا گانا ہوا   ایک نفیری کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا
مفت کی شادی ہوئی اور مفت کا جلسا ہوا   نوجوانوں میں وہ دیکھو پھر صد سالا بنا
لوگ کہتے ہیں مبارک ہو بہت اچھا ہوا
خندہ زن ہیں فرط عشرت سے عروسان چمن

ابر :- غلام دستگیر المتخلص بہ ابر ۔ ۱۳۰۱ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے خانگی تعلیم کے بعد ہائی اسکول میں تعلیم پائی ۔ پھر تعلیم کو چھوڑ دیا ۔ زمانۂ تعلیم میں ایک شاعر مدرس ہدایت علی صاحب ہدایت کے زیر اثر شاعری سے دلچسپی ہو گئی ، حبیب کنتوری کے شاگرد تھے ان کے بعد ضامن کنتوری سے مشورہ کیا ۔ ان کے فیض صحبت سے فن شعر کی تکمیل کی ۔ ضخیم دیوان کے علاوہ ایک مثنوی "نقش قدم" بھی ان کی یادگار ہے ۔

ابر کے کلام میں اسلوب بیان کی جدت اور خیالات کی ندرت پائی جاتی ہے کلام میں سادگی بھی ہے اور رفعت تخیل بھی ۔ کلام کا نمونہ پیش ہے :-

ایک وہ ہیں جو جفا کرتے ہیں
ایک ہم ہیں وفا پہ مرتے ہیں

زندگانی حباب آسا ہے   لوگ پھر بھی غرور کرتے ہیں

کنارے پہ پہونچی فنا ہو گئی — بقا موج کو شور دریا میں ہے

تو ہے تو ہوں گر تو نہیں میں چیز ہی کیا ہوں — یہ ناز ہے، ہے ہست میری ہست سے تیری

ہائے وہ بے نیازیاں لطف نیاز آ گیا — حسن کی لن ترانیاں عشق کی جاں ستانیاں

دوست کی صورت میں یہ دشمن رہا — اس سے مل کر دل نے کی چالاکیاں

دید کے طالب کو سوجھی دور کی
بن کے خاک وادیٔ ایمن رہا

ابر فلک پہ ساقیٔ رند نواز چھا گیا — دور میں دیر کس لئے پیاسوں کی تشنگی بجھے

میرے رونے پر جو ہنسی اڑی وہ ہنسی ہنسی تھی بناوٹی
جو کسی کے دل کی کھلے کلی میری آہ باد سحر نہیں

دنیا قمار خانۂ ارباب ہوش ہے — ہنگامہ خیز غلغلۂ کوشش ہے

ہاں اے حریف ہوش ابھی مجھ کو ہوش ہے — پھر اک نگاہ گو غلط انداز ہی سہی

کیا جانئے کیا دیکھا ہے کچھ یاد نہیں ہے — کیا پوچھتے ہو جلوہ گہ ناز کے اسرار

جعفر:- مرزا علی جعفر نام اور جعفر تخلص۔ حضرت اشہر مرحوم کے چوتھے بیٹے تھے۔ ۱۳۰۰ھ میں تولد ہوئے۔ قدیم طرز پر گھر میں تعلیم پائی۔

بچپن سے شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے ۔ نوحہ، سلام، قصائد اور رباعی اور مراثی موزوں کرتے تھے ۔ جعفر کو حضرت ناجی سے تلمذ حاصل تھا ۔ ناجی کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار تھا، جعفر کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

حالت یہ تھی کہ کانپتا تھا جسم سر بسر
پشت فرس پہ ہانپتے تھے مثل شیر نر
مجروح خود بھی ہو گئے تھے سر سے تا کمر
بن کر لہو پسینہ ٹپکتا تھا خاک پر
تھا پیاس کا وفور بھی اور التہاب بھی
اف اف کے ساتھ کہہ رہے تھے آب آب بھی

بجلی گری کہ تیغ چلی فوج شام پر
نازل خدا کا قہر ہوا خاص و عام پر
قربان تھی برق ابن علی کی حسام پر
سکہ تھا جس کا قلب فریاں دسام پر
بے کار حرب ہو گئے حرب اسکو کہتے ہیں
تھے مدح خواں حریف بھی ضرب اسکو کہتے ہیں

آواز دے، نہ ہجر کا رنج و ملال کھینچ
نزدیک اپنے اے اسد حسن کے لال کھینچ
ہو شرم سار ابروے اکبر کو دیکھ کر
منہ کو حجاب چرخ میں بس اسے ہلال کھینچ
ہوتا ہے درد کہتے تھے مسلم کے لاڈلے
حارث ہمارے سر کے نہ اس طرح بال کھینچ
معمور ہو چکا ہے جہان ظلم و جور سے
اب ذو الفقار کو مرے مولا نکال کھینچ
جعفر خدا سے مانگ نہ کر غیر سے طلب
درگاہ بے نیاز میں دست سوال کھینچ

تصور : صمصام الملک سید علی نواز نام اور تصور تخلص، دکن کے مشہور دیوان شاہ نواز خاں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۔

بچپن سے شعر گوئی کا شوق ہوا ۔ صبا، دہلوی اور سید کے بعد حبیب کنتوری کے شاگردوں میں شامل ہو گئے ۔ حبیب کنتوری کے بعد ان کے فرزند ضامن سے

مشورہ سخن رہا۔ تصور کے کلام میں مضمون آفرینی، چست بندشیں پائی جاتی ہیں۔ کلام میں صفائی اور روانی بھی پائی جاتی ہے۔

سرایت کر گیا ہے سوز دل رگ رگ میں بسمل کے
دھواں بدلے لہو کے خنجر قاتل سے نکلے گا

خاک پر کھینچ کے تصویر مٹا دی دل کی　　اس کو کہتے ہیں سلیقہ ستم آرائی کا

انگڑائیاں نہیں ہیں بت مست خواب کی
سانچے میں ڈھل رہی ہیں ادائیں شباب کی

رہ الفت میں گرد کاروان سے　　زمیں اونچی ہوئی ہے آسمان سے
مری آنکھیں بھی سجدہ کر رہی ہیں　　نظر اٹھتی نہیں ہے آستان سے
نگاہ لطف قاتل بھر رہی ہے　　برسنے کو ہیں جھڑیاں آسمان سے
یہ برق طور بھی ہے موسیٰ　　اٹھا دو سارے پردے درمیان سے

مہر:۔ میر آفتاب علی خان، خاندان شاہی سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے صاحبزادہ کہلاتے ہیں۔ مہر کی پیدائش ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ اولاً گھر پر پھر مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ اور پھر اسی مدرسہ کی خدمت کے لئے مستعد ہو گئے۔ چنانچہ ملازمت کا پورا زمانہ یہاں ہی بسر ہوا۔ شاعری کا مذاق کم سنی سے تھا۔ نظم طباطبائی اور داغ کی شاگردی کی۔ مہر کی شاعری پر اپنے اسکول سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا کلام لطف زبان، رفعت تخیل اور محاسن شاعری سے مملو ہوتا ہے۔ مہر کی

شاعری سے ان کے کردار کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، شگفتگی، معنی آفرینی، روانی اور سلاست ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

آج کی بات آج ہو کل کا بھلا قرار کیا
کل کی خبر کسے یہاں زیست کا اعتبار کیا

صبر میں ثابت قدم ہو دل جب اس قابل بنا — کام دنیا میں مرا مشکل سے بھی مشکل بنا

سبق ایسا سکھایا ہے نظام دہر نے ہم کو — کہ ہم یاروں کے یار اغیار کے اغیار رہتے ہیں

میں کون تھا کہ میرے مٹانے کیو اسطے — دشمن اُٹھے، زمین اٹھی، آسمان اٹھا

کبھی تدبیر سے الٹا کبھی تقدیر سے پلٹا
عجب صورت سے چلتا جا رہا ہے کام انساں کا

یہ بھی کوئی آنا ہے، یہ بھی کوئی ملنا ہے — آئے تو خفا آئے بیٹھے تو خفا بیٹھے

مزا ملتا ہے ایسا رال ٹپکتی پڑتی ہے منہ سے
زبان خشک پر ساقی کا جب افسانہ آتا ہے

بے مانگے موتی ملتے ہیں مانگے ملے نہ بھیک
ملتا ہے وہ نصیب سے ملنا کہیں جسے

حشر میں خاموش جانے سے بھلا کیا فائدہ — تم سناتے جاؤ ہم فریاد کرتے جائیں گے

ہونے کو ہے سب کچھ یہ اور پھر بھی نہیں کچھ بھی
دنیا جسے کہتے ہیں دھوکا نظر آتا ہے

ہمارے بعد زمانے میں کیوں نہ خاک اڑے ✶ کہ کاروان کے پیچھے غبار رہتا ہے

کیا پوچھتے ہو حال مری ہست و بود کا ✶ جھونکا نسیم کا تھا کہ آیا گزر گیا

ہوئی طے منزلِ ہستی تو یوں شام اجل بولی
تھکے ماندے مسافر سو رہیں گے آج دن بھر کے

کس کام کا ہے وہ جو کسی کے نہ کام آئے ✶ کاسہ فقیر کا نہ ہوا، جام جم ہوا

مجبور محض میں تھا، تو مختار کائنات ✶ پھر دل کے اختیار میں کیوں دے دیا مجھے

عالی:- راجہ نرسنگہ راج نام اور عالی تخلص، آپ کے والد راجہ گردھاری پرشاد المتخلص بہ باقی کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے، عالی کی ولادت حیدرآباد میں ۱۳۰۴ھ میں ہوئی۔ کم عمری میں باپ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ مدرسہ عالیہ میں میٹرک تک تعلیم پائی۔ اس کے علاوہ خانگی طور پر گھر میں فارسی، ہندی اور مرہٹی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ شاعری کا بچپن سے شوق رہا۔ حضرت جلیل سے تلمذ رہا۔ زیادہ تر غزل یا رباعی کہتے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعروں میں ہمیشہ شریک ہوتے رہے۔ مہاراجہ کو آپ سے بڑا اخلوص تھا۔ اسی خلوص کے باعث آج تک مہاراجہ کی یادگار میں مشاعرہ آپ کے اہتمام

ہیں ہوا کرتا ہے۔ عالی کے کلام میں تصوف اور معرفت کا رنگ غالب ہے۔
غزلوں میں داغ کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ عالی قدیم اخلاق اور قدیم وضع و معاشرت
کے پابند ہیں۔ ان کی سادگی محبت خلوص، ہمدردی کا ان کے ہر ملنے والوں کو اعتراف
ہوتا ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

رباعی

پوشیدہ ہے گو جلوہ عیاں تیرا ہے ــــ کثرت ہو کہ وحدت نشان تیرا ہے
کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن ــــ کس کے لب پر نہیں بیان تیرا ہے

کس کے لئے ہائے اب میں دنیا میں رہوں ــــ دنیا کے مصائب کو سہوں صبر کروں
عالی جینا تھا صرف جینے سے ترے ــــ اب دونوں برابر ہیں جیوں یا کہ مروں

تم یاد سے اپنی ستایا نہ کرو ــــ غمگین ہوں میں غضب یہ ڈھایا نہ کرو
عالی کو دیا خواب جہاں میں دھوکا ــــ بہتر ہے کہ خواب میں آیا نہ کرو

کون ہمدرد ہو پھر جب نہ ہوا اپنا اپنا ــــ غیر ممکن ہے کہ ہو جائے پرایا اپنا
سر بھی سودائے محبت میں دیا جان بھی دی ــــ کس گرانی سے ہوا دیکھئے سودا اپنا
اس نے ٹھکرا کے مری لاش کو نخوت سے کہا ــــ کیا ہوا اک نہ رہا چاہنے والا اپنا
وہ گھڑی کیسی مبارک تھی خدا پھر لائے ــــ روٹھنا ان کا شبِ وصل منانا اپنا

یاد میں کس کی ہوا حال یہ تیرا عالی
گم ہوا یوں کہ پتہ آپ نہ پایا اپنا

نہیں بھاتی ہیں دور کی باتیں | سنو موسیٰ سے طور کی باتیں
زاہد خشک کچھ سنا ہی کر | ہم سنیں گے سرور کی باتیں
سنتے سب کچھ ہیں واعظوں سے مگر | کون جانے قبور کی باتیں
تجھ کو زیبا ہے اور معاف بھی ہیں | اے جوانی قصور کی باتیں
تلملانا، تڑپنا، جان دینا | ہیں دلِ ناصبور کی باتیں

کون کہتا ہے کہ تو خوگرِ بیداد نہیں | مجھ میں پہلی سی مگر طاقتِ فریاد نہیں

ہائے کیا کیا نہ جوانی کے مزے تھے لیکن | یاد اتنا ہی رہا مجھ کو کہ کچھ یاد نہیں

زمیں پر رہ کے تم خود کو نہ بھولو | ابھی سر پر تمہارے آسماں ہے

تیرِ نظر جو چلتے ہیں تیغِ ادا کے بعد | کیا لوگے امتحانِ وفا پھر جفا کے بعد

بے رخی بے وفائی، بدعہدی | تو نے سیکھی ہے کیا جوانی سے

وفا:۔ محمد حبیب اللہ المتخلص بہ وفا، ان کے داداذ کا تذکرہ صفحات ماقبل میں گزر چکا ہے۔ وفا کی پیدائش ۱۲۹۹ف سنہ میں حیدرآباد میں ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی، پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل میں کامیابی حاصل کی۔ فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فارسی میں تہا، شمسی، نوری اور ضیاء سے تلمذ رہا۔ اردو میں مائل، بیدل اور جلیل اور نظم طباطبائی سے اصلاح لیتے رہے۔ جملہ اصنافِ سخن، مثنوی، قصیدہ، مسدس،

غزل وغیرہ میں اچھی مشق ہے۔ وفا کے کلام میں قدماکا رنگ غالب ہے تخیل کی پرواز، لطف بیان، رنگینی سب کچھ ان کے کلام میں موجود ہے آپ کا کلام پر اثر ہوتا ہے۔ اونہوں نے سنگلاخ زمینوں میں بھی طویل طویل غزلیں لکھی ہیں۔ جن سے ان کی قادرالکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ سررشتہ تعلیمات میں ملازمت کی اور تمام عمر لڑکوں کو تعلیم دینے میں گذاری ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

مثنوی کا نمونہ:۔

صریر کلک نے سیٹی بجادی — زمین شعر و سخن کی ہی ہلادی
رواں انجن ہوا طبع رواں کا — کہ اسٹیشن ہے میدان آسمان کا
مضامیں کا تسلسل ہے کچھ ایسا — قطاریں ریل کی جاری ہیں گویا
تعالی اللہ فیض دور عثمان — رعیت کی ہے آسائش کا سامان
جدہر دیکھو ادہر ریلیں ہیں جاری — مبارک ہو یہ دور کامگاری

سلام کا نمونہ:۔

کیا داغ دل کے سینۂ روشن میں پھول ہیں
نخل غم حسین کے گلشن میں پھول ہیں
رنگ بہار خون شہیداں ہے گل فشاں
مجروح سر ستاں پہ ہے آہن میں پھول ہیں
دل بوئے عشق ساقیؑ کوثر سے مست ہے
اس مے کے قطرے ساغر روشن میں پھول ہیں

غزلوں کا نمونہ:-

مزے خراش کے لیتے ہیں دل فگار الم — گماں ہے پنبۂ مرہم کا تنگ ناخن پر

کمند زلف میں اب مرغ دل کی خبر نہیں — قفس میں بند شکستہ ہے رنگ ناخن پر

نکالو گے کہو کس کس کو بزم ناز سے اپنی
وہ خود اپنے سے باہر ہے جو اس محفل کے اندر ہے

غم سے حالت غیر ہے دھوکا ہے ان کو غیر کا
اے غم الفت تصدق تیری اس تدبیر پر

ساغر پہ جان دیتے ہیں ہم رنگ دیکھ کر — مستانہ چشم کا تری مستانہ چال کا

اسرار عشق دل پہ ابھی تک کھلے نہیں — پیمانہ بے خبر ہی رہا مے کے راز سے

پس مردن بھی داغ عشق دل سے مٹ نہیں سکتا
جلے گی شمع یہ صبح قیامت تک مزاروں میں

تو مری ہمدم ہے میں ہمدم ترا اے بیکسی
تو مری تقدیر میں ہے میں تری تقدیر میں

صورتیں دو ہی تو مرمٹنے کی ہیں — آپ پر یا آپ کی تصویر پر

آدمی آدمی بن جائے فرشتہ نہ سہی — وہ فرشتے ہیں جو انسان کو انساں کر دیں

جذب :- کھوبندر راؤ نام اور جذب تخلص ہے۔ ذات کے برہمن ہیں۔ کنڑی مادری زبان ہے۔ مگر اردو میں خاص دلچسپی ہے۔ صوفی مشرب ہیں۔ ہندو ویدانت کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ اس طرح تصوف اور ویدانت کو ملا کر رباعی موزوں کرتے ہیں۔ اب تک دو تین مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ کلام میں اثر ہے۔ ان کی رباعیاں ہیں اخلاق اور نصیحت کے انمول نگینے ہیں۔ کلام صاف اور عام فہم ہوتا ہے۔

اخلاق کو تن سے ہے اگرچہ نسبت
دونوں میں بہت فرق ہے لیکن حضرت
تن ہے کہ بہت جلد فنا ہوتا ہے
قائم رہتی ہے انتہا تک سیرت

رہتا ہے کوئی بڑوں کی قربت میں اگر
پاتا ہے وہ جذب منفعت ہی اکثر
دیکھا نہیں کیا تم نے کہ چھوٹی سی بیل
بڑھتی ہے درخت کا سہارا لے کر

کر صدق و خلوص سے خدا کو سجدہ
ہے شرک ہوس کو یا ہوا کو سجدہ
جذب اس سے زمیں کو زلزلہ آتا ہے
کرتا ہے زمیں پہ جو ریا کو سجدہ

ہے ہستیٔ موہوم شبابِ ہستی
آئے گا کوئی دم میں نقابِ ہستی
مے خانۂ دنیا میں نہ لے ہاتھ میں جام
آلودۂ زہر ہے شرابِ ہستی

آتی جاتی ہے یوں تو دولت اے یار
دیکھا نہیں اس میں تو سکون اور قرار
گھنگھور گھٹا چھائے اگر گرما میں
کیا اس کا بھروسہ کہ وہ برسے ہر بار

خوشتر:- بشن سنگھ نام اور خوشتر تخلص ۔ راجپوت خاندان سے ہیں۔ زیرک مرحوم سے تلمذ حاصل کیا۔ نظم اور نثر دونوں میں مہارت ہے۔ ناول بھی لکھتے ہیں۔ زیادہ تر غزل موزوں فرماتے ہیں۔ نظم نگاری کی بھی مہارت ہے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

میں اک تڑپ میں کروں لاکھ بجلیاں پیدا
اگر میری یہی بے تابیاں رہیں برسوں
تیری فغاں میں اثر ہوا بھی سے کیا معنی
کہ مشق چاہیئے تجھ کو دلِ حزیں برسوں

رنگ محفل میں جماتے ہیں وہ یکتائی کا ۔۔۔ لو ہوا شوق انہیں انجمن آرائی کا

ساتھ چھوٹے نہ رخ یار سے رعنائی کا ۔۔۔ حسن کے ہاتھ میں دامن رہے زیبائی کا

آفت:- جمشید جی پستن جی صاحب، پارسی قوم کے خوش فکر شاعر ہیں آبکاری کے مستاجر ہیں۔ غزل گوئی میں مہارت ہے۔

اہل محشر سے ہمیں کچھ بھی تعلق نہ رہا
دل نے فتویٰ دیا جب سے تیری یکتائی کا
آہ کے ساتھ دھواں اب تو نکلتا ہے مگر
دل نکل جائے گا اک دن یونہی شیدائی کا

ہمہ ہنگامۂ جوشِ تکلم بے زبانی ہے ۔۔۔ سراپا حشر ساماں طرز آشفتہ بیانی ہے

رہے دنیائے دوں میں آدمی دنیا سے بیگانہ
مذاق فطرت حسن اصول زندگانی ہے
جو تھے اہل وفا ان کو زمانہ ہو گیا مرکر
بس اک گزری ہوئی بات اب محبت کی کہانی ہے
دل سرمایہ دار آرزو منت کش ارماں
ہوس زا کس قدر یہ پیکر دنیائے فانی ہے
ہماری سعی لاحاصل تھی اک سرمایۂ لذت
خلاف جذبہ فطرت حصول کامرانی ہے

جہان رنگ و بو دام فریب زندگی آفت
مآل کار ہستی صرف مرگ ناگہانی ہے

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ساقی نے دی شراب
مستی رہین بادہ نہیں بادہ خوار کی

شورش دل نے بڑھایا حسن کی توقیر کو
ورنہ کیا تھا حسن میں ذوق نظر کے واسطے
قید سے بڑھ کر مجھے آفت ہے بے بال و پری
کیا زنداں طائر بے بال و پر کے واسطے

رہبرؔ:- حکیم ست گرو پرشاد صاحب والا جاہی نام اور رہبر تخلص، کائستھ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاعری میں اچھی مہارت حاصل ہے جناب زیرک سے تلمذ حاصل کیا۔ اگرچہ غزل گوئی میں قدیم اساتذہ سخن کی پیروی کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اخلاقی مضمون بھی ہوتے ہیں۔

تفوق خاکساری کے سوا حاصل نہیں ہوتا
بلندی پر پہنچنے کا ذریعہ ہے تو پستی ہے

نرالا ہے عجب کچھ قاعدہ بازار الفت کا
گراں جنس وفا ہے تو متاع جور سستی ہے
ہمیں عاصی ہیں اس کے مستحق واعظ سر محشر
گنہگاروں پہ ہی اللہ کی رحمت برستی ہے

منظور:- سید علی نام اور منظور تخلص۔ نظم نگاری اور غزل گوئی میں کافی دستگاہ حاصل ہے۔ اردو کا کوئی معیاری رسالہ ایسا نہ ہوگا جس میں سید علی منظور کا کلام شائع نہ ہوتا ہو۔ وہ بڑے پرگو شاعر ہیں۔ واصل، شمسی اور المعی سے مشورہ سخن لیتے رہے ہیں۔ جدید شاعری میں اچھی مہارت ہے۔ منظور کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی سادگی و پرکاری ہے۔ زندگی کی صحیح ترجمانی منظور کی شاعری کا مقصد ہے۔ اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔

ناامیدی میں بھی رہ رہ کے خیال آتا ہے
اب بلایا مجھے اس شوخ نے اب یاد کیا
یہ ہنسی اور بڑھائے گی مرے دل کی تڑپ
اپنی دانست میں تم نے تو مجھے شاد کیا

ہے طرب آموز دل ذوق نگاہ   دیدنی مجھ کو ہر اک منظر ملا

میری مستیاں سمجھیں تیری شوخیاں جانیں
تو نے کیا لیا مجھ سے میں نے تجھ سے کیا پایا

منظور کی نظم کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ اس نظم کا عنوان ہے "عالمانہ اور جاہلانہ بے نیازی"۔

میں ہوں بحر العلوم میں ہوں — ہر سمت ہے جس کی دھوم میں ہوں
چرچا مرا کابل و عرب میں — شہرت مری تونس و حلب میں
زینت دہ مسند سلف ہوں — روشن کن جادۂ خلف ہوں
اصحاب خرد مرے ثنا خواں — ارباب نظر ہیں مجھ پہ حیراں
مقصد مرا حق کی ترجمانی — میں شارح وحی آسمانی

"کلک قلم دریں شب تار"
"بس معنیٔ خفتہ کردہ بیدار"

میری نظر و خرد کی حجت — آمیزش مذہب و سیاست
ہے خسرو علم مجھ سے راضی — مفتی ہوں کبھی، کبھی میں قاضی
پکی مری دھن ہے میں ہوں بے لاگ — ہے قوم کی میرے ہاتھ میں باگ
سلطاں مرے خوشہ چیں پہ حیراں — شاہی مری درس گہ سے لرزاں
یکساں مرا باطن اور ظاہر — ہوں میں ہی علوم دیں کا ماہر

پیوند زمینیاں گسستم
نزدیک بآسماں نشستم

شہرت نہیں پائی میں نے ارزاں — ہر دشمن شرع مجھ سے لرزاں
مغرور کا میں نے کفر توڑا — اس ہاتھ میں وہ اس میں کوڑا
سرکش مرا نام سن کے جھک جائے — رہرو مجھے دیکھ لے تو رک جائے

ہے گرچہ مرا لباس میلا چرچا مرا پھر بھی خوب پھیلا
آرائش تن کے غم سے ہوں دور آسایش جاں ہے مجھ کو منظور

از دولت علم سرفرازم
وز مال ومنال بے نیازم

دوسرے حصہ کے چند شعر یہ ہیں نظم طویل ہے

باشندہ یہ شخص گاؤں کا ہے دیہات میں عمر کاٹتا ہے
بر میں ہے وہی کثیف کرتا جو عید کے دن پہن لیا تھا
کاندھے پہ وہی پرانا کمبل لایا تھا جو چار سال اول
ہے نیم برہنگی کا عادی اس کی حرکات سیدھی سادی
مکھی گر جائے چھاچھ میں تو انگلی سے نکال کر بہ خوش ہو

طلسم مجاز

(۱)

یہی نگاہ یہی "ساز باز" رہنے دے مرے لئے تو درفتنہ باز رہنے دے
بصیرتوں سے مجھے بے نیاز رہنے دے حقیقت اپنی بہ حد مجاز رہنے دے
مری نگاہ کو نظارہ باز رہنے دے

(۲)

جو عشق و حسن میں ہے امتیاز رہنے دے یہی مشاہدہ اسے دل نواز رہنے دے
بڑھائے جا یوں ہی کیفیت نظر بڑھائے جا تو حلقہ ہائے نگاہ ہوس پرست میں آ

تصورات دل پاکباز رہنے دے

(۳)

رہیں "حسرت راز و نیاز" رہنے دے | انہیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے
میں چاہتا ہوں اسی طرح سے رہوں ناکام | متاع بلبل و پروانہ سے مجھے کیا کام
مرے لئے ہوس سوز و ساز رہنے دے

(۴)

مری نگاہ کا دامن دراز رہنے دے | "معاملہ" کی خموشی کو راز رہنے دے
ترے خیال سے لے جاؤں میں اگر بازی | گناہ میرے لئے کیوں ہو پھر نظر بازی
کچھ اور دن ابھی حکم جواز رہنے دے

(۵)

فروغ دیدۂ آئینہ ساز رہنے دے | وہ اپنا جلوۂ بینش گداز رہنے دے
خدا گواہ نہ تھا میں تو سائل دیدار | بنا دیا تری شوخی نے مائل دیدار
مجھے قریب حریم مجاز رہنے دے

پھول

جان تجھ پہ عنادل نے بے وجہ نہیں واری | ہیں دل کو لبھانے کی تجھ میں صفتیں ساری
نرمی تری دلکش ہے رنگت ہے تری پیاری | دل پہ مرے کیف کیوں تجھ سے نہ ہو طاری
اے گل نہ تو خورسندم تو بوئے کسے داری
ہیں محو جو تجھ میں ہوں لوگوں کو تحیر ہے | کیا علم نہیں، تجھ کو اب کس کا تصور ہے

پنہاں تری ہستی میں واللہ بڑا گر ہے　　تا چند کئے جاؤں میں شرح طلب گاری

اے گل ز تو خورسندم تو بوئے کسے داری

افسردگیٔ دل کا میں کس سے کہوں عالم　　مٹی کے پیالے سے کم قدر ہے جام جم

ہے میری نگاہوں میں ہر چیز سبک اس دم　　لیکن تری قیمت ہے پہلے کی طرح بھاری

اے گل ز تو خورسندم تو بوئے کسے داری

اب ہم اس عہد کے جوان ترقی پسند شعرا کا تعارف کراتے ہیں جنہوں نے جدید شاعری میں اچھا مقام حاصل کر لیا ہے۔

فضل الرحمٰن:۔ فضل الرحمٰن صاحب کا کوئی تخلص نہیں ہے۔ سنہ ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد حکیم عبداللہ صاحب، مدرسہ طبیہ کے صدر تھے۔ اور سختی سے مذہبی پابندی کے لحاظ سے مشہور تھے۔ فضل الرحمٰن کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ چادرگھاٹ ہائی اسکول کے بعد نظام کالج میں تعلیم پائی اور پھر پونہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اولاً سٹی ہائی اسکول میں مدرس ہوئے تھے ملازمت سے علیحدگی اختیار کی اس کے بعد مختلف دفاتر کی ذمہ دارانہ خدمات انجام دیں۔ ناظم لاسلکی کے بعد نائب ناظم تعلیمات اور پھر ناظم تعلیمات بنے مگر اب قبل از وقت وظیفہ حاصل کر کے اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

فضل الرحمٰن صاحب ڈرامہ نگار بھی ہیں جس کا تذکرہ اس کے مقام پر آئیگا آپ کے کلام کے دو مجموعے "دھوپ چھاؤں" اور "نقش حیات" شائع ہو چکے ہیں فضل الرحمٰن صاحب بڑے متین اور سنجیدہ ہیں مگر ان کی طبیعت اتنی ہی شوخ

اور مزاحیہ ہے۔ پاکیزہ ذوق ہے، وہ بہترین نقاد ہیں، ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی بحور کی موزونیت۔ تخیل کی لطافت اور مضامین کی بلندی قابل داد ہوتی ہے۔ وہ ترقی پسند شعرا میں بلند مقام رکھتے ہیں وہ ترقی پسند ادب کے ایک نئے باب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ان کا کلام لحن اور ترنم کی لطافتوں کا گنجینہ ہے۔ غلام یزدانی صاحب ان کو ان کی بلند پایہ شاعری اور بہترین نقادی کی بناء پر دکن کی اردو شاعری کا مبتھو آرنلڈ قرار دیتے ہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

من سے کہتے من کی باتیں	کٹتی ہیں تنہائی کی راتیں
راگنی ہیں کچھ دھیمی سریلی	دل ہیں دھن ہونٹوں پہ خموشی
خلوت ہیں مجلس کا سماں ہے	نغموں کی محفل بزم جاں ہے
سینے میں میٹھی دھڑکن پیدا	باہر عالم خموشی کا
جگ پہ اندھیرا سا چھایا ہے	جل تھل پر اک پردہ ہے
جیسے صنم ایک سنگ سیہ کا	نقش مجسم رنگ سیہ کا

آنکھوں میں دل کا درپن ہے اب
کس موہن کا درشن ہے اب

جگت دیوی

کبھی دھوپ کے روپ میں مسکرانا	کبھی چھپ کے بدلی میں آنسو بہانا
شعاعوں سے سورج کی ماتھے پہ افشاں	شفق سے ہتھیلی پہ مہندی لگانا

ستاروں سے مکھڑا چھپانے کی خاطر — پھرا اودی گھٹاؤں کی آنچل بنانا
سبھائیں کبھی شہر والوں کی آ کر — لجائی نگاہوں سے بجلی گرانا
کبھی قتل کرنا جلانا کبھی پھر — کبھی یونہی شور قیامت مچانا
ادھر دور رہنے کی آنکھوں سے کوشش — ادھر دل میں رس بس کے شوخی دکھانا
ادھر ڈھونڈھنا حیلے انجان بن کر — ادھر پیت کی ریت من کو سکھانا
دکھا کر کبھی بے رخی زندگی بھر — دل و جاں کو سو سو طرح آزمانا

غرض اس کی چاہت کا کوئی بھروسہ
نہ کچھ بیر اور دشمنی کا ٹھکانا

"ہنگامۂ ہستی" کے چند بند ملاحظہ ہوں:-

یہی دنیا تھی یہی گرمئ بزم عالم — یہی گیتی یہی ہنگامۂ نسل آدم
رنج و راحت تھے اسی طرح جہاں میں توأم — دل شاداں بھی یہی تھا یہی چشم پرنم

وادئ نیل میں یا سامری گلزاروں میں
باہستان کے آراستہ بازاروں میں
ہند کے مندروں میں چین کے درباروں میں
نقش الفت تھا بہر رنگ دلوں پہ قائم

ساعت موت بھی زیست کے دن رات یہی — حسن اور عشق کی دزدیدہ ملاقات یہی
عہد و اقرار یہی حرف و حکایات یہی — گرچہ موجود نہ تھے روئے زمیں پر ہم تم
راہ گیروں کی سرا منزل فانی ہی سہی — چھاؤں ڈھلتی ہوئی بہتا ہوا پانی ہی سہی
سر بسر ابر و ہوا سیل و روانی ہی سہی — اس روانی پہ بھی ہے منظر ہستی دائم

یہ پہاڑ یہ نہریں یہ کھیت یہ بن یہ زمیں جو ہے جلوؤں میں رشک چمن
وہ ستارے جو پھول ہیں روشنی کے وہ فلک جو ہے نور کا باغ عدن
یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمیں وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ بریں
یہ ہے برق کے ذروں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن تو

یہ ہوائیں جو باغوں میں مست ہیں سب یہ درخت جو شیشہ بدمست ہیں سب
یہ بہار اور نکہت و رنگ کی مے یہ صراحیٔ لالہ یہ جام سمن
یہ ہے برق کے ذروں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

ایک اور نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں :-

جب آگے بڑھیں گے دست و قدم چالیس کروڑ انسانوں کے
ہل جائیں گے گنبد مشرق سے مغرب تک سب ایوانوں کے
لاچاروں کی قسمت چمکے گی پھر جائیں گے دن نادانوں کے
پھر یہ ساری دکھیا راتیں
گویا منظر افسانوں کے

شاعر کے مجسم خوابوں میں جس روح رواں کی تنویریں
وہ زندہ نقش آزادی وہ جیتی جاگتی تصویریں
پابند غلامی خلقت کی کٹ جائیں گی شاید زنجیریں
یا جان سی پڑ جائے گی پھر
ان ڈھانچوں میں بیجانوں کے

جو بطن عدم میں پنہاں ہیں ہستی کو فضا میں آئیں گے
مایوس دلوں کی تسکیں کو پیغام تمنا لائیں گے
اس عہد کی بے نور آنکھیں اب کیا جانے وہ کیا دکھلائیں گے

دریاؤں کے نایاب گہر
یا غنچۂ نوبستانوں کے

آ وقت کی ٹوٹی کشتی کو افلاک کے پار لگائیں پھر
ہے سیل حوادث زوروں پر ہمت کا اثر دکھلائیں پھر
آہستہ کنارِ مقصد تک اس ناؤ کو کھیتے جائیں پھر

پھر تیز ہوائیں چلتی ہیں
آثار ہیں پھر طوفانوں کے

جب آگے بڑھیں گے وست قدم چالیس کروڑ انسانوں کے
ہل جائیں گے گنبد مشرق کے مغرب تک سب ایوانوں کے

قسم ہے زندگی کے درد کی سینہ فگاری کی
قسم بیتابیٔ دل روح فرسا بے قراری کی
قسم افلاس کی قحط و وبا بے روزگاری کی
قسم ہے موت کے ہنگامۂ فریاد و زاری کی
جہاں تک ہو سکے جینے کا ساماں کر کے چھوڑیں گے
بقا کی کشمکش دشوار سے دشوار ہونے دو
بیاباں در بیاباں جادہ پر خار ہونے دو

ہلاکت خیز، خول آشام، آنشبار ہونے دو
عذاب و قہر پیہم سے جہنم زار ہونے دو
اسی دوزخ کو فردوس تن وجان کر کے چھوڑیں گے

وجد:۔ سکندر علی نام اور وجد تخلص، اورنگ آباد وطن۔ ۱۹۱۴ء میں تولد ہوئے جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور ایچ۔سی۔ایس میں کامیاب ہو کر سر رشتہ عدالت میں مامور ہیں، زمانہ طالب علمی سے ان کو شاعری کا شوق ہے موسیقیت، جدت، بلند خیالی، عشقیہ سوز و گداز ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "لہو ترنگ" شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے، غزل اور نظم نگاری دونوں میں دستگاہ حاصل ہے۔ وجد کے پڑھنے کا طرز بڑا دل آویز ہوتا ہے۔ ان کی بیسیوں نظمیں اپنی خصوصیت کے لحاظ سے بہت مشہور رہیں۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ایک نظم "نرس" کے عنوان پر ہے۔

نسیم آتی ہے سب سے پیشتر تیرے جگانے کو
گلوں سے قبل اوس آتی ہے تیرا منہ دھلانے کو
سحر ملبوس نورانی قمر سے مانگ لاتی ہے
تجھے پہنا کے جوڑا کل جہان پر پھیل جاتی ہے
ہوائیں مست و عنبر بار تیرے ساتھ آتی ہیں
ترے آنے سے گل ہنستے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں
دلِ پژمردہ پاتے ہیں رہائی بے قراری سے
تری آمد نہیں کم آمدِ بادِ بہاری سے

بلا کی دل نشینی ہے تری گفتار نے پائی
تری رفتار میں ہے موجزن طوفان رعنائی
نہاں جذبات مہر و لطف ہیں خدمت گزاری میں
اثر اکبر کا پنہاں ہے تیری غم گساری میں
نظام دہر کو تھا ناز اپنی بے مثالی پر
عمل تیرا مگر ہے خندہ زن اس کج خیالی پہ

"اجنتا" پر ان کی متعدد نظمیں ہیں ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے فوق عریانی
گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا اہل جنوں کو حسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصل بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بیقراری کا
سکھایا گر اسے جذبات کی آئینہ داری کا
دل کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھدی
جگر داروں نے بنیاد جہان جاوداں رکھدی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھردی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذت درد جگر دی ہے
کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کردی ہے
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ ارباب ہمم کی سعیٔ پیہم کا جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی غم کا
دل پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسن عالم کا قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسم اعظم کا
چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر خوشامد اہل دولت کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر جئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر
زمانہ کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائینگے شاہوں کے

"عبدالرزاق لاری" نظم کے چند بند یہ ہیں:۔

باغی کوئی سلطان کا ہوا خواہ نہیں ہے ہے کون جو انجام سے آگاہ نہیں ہے
دل کس کا اسیر کشش جاہ نہیں ہے لاری ہی اکیلا ہے جو گمراہ نہیں ہے
غصے میں رخ تیغ دو دم چوم رہا ہے
خادم در آقا پہ کھڑا جھوم رہا ہے

لڑنے لگے خوں خوار مغل قلعہ کے در پر تیغوں کی چمک سے ہیں در و بام منور
کس شبر کی ہمت سے پریشان ہے لشکر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا فوج عدو پر
یہ ہاتھ ہے یا دست اجل طالب جان ہے
قبضے میں ترے تیغ ہے یا برق تپاں ہے

بجلی سر اعدا پہ تڑپتی ہے مسلسل عمروں کے تعین کے ہیں پیمانے گھڑی پل
لاشوں کے ہیں انبار زمیں خون سے جل تھل ہیبت سے پڑی ہے نئی افواج میں ہل چل

جس سمت پھرا، شور اٹھا "جن، بچہ آمد"
ہنگام وغا نیست قضا پیش حشر آمد

ملبوس ترا خون سے گلنار ہوا ہے — ہر عضو بدن زخم سے بیکار ہوا ہے
یہ ضعف ہے سر تن پہ گراں بار ہوا ہے — قد خون میں ڈوبی ہوئی تلوار ہوا ہے

لے جاتے ہیں گو تجھ کو شہنشاہ کی جانب
نظریں ہیں تری تخت قطب شاہ کی جانب

شمشیر دکن! تو نے عجب دھاک بٹھا دی — دشمن کو شب گور کی تصویر دکھا دی
اے مرد خدا قدر وفا تو نے بڑھا دی — قربان ترے، مالک کے لئے جان لٹا دی

جب تک یہ نظام سحر و شام رہے گا
تاریخ دلیراں میں ترا نام رہے گا

اب بعض غزلوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

حریم عشق کے قابل بنا دیا تو نے — روئیں روئیں کو مرے دل بنا دیا تو نے
یہ سب قصور ہے اے قیس کم نگاہی کا — نظر کو پردۂ محمل بنا دیا تو نے
ہر ایک کامل ناقص کو رشک ہے مجھ پر — خوشا کہ ناقص کامل بنا دیا تو نے
سفینہ ڈوب چکا اب سکوں ہے اے طوفاں — بھنور کو دامن ساحل بنا دیا تو نے
بچاؤ اپنے نشیمن کا وجد خوب کیا — کہ بجلیوں کے مقابل بنا دیا تو نے

رہرو راہ محبت کی کوئی منزل نہیں — زندگی عشق حاصل عشق کا حاصل نہیں
چشم ساحل آشنا تجھ سا کوئی غافل نہیں — دیکھ طوفان اجل کی موج ہے ساحل نہیں

ابتدا میں ہر مصیبت پر لرز جاتا تھا دل — اب کوئی غم امتحانِ عشق کے قابل نہیں
قلزمِ ہستی ہے اصلی امتحاں گاہِ کمال — بحر کے طوفان کی ہر موج دریا دل نہیں

شعر کے پردے میں رازِ زندگانی فاش ہو
صرف لفظی شاعری کا وجدیں قائل نہیں

ادائے خاص سے اک بار کوندا ہے بجلی — چمک کے رہ گئی تقدیر آشیانے کی
رہے گا وجدؔ بیاں عشق کا سدا یکساں — بدلتی جائے گی سرخی فقط فسانے کی

چمک رہا ہے مرا مقدر، بھلا عدو کو کہاں یسّر
وہ جلوۂ خاص جس کے رخ پر نقاب کھلتا ہے برہمی کا

سراسر خطا تھی نگاہِ تمنّا — گنہگار تیری جوانی نہیں ہے
مروت گراں ہے، محبت گراں ہے
یہاں دوستوں کی گرانی نہیں ہے

مخدوم :- مخدوم محی الدین، جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ سٹی کالج میں لکچرار بنے پھر خدمت سے مستعفی ہو گئے۔ مزدور کی تحریک کی حمایت اور تائید کی کچھ عرصہ حیدر آباد سے روپوش رہے کیونکہ کمیونسٹ تحریک کے سردار ہیں۔

طالب علمی کے زمانہ سے شاعری سے دلچسپی ہے۔ کلام میں وارفتگی، اور بے باکی پائی جاتی ہے۔ ندرتِ خیال اور دلکش جذبات، نئے مضامین۔ ان کے

کلام کے جوہر ہیں۔ منظر کشی میں بڑی اچھی مہارت ہے۔ مخدوم ایک انقلابی شاعر ہے۔ اس وجہ سے سب سے الگ ہو کر اپنی نئی دنیا بنالی ہے۔ ان کے کلام میں جمالی اور جلالی دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "سرخ سویرا" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ نظم "طور" کے چند بند

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز و حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی
حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پہ لغزشیں ہوتیں
فضائیں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں
چھپائے راز کی پر لطف باہم کوششیں ہوتیں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی — سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی — ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

"ساگر کے کنارے" والی نظم کے چند شعر

مندر میں پجاری لگے ناقوس بجانے — وہ ان کے بھجن پیارے وہ گیت انکے سُہانے
تاریکیِ شب ڈر کے رخصت ہوا عصیاں — تقدیس کے جاری ہوئے ہر سمت ترانے
انگڑائیاں لیتا ہوا طوفان جوانی — ملتا ہوا آنکھیں اُٹھا فتنوں کو جگانے
کچھ لڑکیاں آنچل کو سمیٹے ہوئے بریں — گگری لئے سر پہ چلیں پانی کے بہانے
چلتی ہیں اس انداز سے دامن کو سنبھالے — صدقے ہوئی شوخی تو بلائیں لیں ادا نے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی — کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

تالاب پہ افلاک کے گم گشتہ ستارے
آتے ہیں صبح ہوتے ہی ساگر کے کنارے

بربط نواز بزم الوہی ادھر تو آ — دعوت دہ پیام عبودی ادھر تو آ
انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ — اس آسمان والے کی بیداریاں تو دیکھ
معصومۂ حیات کی بے چارگی تو دیکھ — دستِ ہوس سے حسن کی غارتگری تو دیکھ
خود اپنی زندگی سے پشیماں ہے زندگی — قربان گاہ موت پہ رقصاں ہے زندگی
انسان رہ سکے کوئی ایسا جہان بھی ہے — اس فتنہ زار زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے

او آفتاب رحمت دوراں طلوع ہو
او انجم حمیت یزداں طلوع ہو

مخدوم کے جلالی رنگ کے لئے باغی، جنگ، مشرق، موت کا گیت جو بلی گھر، اور زلف چلیپا وغیرہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ جن میں ملک کی حالت کی

المناکی اور دردانگیز تصویریں طیش اور غضب کی آتش فشاں زلزلہ خیز قوتیں نظر آتی ہیں۔ "نظم مشرق" کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری نجاست کا مکان
زندگانی تازگی عقل و فراست کا ساں
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا جس میں صدیوں کا جذام
ایک ننگی لاش بے گور و کفن ٹھٹھڑی ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں
اس زمین موت پرورده کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

موت کے گیت کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاوو آؤ بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

ایک تاتاری شاعر جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

صف اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر

استالین

مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
ان کی محنت کا اخوت کا محبت کا خمیر
وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں

برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا — تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے — ہے مرا قافلہ سالارِ جہاں استالین

انتظار

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کئے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا
آ گئی تھی دل مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوئے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
مرے محبوب مری نیند اڑانے والے
میرے مسجود مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تا ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

مُسافر

ترے ہجر میں کھو گئے اے مسافر   مسافر چلے چل
نہ جانے وہ کیا ہو گئے اے مسافر   مسافر چلے چل

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
مسافر
چلے چل، چلے چل، چلے چل چلے چل
اندھیرے میں اب ساتھ کیا دیکھتا ہے دیا بجھ گیا ہے
بہرحال چل رات کیا دیکھتا ہے دیا بجھ گیا ہے
تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
مسافر
چلے چل، چلے چل چلے چل چلے چل
سمجھ سوت کی وادیوں سے گذرتا چلا جا رہا ہے
سحر کے تعاقب میں گرتا ابھرتا چلا جا رہا ہے
تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل
مسافر
چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل

مہکش:۔ صاحبزادہ محمد علی خان میکش، حیدرآباد کے شاہی خاندان سے میکش کو تعلق تھا اس لئے صاحبزادہ کے لقب سے موسوم تھے۔ حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ اور جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی۔ نشرگاہ حیدرآباد میں ملازم ہوئے۔ مگر زندگی نے وفا نہیں کی۔ نوجوانی میں دنیا سے چل بسے۔ مگر تھوڑی سی مدت میں ہی اونہوں نے شاعری میں اچھا نام پیدا کیا نظم نگاری اور غزل گوئی میں اپنے کلام سے بہترین نقش چھوڑ گئے۔ میکش کا کلام

حسن خیال، لطف گفتار، بلندیٔ تخئیل کے لحاظ سے قابلِ داد ہے۔ ان کے کلام میں موسیقیت اور غنائیت اور ترنم پایا جاتا ہے۔
ان کی نظموں کا مجموعہ "گریہ و تبسم" کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع ہوا ہے۔

جوانی کا گیت

میں اپنے ذوقِ آرزو سے زندگی بناؤں گا ۔۔۔ شرارِ شوق کی تڑپ میں شمعِ دل جلاؤں گا
جہاں کی سختیوں کو کھیلتے ہوئے اٹھاؤں گا ۔۔۔ ترقیوں کی شاہراہ پر قدم بڑھاؤں گا

عمل کے گیت گاؤں گا
جہانِ نو بساؤں گا
ابھی تو میں جوان ہوں

ربابِ دل میں مرتعش ہے نغمۂ رازِ زندگی ۔۔۔ رگوں میں بہہ رہی ہے ایک جوئبارِ زندگی
نفس کی بیقراریوں میں ہے قرارِ زندگی ۔۔۔ قدم قدم پہ لاکھ مشکلیں ہوں مسکراؤں گا

عمل کے گیت گاؤں گا
جہانِ نو بساؤں گا
ابھی تو میں جوان ہوں

ہے جستجو کی بیقراریاں نظر کے نور میں ۔۔۔ ہے انکسار کی جھلک شباب کے غرور میں
چھپی ہوئی ہے اک تڑپ سکون کے وفور میں ۔۔۔ میں زندگی کی وسعتوں پہ کیف بنکے چھاؤنگا

عمل کے گیت گاؤں گا
جہانِ نو بساؤں گا
ابھی تو میں جوان ہوں

اشنان

کہا ہے مجھ سے یہ تالاب کے کناروں نے
فضائے خلد سے آئی ہوئی بہاروں نے

کہ آج آئی تھی حسن و جمال کی دنیا
مرے شباب کی دیوی خیال کی دنیا

نہا کے بیٹھی تھی شانوں پہ بال بکھرائے
لطیف لہروں میں چاندی سے پاؤں لٹکائے

سحر کے خواب میں تھی اک ادائے بیداری
فضا کو مست بناتی تھی ریشمی ساری

گھما رہی تھی کبھی چوڑیاں کلائی میں
سحر کا عکس جھلکتا تھا دلربائی میں

اٹھا کے چوم رہی تھی کبھی چنبیلی کو
کہ جیسے دل سے لگائے کوئی سہیلی کو

ہوا سے جسم کو سکڑا کے کپکپاتی تھی
شفق کو دیکھتی جاتی تھی گنگناتی تھی

مری شریر نگاہوں سے دور بیٹھی تھی
حریم عرش کے دامن میں حور بیٹھی تھی

فلک کی آنکھ نے دیکھی ہے اس کی تنہائی
کہ جیسے دور سے سنتا ہو کوئی شہنائی

پس پردہ

رنگ و بو کے متوالے اے حسن و نور کے دیوانے
ان پردوں کے پیچھے کیسے محشر ہیں تو کیا جانے
کتنے دلوں کے داغ چھپے ہیں جھل مل جھل مل تاروں میں
ماضی کے کتنے لمحے گم ہیں رنگین نظاروں میں
کتنے گناہوں کی تاریکی ہے ان کالی راتوں میں

کتنے آنسو سہمے ہوئے ہیں رومانی برساتوں میں
کتنی بہاریں توڑ رہی ہیں دم ان ہنس مکھ پھولوں میں
کتنے طوفان جھول رہے ہیں شاخ گل کے جھولوں میں
شبنم جو آسودہ نظر آتی ہے کنول کے سفینے میں
کتنے طوفان انگڑائی لیتے ہیں اس کے سینے میں
کتنے بے بس پیاسوں کے ٹوٹے ارماں ہیں گلابی میں
کتنے بھوکوں کی آہیں ہیں کھیتوں کی شادابی میں
ڈوبتے ہیں گل پاش شفق کی رنگینی میں شام و سحر
لیکن اس میں کتنی غمگیں روحوں کا ہے خون جگر
ٹوٹتے تاروں کو لے لے کر کتنی نگاہیں گرتی ہیں
انسانوں کے روپ میں کتنی زندہ نعشیں پھرتی ہیں
برکھا رت ماتم کرتی پھرتی ہے اب ویرانوں میں
چاندنی راتیں آتی ہیں کھو جاتی ہیں قبرستانوں میں
حسن ملے گا نظاروں میں اب وہ گھڑیاں آئیں گی
اپنے ہاتھوں اپنی بہاریں واپس لائی جائیں گی

چاند اور شاعر

دھان کے کھیتوں کی جانب دیکھتا ہے بار بار
پریت کے مارے ہوؤں کی طرح چہرہ زرد ہے

اس کی بیتابی بتاتی ہے کہ دل میں درد ہے
چاند بھی شاید ہے لذت آشنائے انتظار
قلب کی گہرائیوں میں آرزو مستور ہے
بس گیا ہے جب سے فکرستان ہستی میں کوئی
آگ سی بھڑکا رہا ہے دل کی بستی میں کوئی
قلب شاعر جوشِ احساسات سے مجبور ہے
ابر سے چھن چھن کے گرتی ہیں شعاعیں ماہ کی
حسنِ منظر پر حجاب نور ہے چھایا ہوا
پڑ گیا ہے چہرۂ گیتی پہ اک رنگیں نقاب
ہے سکوتِ شام میں آتش نوائی آہ کی
روح تڑپاتی ہوئی قلب گرمایا ہوا
ساغر تخییل میں گویا چھلکتی ہے شراب

اب میکش کی غزلوں کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا ۔ پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
چھلک رہا تھا تبسم بھی ساغر مئے میں ۔ پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
شراب نغمہ بھی بہتی رہے فضاؤں میں ۔ کلام حافظ و خیام گنگنا کے پلا
ترا خیال ہے مجھ کو کبھی نہ بہکوں گا ۔ تری قسم مجھے سو بار آزما کے پلا

کچھ امتیاز رہے میکدے میں میکش کا
لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

میری محویت کو گرما کے ہنسے — برق سی ہونٹوں پہ لہرا کر ہنسے
ہنس کے دیکھا دیکھ کر تڑپا دیا — دیکھنے والے کو تڑپا کر ہنسے
کچھ تکلف سے گرائی برق بھی — جب ہنسی آئی تو شرما کر ہنسے
چاند کی کرنوں میں پھونکی روح سی — مستیاں منظر میں بکھرا کر ہنسے
کھو دیا حسن تکلم میں مجھے — اپنے منہ سے پھول برسا کر ہنسے
دست نازک میرے شانے پر رکھا — بجلیاں رگ رگ میں دوڑا کر ہنسے

میکش خاموش نے مانگی جو مئے
دور سے ساغر کو دکھلا کر ہنسے

بیزار ہو گئے ہیں بہار و خزاں سے ہم
اڑتے ہیں اب قفس کی طرف آشیاں سے ہم
قسمت نے اپنے ساتھ تھپک کر سلا دیا
کچھ چونکنے ہی والے تھے خواب گراں سے ہم
گم گشتگی میں منزل مقصود مل گئی
اچھا ہوا کہ چھوٹ گئے کارواں سے ہم

مری گردش سے گردش میں رہا بخت فلک اکثر
اٹھائی ہے بلندی نے مری پستی سے زک اکثر
سکھائی ہے جن آنکھوں نے محبت کی تڑپ مجھ کو
ان ہی آنکھوں میں دیکھی ہے محبت کی جھلک اکثر

بلندی کے ستارے میری پستی سے نہ منہ پھیریں
شعاعِ مہر بن جاتی ہے ذروں کی چمک اکثر

دل اسیرِ شباب ہے پیارے　　زندگانی عذاب ہے پیارے
تری ہر بات میکدہ بردوش　　تو مجسم شراب ہے پیارے

ڈرتے ڈرتے گناہ کرتا ہوں　　تیری جانب نگاہ کرتا ہوں
عنفوانِ شباب کے صدقے　　دل کی دنیا تباہ کرتا ہوں
دامنِ زہد کے تقدس کو　　پردہ دارِ گناہ کرتا ہوں
آج رہ رہ کے اپنے سجدوں کو　　جانے کیوں فرشِ راہ کرتا ہوں
لبِ فریاد بند ہے میکشؔ　　ضبط کو صرفِ آہ کرتا ہوں

قفس میں بیٹھ کر دیکھیں بہارِ رنگ و بو کیوں کر
خزاں جانے سے پہلے آگ لگ جائے گلستاں کو

وہ آ رہا ہے میکشِ مخمور جھومتا　　پوچھیں گے میکدہ کا پتہ اس جواں سے ہم

ارمان:- شنکر موہن لال نام اور ارمان تخلص۔ جامعہ عثمانیہ سے طیلسان حاصل کیا ہے۔ ہندی تخئیل کے ساتھ اردو شاعری کرتے ہیں۔ قدیم طرز کے جذبات کو جدید سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔ خیالات میں الجھاؤ نہیں ہوتا۔ نظمیں اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔

بہار

پھر آیا موسم گل عاشقوں کی قدر دانی سے
زمیں خود ہو گئی ہے آسمانی گل فشانی سے
نچھاور کر رہے ہیں اس قدر گل سبز پوشاکاں
کہ گلچیں بول اٹھا ہیں باز آیا باغبانی سے
بہار آتے ہی گلشن میں عجب مستی سی چھائی ہے
کہ بوئے گل ہے بڑھ چڑھ کر شراب ارغوانی سے
ہوا ہے سرخ غصہ سے اگر لالہ چنبیلی پر
تو نرگس دیکھتی چمپا کو ہے کس دل ستانی سے
یہ ہے موسم کی حالت اور پھر ایسا بیان اپنا
نہ کیوں ارمان پھولوں اٹھائے شادمانی سے

ایک ہندی عورت عالم خیال میں

میرے پریتم آؤ آؤ　　　بن کے جوانی مجھ پر چھاؤ
آؤ مست فضائیں لے کر　　　بھولی بھالی ادائیں لے کر

آؤ آؤ میرے پریتم

رات کو چھپ کر گاؤں میں آؤ　　　تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آؤ
آؤ بھیگی بھیگی فضا میں لو　　　کالی کالی مست گھٹائیں

آؤ آؤ میرے پریتم

دھندلے، دھندلے سپن میں آؤ میرے مست احساس پہ چھاؤ
آؤ لب پہ تبسم لے کر ارمانوں کا تلاطم لے کر
آؤ میرے بھولے پریتم

پھولوں کی گھمبیر کھپائیں ہُو برکھا رت کی مست ہوائیں
نینوں کے رس تم کو پلاؤں پریم کے نغمے گا کے سناؤں
آؤ اداؤں والے پریتم

بن میں پپیہا گونج رہا ہے پتہ پتہ مست ہوا ہے
آؤ لوٹیں ہم بھی بہاریں جھولا جھولیں گائیں ملاریں
کالی آنکھوں والے پریتم
آؤ بھولے بھالے پریتم

عالم فراق

آج نہیں وہ لطف صحبت جوش شباب آغوش راحت
راز و نیاز و پیار و محبّت ہو عشوہ و غمزہ و ناز و نزاکت
دل کی دنیا روح کی جنت

سانولی صورت بھولی مورت حسن یکتا حسن حقیقت
طور پہ مثل برق وحدت شمس و قمر میں جلوۂ کثرت
آئنے میں نور وحدت

دیکھو کیا ہے حسن کی مایا　　اک ہی نظر میں ہوش اڑایا
اس نے سارے جگ کو پھنسایا　　ہنستے ہنستے مجھ کو رلایا
دل میں میرے خاک بنایا

غزل

اب کہاں وہ لطف عیش سرمدی تیرے بغیر
اک عذاب مستقل ہے زندگی تیرے بغیر
صحن گلشن ہو لب دریا ہو یا مے خانہ ہو
بجھ نہیں سکتی کہیں دل کی لگی تیرے بغیر

کون کہتا ہے مری حالت میں تبدیلی ہوئی
تھی وہی جانے سے پہلے ہے وہی آنے کے بعد
جب ہوا بیدل تو پردہ غیریت کا اٹھ گیا
سوز میں بھی ساز آجاتا ہے دل جانے کے بعد
یوں تو سب ہی آتے جاتے ہیں سرائے دہر میں
ہے وہی اک مرد بچ جائے مر جانے کے بعد
یہ جہاں ارماں کبھی منزل گہہ عشرت نہیں
یہ کھلا ہے راز ہم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد

اب تو خدا کے واسطے جلوہ مجھے دکھائیے　　جان بھی لب پہ آگئی آپ کے انتظار میں

یاد جمال ہم نشیں تازہ ہوئی ہے خود بخود — ضبط کر دل تو کس طرح دل نہیں اختیار میں
رنگ چمن کو دیکھ کر جان میں جان آ گئی — غنچے کھلے تو کھل گئی دل کی کلی بہار میں

چاک دامن کوئی بسمل کوئی حیران آیا — بزم میں تیری جو آیا وہ پریشان آیا
یوں تو سینہ میں کئی تیر چبھانے تھے مگر — ناوک ناز مرے دل پہ نمایاں آیا
یہ تجاہل بھی عجب ہے کہ وہی پوچھتے ہیں — دل کو تھامے ہوئے یہ کونسا مہماں آیا
جب جنوں میں مجھے اپنا نہ پرایا سوجھا — چھوڑ کر کوہ و چمن سوئے بیاباں آیا

نیند آتی ہی نہیں پہلے تو ارماں ان کو
چونک اٹھا خواب میں جب خواب پریشاں آیا

جو مقدر میں لکھا ہے وہ ملے گا بیشک — ہاتھ پھیلائے کسی اور سے کہنا کیا ہے

بدر :- ابوالکلام بدرالدین نام اور بدرؔ تخلص، جامعہ عثمانیہ کے اولین دور کے گریجویٹ ہیں۔ پھر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی ڈاکٹری کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ شاعری میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ غزل گوئی اور نظم نگاری میں بڑی عمدہ دستگاہ حاصل ہے۔ حسن و عشق اور رومان کے رنگین مزاج رنگین خیال شاعر ہیں۔ سلاست اور روانی ان کے نغموں کی جان ہوتی ہے۔

جرائیم

جرائیم بیں بھی طرح واریاں ہیں — قضا میں قضا کی یہ چنگاریاں ہیں
یہ افشاں سے ہیں کاکل عنبریں کے — شر بچہ یہ تارے ہیں چرخ بریں کے

انہیں پالنا نازبرداریوں سے — بڑی کاوشوں اور بیداریوں سے
بہت تجربوں سے یہ پائے ہوئے ہیں — یہ تحقیق کے گل کھلائے ہوئے ہیں
یہ لڑکیاں ہیں ان کی کہ موتی کے دانے — انہیں شکل پیاری عطا کی خدا نے
یہ افعی ہیں یا موت کے نامہ بر ہیں — ستم کوشی فطرت کے نیر نظر ہیں
رگ و ریشہ گویا ولایت ہے ان کی — قضا کا ہراول سرایت ہے ان کی
کھلے بندوں کوئی کوئی گھات میں ہے — سکندر کوئی بحر ظلمات میں ہے
وہ جیتا بچے کب جو بسمل ہے ان کا — لعاب دہن زہر قاتل ہے ان کا
ہراک فرد ان میں کا رنگیں ادا ہے — اگرچہ ہے ظالم بڑا دلربا ہے

رگ جان کا دشمن یہی نازنیں ہے
جلال مشیت بھی کتنا حسیں ہے

ایک طویل نظم "دلہن" ملاحظہ ہو۔

تو کہ بیٹھی ہے مسہری پہ نکالے گھونگٹ — یوں نہ گردن کو جھکا لے مری پاکر آہٹ
نیچی نظروں سے ذرا دیکھ تو گھونگٹ کو الٹ — میں سناؤں تجھے مٹ جائے جو دم بھر تری ہٹ

سن دیا عشق و غم دہر کا چھینٹا تو نے
پھول دیکر مجھے کانٹوں میں گھسیٹا تو نے

چھوڑا بچپن نے ہمیں عقد کا تحفہ دیکر — سر پہ دستار بندھائی ہے تو سودا دیکر
کس مصیبت میں پھنسایا ہمیں دنیا دیکر — باب ابجد کا ہوا ختم تمنا دے کر

آ نکالیں وہ عبارت کہ تھی دل میں ملفوف
آکہ اب مل کے جڑیں عشق و محبت کے حروف

بھولی لڑکی تجھے معلوم ہے دنیا کیا ہے　　گھاٹیوں سے کہیں دشوار گذر اس کا ہے
سر پہ ٹھلیا ہے بڑی دور مگر چشمہ ہے　　ساتھ میں بھی تو چلوں گا تجھے کیا پروا ہے

باندھ ہمت وہ چٹانوں کو بھی جو نرم کرے
سرد مہری جہاں اور بھی دل گرم کرے

سن مری موہنی اے سانولے مکھڑے والی　　دل کے بہلانے کو خالق نے نئی مورت ڈھالی
میں نغلبے چین اکیلا مجھے یہ دے ڈالی　　پھر تو وہ پیار کی باتیں ہوئیں بھولی بھالی

سر بہ سجدہ ہیں ملک جھوم رہی ہے فطرت
دیکھتا ہے ہمیں کس پیار سے رب العزت

وجہ تکوین بھی شاید ہوں یہی راز و نیاز　　اپنی تخلیق ہے خالق کے لئے مایۂ ناز
زندگی جوڑ سے ہوتی ہے لچکدار و گداز　　اس میں پوشیدہ ہے انسان کی تکمیل کا راز

اپنی الفت کو ہم اب زندۂ جاوید کریں
آ کہ فردوس کے اقرار کی تجدید کریں

اپنے سنسار کی دیوی میں بناؤں گا تجھے　　لطف کی چھیڑ سے خوش ہو کے ہنساؤں گا تجھے
تو اگر روٹھے تو ہنس ہنس کے مناؤں گا تجھے　　مجھے رونا ہو تو رو رو کے رلاؤں گا تجھے

ہم جو دنیا میں بہم مونس و یاور ہوں گے
عالم قدس سے پھر پھول نچھاور ہوں گے

غزل

غم جو چھا جاتا ہے دل پر تو برس جاتا ہوں　　اے فلک تو نے سکھایا مجھے نیساں ہونا

کوچہ یار میں آ دیکھنا منظور ہے گر   خاک کے فرش کا اورنگ سلیمان ہونا
ذرے ذرے میں نظر آتے ہیں تیرے جلوے   چمن دہر کی قسمت تھی پرستان ہونا

اشک:۔ جلال الدین نام، اشک تخلص، جامعہ عثمانیہ کے طیلسان، شاعری کا بڑا اچھا مذاق حاصل ہے۔ نظمیں اور غزلیں دونوں موزوں کرتے ہیں۔ تخلص کی طرح مزاج بھی نرم اور نازک ہے۔ درد اور احساس ان کی زندگی کے جز لاینفک ہیں سلطانہ رضیہ، برسات، گوند شہزادی، نغمہ رنگیں وغیرہ ان کی نظمیں کافی مقبول ہوئیں۔

سلطانہ رضیہ میدان جنگ میں

ہاتھ میں تیر کماں اور کمر میں تلوار   دوش پر زلف سیہ گوش میں دُر شہوار
زیر ران اسپ سبکسیر و صرصر رفتار   تمتمائے ہوئے گرمی سے وہ دونوں رخسار
آج میدان میں رضیہ کی سپہ داری ہے
کچھ انوکھی یہ زمانہ سے طرح داری ہے

گرد آلودہ جبیں ہونٹوں پہ آہ سوزاں   اثر رنج والم دیدۂ گریاں سے عیاں
دولت حسن پہ اپنے جو کبھی تھی نازاں   آج میدان میں آئی ہے وہ نالاں گریاں
ہیچ تقدیر کا ہے گیسوئے پرپیچ اسے
کام دنیا کے نظر آتے ہیں سب ہیچ اسے

آہ بگڑی نظر آتی ہے زمانہ کی ہوا   اپنی ہی فوج کے سردار ہیں سرگرم جفا
کل وفادار تھے جو آج وہ دیتے ہیں دغا   لٹ رہی ہے سر بازار جہاں جنس وفا

ظلمت یاس کی چھائی ہیں گھٹائیں سر پر
کس غضب کی ہوئی نازل ہیں بلائیں سر پر

یاس انگیز زمانہ کی ہے حالت کیسی — آنکھ جھپکاتے پلٹ جاتی ہے قسمت کیسی
سر پہ رضیہ کے ہے آئی ہوئی آفت کیسی — اس کی صورت سے عیاں آج ہے حسرت کیسی

جو وفادار تھے غدار نظر آتے ہیں
تخت شاہی کے طلب گار نظر آتے ہیں

نغمۂ رنگیں

وہ بلاتے ہیں میں انکار کروں یا نہ کروں — سوچتی ہوں کہ انہیں پیار کروں یا نہ کروں
دیکھتے ہیں وہ مرے گیسوئے پیچاں کی طرف — ان کمندوں میں گرفتار کروں یا نہ کروں
نیم بسمل ہیں ابھی کیوں نہ بنا دوں بسمل — تیغ ابرو کے ادھر وار کروں یا نہ کروں
نذر کرتے ہیں مجھے قلب پہ ارماں اپنا — ناوک ناز کو دو سار کروں یا نہ کروں
آزماؤں نہ کیوں اب حسن کا جادو اے دل — نگہ چشم فسوں کار کروں یا نہ کروں
غمزۂ ابروئے خمدار کروں یا نہ کروں — عشوۂ نرگس بیمار کروں یا نہ کروں
رات دن آتش فرقت میں جلا کرتی ہوں — حال سے ان کو خبردار کروں یا نہ کروں
ضبط کی تاب نہیں اب دل مضطر میں مرے — آج اک آہ شرربار کروں یا نہ کروں
اشک امڈے ہی چلے آتے ہیں طوفان بہ کنار — دیدۂ تر کو گہربار کروں یا نہ کروں
دامن صبر مرا چاک ہوا جاتا ہے — ان کی الفت کا میں اقرار کروں یا نہ کروں
سوچتی ہوں کہ انہیں پیار کروں یا نہ کروں — جذبۂ عشق کا اظہار کروں یا نہ کروں

گونڈ شہزادہ کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

قلب آزاد نہیں قیدی بند تہذیب کبھی پاسے گا نہ تجھ کو یہ سمند تہذیب
دور رہتا ہے بہت تجھ سے گزند تہذیب نہ تو تہذیب پسند اور نہ پسند تہذیب
تیری توصیف میں خامہ کو جو جولاں کردوں
سارے تہذیب کے دفتر کو پریشاں کردوں

کوہ تیرے ہیں ترا دشت ہے صحرا تیرا ندیاں تیری ہیں نالے ترے دریا تیرا
اور گنگا ہیں نہاں آئینہ خانہ تیرا چار سو عالم فطرت میں ہے چرچا تیرا
شیر بھی کانپتے ہیں بانگ درا سے تیری
چیتے گھبراتے ہیں دلدوز صدا سے تیری

ہے یہ زنجیرۂ کہسار ترا حصن حصین قلۂ کوہ پہ ہوتا ہے تو اورنگ نشین
سامنے تیرے درختوں کا ہے حسن رنگیں اور پھیلائے ہے گنگا بھی ردائے سیمین
تیری تقدیر میں فطرت کی شہنشاہی ہے
ساری دنیا تری مصروف ہوا خواہی ہے

غزل کا نمونہ۔

شعلوں میں خود کو یوں نہ چھپایا کرے کوئی خون شفق سے جلوہ دکھایا کرے کوئی
آنکھیں بچھی ہیں انجم تاباں کی ہر طرف گلگشت کے لئے کبھی آیا کرے کوئی
اے اشک قصۂ غم الفت نہ چھیڑنا ایسا نہ ہو کہ تجھ کو بھی رسوا کرے کوئی

آسمانوں کی طرف مائل پرواز ہے دل اک ستارے کی طرح محو تگ و تاز ہے دل

کتنی دلچسپ ہے دنیا میں کہانی دل کی　　کشتۂ ناز ہے دل کشتہ انداز ہے دل

بل کھائی ہوئی زلف معنبر کو ذرا دیکھ　　شرمائی ہوئی نرگس شہلا کی ادا دیکھ
ہاتھوں میں لئے بادۂ گلرنگ کے ساغر　　کس شان سے آتا ہے محبت کا خدا دیکھ

وحید:- ابوظفر عبدالوحید - جامعہ عثمانیہ سے ایم - اے کی ڈگری لی ہے - اور تعلیمی لائن اپنے لئے منتخب کی ہے - اولاً سٹی کالج میں لکچرار رہے پھر جامعہ عثمانیہ رہ کر اس کے بعد سکندرآباد کالج میں پروفیسر ہیں - جدید شعرا کی ذہنیت پر آپ کا خاص اثر ہوا ہے - ہندی آمیز شاعری آپ کی محبوب شاعری ہے - آپ کے کلام میں شیرینی اور حلاوت ہوتی ہے -

طائر بلند مقام

وفا شعار ہوں مسلک مرا جفا طلبی　　بہ قرب و بعد کے قضیے یہ فاصلے کیا ہیں
پسند ہے تجھے دوری تو دور رکھ مجھ کو　　کہ آگے تیری خوشی کے مرے گلے کیا ہیں
ازل سے تا بہ ابد ایک آن کا ہے سفر　　نگاہ مردم بینا میں فاصلے کیا ہیں
تو اپنی آن پہ رہ - طائر بلند مقام　　وزارت اور امارت کے گھونسلے کیا ہیں
یہ سب کھلونے ہیں فانی اک آن باقی ہے　　مجاہدانہ گزر جا یہ بلبلے کیا ہیں

اچھل کے بحر حوادث سے بیکراں ہوجا
سبک ہے پلہ ابھی اور کچھ گراں ہوجا

اقدس:- عباس حسین المتخلص بہ اقدس۔ سنہ ۱۳۲۱ھ میں تولد ہوئے۔ اور سنہ ۱۳۴۸ھ میں انتقال کر گئے۔ مگر اپنے کلام کو یادگار چھوڑا۔ اورنگ آباد وطن تھا۔ وحید الدین سلیم مرحوم کو اپنا استاد مانتے تھے۔ اقدس کے کلام میں بلا کی قنوطیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ سلاست اور روانی بھی ہے اور مضمون آفرینی بھی۔

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظار وعدہ محشر
یہی لے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا

ترا دست ستم بھی باغباں شانے سے کٹ جائے
غضب ہے چھانٹ کر چھانٹا مری شاخ نشیمن کو

گھبرا گئے ہیں کشمکش انتظار سے
فرقت نصیب مانگ رہے ہیں دعائے مرگ

تم کیا خفا ہوئے کہ زمانہ خفا ہے اب
تم کیا بگڑ گئے کہ زمانہ بگڑ گیا

جو نہ ہونا تھا ہوا عشق کی رسوائی میں
جو نہ کرنا تھا کیا حسن کی خاطر ہم نے

ہوش و حواس کھو کے دل بیقرار سے
ناکام جا رہا ہے کوئی بزم یار سے

ہو گئے ساماں میری بربادئ تقدیر کے
نالہ برہم اشک مضطر آہ بیتابانہ ہے

خوش ہوں گے آپ بھی اس جاں نثار سے
اقدس ہے جس کا نام وہ عاشق مزاج ہے

خار حسرت تو نہ تھا قلب تمنائی میں
کیوں ہوئے دامن فریاد کے ٹکڑے ٹکڑے

اقدس کی نظموں کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ "تجلیات سحر" کے چند شعر یہ ہیں۔

ذرے میں جگمگا رہے نور کا وقت ہو گیا
آتی ہے آبشار سے نغمہ عیش کی صدا
سبزے سے دشت پٹ گیا جوش نمو کا یہ اثر
رنگ فضا کو دیکھ کر محو سرور ہے نظر
سرخ سپید پھولوں کا رنگ بھی شوخ و شنگ ہے
چشم حقیقت آشنا دیکھ کے جس کو دنگ ہے
تند ہوا سے جھڑ گئے پتے جو زرد زرد تھے
ٹہنیاں سبز ہو گئیں تازہ شگوفے ہیں گئے
تاب نظارہ ہے کہاں چشم نظارہ باز کو
کھوئے ہوئے ہیں اب تو ہم قوت امتیاز کو
زینت حسن ہیں ہے محو صبح کو روئے مہوشاں
آئینے میں سما گئیں حسن کی بھر تجلیاں
نرگس اگر ہے زرفشاں لالہ بھی شعلہ زیر ہے
پھولوں سے چھیڑ کرتی ہے موج ہوا جو تیز ہے
دیکھ تو چشم دید باز تجھ میں کہاں یہ تاب ہے
تیری ہی تابش نظر تیرے لئے حجاب ہے
بلبل بے نوا کے اب نالے شرر فشاں نہیں
آہ نہیں بکا نہیں یاس نہیں فغاں نہیں

ظلمتیں شب کی چھٹ گئیں پھیل گئیں تجلیاں
جام جہاں نما ہے یہ کہئے اسے نہ آسماں
صدر نشیں بنا ہوا محفلِ کائنات کا
جس نے کہ ذمہ لے لیا تازگیِ حیات کا

لمعہ:- محمد عباس علی خان لمعہ تخلص۔ سٹی ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد ڈاکٹری تعلیم پائی۔ سرجری میں مہارت حاصل کی۔ شاعری سے بچپن سے دلچسپی رہی۔ اردو کے ساتھ فارسی اور انگریزی شاعری کا بھی شوق رہا۔ لمعہ اقبال سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اقبال سے ان کو بچپن سے عقیدت رہی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

پیری میں شباب یاد آیا ۔۔۔ زاہد کو خضاب یاد آیا
دنیا نے بھلا دیا تھا سب کچھ ۔۔۔ محشر میں حساب یاد آیا
جی بھر کے میں رو لیا اسی وقت ۔۔۔ جب ان کا عتاب یاد آیا
رحمت کا خیال کر کے مجھ کو ۔۔۔ دوزخ کا عذاب یاد آیا
اللہ رے وسعتِ تخیل
دریا کو حباب یاد آیا

عشق مذہب ہے مرا سوز ہے فطرت میری ۔۔۔ شمع ہے حسن تو پروانہ ہے حسرت میری
حسن ایماں ہے مرا درد ہے راحت مجھ کو ۔۔۔ غم مری روح ہے نالے ہیں عبادت میری
آتشِ حسن تو اتنا نہ بھڑک بہرِ خدا ۔۔۔ سو رہی ہے ترے پہلو میں محبت میری

بے اختیار ہوں میں با اختیار ہوں میں
کچھ بے خودی سے ایسی خود پر نثار ہوں میں

برق:۔ میر کاظم علی موسوی نام اور برق تخلص۔ برق ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے افراد صدیوں سے شاعری میں نام آوری حاصل کرتے رہے ہیں۔ ان کے پر دادا "شہید"۔ دادا "شعلہ" اور باپ رعد اور چچا لمعہ کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے۔ برق حیدر آباد میں ۱۹۱۴ء کو تولد ہوئے باپ کی اضلاع کی ملازمت کے باعث اعلیٰ تعلیم میسر نہ ہو سکی۔ خاندانی ماحول اور ذاتی شوق سے فارسی اور اردو میں خاصی مہارت حاصل کر لی ہے۔ بچپن سے شاعری سے دلچسپی رہی۔ وہ اکتسابی شاعر نہیں بلکہ خاندانی میراث کے طور پر شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ کلام کے دو مجموعے "عقل و جنوں" اور "کنول" شائع ہو چکے ہیں۔ برق نظم نگاری بھی کرتے ہیں اور غزل گوئی بھی۔ ان کے کلام میں جوش کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اس رنگ میں کامیابی سے لکھ جاتے ہیں۔ کہ جوش کے کلام کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ ان کی شاعری میں مزدوروں کی فریاد، غریبوں کا درد، مظلوموں کے آنسو، بہار کی نیرنگی، مناظر قدرت کی دلکشی اور دل فریبی نظر آتی ہے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ "مزدور حسینہ" ایک طویل نظم ہے اس کے چند شعر یہ ہیں۔

مانگ میں ہے تیری صندل کے عوض گرد و غبار
سر پہ پھولوں کے عوض یہ سنگ سیو کا ہے بار
دھوپ سے کملا رہا ہے تیرا چہرہ نازنین
ہے عرق میں تر عوض چندن کے چاندی سی جبیں

مدبھری آنکھوں میں اور یہ بے کسی کا تو تیا
تیری چشم مست میں کاجل جو کھلتا خوب تھا
جم رہی ہیں پپڑیاں تیرے لبوں پر دھوپ سے
خوب جم سکتی تھی مستی پتلے ہونٹوں پر ترے
تیرے ہاتھوں پر ہیں پتھر کی خراشیں جابجا
گورے ہاتھوں میں ترے مہندی جو رچتی خوب تھا
سچ ہے تیرا حسن مزدوری کے قابل تو نہ تھا
لیکن اس کا کیا علاج اے پیکر صدق و صفا
تیرا بس کیا؟ گو کہ دنیا ہے تری دارالمحن
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

اے مرے مفلس وطن ہندوستاں ہندوستاں
سخت حیرت ہے تجھے کہتے ہیں کیوں جنت نشاں
چلچلاتی دھوپ میں حسن اور مزدوری کرے
سر پہ پتھر ڈھوئے دن بھر جنبۂ بیسوں کیلئے
جس کے نازک ہاتھ ہوں مہندی رچانے کیلئے
حیف وہ مجبور ہو پتھر اٹھانے کے لئے
جس کے تلوے ہوں مناسب فرش قالین کیلئے
حیف وہ سرپا برہنہ سنگریزوں پر چلے
سود خواروں سے غریبوں پر یہ دنیا تنگ ہے
ہند میں اہل وطن سرمایہ داری ننگ ہے

"برکھا کے نظارے"

مدہوش، بلانوش گھٹا جھوم رہی ہے
کلیوں کا صبا ناز سے منہ چوم رہی ہے
بھونروں کی لگن مست صدا گھوم رہی ہے
کوئل کی ملاریں ہیں پپیہے کے کدارے برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

سرخی پہ شفق کی یہ گھٹاؤں کی سیاہی
رنگیں دھنک یہ تری قدرت ہے الٰہی
یہ سات جدا رنگ بھلے لگتے ہیں کیا ہی
سورج کی شعاعوں نے عجب رنگ نکھارے برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

یہ ٹھنڈی ہوا مست گھٹا ہلکی پھواریں تو
یہ آم کے باغات یہ جھولوں کی بہاریں
یہ قہقہے یہ شوخیاں یہ دھن یہ ملاریں
مر رہنے کے سامان تو جینے کے سہارے برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

کاکل ہیں کہ یہ کالی گھٹا سر پہ کھڑی ہے
ناشفتہ یہ موتی ہیں کہ پانی کی جھڑی ہے
یا مانگ میں دلہن کی یہ موتی کی لڑی ہے
لائے ہیں جسے بیاہ کے منڈپ میں سنوارے برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

مہکی ہوئی بہکی ہوئی سرشار ہوائیں

گاتی ہوئی ہنستی ہوئی گلبار ہوائیں
پر کیف طرب خیز طرب کار ہوائیں
پیغامبر آمدن فصل بہار ہے   برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

ہنستے ہوئے یہ کھیت کسانوں کے یہ ارماں
یہ دھان لپکتے ہوئے اڑتی ہوئی چڑیاں
کھیتوں میں مگن پھرتے ہیں گاتے ہوئے دہقاں
کس طرح سے پھولے نہ سمائے ہیں بچارے   برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

فردوس نظر ہے کہ یہ پھولا ہوا جنگل
بستی میں ہیں رنگ رلیاں تو جنگل میں ہے منگل
پودے یہ چہکتے ہوئے گاتی ہوئی کوئل
موروں کا یہ رقص اور یہ ہرنوں کے ترارے   برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

بوندیں یہ ٹپکتی ہیں درختوں سے زمیں پر
یا بال جھٹکتی ہے کوئی شوخ نہا کر
یہ برق ہے یا ابر کی چلمن کو ہٹا کر
کرتی ہے کوئی حور بصد ناز اشارے   برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

یہ تتلیاں اڑتے ہوئے جادو کے چمن ہیں
یہ بھوٹیاں چلتے ہو یا لعل یمن ہیں
یہ صبح کو شبنم ہے کہ دُرہائے عدن ہیں
یہ شام کو جگنو ہیں کہ جاندار شرارے   برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

یوں بدلیوں میں رنگ بدلتے ہیں شفق کے
تو یہ کہیے قالین یہ بنتے ہیں جلا ہے
آکاش پہ یوں ڈولتے ہیں ابر کے ٹکے
کشمیر کے جھیلوں میں رواں جیسے شکارے   برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے
"پی پی" سے پپیہے کی دلوں کا یہ امنڈنا
بے نام تمنا کا ہر اک دل میں مچلنا
برسات کے یہ روپ مصور سے کھنچیں کیا
شاعر کے سوا کون یہ تصویر اتارے   برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے

غزل

آئے وہ دل میں آگ لگا کر چلے گئے
بے تابیوں کو اور بڑھا کر چلے گئے

کافر نظر ملا کے ذرا مسکرا دیا
قلب حزیں پہ برق گرا کر چلے گئے

دنیا کے ساز چھو نہیں سکتے ہیں جس کی دھن
وہ راگ ساز دل پہ سنا کر چلے گئے

اہل خرد کے نقش قدم جس جگہ نہیں
وہ مجھ کو ایسی راہ بتا کر چلے گئے

دنیا کی فکر اب ہے نہ عقبیٰ کا خوف ہے
یہ دغدغہ وہ دل سے مٹا کر چلے گئے

رسوائیوں کا خوف نہ پروائے ننگ و نام
وہ سب سے اک نظر میں چھڑا کر چلے گئے

پیتے ہیں جس کو ساغر و پیمانہ کے بغیر
ایسی شراب مجھ کو پلا کر چلے گئے

دنیا تمام مست نظر آ رہی ہے اب
ایسا وہ مجھ کو مست بنا کر چلے گئے

میرے مشام جام کو معطر بنا دیا
بو زلف عنبریں کی سنگھا کر چلے گئے

وہ آئے اور اس کو جگا کر چلے گئے　　کچھ سو گئی تھی روح مری برق موسوی

باقی:- عبدالقیوم خان باقی تخلص - آپ کے والد خانی تخلص حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے، باقی کی تعلیم جامعہ عثمانیہ میں ہوئی - ایم - اے میں اونہوں نے کامیابی حاصل کی - باپ سے شاعری میں تلمذ رہا - نظام کالج میں اردو، فارسی کے لکچرار ہیں - ہر صنف سخن میں دستگاہ حاصل ہے - نظم میں ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے - باقی ایک باکمال آرٹسٹ ہیں - شاعری، موسیقی اور مصوری میں اچھی مہارت رکھتے ہیں -

گناہ

ذرے میں رقص برق شرارت کا آگیا　　آدم کسی کی بزم محبت پہ چھا گیا

شوخی، سمند شوق کی مہمیز ہو گئی　　دوزخ کی آنچ اس کے لئے تیز ہو گئی

مخمور اضطراب اثر دیکھتا نہیں　　فردوس سامنے ہے مگر دیکھتا نہیں

گردن اٹھا کے خاک کا پتلا رواں ہوا　　یہ ذرۂ زمیں نہ ہوا آسماں ہوا

زہرہ میں اس کی دھوم ہے اور کہکشاں میں دھوم　　سنتے ہیں اس کے شوق کی کون و مکاں میں دھوم

یہ گرمیاں کہاں کی ہیں پہچانتے ہیں کیا؟　　اس کے جنوں کو اہل فلک جانتے ہیں کیا

ہر سانس میں گناہ کی لذت ملی ہوئی
یوں ساکنِ زمیں کو عطا زندگی ہوئی

مقبرہ رابعہ دورانی

کس درد سے چھڑنے لگا پھر ساز محبت
کس سمت سے آنے لگی آواز محبت

ماتم کدۂ حسن کی اس زحمت گری میں
حسرت کدۂ عشق کی خونیں جگری میں

ہے درد کی دنیاؤں کا اک آئینہ خانہ
کس شان سے ہے جلوہ نما غم کا فسانہ

دروازے پہ جو حوض ہے سرشار الم ہے
دنیائے محبت کا چھلکتا ہوا غم ہے

اور جوئے رواں اشک رواں کی ہے نشانی
ماں کے لئے خونبار ہے بیٹے کی جوانی

ہے سرو کی مانند نکلتی ہوئی آہیں
جو ڈھونڈتی ہیں عرش پہ پرواز کی راہیں

بیمار نہیں دست دعا فاتحہ خواں ہیں
یہ امن داماں کے لئے ہر سو نگراں ہیں

گنبد میں سدا گونجتی ہے نالہ و فریاد
بے ساختہ کرتا ہے کوئی نام خدا یاد

بے رحم ہے اور خانہ بر انداز زمانہ
دنیا سے مٹا دیتا ہے دنیا کا فسانہ

آنکھوں میں جفا کار کے جچتا نہیں کوئی
اس دشمن بیدرد سے بچتا نہیں کوئی

برباد نہ کر دے کہیں اس جنت غم کو
بے کیف نہ کر دے کہیں اس فن کے حرم کو

اس واسطے معمار نے اس خلد بریں میں
اس ماں کے دھڑکتے ہوئے سینے کی تہیں میں

صورت گری حسن اس انداز سے کی ہے
گویا کہ یہ غم دہر میں دوا زلی ہے

تابندگی و رفعت ارمان سے دیکھو
اس غم کے فسانے کو اسی شان سے دیکھو

غزلیں

دلِ غریب کی بیتا بیاں دکھا نہ سکے
ہم اس کے دردِ محبت کو آزما نہ سکے

نگاہِ شوق کو ہر ہر قدم پہ لغزش تھی
نظر ملا کے بھی ان سے نظر ملا نہ سکے

خیال عشق کی رعنائیوں سے ڈرتا ہوں
بھلا ہوا کہ تصور میں وہ سما نہ سکے

یہ اور بات ہے تقدیر ہی بدل ڈالیں
لکھا ہوا مری تقدیر کا مٹا نہ سکے

غمِ نہائی پیہم کی خیر ہو یا رب
وہ اپنی یاد کا دامن چھڑا کے جا نہ سکے

نظر جھکا کے دیا ساغرِ شراب مجھے
جو مانگتی تھیں نگاہیں وہی پلا نہ سکے

رہے نصیب کہ تیر دیارِ عشق مست وفا
نگاہ رک نہ سکی دل کو ہم بچا نہ سکے

خدا گواہ کہ باقی کے چاہنے والے
کبھی خلوص و محبت اسے دکھا نہ سکے

روٹھ گئی ان کی نظر دیکھنا
جرمِ محبت کا اثر دیکھنا

پی گئے افسانۂ طور و کلیم
دیکھنے والوں کا جگر دیکھنا

پوچھنے والے تو یونہی رہ گئے
دل کی غیروں کو خبر دیکھنا

ہوش سکون زیست تمنا خوشی
زیست کا سامان سفر دیکھنا

باعثِ جمعیت دل بن گیا
باقی آشفتہ نظر دیکھنا

مرحبا اے جذبۂ عشق آفریں صد مرحبا
حسن بن جاتی ہے دنیا جس طرف جاتا ہوں میں

اک کھلونا رکھ کے وہ عالم کا اپنے سامنے
مجھ کو بہلاتے ہیں وہ اور ان کو بہلاتا ہوں میں

لطیف ساجد:۔ دور موجودہ کے ترقی پسند شاعر ہیں۔ اپنے انفرادی تاثر کو روح اجتماعیت سے علیحدہ کرنا پسند نہیں کرتے وہ زندگی کے ترقی پسند افراد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور ادب اور شاعری میں زندگی کے غیر سائنسی مابعد الطبعیات تصور کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی نظر میں شاعری زندگی کی حرکت پذیر تغیر آشنا قدروں کا نام ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے بی اے کی ڈگری لی ہے۔ ان کی شاعرانہ ذہنیت کو مجلا کرنے میں ان کے قابل پروفیسر ابو ظفر عبدالوحید صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ لطیف ساجد، غزل اور نظم دونوں موزوں کرتے ہیں۔ دفتری خشک فضا کے باوجود ان کی شاعری پروان چڑھی ہے

نوائے شوق

کیا کروں اے غم بے چارگی درد حیات

آہ یہ بزم کہ ہے مجلس اوہام پہ شاد — عقل سہمی ہوئی تدبیر کے ساماں برباد
ہر طرف جہل کی تاریکی گھٹاؤں کا نزول — سینۂ زیست پہ ہے رقص کناں دیوانہ

کیا کروں اے غم بے چارگی درد حیات

آہ یہ چشم امارت کے بہکتے ہوئے خواب — اف یہ لٹتا ہوا دو شیزہ مسرت کا شباب
بے کسی ظلم و ستم جور و جفا تعزیریں — زندگی پردہ در کش مکش روز حساب

کیا کروں اے غم بے چارگی درد حیات

شوق کو فرصت آرائش افکار تو دے
میری آزاد روی کو دل سرشار تو دے
اور کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں اے دردِ حیات
اک فقط جذبۂ بے باک کی تلوار تو دے

کیا کروں اے غم بے چارگی دردِ حیات

نورِ احساس کا بہتا ہوا دھارا بن کر
ایک خورشید در آغوش شرارا بن کر
چھین ہی لوں گا امارت کی جبیں سے تنویر
شب افلاس کی قسمت کا ستارا بن کر

اک فقط جذبۂ بے باک کی تلوار تو دے
اور کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں اے دردِ حیات

آب و آتش

یک بیک نالۂ شب گیر کی مانند اٹھا
ابر کا شور دل چرخ کو دہلاتا ہوا
ایک بپھرے ہوئے امڈے ہوئے طوفاں کی طرح
وقت کے ساحل خاموش سے ٹکراتا ہوا

مسندِ خاک پہ وہ دیکھو ہوئے جلوہ فروز
گوہر آب کی صورت میں ستاروں کے رسول
ہر طرف نورِ مسرت کا ہے فرماں جاری
قلب گردوں ہے مگر خستہ و ناشاد و ملول

جانے کس بزم میں لے آئے ہیں دل کو میرے
یہ سلگتے ہوئے ارماں یہ برستی ہوئی رات
جس جگہ کیف نہیں رنگ نہیں حسن نہیں
گرمیِ ساز سے بیزار دل سازِ حیات

شعلۂ زیست ہے رستی ہوئی آہوں کا دھواں
جذبۂ شوق — اترتے ہوئے نشہ کا خمار

نہ تلاطم کی تمنّا نہ تبسم کا شعور
صرف اک جنبش انفاس، سو وہ بھی بیمار
کس طرح دیکھوں یہ دم توڑتی نظروں کا گداز
کس طرح آتش احساس بجھاؤں آخر
حسن اور حلقۂ تاریکیٔ غم میں مجبور
آہ کس دل سے نگاہوں کو چراؤں آخر
دل کہ مدت سے اسیر خم ابرو ہی رہا
خنجر و تیغ کی جھنکار بھی سن سکتا ہے
لاؤ اب ظلمتیں تا دیر نہیں رہ سکتیں
صبح فردا کی بھی اس گیت پہ سر دھنتا ہے

عہدِ نو

آخر کار فضاؤں میں سلگ ہی اٹھا
سرخ شعلہ سا تمناؤں کی آزادی کا
ناز پروردۂ انوار مہ و مہر و نجوم
جلوہ آرائے شبستان نوا روح وفا
تیرگی پنپ گئی آہ بہ لب دست بہ دل تو
اپنی بے مایہ خدائی کی قسم کھاتی ہوئی
کس نظر در کی تمنا ہے وہ عالم پہ محیط
نغمۂ زیست سناتی ہوئی اٹھلاتی ہوئی
سینکڑوں صدیوں کے گھٹتے ہوئے ارمانوں نے
پا بہ زنجیر عزائم کو دیا اذن نمود
آج بھی موت عناں گیر نفس ہے تو کیا
مطلق الحکم ہے انسان کا احساس وجود
وقت کے دل میں یہ انداز تقاضائے جنوں

خون ٹیپو کی کہن سال حمیت جاگی
وہ کرن پھوٹی وہ افسردہ ستارے ڈوبے
صورت موج نظر تیز گئی غم بھاگی

ابن آدم یہ نیا دور یہ ہستی ہوئی زیست — تیری تقدیر یہ زیاں کار کو ہے درس فرار
جھوم ہر گام پہ ہر بات پہ ہر سانس پہ جھوم — رسم خاموشی کا قابل ہی نہیں جوش بہار

غزل

بے گمانۂ آلام نہ وابستۂ آلام — پہلو میں ہے دل یا کوئی دیوانۂ خودکام

ہنستے ہوئے دیکھے ہیں جہان سے نے — روتی ہوئی آنکھوں کے اشارے

وہ نگاہ ناز کہ حسرتوں کو نوید کیف دوام ہے
کبھی شمع بزم سکوت ہے کبھی موج نغمہ خرام ہے
نہ سحر میں روح شگفتگی نہ شبوں میں لذت تازگی
یہ عجیب دور بہار ہے یہ عجیب گردش جام ہے
ہیں خراب بادۂ غم سہی تو ملول فکر کرم نہ ہو
تری غفلتوں کی پناہ میں مری زندگی کا نظام ہے
کبھی برق بن کے مچل گئی کبھی شمع بن کے پگھل گئی
وہ نوائے غم جسے روح میں نہ قرار ہے نہ قیام ہے
یہ کوئی پیام نظر نہیں یہ کوئی نوید سحر نہیں
ابھی زندگی ہے فسردہ دل ابھی شوق نیم تمام ہے

شاہد:۔ شاہد صدیقی بھی ترقی پسند شعراء میں شامل ہیں نظم اور غزل گوئی میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ زیادہ تر غزل گوئی کو پسند کرتے ہیں۔ نوجواں شعراء میں شاہد کا مقام بہت بلند ہے۔

یہ زمانہ

آپ کیوں ہیں انقلابات جہاں سے بدگماں
زیست منزل کے لئے بیتاب ہے اے مہرباں
کل تک اس کی عقل پہ کارزیں بھی بار تھا
آج انساں کی نظر ہے ماورائے کہکشاں
عقل محتاج سکوں ہے عشق جویائے تلاش
بڑھ رہا ہے اپنی منزل کی طرف ہر کارواں
آج تقدیر چمن کو جانے کیا منظور ہے
اک طرف کچھ آشیاں ہیں اک طرف کچھ بجلیاں
اپنی بربادی کا اس کو خوف ہو سکتا نہیں
بجلیوں پر جس نے رکھی ہو بنائے آشیاں
کھولتی جاتی ہیں راہیں ذہن تازہ کے لئے
ایک فرسودہ نظام فکر کی بربادیاں
کہنگی کی لاش پر محو تبسم ہے شباب
اور بڑھاپا ہے پرانے مقبروں میں نوحہ خواں
اک طرف بھڑکے ہوئے شعلوں میں بھی خشکی سی ہے

ایک جانب اڑ رہا ہے سطح دریا سے دھواں
ایک جانب موت کی آنکھوں میں ہے کچھ نیند سی
ایک جانب لے رہی ہے زندگی انگڑائیاں
ایک جانب چہرۂ افلاس پر رنگ وقار
اک طرف روئے امارت پر ہزاروں جھریاں
ہے یہ موزوں وقت تعمیر نشیمن کے لئے
زلزلے ہی زلزلے ہیں آندھیاں ہی آندھیاں
یہ زمانہ کس قدر مغموم و راحت خیز ہے
زندگی کی دوڑ کتنی سست کتنی تیز ہے

کنول:- کنول پرشاد صاحب نام اور کنول تخلص۔ اس دور کے نوجوان شاعر ہیں۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں زیادہ تر نظمیں قلمبند کرتے ہیں ان کی نظموں میں حلاوت اور شیرینی پائی جاتی ہے گیت بھی لکھا کرتے ہیں۔ کلام میں اثر اور درد ہوتا ہے۔ کنول پرشاد کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ اگر اس کو ناگری رسم الخط میں لکھیں تو ہندی اور اردو رسم الخط میں لکھیں تو اردو کہا جا سکتا ہے۔

مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
میں راہی ہوں ایک اکیلا
گھیرے رہتا راہ کو جس کی ہردم طوفانوں کا ریلا
تم اپنے دھندلے دن دیکھو میری ڈھلتی شام نہ پوچھو

مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
تھک کر چور رہا جاتا ہوں
جتنا چلتا ہوں منزل سے اتنا دور رہا جاتا ہوں
اجڑے گھر میں بسنے والو میرا اجڑا گرام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
سانجھ سویرے رونے والو
جینے کے پیچھے مر مر کر اپنا جیون کھونے والو
اپنے الجھے دھندے دیکھو میرا الجھا کام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
آزادی کا دیوانہ ہوں
انگاروں سے کھیلنے والا اک البیلا پروانہ ہوں
تم سو بندھن میں جکڑے ہو آزادی کے دام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو
دنیا کا رنگ دیکھ رہا ہوں
منڈلاتے طوفانوں بھونچالوں کا بھی ڈھنگ دیکھ رہا ہوں
کانپ اٹھو گے دنیا والو دنیا کا انجام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

اس زمانہ میں دیہات کی زبان میں یا قدیم نہج پر اصلاحی شاعری کا بھی رواج

ہوا۔ کئی شعراء اس نہج کی شاعری کرنے لگے ان میں دہقانی، کھرمر، رحیم صاحب میاں وغیرہ کئی اصحاب نے طبع آزمائی ہے۔ اس موقع پر ہم صرف دہقانی کا تعارف کراتے ہیں۔

دہقانی:۔ نذیر احمد نام اور دہقانی تخلص۔ اسی دور کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جبکہ اونہوں نے دیہات کی سادہ زندگی میں اپنی عمر بسر کی۔ گاؤں کی فضا اور ماحول میں ان کی شاعری پروان چڑھی جس میں دیہات کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ موٹ کا گیت، شاعر اور برسات، لباڈن، دیہاتن وغیرہ اس دور کی مشہور اور مقبول نظمیں ہیں۔ دوسرا دوران کا شہر میں آنے کے بعد شروع ہوتا ہے اس میں اونہوں نے شہری زندگی کی تکلیف اور تصنع دیکھا۔ حیدرآباد کی جگمگاتی فضا میں اونہوں نے جو کچھ دیکھا اس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ تیسرا دوران کا سیاسی دور ہے۔ جبکہ قائد ملت اور قائد اعظم کی تحریکات سے متاثر ہو کر اپنی شاعری میں سیاسی پہلو کو پیش نظر رکھا۔ اس دور کی نظموں میں "نذرت تمہاری کی" غنچ چیپ، روتی صورت، خالہ ماں، رس تو کیا نہیں تو نہیں رس تو کیا، مزدور، موسی ندی کی کہانی، کب تلک وغیرہ نظمیں مشہور رہیں۔

دہقانی کی نظمیں اپنی صداقت، صاف گوئی کے لحاظ سے موثر ہوتی ہیں ان میں وہی ہوتا ہے جو زندگی میں گزرتا اور پیش آتا اور نظر آتا ہے۔ تخیل کی بلندی۔ معانی کی رفعت، محاورات اور ضرب الامثال کی بندش ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ کلام کا نمونہ

مُوٹ کا گیت

جب لوکاں رہتیں نیندان میں ہاتھ میں لمبا لٹ لیکو
میں مُوٹ چلانے جاتا ہوں تو کھ ندے پو کمل سٹ لے کو
میں موٹ چلاتے رہتا ہوں جب ہو کر مست خیالاں میں
شونم کے موتیاں پڑاتی ہوے تو مرے سر کے بالاں میں
یہ کر کا یم ہر چکر پو کوٹل کے نغماں کرتا ہے
اُو ٹھتا ہے درد جی میں مرے تو ٹھنڈے سانس بھرتا ہے
جب ڈھول ڈاتوں بوڑی میں ہر رگ رگ جنبش کرتی ہے
تو دیکھ کو ہمت ٹھنڈی ہوے اک اک کو ہش ہش کرتی ہے
جب کھیت کے مرڈباں پانی سے سن جیسا جیسا بھرتے ہیں
اَسماں سے تو اک اک کر کو سب تارے نہارنے اترتے ہیں
خاموش ہوے ہیں گاوں میں جب جی میں شولے بھڑکتے ہیں
تو سن کو پھرڈا پھر بوڑی میں سب مچھلیاں سارے پھڑکتے ہیں
یہ ڈھول سے پانی نچے کو جب جوش میں آکر بہتا ہے
گویا فرشتہ دونی میں ایک سو کو خراٹے لیتا ہے
میں چٹا پینے دم لیتوں جب پاواں میرے دکتے ہیں
تو میرے بلایاں لینے کو جھاڑاں کے ڈنالیاں جھکتے ہیں

رونی صورت

کُراڑی مار لیکو بلبلا رہا رونی صورت
شرم نیں ہوکو اب بھر کو پڑا رہا رونی صورت
نکو میاں آکو ہے بگی بتا دے ہاتھ اپنا
نوسگیاں کو چ کیوں ہاتاں بنا رہا رونی صورت
چلے گئے کھیت چپ کو کب کی تیر اچیڑیاں سارے
تو منج پو کھرٹے کو کیا اڑا رہا رونی صورت
ادھر جو برس رئیں سر پو تیرے حاسدے لیے حار
ادھر تو بھر کو کھا کو مسکرا رہا رونی صورت
یہ دہقانی کے باتاں نیں سمج کو لوکاں بولے
ارے ان ہمنا پڑ کو کیا سنا رہا رونی صورت

غچ چپ

کوئی چپ کے چمکاریں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے
بتبرو کنگی سے دبکاریں تمے سب کیا کی غچ چپا ہے
ارے بھولے پنے کی حد بی ہے تم جگنواں سمجیں
گھراں پچھے سے سلگاریں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے
چھرے سے گلے کٹا تو حال یہ ہد نقے سے بکریاں کا

وہ مڑ کو سنگا دکھلاریں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے
یہ سارے گوبریلے گویاں کر کر گوبر کے
تو پنج دولت کو لڑکاریں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے
جرا لکڑی لئے تو دم دبا کو نہاٹ نئیں سکتے
وہ ہو ہو کر کو ازماریں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے
پتنگ کو غوطہ دے کو کاٹ دیو لیق پتنگاں سب
ہوامیں سارے پل جاریں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے
تمارے باغ میں بڑ باغلاں آ آ کو راتاں کو
پھلاں کو سارے کھاجاریں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے
بیں دن کو دن کیا تو وہ کہنے ہے رات، دہقانی ہو
غجب سچے کو جھٹلاویں تمے سب کیا کی غچ چپ ہے

موسیٰ ندی کی کہانی

طویل نظم ہے چند بند ملاحظہ ہوں ۔

دیکھے کی نارے موسیٰ کے مستی میں کھو گئے — وہ جاتے جاتے نفتی سوبی عجت کو دھو گئے
وہ چلتے چلتے دیکھے کی بے ہوش سو گئے — گنگا، کرشنا، گوداوری ایک ہو گئے
ملنے کے مان کیا تھا آتا شان بڑ گئی
مردہ دلاں میں سمجھو اتا جان پڑ گئی
بولے اب ہمنا روکنے والا نہیں کوئی — دنیا میں آج ٹوکنے والا نہیں کوئی

جو کہوں میں جان چھوکنے والا نہیں کوئی خم اپنے اگے ٹھوکنے والا نہیں کوئی
سر کو اٹھاتے جاتے سکتے اپنے غرور سے
سب کو سناتے جاتے تھے آواج دور سے
آپس میں بولے دیکھو جی اک کام کریں گے گر ہو سکیا تو موسیٰ کو بدلام کریں گے
اس پو بی سر اٹھائے تو ہم رام کریں گے دنیا میں الو الوا نا نام کریں گے
ساری جمین پو اپنی حکومت جگائیں گے
ہوٹاں کو چھوڑو نگایاں کو پانی پلائیں گے
سینچ موسیٰ ندی بی ہشیار ہو گئی بولاں سنی تو غصے میں انگار ہو گئی
حالت کو اپنی دیکھ کو بیمار ہو گئی مجبوریاں کو دیکھ کو لاچار ہو گئی
نالے تمام جاتے تھے بہ کو الگ الگ
تھے کاٹ میں ہر ایک کی رہ کو الگ الگ
مارے شرم کے ایک کو بس آب ہو گئی دل میں درد اٹھیا تو وہ بیتاب ہو گئی
ایسی پڑی زرد کہ وہ مہتاب ہو گئی پھر سے انے تاریخ کا اک باب ہو گئی
وہ روتی رو کو انکھیاں کو پوچھتے ہوئے
اگے قدم بڑھا انے لگی سونچتے ہوئے
چغلی جو کھائے نالے سمندر دبا حکم سنتے میں کٹا ٹوالوں لگا اگے بڑھا قدم
بولا وہ سر اٹھانے کو آتی نہیں شرم کیوں بی لگاؤ تھا تو سنایا زم گرم
موسیٰ سنی تو ہور پریشان ہو گئی
قربان ہونے آئی تھی قربان ہو گئی

جب للکادیں جان بہتے رہو گی میں — طاقت جہان میں ہے تو کہتے رہو گی میں
دل ہورا ہے ہر سختی کو سہتے رہوں گی میں — ہر اک برائی سے بس بچتے رہوں گی میں

موسیٰ کے نقب سے مجھ تم انکو پکار دو
جو بوجھ میرے سر پہ ہے تم انکو اتار دو

نثر نگاری:۔ چھٹے دور میں نثر نگاری کے موضوع کو بڑی وسعت ہو چکی تھی۔ تاریخ، سوانح، سفرنامے، فلسفہ، سائنس، ناول، افسانے، مختصر افسانے، قانون، وغیرہ کی کتابیں مرتب ہو چکی تھیں۔ اس ساتویں دور میں نثر نگاری کے موضوع کو اور زیادہ وسعت ہوئی۔ نئے نئے موضوع نئے نئے رجحانات کا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ سے اردو کے خزانہ میں انمول نگینوں کا کافی مسالہ جمع ہو گیا۔ تاریخ ادب، تنقید ادب، معاشیات، جغرافیہ ڈومسٹک سائنس، سائنس کے مختلف شعبوں، کیمیا، طبعیات، ہیئت ریاضی عملی و نظری، برقیات، انجینیرنگ، طب، معدنیات، حیاتیات وغیرہ کے موضوع کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور تصانیف کی گئیں، ریسرچ کرکے انکشافات کا دروازہ کھل گیا۔ اس طرح اردو نثر کی کتابوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی۔

اس دور کے شعراء کی طرح نثر نگاروں کے بھی چار گروہ قرار دئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کے آباء اجداد صدیوں سے یہاں سکونت کرتے آئے ہیں۔ اور وہ نسلاً بعد نسلاً دکن کے ہیں۔ ایسے اہل قلم میں بعض وہ

ہیں جو چھٹے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اس دور میں ان کا انتقال ہوا۔ یا ہنوز بقید حیات
ہیں۔ مثلاً مرحومین، مولوی سید اشرف شمسی، سید جمال الدین نوری، مولانا محمد مرتضیٰ
مولوی عبدالواسع، راجیشر راؤ اصغر، مانک راؤ وٹھل راؤ وغیرہ اور جو اس وقت بقید
حیات ہیں ان میں حضرت امجد، سید شمس اللہ قادری، سید خورشید علی، ملا عبدالباسط
مولوی محمد مظہر، احمد اللہ خاں منصور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دوسرے وہ اہل قلم ہیں جو اسی زمانہ میں نثر نگاری میں مشغول ہوئے۔ ان کے
کارنامے اسی ساتویں دور کی یادگار ہیں، لیکن ان کو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں ہے
ان میں سے بھی بعض فوت ہو چکے ہیں، اور بعض مصروف عمل ہیں۔ مثلاً عبدالرحمن خاں
سید سردار علی، سراج الدین طالب مرحوم، مولوی عمر یافعی، مولوی عبدالسلام مرحوم
سید احمد اللہ قادری، سید حسام الدین، فضل الرحمن، سید بادشاہ حسین ناکارہ، عبدالغفور
عابدی، رہبر فاروقی، سید تمکین کاظمی ابراہیم جلیس وغیرہ

تیسرے وہ صاحب قلم ہیں جن کو جامعہ عثمانیہ نے پیدا کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر
زور، سید عبدالقادر سہروردی، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر ولی الدین، عبدالمجید
صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محمد غوث، سید محمد، رشید قریشی، سری کشن سہنا،
وغیرہم۔

چوتھا طبقہ ان اصحاب علم و فن کا ہے جو ولادت کے لحاظ سے تو دکن کے
نہیں ہیں مگر عنفوان شباب میں یا فارغ التحصیل ہو کر ملازمت کے سلسلہ میں دکن
آ گئے اور یہاں بس گئے۔ افسوس ہے کہ ان میں بعض قضا کر چکے ہیں۔ مثلاً مرزا
فرحت اللہ بیگ صاحب مرحوم، سید علی اصغر بلگرامی، غلام یزدانی، حسین احمد

بیگ صاحب، ہارون خاں صاحب شروانی، مولوی عبد اللہ عمادی مرحوم، محمد الیاس برنی، مولوی محمد جمیل الرحمٰن مرحوم، ڈاکٹر یوسف حسن خاں صاحب وغیرہ۔

اگر بلحاظ فن نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دینیات کے موضوع پر مولوی سید حسام الدین صاحب، شمس الدین صاحب صدیقی، عبد الغفور عابدی، عبد الغفار صاحب ابو الخیر خیر اللہ صاحب، عبد الوہاب عندلیب، ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور ڈاکٹر یوسف الدین وغیرہ نے خامہ فرسائی کی ہے، تاریخ اور سوانح عمری کے موضوع پر عبد الرحمٰن خان، غلام یزدانی، سید علی اصغر بلگرامی محمد مظہر، سراج الدین مرحوم، ڈاکٹر سید محی الدین زور، عبد المجید صدیقی، ڈاکٹر ڈاکٹر یوسف حسن خاں، ڈاکٹر محمد غوث وغیرہ نے بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا ہے تاریخ ادب اور تنقید ادب کا موضوع اس دور کا ایک جدید موضوع ہے اس پر ڈاکٹر سید محی الدین زور، عبد القادر سروری، سید محمد صاحب کے علاوہ راقم الحروف نے بہت سا مسالہ جمع کر دیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ زیر نظر کتاب "دکن میں اردو" ہی اس فن کی اولین کتاب ہے۔ اور ایک کتاب آفرین کتاب ثابت ہوئی ہے تو غلط نہیں ہو سکتا۔

فلسفہ کی جانب سر امین جنگ، ڈاکٹر ولی الدین وغیرہ نے توجہ کر کے جو ذخیرہ قلمبند کیا ہے وہ قابل ستایش قرار پاتا ہے، سائنس اور ریاضی کے متعلق ڈاکٹر رضی الدین، عبد الرحمٰن خاں، سید محمد علی خاں، ڈاکٹر سعید الدین، فیض محمد خان وغیرہ نے جو کتابیں مرتب کی ہیں وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ معاشیات کے عنوان پر مولوی الیاس برنی، محمد شرف الدین، ڈاکٹر یوسف الدین، وغیرہ کے کارنامے

اردو کی اہم کتابیں ہیں۔

ناول اور مختصر افسانوں کا بھارت اور پاکستان کی طرح دکن کے اہل قلم اصحاب نے بھی بہت سا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، مختلف النوع افسانے ان کے قلم کے رہین منت ہیں، رومانی افسانے، تاریخی افسانے، اصلاحی، سماجی، معاشرتی اور اشتراکی افسانوں کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے، افسانہ نگاری میں کئی اصحاب مصروف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔ محشر عابدی، شبیر حسین قیس، ڈاکٹر سید محی الدین زور، ابراہیم جلیس، رشید قریشی، ظفر الحسن، سری کرشن سہنا، جے شنکر راؤ مسلم ضیائی، محبوب حسین جگر، امجد یوسف زائی وغیرہ کے افسانے ہر آئینہ قابلِ قدر ہیں اس ضمن میں عبدالقادر سروری نے دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ کے عنوان پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ بھی ادب اردو میں خاص مقام رکھتی ہیں۔

مزاحیہ نگاری اور طنز نگاری میں سب سے پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مرحوم اور پھر ناکارہ کا نام خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے، ان اصحاب نے جو ادب مہیا کر دیا ہے وہ دنیائے اردو میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ڈرامہ کے متعلق ہم نے علیحدہ صراحت کر دی ہے، بہر حال شاعری کی طرح نثر نگاری کو بھی اسی دور میں خاصی ترقی ہوئی، نہ صرف جدید موضوع زیر بحث رہے بلکہ جدید رجحانات بھی پیدا ہوئے، ان پر جس کامیابی سے دکن کے مصنفین نے اپنے قلم کے نقش ثبت کئے ہیں وہ اردو زبان اور ادب میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہیں گے۔

اس موقع پر یہ بھی قابل تذکرہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے تحت جن اصحاب نے

ریسرچ کر کے مقالات مرتب کئے ہیں یعنی ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محمد غوث، ڈاکٹر یوسف الدین ان کے مقالات قابل قدر ہیں ان اصحاب نے تحقیق و انکشافات کے لحاظ سے جو کام کیا ہے وہ بلند معیار کا حامل اور اردو میں خاصی اہمیت رکھتا ہے شیخ چاند صاحب کا مقالہ جو سودا پر لکھا گیا ہے وہ شایع بھی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹریت کے علاوہ ایم۔ اے۔ ایم اید کے امتحان کے لئے جو مقالے تاریخ، فلسفہ، معاشیات، عربی، فارسی اور اردو کے قلمبند ہوئے ہیں وہ بھی اپنی معلومات آفرین اندراجات اور تحقیق کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت کم مقالے طبع ہو کر منظر عام پر آئے ہیں۔ اور ان کا زیادہ حصہ غیر مطبوعہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ جن اصحاب نے ان مقالوں کو مطالعہ کر کے تنقیدی رائے دی اور طلبہ کو کامیاب کیا گیا ہے۔ ان آراء سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ مقالے اردو میں تحقیقی لحاظ سے اہم حیثیت رکھتے ہیں۔

اس تفصیل کے بعد ہم چند نثر نگاروں کا تعارف کراتے ہیں اولاً کہن سالی اور جوان مصنفوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

فرحت اللہ بیگ مرحوم:۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مرحوم کی پیدائش دہلی میں ۱۸۸۳ء میں ہوئی، وہاں ہی تعلیم پائی بی۔ اے میں کامیابی حاصل کر کے حیدرآباد آگئے کیونکہ یہاں آپ کے خاندان کے بیسیوں افراد سرکاری ملازمت میں شامل تھے، ملازمت کے بعد مرزا صاحب دکن کے ہی ہو گئے۔ یہاں ہی مضمون نگار بنے، نقاد بنے شاعر بنے، ادیب یعنی مزاحیہ نگار بنے، غرض وہ جو کچھ تھے دکن آکر ہی بنے تھے

۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا چار گھاٹ کے پل کے قریب آپ کا مدفن ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاحیہ نگاری کے متعلق مرحوم عظمت اللہ خاں کا خیال بالکل درست تھا آپکی تحریر کو خوش مذاقی سے موسوم کرنا چاہئے جس میں قہقہے کا موقع نہیں ہوتا بلکہ تبسم کے موقع ملتے ہیں، مرزا صاحب نے علمی اور ادبی رنگ میں شوخی پیدا کی تھی۔

مرزا صاحب کو صرف مزاحیہ نگار یا طنز نگار کہنا صحیح نہ ہوگا وہ جس طرح ایک اچھے مزاحیہ نگار تھے اسی طرح بڑے نقاد بھی تھے ان کی تنقید قابل قدر اور صحیح تنقید کا نمونہ ہوتی تھی۔ اونہوں نے شعراء کے کلام پر جس طرح تنقید فرمائی ہے اور ان کے اچھے برے رنگ کو اجاگر کیا ہے وہ مرزا صاحب کا ہی حق تھا، وہ محقق تھے۔ اونہوں نے جس تحقیق اور موشگافی سے ادیبوں اور شاعروں کے کلام کی تحقیق کی ہے وہ اردو زبان میں زندگی جاوید کی مستحق ہے۔ مرزا صاحب ایک بہترین سوانح نگار بھی تھے، اونہوں نے مولانا نذیر احمد اور مولوی سلیم کی سیرت اور کردار کو جس طرح پیش کیا ہے وہ سب کے بس کی بات نہیں ہے۔

مرزا صاحب کے قلم کی بے باکی اور ذہن کی براقی اردو انشا پردازی میں اپنی نظیر آپ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ ادبی تحقیقی مضامین میں تحقیق، سوچ بچار تلاش اور جستجو کا پورا حق ادا کرتے تھے، اور یہ عجیب بات ہے۔ اگر وہ مزاحیہ نگاری میں من چلے، بے چین قلم کے بے باک تھے تو اس کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیقی مقالوں کے لئے وہ صبر اور استقلال کے ساتھ داد تحقیق دیتے تھے۔ پوری کوشش اور فکر و کاوش کو کام میں لاتے تھے۔ مرزا صاحب کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے، اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے۔ ایک تو حافظ دوسرے عالم تیسرے لسان، بھلا ان سے کون دا آسکتا تھا۔ اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے۔ خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے۔ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا۔ کہنے لگے کتنا روپیہ چاہیئے۔ میں نے کہا بارہ ہزار۔ بولے ضمانت میں نے کہا چوڑیوالوں والا مکان پوچھا کتنی مالیت کا ہے۔ میں نے کہا کوئی ساٹھ ستّر ہزار روپے کا، فرمایا کل قبالہ لیتے آنا۔ میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی۔ بڑی جلدی معاملہ نپٹ گیا، دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا کہا ٹھیک ہے۔ مگر بیٹا سود کیا دو گے، میں نے کہا مولوی صاحب آپ اور سود۔ کہنے لگے کیوں، اس میں کیا ہرج ہے۔ میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لو گے۔ اس کو خوشی سے سود دو گے، ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین دنیا دونوں میں بھلا ہو گا۔" (مولانا نذیر احمد کی کہانی)

"نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں خواص نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکال، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سوڈھ کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا، الفاظ کی نشست زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا، ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔

استادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے۔ ورنہ ساری مجلس پر ایک عالمِ بے خودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا، باصرارِ تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا، لیجئے آپ بھی پڑھئے اور زبان کے مزے لیجئے

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا"[1]

"معلوم یہ ہوتا ہے کہ آزاد مرحوم سید انشاء کو قبولیت عام اور شہرت دوام کا خلعت دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اونھوں نے آبِ حیات میں نہ صرف شیفتہ جیسے سخن فہم اور سخن سنج کی رائے سے اختلاف کیا بلکہ انشاء کے متعلق ایسے ایسے واقعات بیان کئے جن کی تائید کسی تذکرے یا کسی اور کتاب سے نہیں ہوتی۔ اس پر غضب یہ کیا ہے کہ واقعات کے بیان کرنے میں راوی کا ذکر نہیں کیا ہے اور جہاں کیا ہے وہاں غلطی کھائی ہے۔ مثلاً جہاں انشاء کی زندگی کے چار دور دکھائے ہیں وہاں سعادت یار خاں رنگین کا حوالہ دیا ہے لیکن ان میں سے ایک واقعہ کا بھی ذکر رنگین کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو مجالس رنگین میں ہوتا مگر وہ سنہ ۱۲۱۵ھ کی تصنیف ہے اور اس زمانہ میں انشاء اور رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے درباریوں میں تھے۔ اس لئے اس کمزوری کو آزاد مرحوم نے "رنگین کہا کرتے تھے" کے پردے سے ڈھانکا ہے"[2]

---

[1] سنہ ۱۲۶۱ میں دہلی کا مشاعرہ [2] انشاء صفحہ ۵۷

مولوی مسعود علی محوی:- مسعود علی خاں کے بزرگوں کا وطن فتح پور ضلع بارہ بنکی ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۶ء میں دہلی میں ہوئی، علی گڈھ سے بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آکر ہوم سیکرٹری میں مترجم بنے۔ پھر ترقی کرتے ہوئے ناظم صدر عدالت تک پہنچکر وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد پھر جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں مامور ہوئے مسعود علی صاحب کو تصنیف وتالیف سے دلچسپی رہی چنانچہ کئی ایک کتابیں آپ کی شائع ہوئی تھیں مگر ایسی اور کتابیں بھی ہیں جن کی اشاعت نہیں ہوئی ہے آپ کی بعض کتابیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) کوکبہ حمیدی (۲) وکالت (۳) مشیرالوکلاء (۴) دستورالعمل کوتوالی (۵) حالات اقوام جرائم پیشہ (۶) اصول واقعات متعلقہ (۷) شعرائے دربار سلطان محمود (۸) اربعہ عناصر رباعی (۹) مخدوم زادگان فتح پور (۱۰) مجموعہ نظم فارسی۔

ان کے علاوہ دارالترجمہ میں جو قانون وغیرہ کی کتابیں آپ نے ترجمہ فرمائی ہیں وہ بھی کافی تعداد میں ہیں۔

مولوی مسعود علی صاحب کو شاعری سے بھی دلچسپی رہی زیادہ تر فارسی سے دلچسپی رہی ہے۔ محوی آپ کا تخلص ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے خاص روابط تھے۔ مہاراجہ کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے اور فارسی کلام سناتے تھے۔

عبدالرحمٰن خاں صاحب:- خان صاحب کے اجداد مدراس سے

حیدر آباد آئے تھے۔ آپ کی پیدائش حیدر آباد میں ۱۲۹۷ھ ۱۸۹۰ء میں ہوئی، خاندانی اصحاب اور خود آپ کے والد اہل سیف تھے آپ نے قلم ہاتھ میں لیا۔ نظام کالج سے جبکہ اس کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا بی۔ اے میں کامیابی حاصل کر کے ملازم ہو گئے۔ مگر پھر تعلیمی شوق کے مدنظر یورپ گئے اور لنڈن یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر نظام کالج میں لکچرار طبعیات بنے پھر پروفیسر طبعیات پر آپ کو ترقی ملی۔ آپ پہلے مسلمان تھے جو طبیعیات کے پروفیسر بنے تھے۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ کی صدارت پر آپ کا تقرر ہوا۔ جس وقت خان صاحب کا تقرر اس خدمت پر ہوا جامعہ کی حالت ابتدائی تھی آپ کی کوشش جدوجہد سے جامعہ کو ترقی ہوئی اور اس کے سپوت یورپ کو روانہ کئے جانے لگے اور واپسی کے بعد ان کو یونیورسٹی میں مددگار پروفیسر اور پروفیسر کی جگہ دی جانے لگی۔ جامعہ کے ہر شعبہ میں اصلاح ہوئی اور ترقی کے زینے طے ہونے لگے ——— ۱۹۳۶ء میں خدمت سے سبکدوشی حاصل کی بعض اصحاب کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔ خان صاحب ہمیشہ سے علم آشنا، علم پرور اور علماء دوست رہے۔

اگرچہ جامعہ عثمانیہ کے قیام میں حیدری صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کو یورپ روانہ کرنے اور ان کو خدمتیں دلانے اور جامعہ کے بعض دوسرے امور میں خاں صاحب کو حیدری صاحب سے مدد نہیں ملی بلکہ قدم قدم پر ٹکر لینی پڑی بالآخر اسی مخالفت کی وجہ سے خاں صاحب کو خدمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ یہ واقعہ ہے جامعہ عثمانیہ کے استحکام

ہیں عبدالرحمٰن خاں صاحب نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں اوران کا دور صدارت تاریخ جامعہ کا ایک شاندار باب رہے گا۔

خاں صاحب کو علم سے جو دلچسپی رہی اس کے مد نظر اونہوں نے بیسیوں مقالے انگریزی اور اردو میں قلمبند کئے، جامعہ کے لئے سائنس کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ان کے مضامین اپنی تحقیقات کی رفعت اور انکشافات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں جن کا اعتراف یورپ اور امریکہ کے سائنس دانوں نے کیا ہے۔ سائنس کی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ طبیعیات، فلکیات آپ کے اہم مضمون رہے ہیں اس کے ساتھ تاریخ سے بھی دلچسپی رہی۔ اب تو فارسی اور اردو میں شاعری بھی کرتے ہیں۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت برسوں سے آپ سے متعلق ہے حیدرآباد اکیڈیمی کی صدارت بھی آپ فرماتے ہیں، علمی انجمنوں میں آپ کا عملی حصّہ ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اردو کے محسنوں میں آپ کا شمار کرنا بالکل بجا اور درست ہے۔ آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"سیارگان نظام شمسی کا جب ہم غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عموماً اسی سمت میں اپنے محوروں اور مداروں میں حرکت کرتے ہیں جس سمت میں آفتاب اپنے محور پر گھومتا ہے۔ تقریباً سیارے (باستثناء بعض نجمیہ سیاروں کے) طریق الشمس کے مستوی یا اس کے ساتھ چھوٹے زاویوں پر مائل مستویوں میں حرکت کرتے ہیں۔ اکثر ذوذنب یعنی

ومدار تارے بھی اسی طرح حرکت کرتے ہیں۔ پلوٹو کا مدار البتہ طریق الشمس سے ۱۷ درجہ پر مائل ہے لیکن ہمارے چاند کا مدار صرف ۵ درجہ مائل ہے۔" (سیاروں پر زندگی کے امکانات[1])

"جملہ مستقل عناصر کی تعداد اس وقت ۹۲ ہے ممکن ہے کہ کائنات کے ابتدائی زمانہ میں اس سے زائد ہو۔ ان کے کمیتی اعداد ایک سے لیکر ۲۳۸ تک ہیں، مرکزہ کی کمیت ہمیشہ ایک آساسی اکائی کی تقریباً صحیح عددی ضعف ہوتی ہے۔ یہ اکائی ہیڈروجن کے مرکزہ یعنی پروٹون کی کمیت کے قریب قریب مساوی ہے۔ اس صحیح عدد کو کمیتی عدد کہتے ہیں۔ اور وہ باستثناء ہیڈروجن اور ایک شاذ و نادر ہمجائے ہیلیم (کمیتی عدد ۳) کے ہمیشہ جوہری عدد کا کم از کم دو چند ہوتا ہے چونکہ پروٹون کی کمیت ایلکٹرون کی کمیت کا ۱۸۴۰ گنا ہوتی ہے اس لئے جوہر کی کمیت تقریباً تمام کی تمام اس کے مرکزہ ہی پر مجتمع ہے۔"[2]

سید علی اصغر صاحب بلگرامی:۔ نواب عماد الملک کے حیدر آباد آنے کے بعد جن بلگرامی خاندانوں نے حیدر آباد کو وطن بنالیا ان میں سے ایک سید علی اصغر صاحب کا خاندان ہے آپ کی پیدائش حیدر آباد میں ۱۳۰۰ف میں ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا شوق ہے کئی کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ مختلف رسالوں میں آپ کے بلند پایہ مضامین شائع ہوئے اور پسند کئے گئے ہیں۔ حیدر آباد کے آثار قدیمہ پر آپ کی ایک کتاب "ماثر دکن" شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ فلسفہ ازدواج دوسری

---

[1]، [2] مجموعہ مقالات علمیہ نمبر ۵ و نمبر ۹ ۱۹۴۳ء و ۱۹۴۷ء

کتاب ہے ان کے علاوہ اور تصانیف بھی ہیں ادب اور تاریخ سے آپ کو دلچسپی رہی ہے۔ صوبہ داری کی خدمت سے آپ نے وظیفہ حاصل کیا ہے۔ نمونہ نثر حسب ذیل ہے:۔

"جب سے کہ دنیا پر تمدن جلوہ ریز ہوا ہے یہ تلقین تقریباً سارے مذاہب عالم کے واعظوں اور مقرروں کے افکار و خطب میں قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ زندگانی دنیا چند روزہ ہے۔ "مکن تکیہ بر عمر ناپائدار" دنیا گزر رہی ہے اور اپنے گزرنے کا ببانگ دہل اعلان کر رہی ہے۔ اس دنیا کا سایہ زوال پذیر ہے اس کا حال انتقال و زوال ہے۔ دنیا کے عیش مکدر ہیں۔ اس کی شیرینیاں ناگوار۔ اس کی حلاوتیں تلخ اس کے اسباب مٹنے والے اور اس کی زندگی کا انجام موت ہے۔ باوجود اس کے وہ آرائشیں جو دل کو لبھا لیتی ہیں ہم ان پر مفتوں ہیں ہماری نگاہیں اس کی زینتوں میں الجھی ہوئی ہیں[1]"

ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب:۔ آپ کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں دہلی میں ہوئی جو آپ کے اجداد کا وطن ہے۔
مشرقی اور مغربی علوم میں فارغ التحصیل ہو کر پنجاب گورنمنٹ میں تحصیلدار بنے پھر مشرقی بنگال میں پروفیسر عربی اور فارسی کی خدمت پر منتقل ہوئے۔ اسی خدمت سے ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد کی ملازمت میں منسلک ہوئے۔ آثار قدیمہ کی نظامت پر آپ کا تقرر ہوا۔ اسی وقت سے آپ حیدرآباد کو وطن بنا کر مقیم ہو گئے۔ برطانوی ہند میں آپ نے کتبات کے متعلق بہت کچھ کام انجام دیا ہے۔ اسلامی

---

[1] روح ترقی جمادی الاول ۱۳۶۹ھ

آثار قدیمہ کے دیکھنے کے لئے آپ کو حکومت آصفیہ نے روانہ فرمایا تھا دو سال تک آپ نے سیاحت کی۔ اور کثیر معلومات جمع کیں۔ غلام یزدانی صاحب کو عربی فارسی، انگریزی کے ساتھ اردو سے بھی دلچسپی ہے۔ تاریخ اور ادب آپ کے خاص مضمون ہیں۔ انگریزی اور اردو میں آپ کی کئی تصانیف طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

آپ نے جو اردو مقالے مختلف عنوان پر لکھے ہیں وہ معلومات آفرین اور دلچسپ ہیں۔ تحقیقات اور انکشافات سے آپ کو بڑی دلچسپی رہی ہے۔ آپ کا اسلوب بیان صاف، سادہ اور دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی معلومات کے ماخذوں کو نہایت دیانت کے ساتھ واضح طور پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ خصوصیت بعض اردو کے نامور محققین میں نہیں پائی جاتی، رسالہ اردو، ہمایوں، ساقی وغیرہ میں آپ کے مضامین شایع ہوتے ہیں۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"اجنتا کی تصاویر کی ممتاز خصوصیات ان کی مسرت آمیز روحانیت ہے یا وہ انسانی امنگیں ہیں جو ہر کہ و مہ کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسی صفات ہیں جو ہر خیال اور ہر طبقہ کے آدمی کو اپنی طرف کھینچ کر محویت اور بے خودی پیدا کر دیتی ہیں۔ اور یہی فنون لطیفہ کی اصلی غرض ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے ان تصاویر کا مقابلہ پومپیائی کی تصاویر سے کیا جا سکتا ہے۔ رومانوی زندگی میں تزک و شان کے ساتھ جبروتیت ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔ اور چونکہ یہ جبروتیت اکثر اوقات بہیمیت تک پہنچ جاتی ہے اس لئے اس کا اثر پومپیائی کی تصاویر میں صاف نظر آتا ہے

مغربی مبصران کی تعریف میں خواہ کیسے ہی رطب اللسان ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان مرقعوں میں فن کا احساس ہی جذبات کے تحت کیا گیا ہے۔ اور پاکیزگی یا روحانیت بالکل مفقود ہے۔ جو اجنتا کی تصاویر کی خاص شان ہے[۱]"۔

"ذہنی تربیت اور شاعرانہ قابلیت کو پروان چڑھانے میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور بعض فاضل عہدہ داران کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ ان بزرگوں میں مولوی علی حیدر طباطبائی۔ مولوی وحید الدین سلیم اور مولانا ڈاکٹر عبدالحق خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان ماہرین کی صحیح تنقید نے نوعمر شعرا کو پرانی طرز کی بھول بھلیوں اور منزل سے ہٹی ہوئی پیچیدار راہوں سے بچالیا اور ایسے روشن اور واضح طریقے بتائے جس سے وہ شاعری کے اصل مقصد تک آسانی سے پہنچ جائیں[۲]"۔

محمد مظہر:- مولوی محمد مظہر صاحب اگرچہ گزشتہ دور کے لکھنے والے ہیں مگر اس دور میں اونہوں نے اردو کی خدمت زیادہ سے زیادہ انجام دی۔ ان کے بھائی مولوی محمد مرتضیٰ صاحب کا تذکرہ گزشتہ دور میں ہوچکا ہے محمد مظہر صاحب کی ولادت ۱۳۰۷ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی سے کامیابی حاصل کی۔ روزنانہ اخباروں اور ماہوار رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ "قلمرو آصفی کی دولت" آپ کی تصنیف مرحوم حضور آصف جاہ سادس کے جوبلی کے زمانہ میں مرتب ہوئی اور اس دور میں شائع ہوئی ان کی دوسری قابل قدر کتاب "تذکرہ باب حکومت" ہے۔ اخبار صحیفہ روزانہ میں ان کے قابل قدر مضمون شائع ہوتے رہے۔ اور اس کی ادارت کے

---

[۱] اجنتا کی نقاشی صفحہ ۲ [۲] حیدرآباد کے چند شعرا ساقی ۱۹۴۵ء

فرائض بھی آپ سے متعلق رہے۔ رسالہ "روح ترقی" شائع کرتے رہے سرکار عالی کی ملازمت میں شامل رہنے کے باوجود انہوں نے جو کچھ علمی خدمت کی وہ قابل قدر ہے۔ ان کا اسلوب بیان سادہ اور صاف ہے۔ تحریر میں دلچسپی پائی جاتی ہے۔ تاریخ، مذہب، معاشرت، سیاست، تعلیم اور صنعت و حرفت وغیرہ آپ کے دلچسپ اور پسندیدہ موضوع رہے۔ اعداد و شمار سے بحث کرنا گذشتہ تاریخ کو پیش کر کے آئندہ کے لئے سبق دینا آپ کا معمول رہا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی معتمدی کے فرائض بھی کئی سال سے انجام دے رہے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب کی معتمدی کے زمانہ میں جو نقصان عظیم کانفرنس کے فنڈ کو برداشت کرنا پڑا اس کی تلافی مختلف ذرائع سے آپ نے کی اور ایک معتد بہ رقم فراہم کر لی تاکہ غریب طلبہ کو وظائف دئے جائیں۔ آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

" مہاراجہ چندولال کی سبکدوشی کے بعد حضرت آصف جاہ رابع ناصر الدولہ غفران منزل نے معتد بہ عرصہ تک مدار المہامی پر کسی کو مامور نہ فرمایا تھا۔ اور خود پیش گاہ جلالت مآب ہی سے اس کی ذمہ داریاں وابستہ رہی تھیں۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ مغلیہ سلطنت کی اصطلاح دیوان عام اور دیوان خاص سے وہ مقام مراد ہے جہاں اقتدار اعلیٰ کے فرائض و احکام سر انجام پاتے تھے۔ اور جہاں وزراء، سپہ سالار اور ذمہ دار افراد حکومت، علماء و صلحاء اہل غرض، غرض گزار مستغیث جمع ہو کر عرض معروض کرتے تھے۔ لفظ دیوان خانہ بھی ناظم صوبہ یا وسیرائے سے متعلق اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔"[1]

---

[1] تذکرہ باب حکومت صفحہ ۲۱

"حقیقت یہ ہے کہ ہندو پاکستان کے تمام مروجہ السنہ میں بلکہ مشرق کے السنہ میں عربی کے پہلو بہ پہلو اردو ہی ہے جو گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی ہے۔ سرکاری مراسلت، تجارتی کاروبار اردو کے ذریعہ انجام پاتے رہے اور پا سکتے ہیں، قانون، فلسفہ، سائنس، ادب، تاریخ، شاعری اور مذہب اسلام و ہندو مت کے متعلق جو علمی خزائن اردو میں موجود ہیں وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ گزشتہ تیس سال میں جامعہ عثمانیہ نے جو کچھ بھی کام کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ کشمیر سے لیکر راس کماری تک جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے انگریزی زبان کو مزید پندرہ سال تک گوارا کرنا اور اس کے ساتھ ہندی کو بھی سرکاری زبان قرار دینا دوگونہ مشکلات کا باعث ہے۔[1]

سراج الدین:۔ مولوی سراج الدین صاحب مرحوم بھی اسی دور کے ایک مورخ اور انشا پرداز تھے، حیدرآباد ان کے آباو اجداد کا وطن تھا۔ حیدرآباد میں ان کی ولادت ہوئی۔ تعلیم زیادہ تر مشرقی ہوئی۔ انگریزی بھی پڑھی تھی مگر کسی جامعہ کی ڈگری حاصل نہیں کی۔ ابتداءً سررشتہ مالگذاری میں گزینڈ خدمت پر مامور ہوئے۔ پھر تخفیف میں آکر ملازمت کے لئے سرگرداں رہے۔ آخر دفتر دیوان و مال میں ملازم ہوئے۔ اور زمانہ ملازمت ہی میں بہ مرض دق انتقال فرمایا۔

مرحوم کو فن تاریخ اور خصوصاً حیدرآباد کی آصفیہ تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔

---

[1] رسالہ روح ترقی صفحہ (۲) ربیع الاول ۱۳۶۹ھ

اس موضوع میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں نظام علی خاں، حصہ اول اور دوم۔ میر عالم اور "شیر جنگ" مشہور کتابیں ہیں، شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ طالب تخلص تھا۔ ان کی اردو نثر صاف اور سادہ ہوتی ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"سب سے پہلے ہم شاہنواز خاں کا ذکر کرتے ہیں کہ پہلے انہیں کا منصوبہ بر سر کار آیا ہے۔ وہ فرانسیسیوں کی مخالفت کی بناء پر یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ اونہوں نے دیوان ہوتے ہی اپنی تمام تر توجہ اسی طرف منعطف کر دی، لیکن جب یہ دیکھا کہ صلابت جنگ خود یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ انہیں (فرانسیسیوں) کی بدولت سلطنت پر جلوہ فرما ہیں تو پھر ممکن نہ تھا کہ ان کے پاس فرانسیسیوں کے خلاف کوئی چال چل سکتے۔ چنانچہ شاہ نواز خاں کے پیشتر لشکر خاں بھی بہ حیثیت مدار المہام فرانسیسیوں کے خلاف کوشش کی تھی"[1]

یافعی صاحب:۔ اس دور کے ایک نثر نگار ابو محمد عمر یافعی صاحب ہیں۔ آپ کی ولادت حیدر آباد میں ۱۳۱۴ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دار العلوم میں تعلیم پائی۔ اور حضرت کیفی سے فارسی کی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی، حیدر آباد میں آپ کا ذاتی کتب خانہ مشہور ہے۔ جس سے شائقین استفادہ کرتے ہیں۔ اس کتب خانہ میں قلمی کتابوں کا خاصا ذخیرہ ہے۔ مطبوعہ کتابیں بھی کمیاب اور نایاب محفوظ ہیں۔ یافعی صاحب بہت کم لکھا کرتے ہیں مگر جو لکھتے ہیں وہ پوری تحقیق اور جانچ کے بعد لکھا کرتے ہیں۔ آپ کے تاریخی اور تحقیقی مضمون قابل قدر ہوتے ہیں۔ طرز بیان صاف، سادہ اور عام

---

[1] نظام علی خان حصہ اول صفحہ ۳۶

فہم ہوتا ہے، اردو کے معیاری رسالوں اردو، معارف تحفہ، مکتبہ، ہندوستانی ادب وغیرہ میں آپ کے تحقیقی اور انکشافی مضمون شائع ہوئے ہیں۔

انجمن ارباب اردو کے آپ روح رواں تھے، آپ کی وسیع معلومات سے جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اور دوسرے شائقین استفادہ کرتے رہتے ہیں، اگر آپ کو معلومات تاریخی اور ادبی، کا گنجینہ کہا جائے تو موزوں ہو سکتا ہے اگرچہ اب تک یافعی کی کوئی مستقل کتاب شائع نہیں ہوئی ہے، مگر جو مفید اور تحقیقی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان کا مجموعہ کافی ضخیم ہو سکتا ہے۔

عمر یافعی صاحب کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ لوگ صاحب آب حیات ہی کی تحقیق نظم و نثر اردو پر سر دھنتے تھے، شمس العلماء محمد حسین آزاد نے ولی (وفات ۱۱۰۱ھ) کو نظم اردو کا باوا آدم بنا دیا۔ اور نثر اردو کی ابتدا کا سہرا مولانا فضلی کی وہ مجلس (۱۱۴۵ھ) کے سر باندھا ہے۔ آزاد کے قلم جادو رقم کے لوگ مدت تک مسحور رہے، صاحب آب حیات نے دلی اورنگ آبادی (ولی اللہ، شمس ولی اللہ، محمد ولی) کو باوا آدم تو بنا دیا اور اس کے معاصر ولی دکنی کو (محمد فیاض) جس کی روضۃ الشہدا ۱۱۱۹ھ میں تصنیف ہوئی ظلمت میں چھوڑ دیا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اردو کی تحقیقات کے دریا بہا دئے۔ بہی خواہان اردو سات پتال کا تھل بیڑا لانے لگے لوگوں سے اخفائے فادر کا مرض کم ہوتا چلا۔ نثر اردو کے متعلق اب تک جتنی تحقیقات ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخ عین الدین گنج العلم (۷۰۶ھ تا ۷۹۵ھ) نے چھوٹے چھوٹے

کئی رسالے دکنی زبان میں تصنیف فرمائے"۔ [۱]

حیدرآباد کے مشہور قابل قدر مصنف
سید محی الدین قادری زور :- اور جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر سپوت

ڈاکٹر زور کا خاندان اس وقت دکن آیا تھا جبکہ محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا تھا۔ قندھار میں ان کے اجداد مقیم ہوئے، اور علم و فن کی خدمت کے ساتھ ارشاد اور ہدایت میں مشغول رہے، ڈاکٹر زور کی پیدائش ۱۳۲۳ھ میں ہوئی دارالعلوم اور جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہو کر لندن گئے اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور فرانس میں بھی لسانیات پر ریسرچ کیا۔ واپسی پر جامعہ عثمانیہ میں مامور ہوئے، پروفیسر اردو کی خدمت انجام دی اور اب چادرگھاٹ کالج کے صدر ہیں۔ موت 25 ستمبر 1962ء

ڈاکٹر زور کو تصنیف اور تالیف سے خاص دلچسپی ہے، تاریخ، ادب، تنقید، ان کے خاص موضوع ہیں، اب تک دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع کر دی ہیں، ادارہ ادبیات اردو آپ نے قائم فرمایا ہے جس کے ذریعہ اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ڈاکٹر زور کی کتابوں میں اردو شہ پارے، روح تنقید، سلطان محمد قلی قطب شاہ، اردو اسالیب بیان، میر محمد مومن، تذکرہ اردو مخطوطات" وغیرہ بڑے معرکہ کی کتابیں ہیں،

عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

"سلاطین قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ ہے جس کا

---

[۱] رسالہ مجلہ مکتبہ نمبر (۱) نمبر (۱) اپریل ۱۹۲۸ء

زمانہ زیادہ سے زیادہ امن واماں اور راحت و آرام سے گزرا اور جس نے اپنی تمام زندگی عیش و عشرت اور بہجت و کامرانی میں گذار دی مغل مؤرخوں نے قطب شاہیوں کے آخری یادگار ابوالحسن تاناشاہ کو بدنام کرنے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تاناشاہ کو بڑا عیاش اور رند بدمست مشہور کر رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد قلی کو عیاشی کے جو موقع حاصل ہوئے تاناشاہ کو ان کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔

محمد قلی نے بچپن سے محل کے ناز و نعم میں پرورش پائی اور اگر وہ بھاگ متی والا قصہ صحیح ہے جس کی رو سے بھاگ متی کی خاطر اس نے زبردست طغیانی کے باوجود رود موسی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور بعد کو اس جرأت کی پاداش میں محل سرا میں نظر بند کر دیا گیا اور وہاں ملک ملک کی حسین دوشیزاؤں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور رقاصہ چھلم کا خیال اس کے دل سے دور کر دیں تو ظاہر ہے کہ عنفوان شباب کے ساتھ ہی وہ مہ جبینوں کے ماحول میں رہنے لگا جن میں سے ہر ایک اس پر جان و دل فدا کرنے کو تیار تھی"[1]

"پھول بن بلا شبہ ان چند نظموں میں سے ہے جو حقیقی معنوں میں سخت کد و کاوش کا نتیجہ ہیں اس کے مصنف کا اصل مقصد ایک خاص ادبی اور دلچسپ کتاب تحریر کرنا تھا، نہ کہ فارسی قصے کا خشک اور لفظی ترجمہ کرنا جیسا کہ اس نے خاتمہ پر بتایا ہے۔ اس امر کی کوشش کی ہے کہ علم معانی کے اصول و قواعد کے موافق انتالیس قسم کی مصنوعی خوبیاں پیدا کرے اس پر بھی یہ نظم اس قسم کی محض مشق نہیں رہی،

---

[1] سلطان محمد قلی قطب شاہ صفحہ ۵۸، ۵۹

زبان وطرز بیان کے لحاظ سے یہ دکھنی کی بہترین مثنویوں میں سے ہے۔ اس کی بحر بھی خاصی اور دلکش ہے۔ مصنف اپنی طبیعت کی اپج اور اصلی جوش کو قدم قدم پر ظاہر کرنے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ تقاریب اور شادی کی رسومات کے جو بیانات اس میں پیش کیے گئے ہیں بالکل نیچرل اور حیات انسان کے بالکل مطابق ہیں، وہ سلطنت قطب شاہیہ کی معاشرت اور رسم و رواج کی اعلیٰ تصویریں ہیں۔[1]

" جس طرح ادیبوں کی تصنیفات کے معائب و محاسن کا محاسبہ ارتقائے ادب کا زبردست حامی ہے تنقید نگاروں کے کارناموں کی تنقیح کرنی ادبی مذاق کی درستی کے لئے ضروری ہے، کیونکہ جس طرح ادیبوں کو آزاد چھوڑ دینا قوم کے لئے خطرناک ہے تنقید نگاروں کو بے لگام کر دینا بھی ادب کے لئے مہلک ہے لیکن موخر الذکر کام کا سرانجام دینا پہلے کام سے بہت زیادہ دشوار ہے۔"[2]

سید عبدالقادر سروری:۔ سروری صاحب بھی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن کو تصوّف سے دلچسپی تھی اور صاحب باطن تھے، حیدرآباد آپ کا وطن ہے ۱۳۲۱ھ کو آپ کی ولادت ہوئی، مختلف مدارس میں آپ کی تعلیم ہوئی اور بالآخر جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے۔ایل۔بی کی ڈگری ایک ساتھ امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ اور جامعہ کو اپنے قابل سپوت کو اپنے دامن سے جدا کرنا پسند نہ آیا، مددگار پروفیسر اردو کی خدمت پر مامور ہوئے، چند سال کے بعد میسور یونیورسٹی نے آپ کو پروفیسر اردو کی حیثیت سے طلب کر لیا، مگر پھر جامعہ عثمانیہ میں واپس ہو گئے اور اب پروفیسر

---

[1] اردو شہ پارے صفحہ (۱۰۸) [2] روح تنقید صفحہ ۱۲۹

اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

سروری صاحب کو کم سنی سے مضامین نگاری سے دلچسپی رہی، اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے رہے، فارغ التحصیل ہونے پر تصنیف و تالیف سے زیادہ دلچسپی ہوگئی، تاریخ ادب، تنقید، افسانہ نگاری وغیرہ آپ کے خاص موضوع ہیں، آپ کی تصانیف کے منجملہ چند یہ ہیں۔

جدید اردو[1] شاعری (اس کے کئی اڈیشن شائع ہوئے ہیں بعض جامعات کے نصابوں میں شریک ہے) دنیائے[2] افسانہ، کردار[3] افسانہ، حیدر[4] آباد کی پچیس سالہ تعلیمی ترقی، اردو[5] مثنویات، حضرت سراج[6] اور ان کی شاعری جامعہ عثمانیہ کے اردو[7] مخطوطات، اس کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں، مضامین کی تعداد بھی کثیر ہے۔

سروری صاحب کا اسلوب بیان بھی سادہ ہے اس میں ندرت ہے۔ مضامین میں عمق اور گہرائی ساتھ دلچسپی اور اثر پایا جاتا ہے۔ نمونہ پیش ہے:۔

"اردو شاعری نے اپنی پیدائش سے لے کر اب تک کئی لباس بدلے۔ نہایت سرسری اور وسیع مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کم سے کم تین رجحان اس نے زبردست ظاہر کئے، سب سے پہلے اپنی پیدائش میں یہ زیادہ تر ہندی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہندی سرزمین اور ہندی معاشرہ کے آب و گل سے اس کا خمیر ہوا ہے، بعد میں حاکم مغلوں کی زبان یعنی فارسی سے یہ اس قدر متاثر ہوئی کہ ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے یہ فارسی شاعری کا مثنیٰ معلوم ہونے لگی، پھر جب انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر ہوا تو مغربی شاعری کی طرف یہ زیادہ سے زیادہ مائل ہونے لگی، گویا اردو شاعری کے بھی وہی تین دور ہیں جو خود ہندوستان

کی تاریخ کے سمجھے جاتے ہیں۔

اردو شاعری پر موجودہ انقلاب آنے سے پہلے اس کی جو حالت تھی اس پر ہم یہاں تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اس باب کا مطالعہ موجودہ دور میں اردو شاعری کی اصولی تبدیلی کی ضرورت قارئین کرام پر اچھی طرح کر دے گا اور اس سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوگا کہ ہم انقلاب سے قبل کی شاعری کا موازنہ جدید شاعری کے ساتھ بآسانی کر سکیں گے"۔[1]

ڈاکٹر رضی الدین:۔ رضی الدین صاحب کا خاندان حیدرآباد کے قدیم صدیقی خاندانوں میں سے ایک ہے۔

سنہ میں رضی الدین صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم ہوئی۔منشی اور عثمانیہ میٹرک کا امتحان ایک ساتھ دے کر درجۂ اوّل میں کامیابی حاصل کی پھر جامعہ عثمانیہ کے امتحانوں میں فسٹ آتے رہے، سرکاری وظیفہ پر انگلینڈ گئے، اور کیمبرج سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر رضی الدین فن ریاضی میں جس طرح مہارت تامہ رکھتے ہیں وہ پوشیدہ نہیں ہے، اس کے ساتھ ہی ان کو ادبیات سے بہت دلچسپی ہے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے ادب پر عبور ہے، اقبال کا مطالعہ خصوصیت سے کیا ہے۔اسی طرح وہ امجد کی شاعری سے شغف رکھتے ہیں۔

کئی ایک کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔اور کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے ادبی مقالے بھی بلند پایہ ہوتے ہیں، ان سے ان کی قابلیت اور

---

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۶۴

غور و فکر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے،

"نظریہ اضافیت اور کوانٹم نظریہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی ہر شے میں دوئی پائی جاتی ہے، ایک ہی شئی کبھی ذرہ کے خواص کا اظہار کرتی ہے اور کبھی موج کے خواص کا۔ مادہ اور توانائی میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے۔
اس جدید انکشاف نے مادیت کا خاتمہ کر دیا ہے مادہ پرستوں اور دہریوں کا خدا کی ہستی کے خلاف یہ استدلال تھا۔ کہ ایک غیر مادی خالق مادی اشیاء کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ مادہ اور توانائی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے اللہ نور السمٰوٰت والارض یعنی خدا آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ نظریہ اضافیت کے اس فلسفیانہ پہلو کی قدر و قیمت اقبال خوب جانتے تھے۔ چنانچہ وہ خطبات صفحہ ۵۲ میں فرماتے ہیں" اس طرح ہمیں معلوم ہو گیا کہ قدیم طبعیات کی مادیت کا سرے سے وجود نہیں"۔ نظریہ اضافیت نیچر کی واقعیت کو معدوم نہیں کرتا بلکہ مادہ کے متعلق اس تصوّر کا خاتمہ کرتا ہے۔ کہ مادہ نیچر میں خود بخود پھیلا پڑا ہے۔ اسی تصور نے قدیم طبیعات کو مادیت کے غار میں دھکیلا تھا۔ جدید اضافیتی طبیعات میں مادہ کوئی پائدار شئے نہیں ہے جس کی خاصیتیں بدلتی جائیں بلکہ یہ محض ایک باہمی تعلق رکھنے والے واقعات کے نظام کا نام ہے"۔[1]

"ہر فرد کی زندگی کے دو بڑے پہلو ہوتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی پھر انفرادی زندگی بھی تین ذیلی شعبوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ یعنی جسمانی، ذہنی

---

[1] اقبال کا تصوّر زمان و مکان صفحہ ۵۵، ۵۶

اور روحانی زندگی کے ان مختلف پہلوؤں کے نشوونما اور ترقی میں مدد دے
اور کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرے، اس لئے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و
تربیت میں ورزش اور کھیل کود کے ساتھ عقلی اور ذہنی علوم اور مذہب و دینیات
کی تعلیم کا صحیح تناسب میں انتظام ہونا چاہیئے تاکہ انفرادی زندگی کے تینوں
پہلو ایک ساتھ نشوونما پائیں اگر کسی فرد کی زندگی میں ایک پہلو بھی حد سے زیادہ
کمزور رہ جائے تو اس کی زندگی مکمل اور خوش گوار نہیں کہلائی جاسکتی۔
اس لئے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے ان مختلف شعبوں میں سے ہر شعبہ
کی اس حد تک تربیت حاصل کرے کہ وہ شعبہ نشوونما کے ایک قلیل ترین
(minimum) معیاری درجہ تک پہنچ جائے اور آئندہ زندگی میں
مفید ہو سکے" [1]

ڈاکٹر حمید اللہ:- ڈاکٹر حمید اللہ صاحب راقم الحروف کے خاندان سے
تعلق رکھتے ہیں ۱۳۲۶ھ میں ان کی پیدائش ہوئی، مدرسہ
دارالعلوم سے میٹرک میں کامیابی حاصل کر کے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات
میں شرکت کی اور ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی کی کامیابی کے بعد یورپ گئے۔
جرمنی کی بون یونیورسٹی سے صرف دس ماہ کے عرصہ میں ڈی فل کی ڈگری حاصل
کرنے کے بعد فرانس گئے اور ایک سال کے عرصہ میں ڈی لیٹ کی ڈگری
حاصل کی۔ دو سال کے اندر انہوں نے جرمنی اور فرنچ زبانوں پر عبور حاصل
کیا۔ آنحضرت صلعم کی سیرت مقدس اور آپ کے غزوات کے متعلق انہوں نے

[1] تعلیم کا مسئلہ صفحہ ۹

بڑا ریسرچ کیا ہے، اور اس ریسرچ کے متعلق کئی تصانیف کرنے کے علاوہ جامعہ فرانس کے تحت لکچر بھی دیئے ہیں، قانون بین الاقوام کے ماہر ہونے کے لحاظ سے آپ کی بڑی شہرت ہے، انگریزی، فرنچ، جرمنی، اطالینی زبانوں کے علاوہ عربی فارسی، ترکی اور اردو زبان کے ماہر ہیں، عربی، اردو، انگریزی، فرنچ اور جرمنی زبانوں میں مقالات قلمبند کرنے کے علاوہ تصانیف بھی کی ہیں، ان کی فہرست خاصی طویل ہے، اردو تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آبادی کے متعلق قرآن کا مواد (۲) روس اور اسلامی ادارہ غلامی (۳) رسول کریم کی سیرت کا کیوں مطالعہ کیا جائے۔ (۴) قانون بین الممالک کے اصول (۵) اسلامی قانون بین الممالک (۶) آنحضرت کے میدان جنگ (۷) عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔

"اسلام کا اصل اصول یہ ہے کہ فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة (یعنی دنیا میں بھی اچھے رہیں اور آخرت میں بھی) اولاً ہم یہ دیکھیں گے کہ دنیاوی معاملات میں آنحضرت کی سیرت اور طرز تعلیم میں ہمارے لئے کیا سبق ہیں؟

دنیا میں ایک حیثیتی بڑے لوگوں کی کمی نہیں، لیکن اگر ہم مثلاً سکندر اعظم، اور نپولین و ہٹلر کو لیں تو ان کی زندگی صرف ایک سپہ سالار اور فاتح کے لئے مفید مطالعہ ثابت ہو سکتی ہے اور بس گوتم بدھ کی زندگی ریاضت اور عبادت میں خصوصی دلچسپی لینے والوں ہی کے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے، ہومر صرف ایک شاعر اور قصہ گو تھا افلاطون اور ارسطو صرف حکیم و فلسفی تھے، زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی کوئی بڑی وقعت نہیں خاص کر اکثر ناصح بے عمل رہے۔

اس کے برخلاف پیغمبر اسلام کی زندگی قول و فعل کی یکسانی ہمہ جہتی جیثیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ زندگی ہی میں کامیابی کے لحاظ سے ایک بے مثل چیز ہے۔

چنانچہ سیاسی پہلو کو لیجئے تو آپ نے دس سال کے قلیل عرصے میں جزیرہ نمائے عرب کے تراج (حکومتی) جہاں زیادہ تر خود سر خانہ بدوش قبائل میں خانہ جنگیاں ہی رہا کرتی تھیں ایک مستحکم اور بڑی مملکت قائم کردی[1]

"چینی مسلمانوں میں سب سے مستند سیرت النبی نان کنگ کے ایک عالم لیوچی کی ہے، ان مؤلف کا نام کیٹی لیئسن بھی ہوتا ہے، یہ ۱۱۳۴ھ ۱۷۲۱ء میں لکھی گئی اور بعد میں دس جلدوں میں شائع ہوئی، اس میں آغاز اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ چین کے بادشاہ نے ایک ڈراونا خواب دیکھا کہ اس کے محل میں بھوت گھس آئے ہیں پھر ایک عمامہ پوش شخص آکر اپنے ہاتھ میں کی ایک کتاب تلاوت کرنے لگا تو بھوت گڑگڑانے لگے مگر تلاوت جاری رہی تو تھوڑی دیر میں وہ خاک کا تودہ ہو گئے ......

.... قبل اس کے کہ اس روایت کی تنقید کی جائے دو امور قابل ذکر ہیں ایک تو یہ کہ لیوچی کا تذکرہ "سعد وقاص" چین کی جس قدیم ترین تالیف میں ملتا ہے وہ خانوادہ منگ کا عظیم الشان جغرافیہ ہے جو ۷۷۲ھ ۱۳۷۰ء میں مرتب ہونا شروع ہوا اور ۸۶۶ھ ۱۴۶۱ء میں شائع ہوا، اس میں شہر مدینہ کے حالات پر بھی ایک باب ہے، اور اس میں لکھا ہے کہ سعد وقاص صحابی کی چین میں آمد خانوادۂ سوی کے حکمران کائی ہوانگ کے زمانہ میں ہوئی دوسری قابل ذکر چیز یہ ہے کہ چینی رسم الخط کے باعث جن اشخاص کے بطور سفیر و مبلغ چین آنے کا

---

[1] عہد نبوی میں نظام حکمرانی صفحہ ۶

ذکر کیا گیا ہے ان کا نام مختلف کتبوں اور کتابوں میں بدلا ہوا ہے۔[1]

ڈاکٹر ولی الدین:۔ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب حیدر آباد کے باشندہ ہیں آپ کے اجداد صاحب منصب و جاگیر تھے۔

سنہ میں ڈاکٹر صاحب کی پیدائش ہوئی جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے اور ڈھاکہ سے ایم۔اے کی کامیابی کے بعد لندن گئے اور لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی فلسفہ آپ کا مضمون ہے۔واپسی کے بعد مددگار پروفیسر فلسفہ کی خدمت پر جامعہ عثمانیہ میں مامور ہوئے، اور اب پروفیسر ہیں۔

مغربی فلسفہ کو اسلامی فلسفہ کی روشنی میں متعارف کرانا آپ کا محبوب مشغلہ ہے، اس عنوان پر کئی کتابیں اور مقالے قلمبند کر چکے ہیں، معیاری سالوں میں آپ کے مضامین قدر اور عزت کے ساتھ شائع ہوتے ہیں، قنوطیت، ابطال مادیت، قرآن کا فلسفہ مذہب، اقبال اور حدیث جبر و قدر وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔

آپ حیدر آباد اکیڈیمی کے معتمد ہیں، اکیڈیمی کی جانب سے کئی مرتبہ بلند پایہ علمی لکچر ہونے کے علاوہ مقالات علمیہ بھی شائع ہوئے ہیں، یہ مقالے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں ان مقالات کی یورپ کے جامعات نے بڑی قدر کی ہے اور ان کے تحقیقی مضامین کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر ولی الدین کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ فلسفہ جیسے خشک موضوع کو وہ بڑا دلچسپ اور دلکش بنا دیتے ہیں، عبارت عام فہم اور سادہ و صاف ہوتی ہے نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

---

[1] مجلہ لمیلسانین

"یہ صحیح ہے کہ خدا کے وجود اور حیات بعد الموت کے انکار کی وجہ سے ایک قسم کی آزادی طبیعت میں سماجاتی ہے، اور نیٹشے کی طرح کہا جاتا ہے کہ معاذ اللہ" خدا مرچکا اور اس کی قبریں منادر و مساجد میں بنائی جاچکیں اب ہر چیز جائز ہے" فطرت اور فطرتی ہیجانات برے نہیں اچھے ہیں، شرم و خبط دور کرنی چاہیئے جذبات و خواہشات کا اظہار ضروری ہے، آزاد مرد کا اخلاقی اصول اظہار ذات ہے نہ کہ انکار ذات

خیام نے تو سارے جہان پر نظر ڈالی صاحب نظر حکیموں سے مشورہ کیا اور کہا

در عالم خاک از کراں تا بکران   چندانکہ نظر کنند صاحب نظران
حاصل ز جہاں بیو نا چیزے نیست   الا مئی لعل و عارض خوش پسران[1]"

"بہر حال اتباع نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن" اجملوا فی الطلب" کو پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل سبب یا قطعی علت نہیں۔ شاہ عبد الحق محدث دہلوی شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو اجمالاً خوب ادا کیا ہے بعد از طلب می یابی امانہ بطلب می یابی یہی مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے۔

بجستجوے نیابد کسے مراد دلی   کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد[2]

---

[1] ابطال مادیت صفحہ ۲۶ [2] قرآن کا فلسفہ مذہب صفحہ ۲۵

عبدالمجید صدیقی:۔ عبدالمجید صاحب صدیقی کے اجداد حیدرآباد میں کئی صدی سے متوطن ہیں، سنہ میں صدیقی صاحب کی ولادت ہوئی، مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم ہوئی، منشی اور دبیر کی کامیابی کے بعد عثمانیہ میٹرک کا انگریزی امتحان دیا، پھر جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے۔ایم۔اے۔ایل۔ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں، بعد کامیابی جامعہ میں تاریخ کے لکچرار ہوئے، پھر مددگار پروفیسر بنے اسی خدمت پر اب مامور ہیں۔

صدیقی صاحب ایک خاموش پسند انہماک سے کام کرنے والے شخص ہیں اپنے فن کے ماہر ہیں تاریخ اور سیاست میں اونھوں نے ریسرچ کیا ہے اور اپنے ریسرچ کے نتائج کو کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ پیش کرکے اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں،

تاریخ گولکنڈہ، تاریخ سیاسیات ان کے شہ کار ہیں، اوّل الذکر تاریخ میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کی تاریخ ہے، جو زمانہ حال کے مطابق تیار کی گئی ہے، تاریخ سیاسیات بھی فن سیاست کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ ہے، کئی مقالوں میں تاریخ کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے، ان کا مجموعہ بھی ایک ضخیم کتاب کی صورت رکھتا ہے مقدمہ تاریخ دکن، اور ارسطو جاہ آپ کی دوسری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

صدیقی صاحب کا انداز بیان دلکش اور دل نشین ہوتا ہے، عبارت صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ طرز بیان کی سلاست بھی قابل داد ہوتی ہے، نمونہ پیش ہے۔

"گولکنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر سے مغل سلطنت کو نقصان پہنچا ہی تھا، لیکن دکن کو بھی ناقابل تلافی ضرب لگی، اس کے تمدن کی رفتار ترقی بہت دنوں تک رکی رہی، بلکہ دکن کے بعض اقطاع تو ہمیشہ کے لئے بے چراغ ہو گئے، قطب شاہوں نے تلنگانے میں جو تمدن پیدا کیا تھا اس کا بُری طرح شیرازہ بکھر گیا۔ شاہ عالم کے حملے میں شہر حیدر آباد کی اس قدر افسوس ناک تاخت و تاراج ہوئی کہ تمام قطب شاہی تمدن خاک میں مل گیا، مغل قبضے کے بعد بھی شاہی محلات کی خاطر خواہ نگہداشت نہیں کی گئی، چنانچہ یہ سب بربادی کی نذر ہو گئے، مغل فاتح یہاں سے لاکھوں روپے زر و جواہر تو لے گئے لیکن قطب شاہی عمارتوں کو برباد ہونے دیا۔ اس وقت حیدر آباد اور اس کے گرد و نواح میں قطب شاہی مساجد کے سوا کسی محل کا پتہ نہیں چلتا، حالانکہ مختلف بادشاہوں کے بنائے ہوئے بے شمار محل تھے"[1]

"مملکت کی ابتدا کے متعلق اسلام کا تخیل یہ ہے کہ اس کی تشکیل ایک سماجی ضرورت پر مبنی ہے، بغیر مملکت کے معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا، چنانچہ سیاست اسلام کے بڑے مفکر ماوردی کا کہنا ہے کہ" لوگ فطری طور پر اپنے معاملات ایسے رہبر کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں جو انہیں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور باہمی معاملات میں ان کے درمیان فیصلہ کرے، اور اگر ذی اقتدار اشخاص نہ ہوں تو دنیا میں شخصی اقتدار پھیل جائے گا، اور تہذیب و اجتماع کا شیرازہ بکھر جائے گا۔" مقصد کے متعلق ماوردی کہتا ہے کہ دین کی حفاظت ہو اور دنیا کا انتظام برقرار رہے، چونکہ اس کا کام بلند کرداری کی تربیت ہے اس لئے اسلامی مملکت

---

[1] تاریخ گولکنڈہ صفحہ ۲۴۶

کا مدعا اخلاقی ہے نہ کہ مادی ۔ اس کے لئے مملکت ضروری ہے، اور یہی حقیقی و فطری توجیہ ہے ۔ نہ کہ لاک اور روسو کی طرح معاہدہ معاشری، اب رہا مملکت کا اقتدار اعلیٰ، تو اس کو عہد نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بلند شخصیت اور اسوۂ حسنہ سے حاصل کر لیا، اور تمام مسلمانوں نے یہ اقتدار نہایت خوشی سے مان لیا ۔"[1]

تمکین کاظمی :۔ سید تمکین کاظمی، حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد سید منتجب الدین تجلی کا تذکرہ گزشتہ صور میں ہو چکا ہے، کاظمی صاحب کو مزاحیہ نگاری، تنقید نگاری اور تاریخی مضمون سے دلچسپی ہے اردو کے معیاری رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے ہیں، غنچۂ تبسم مزاحیہ مضمون کا مجموعہ اور تذکرہ ریختی وغیرہ آپ کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے، تمکین کاظمی صاحب کی تحریریں دکھنی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے ہیں،

"میری مادری زبان اُردو ہے اور میں نے اردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے، مگر میں اس قدر مجبور ہونا پسند نہیں کرتا کہ اماحوا کی بجائے ماماحوا، گنڈیوں کے عوض گھنڈیاں ۔ چھاتے کی بجائے سنیہ گردڈاڈھی کے بدلے گردوے کی ڈاڑھی اور چپکے ہوئے گال کو پچکے ہوئے گال کہوں . . . . . . میں نے جان بوجھ کر ان الفاظ کا استعمال کیا ہے ۔" اس صراحت سے واضح ہو سکتا ہے کہ ان کی طرز نگارش کس نہج کی ہو سکتی ہے ۔ غنچۂ تبسم پر ملا رموزی نے مقدمہ لکھا ہے،

---

[1] تاریخ سیاسیات صفحہ ۱۳۸، ۱۳۹

ان کے مزاحیہ مضمون کی داد دی ہے ۔نمونہ ملاحظہ ہو :۔

" میرزا صاحب کے پھکڑپن سے ہماری روح ہی فنا ہوتی ہے، ہم نے سونچا کہ مرزا صاحب نہ ملیں تو پھر قیامت آجائے گی۔ راستہ میں جہاں کہیں ملاقات ہوگی حضرت نے لے ڈالیں گے وہ وہ بے نقطہ سنائیں گے کہ توبہ، سنگ آمد وسخت آمد کہکر پہونچ ہی گئے۔ مرزا صاحب دیوان خانے میں بیٹھے تھے، ایک صاحب کو بنوٹ کے کچھ زبانی گر بتا رہے تھے، ایک شخص کو موجود پاکر مسرت ہوئی کہ چلو اس غریب سے مرزا صاحب کو جھک جھک کرنے دو۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئیں گے مگر ہمارا بیٹھنا ہی تھا کہ مرزا صاحب نے اپنا لکچر ختم کر دیا۔ اور متوجہ ہو گئے ہماری طرف، رسمی گفتگو کے بعد ستار ہارمونیم کا موزانہ شروع کیا اور دیر تک اس پر روشنی ڈالتے رہے "

" اس وقت بیگم صاحبہ کا پارہ ایک سو پندرہ سے بھی کچھ اونچا ہو چلا تھا۔ ہمیں خوف یہ تھا کہ کہیں حملہ آور نہ ہوں ۔ مگر خیر یہ گذری کہ ابھی وہ رجز خوانی کر رہی تھیں کہ اذان کی آواز آنے لگی الصلوۃ خیر من النوم کو ہم نے دہرانے کے بجائے الصلوۃ خیر من الغضب کو تین تین چار چار دفعہ دہرانا شروع کیا "

" بعض نقادوں کی رائے میں قدیم گیت اور کہانیاں نارووت کا بہترین انگریزی کارنامہ ہے، جس سے اس کی ذاتی قابلیت اور اس نارووت پر فرانسیسی اور انگریزی فنون عالیہ کے اثرات کا پتہ چلتا ہے، اس کا یہ کارنامہ سنسکرت میں یک سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے جبکہ وہ اپنے باپ کے ہمراہ انگلستان سے

واپس ہوئی تھی، بائیس سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا اس کی اس کم عمری کے پیش نظر اس کے کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ (تاریخ وفات رسالہ آج کل نومبر ۱۹۵۷ء)

ڈاکٹر محمد غوث:۔ مولوی محمد مرتضیٰ صاحب کا تذکرہ گزشتہ دور کے نثر نگاروں میں آچکا ہے۔ اور پھر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے معتمد اور حیدرآباد میں جامعہ کے قیام کے پہلے معمار کی حیثیت سے ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں، مرحوم کے قابل فرزند محمد غوث ہیں جو ۱۳۲۷ھ میں تولد ہوئے، دارالعلوم سے تعلیم کی ابتدا ہوئی، اور جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات سے بی۔اے۔ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی اور اس کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے سے پہلے جامعہ کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے بھی ایک قابل قدر مقالہ قلمبند کر چکے ہیں، اسلامی فقہ کو جدید قوانین سے مطابقت دے کر آپ نے جو مقالے لکھے ہیں وہ اردو میں نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ فن تاریخ پر بھی آپ کے کئی مضامین اور مقالے ہیں جو معیاری رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں تاریخی واقعات کو جو تاریکی میں ہیں انکشاف کیا گیا ہے۔

رسالہ "طیلسانین" کو کئی سال تک محمد غوث صاحب کی ادارت حاصل رہی اس زمانہ میں اس رسالہ نے بڑی ترقی کی، دفتر دیوانی ومال کے عربی فارسی مخطوطات پر آپ کی ضخیم کیٹلاگ ریویو اور ایتھے کی کیٹلاگوں کے مماثل ہے۔ جو اردو میں اپنی آپ نظیر ہے، افسوس ہے کہ اس کو شائع نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر محمد غوث کی تصانیف یہ ہیں:۔

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"جن اصحاب نے کرناٹک کی تاریخ کی فارسی کتابیں پڑھی ہیں ان پر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس میں ابھی صرف تاجرانہ کاروبار کے نشیب و فراز سے دوچار تھی کہ فرانسیسی حکمت عملی کے ایک استاد دوپلے نے انگریزی تاجروں کو مدراس سے بے دخل کر دیا، محض کمپنی کی درد بھری التجاؤں پر اس وقت کے حاکم صوبہ کرناٹک نواب انورالدین خان شہید نے جن کا مستقر حکومت ارکاٹ تھا فرانسیسی کارپردازوں کی قرار واقعی تنبیہہ کی اور یکے بعد دیگرے اپنے فرزندوں نواب محمد محفوظ خاں اور نواب محمد علی خاں والاجاہ کو فرانسیسی فوج سے مقابلہ کے لیئے روانہ کیا اور بالآخر مدراس کو فرانسیسی اقتدار سے آزاد کرا کے پھر انگریزی کمپنی کے سپرد کر دیا۔"[1]

"بختاور خان اورنگ زیب کے زمانہ میں خواجہ سرا تھا، اور داروغہ خواجان بڑا اعتبار حاصل کیا تھا۔ علم اور متعدد کتابوں کے مؤلف کی حیثیت سے نمود پیدا کیا، آخری کتاب میں اپنی تصانیف کی تفصیل بیان کی ہے، شاہی نوازش ان کے حال پر بہت تھی، ۱۰۹۶ھ میں اونہوں نے احمد نگر میں انتقال کیا، اور خود شاہ خلد مکاں نے نماز جنازہ پڑھی، تاریخ کا ان کو خاص ذوق تھا، مراۃ العالم ۱۰۷۸ھ میں اتمام کو پہنچی اور "آئنہ بخت" سے سنہ تالیف کے اعداد برآمد ہوتے ہیں، لیکن غالباً بعد میں ۱۰۸۹ھ کے واقعات زیادہ کئے گئے ہیں، سر ہنری الیٹ نے یہ امر تسلیم کیا ہے کہ مشرق کی تاریخ میں یہ کتاب بہت ہی کارآمد اور قابل اسناد ہے

[1] "خاندان والاجاہی کا خاتمہ" مجلہ طیلسانین

بالخصوص اورنگ زیب کی حکمرانی کے ابتدائی دس سال کے واقعات بہت ہی قابل لحاظ ہیں [۱]

سید محمد صاحب :- سید محمد صاحب کا وطن بھی حیدرآباد ہے ۱۳ ہ میں آپ کی پیدائش ہوئی جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی میں کامیابی حاصل کی پہلے سٹی کالج میں لکچرار بنے اور اب جامعہ عثمانیہ میں اردو کے مددگار پروفیسر ہیں۔

مضامین نگاری اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہے، "ارباب نثر اردو" آپ کی قابل قدر کتاب ہے، اس میں آپ نے فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تحقیقی اور تنقیدی تذکرہ کیا ہے، اس کتاب کے پیش نامہ میں ڈاکٹر سید عبداللطیف نے جو صراحت کی ہے اس سے مؤلف کی محنت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "مؤلف نے جس تحقیق و تلاش سے منتشر مواد کو خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے اور اس پر تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل ستایش و لایق قدر ہے، اس کتاب کو لکھ کر مؤلف نے ادبیات اردو میں تاریخی تحقیقی و تدقیق کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے"

نمونہ عبارت حسب ذیل ہے:-

"تاریخ ہند کی اس عجیب و غریب حقیقت سے سب واقف ہیں کہ انگریز اس ملک میں تجارت کے بہانے داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ملک گیری اور تسخیر سلطنت شروع کر دی ملک کے حالات نے ان کی مساعدت کی۔

---

[۱] دفتر دیوانی کے مخطوطات۔

مرکزی حکومت مغلیہ کی کمزوری اور صوبہ داروں اور راجاؤں کے آپس کے نفاق نے بہت جلد ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان پر حکمران بنا دیا۔۔۔۔۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اردو کی ترقی میں ایک ایسی قوم کو حصّہ لینا پڑا جو اہلِ زبان یعنی ہندوستانیوں سے صورت شکل، رنگ، لباس، وضع قطع اور رسم و رواج ہر حیثیت سے جدا تھی یہی قوم جس نے اہل ہند کے ہاتھوں سے ہندوستان کی حکومت چھین لی اور خود اس کی مالک بن بیٹھی، ان کی زبان کی ترقی کا باعث ہوئی، اسی قوم کی ہر وقت توجہ نے اہلِ ہند کی عام زبان یعنی اردو کی پرورش کی اور اپنی مسیحا نفسی سے اس کے قالب مردہ میں جان ڈال دی"[1]

ناکارہ:- محمد شفیع الدین صاحب ناکارہ لقب، حیدرآباد وطن، نظام کالج میں تعلیم پائی، مگر خانگی مجبوریوں کے باعث بی۔اے کا امتحان نہ دے سکے، زمانہ تعلیم ہی سے مضمون نگاری سے دلچسپی رہی انجام رہبر دکن میں آپ کے مضمون شائع ہوتے رہے، اس کے بعد آپ نے مزاحیہ نگاری کی طرف توجہ کی اور اس میں بڑی دستگاہ حاصل کر لی ہے۔

اردو کے معیاری رسالوں میں آپ کے افسانے اور مضامین شائع ہوتے ہیں "صمدانی" کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے،

ناکارہ صاحب کے مزاحیہ افسانے، ڈرامے اور مضامین مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں، کسی میں طنز ہوتا ہے تو کسی کے خاکہ میں ایسے واقعات کا

---

[1] ارباب نثر اردو صفحہ ۸، ۹

تذکرہ ہوتا ہے جس سے ہم ہنسی پر مجبور ہو جاتے ہیں، کسی مضمون میں اپنے گرد و پیش اور تجربہ کی باتیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم ہنسی پر مجبور ہو جاتے ہیں، کہیں وہ اپنی ذکاوت اور فراست سے انشاء پردازی کو اتنا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد ہی غیر معمولی شگفتگی پیدا کر لیتا ہے۔ ناکارہ کے مضامین قہقہہ کی سرحد میں نہیں پہنچتے، ان کے مزاحیہ اور طنزیہ مضمون سبق آموز ہوتے ہیں، صرف ہنسنا ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ فنی حیثیت سے ناکارہ کے مضمون اہمیت رکھتے ہیں۔ اور وہ اردو کے مزاحیہ نویسوں کی صفِ اوّل میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ نمونہ حسب ذیل ہے :-

"میں نے چچا ابا کو دیکھا وہ باری باری سے میری اور اس عورت کی صورت تک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہم دونوں میں شوہر کون ہے اور بیوی کون؟

میں نے چچی جان کو دیکھا وہ محبت بھری نظروں سے اپنی نام نہاد بھتیجی بہو کو دیکھ رہی تھیں، غالباً ان کا دل چاہ رہا ہوگا کہ اس کو گلے سے لگا لیں اور خوب پیار کریں اور اس کی زندگی کا دردناک افسانہ سنیں اور اس کا اشک آلود چہرہ دیکھ کر خود بھی آنسو بہائیں۔" (ناشادی[1])

"صمدانی نے ایک مرغی آغا کے آگے رکھ دی، آغا ڈر کر یوں پیچھے ہٹے جیسے مرغی کاٹ کھائے گی، بولے ارے یہ کیا واہیات ہے، پھینکو اسے پھینکو، نانسنس، میں ان کو اندر لے گیا۔ مگر دن کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا۔

[1] حمدانی

فرمایا ناٹ بیڈ (برے نہیں) کام چل جائے گا۔ صوفے نہیں ہیں، آل رائیٹ آل رائیٹ کوئی مضائقہ نہیں، باتھ روم کونسا ہے؟ میں ذرا نہالوں پھر فرصت سے ٹاک (گفتگو) کریں گے۔" (مشرقی اور مغربی تہذیب کی ٹکر[1])

"خالدہ۔ ایک بات ذہن میں آئی ہے کملا

کملا۔ کیا بات؟ جلدی سے کہئے

خالدہ۔ تم نے ابھی کہا تھا سلمیٰ کسی کو پہچانتی نہیں، میری رائے ہے کوئی عورت اس کی بہن بن جائے۔

کملا۔ آپ —— آپ کا مطلب ہے کوئی عورت جھوٹ موٹ اس کی بہن بن جائے۔

خالدہ۔ وہ اس کے سامنے جا کر کہے لو سلمیٰ میں آگئی۔

کملا۔ خوش ہو کر بڑی اچھی ترکیب ہے، خالدہ میں جانتی تھی تم ایسی ہی کوئی ترکیب بتاؤ گی یہ دھوکا تو ہے مگر کوئی اور صورت بھی تو نہیں کہ اس سکرات سے اسے چھڑایا جائے[2]۔

سنہا:۔ سری کرشن صاحب سنہا۔ حیدرآباد کے متوطن ہیں، ان کے اجداد دتلام سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے، جو وہاں وزیر اعظم تھے سری کرشن صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی آپ کا خاندان حیدرآباد کے معزز کائستھ خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، سنہا صاحب کی اردو، فارسی اور انگریزی تعلیم اولاً گھر پر ہوئی پھر سٹی کالج سے میٹرک میں کامیابی

---

[1] صمدانی [2] ماہ نو جولائی ۴۹ء

حاصل کر کے جامعہ عثمانیہ سے بی ۔ اے کی ڈگری لی، اکثر مضامین میں امتیازی
نمبر حاصل کئے، آپ کو امتیازی قابلیت کا وظیفہ ملا، جامعہ کی زندگی میں اونہوں
نے اردو اور انگریزی مقرر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی، سلیس اور شستہ
اردو اور انگریزی لکھتے ہیں انہیں کمال حاصل ہے، اور ایک اچھے ادیب ہیں،
ان کے مضامین اور افسانے اردو کے معیاری رسالوں زمانہ، ساقی، سب رس
مجلہ عثمانیہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں، ان کا ایک مقالہ اشتراکیت کے عنوان
پر بہت پسند کیا گیا تھا۔ حیدر آباد سول سروس میں شامل ہوئے اور اس وقت
ایک ضلع کے کلکٹر ہیں، آپ کے اردو کے افسانوں کے دو مجموعے "رم جھم"
اور "زمیں کانپ رہی تھی" کے ناموں سے شائع ہوئے ہیں، آپ ایک ترقی پسند
مصنف ہیں اس لئے مزدور، قحط، سرمایہ دار، جنگ کی ہولناکیاں سب موجود
ہیں ۔ یہ افسانے آسان اور عام فہم ہیں، ان کی تشبیہیں دلکش ہوتی ہیں، کہیں
کہیں طنز کی ہلکی چاشنی بھی ہوتی ہے، حقیقت نگاری اور فلسفیانہ سوچ بچار،
پختگی خیال ان کے افسانوں کی خصوصیات ہیں، ایک انگریزی کتاب "مسلم سلاطین
دکن" جلد اول بھی شائع فرمائی ہے۔

"رات ہو چکی، ہوا کے جھونکے جھومتے گیت گاتے نظر آنے لگے، نہر کا
صاف وشفاف پانی کسی رنگین پری کے روپ میں نظر آنے لگا۔ وہ تھوڑی
دور تک اسی دھن میں مست چلا گیا، مگر کچھ لوگوں کی آواز سے آخر اس کے خیالی
کا تانا ٹوٹ گیا، وہ ان لوگوں تک پہنچ کر ان کی باتیں سننے لگا، اور جب اس کو
یہ معلوم ہوا کہ یہ قافلہ بھی اپنے گاؤں کو چھوڑ کر آب ودانہ کی کشش میں بڑھے

شہر کو جا رہا ہے تو اس کے جسم میں ایک خطرے کی لہر دوڑ گئی، اس نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ لوگ بڑے شہر کو اس سے پہلے پہنچ گئے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا ان کو روٹی مل جائے گی اور وہ مایوس ہو گا۔ اس خیال نے اس پر تازیانے کا کام کیا اور وہ زیادہ تیزی سے چلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ ان لوگوں سے بہت آگے نکل گیا۔ وہ لوگ اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے، شیامو نے اطمینان کا سانس لیا۔"
(زمین کانپ رہی تھی)

"میری شادی ہو گئی، محبت کا کنگن اجیت نے مجھ کو پہنا دیا، میں یہ محسوس کرنے لگی کہ مجھ کو آزاد فضا سے نکال کر محبّت و عشق کے پنجرے میں قید کر دیا گیا۔ لیکن یہ وہ قید نہ تھی جس کی شکایت بلبل کرتی ہے، بلکہ میری تمنّا اور آرزو کی تکمیل کی قید تھی۔ انتہائی خوش کن اور مسرت خیز۔ اجیت کی تھوڑی دیر کی جدائی بھی مجھ کو گوارا نہ ہوتی، اجیت جب کورٹ جاتے تو میں کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی آنکھیں کتاب کے ورقوں پر لیکن کان کسی کی آواز کے منتظر ہوتے۔
کوئی سال بھر عیش و عشرت میں گزر گیا، میں نے کبھی سے التفاتی کی بھیانک صورت نہ دیکھی، لیکن دنیا آخر دنیا ہے" (بت شکن)

رشید قریشی:۔ حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا۔ ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ افسانہ نویسی میں نام پیدا کیا ہے، جامعہ کے ان فرزندوں میں شامل ہیں جنہوں نے افسانہ کو اپنے قلم کا جولان گاہ بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "من کی دنیا" کے نام سے شائع ہوا ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر زور کے یہ الفاظ قابل ملاحظہ ہیں۔

"اس مجموعہ کا مطالعہ کرنے والا ان کی دنیا کو تھوڑی دیر کے لئے بالکل بھول جائے گا کیونکہ ان افسانوں میں زیادہ تر ایک نوجوان کی "خیال کی بستی" آباد ہے ان میں سے اکثر شباب کی "تفسیریں ہیں" ان میں سوز ہے، مستی ہے، جذب ہے، شوق ہے، اور کہیں کہیں شاید وہ یک گونہ عریانی بھی ہے، جس کو آج کل شبابیات کے نام سے بد قسمتی سے اردو ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔"

اور پروفیسر عبد القادر سہروردی نے لکھا ہے

"رشید قریشی کے قصوں کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یہ تقریباً سب کے سب ان کے طبعزاد ہیں، اس لئے یہ ہماری زندگی کے نقشے معلوم ہوتے ہیں۔ ان قصوں کے مطالعہ کرنے والے رشید صاحب کے مشاہدے انتخاب اور پیش کش کے انداز کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔"

ان آراء سے رشید صاحب کے افسانوں کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے رشید ایک ترقی پسند افسانہ نگار ہیں اگرچہ ان کے یہاں مزدور کی حمایت، سرمایہ داری کی مخالفت نہیں ہے وہ رومانی افسانے لکھتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ بات میں بات نکل آتی ہے دوپٹوں کی سرسراہٹ اور چوڑیوں کی جھنکاریں ان کے افسانے پروان چڑھتے ہیں، بہر حال رشید ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔

"باہر دروازہ پر کچھ آہٹ ہوئی، میں نے سمجھا کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کیا ربلیش بابو ہیں یہ کون ہیں؟ میں نے دل میں کہا یہ وہ دوست ہیں۔ بڑے حسن پرست ہیں ایک دفعہ کہہ رہے تھے ۔حسن کو ایک کے لئے مقید کرنا پاپ ہے

واہ گویا سب کو آنکھیں سینکنے کا موقع دینا چاہیے .... میں انہیں ان کی آواز سے پہچان گئی، رمیش بابو نہیں ہیں، میں نے بڑبڑانا شروع کیا وہ گھر میں نہیں رہتے انہیں اب گھر میں کوئی لطف نہیں آتا۔ وہ سیر کرنے گئے ہیں، ....

دروازہ پر پہونچ کر میں نے بسورتے ہوئے کہا رمیش بابو نہیں ہیں۔"

"ایک دوست سے ملنے گیا میرے ہوش وحواس پر جیسے بجلی گر پڑی۔ کلثوم ایک چھوٹے بچے کو گود میں لئے میرے سامنے سے گزر گئی۔ اتنے میں میرا دوست بھی آ گیا کہنے لگا "کیوں کیسی ہے یہ ہماری نئی آیا" "مبارک" میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ بڑی مشکل سے ہاتھ لگی ہے۔ مگر یار تعجب ہوتا ہے گاؤں والیوں میں بھی اتنی تمیز، اتنی شرارت اور دل موہ لینے کے ڈھنگ ہوتے ہیں، وہ ہنسنے لگا۔ میں نے خون کے گھونٹ پیتے صرف جی ہاں کہا اور دوبارہ کبھی اس کے گھر نہ گیا۔"

"موت پر کس کا زور چل سکتا ہے۔ بنواری لال تھوڑی سی علالت کے بعد تیس سال کی عمر ہی میں مر گیا ——— ایک بیوی کو دنیا سے اس ناانصافی کی شکایت کرنے کے لئے زندہ چھوڑتے ہوئے ——— ایک نوجوان بیوی کو جس کی امیدوں اور آرزوؤں کے چراغ اپنی پوری روشنی سے اس کے دل کو منور کر رہے تھے شیلا اب بیوہ تھی۔" (من کی دنیا)

جلیس:۔ ابراہیم جلیس۔ حیدرآباد وطن، علی گڑھ میں تعلیم پائی، ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں، افسانہ نگار ہیں اور بہت جلد انہوں نے ترقی کی ہے اور ایک مشہور افسانہ نگار کی حیثیت سے دنیائے اردو میں نام آوری

حاصل کر لی ہے، جلبیس ترقی پسند صاحب طرز افسانہ نگار ہیں، اونہوں نے اپنا راستہ آپ بنا لیا ہے۔ اور دوسرے ان کی طرز کی پیروی کرنے لگے ہیں، وہ لطیف طنز کرتے ہیں باتوں باتوں میں طنز یہ جملے پوشیدہ ہوتے ہیں، جن کو سطح نظر میں محض مزاح سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کے عمق میں طنز کی گہرائی نہیں ہوتی ہے، گھر کی اندرونی۔ اور باہر کی زندگی کی سیاست کو ہم آہنگ کرنا جلبیس کا کام ہے ان کو معاشرتی اور سیاسی افسانے لکھنے کا خاصہ ملکہ ہے، ان کے افسانے اردو کے معیاری رسالوں میں بڑے قدر کے ساتھ ساتھ شائع ہوتے ہیں۔
حیدر آباد کے افسانہ نگاروں میں ان کو مختلف حیثیت سے تفوق حاصل ہے، ان کے افسانوں کا پلاٹ، کردار دونوں قابل قدر ہوتے ہیں، سینکڑوں افسانے اونہوں نے لکھے ہیں ان کے مجموعے اب تک حسب ذیل شائع ہو چکے ہیں:۔
(۱) چور بازار ناول (۲) زرد چہرے۔ افسانے (۳) چالیس کروڑ بھکاری۔ افسانے (۴) کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں (۵) بھوکا ہے بنگال (۶) ترنگے کی چھاؤں میں (۷) گورے گئے کالے آئے۔

"میں کون ہوں ——— ؟

کیا پوچھتے ہو دوست کہ میں کون ہوں؟ ہاں میں مسلمان اقلیت ہوں، میں ابھی ابھی ہندوستانی حکومت کی قتل گاہ سے جان بچا کر آرہا ہوں، ہندوستانی حکومت کے گھناؤنے اندھیرے میں اب میں یکہ و تنہا ہوں، اب میں صرف ایک پناہ گزیں ہوں، میرا جسم زخموں سے چور چور ہے۔ میرے جسم کے ایک ایک زخم میں ایک ایک مہاسبھائی اور اکالی سکھ بیٹھا ہوا ہے۔ میرے جسم

ہیں اکثریتی حکومت کا زہر پھیل گیا ہے۔ اب میں بچ نہ سکوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرجاؤں گا۔ مگر میری یہ موت محض ایک عارضی موت ہے، کیونکہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان زندہ جاوید ہوتا ہے۔ (میں مر نہیں سکتا)

"اب وزیراعظم حکومت ہند اور شیخ عبداللہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگر کشمیر کا مسئلہ ادارۂ اقوام متحدہ میں پیش کردیا جائے تو محفل احباء میں بڑی رسوائی ہوگی، کشمیر کے مجرم منظر عام پر وہیر لئے جائیں گے انہیں اس بات کا بالکلیہ یقین ہے کہ اگر کشمیر میں استصواب عامہ کیا جائے گا تو شیخ عبداللہ اور حکومت ہند کو ادارۂ اقوام متحدہ کے ہال میں کرسیوں سے منہ کے بل گرنا پڑے گا۔ شیخ عبداللہ اور پنڈت نہرو گھبرا گئے۔ کیونکہ ان کو کوئی ایسا بدبخت کشمیری نہ ملا جو ڈوگروں، ہندوؤں، راجپوتوں اور سکھوں کی حمایت میں اپنی رائے دے گا۔ شیخ عبداللہ نے فوراً صحافت کی مدد لی اور پھر جھوٹا پروپیگنڈا شروع کردیا۔" (ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا)

جانکی پرشاد:۔ حیدرآباد آپ کا وطن ہے یہاں ۱۹۰۰ء میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ہوئی پھر نظام کالج میں تعلیم پانے کے بعد سرکاری ملازمت میں شامل ہوئے۔ اٹھارہ سال تک سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ملازمت کرتے رہے اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں محکمہ اطلاعات میں تبادلہ ہوا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اس دفتر کے نائب ناظم بنے اور اسی خدمت پر مامور ہیں۔

جانکی پرشاد صاحب مشرقی تہذیب و تمدن کے گرویدہ ہیں ہندو مسلم

اتحاد اور امن و شانتی کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ اسی اصول کے حامی اور مؤید ہیں عرصۂ دراز تک انجمن "قیام امن" کے پبلسٹی آفیسر رہے اس انجمن نے اپنے دورِ حیات میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جس کا سہرا جانکی پرشاد صاحب کے سر ہے۔

زمانہ تعلیم ہی سے آپ کو مضمون نویسی تصنیف و تالیف کا شوق رہا۔ تاریخی۔ اصلاحی، سماجی اور تعلیمی مضامین سے زیادہ شغف رہا۔ نشر گاہ حیدرآباد سے اکثر آپ کی تقریریں نشر ہوتی ہیں۔ جو معلومات آفرین اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ "عصر جدید" کے نام سے جانکی پرشاد صاحب کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔ جو اعلیحضرت آصف جاہ سابع کے چہل سالہ جوبلی کے موقع پر شائع ہوئی اس میں دورِ عثمانی کے نظم و نسق کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہم اصلاحات اور ترقیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کا اسلوب بیان صاف سادہ، عام فہم اور دلچسپ ہوتا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"جامعہ عثمانیہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کی علمی سرگرمیوں نے اپنے فرزندانِ تعلیم سے گزر کر خصوصاً بلدہ حیدرآباد اور عموماً مستقر ہائے اضلاع و قصبات کی رعایا میں ایک عام علمی چہل پہل پیدا کر دی ہے، اعلیحضرت بندگانِ عالی کی دورِ حکمرانی میں جس قدر اخبارات اور رسالے حیدرآباد، سکندرآباد اور بعض مستقر ہائے اضلاع سے نکل رہے ہیں ان کی نظیر کسی گزشتہ دور میں پائی نہیں جاتی، یہ اخبارات اور رسائل زیادہ تر اردو زبان میں ہیں مگر تعداد اشاعت میں ہم کو انگریزی "تلنگی۔ مرہٹی اور کنڑی اخبارات و رسائل کے نام بھی ملتے ہیں"[1]

---

[1] عصر جدید صفحہ ۴۳

بال ریڈی:- آپ حیدرآباد کے ایک ریڈی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا بی۔اے اور ٹیپ ایڈ میں کامیابی حاصل کی، سررشتۂ تعلیمات میں ملازم ہیں، اردو سے خاص دلچسپی ہے مقالے اور مضامین لکھا کرتے ہیں، جو سبق آموز اور اصلاحی ہوتے ہیں، مضامین سے گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔

بال ریڈی صاحب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"مہاتما گاندھی نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں بمقام "رام پور ہاٹ" اس بارے میں بالکل بجا فرمایا کہ:- "اگر ہم سارے ہندوستان کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے پاس آئیں تو ہماری ایک مشترک زبان ہونی چاہئے، اور یہ زبان ہندوستانی ہے، جو لوگ ہندوستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو ہندوستان کی دونوں اشکال اور رسم الخط (اردو، ہندی) سیکھنا چاہئے۔ اس ضرورت کو ہماری اپنی بین قومی زبان لنگوافرینکا نے (چاہے ہم اسے اردو کہیں یا ہندی یا ہندوستانی) پورا کر دیا ہے۔ یہاں اس بات کے بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ اس زبان کو بنانے، پال پوس کر پروان چڑھانے اور ارتقائی منازل سے گزار کر موجودہ حالت پر پہنچانے کا سہرا کسی خاص قوم و مذہب کے سر نہیں ہے، بلکہ اس کی پرورش اور پرداخت میں مادر ہند کے دونوں سپوت ہندو اور مسلمان برابر کے حصہ دار ہیں، یہ ایک بڑی غلط فہمی اور لاعلمی ہے کہ اس زبان کو کسی خاص مذہب یا فرقہ سے متعلق کر کے اردو اور ہندی کا جھگڑا کھڑا کیا جائے۔ کیونکہ اردو اور ہندی میں بجز طرز نوشت کے کوئی خاص فرق

نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ زبان تو ایک ہی ہے، مگر اس کا لباس جدا جدا ہے۔ ایک کو فارسی خط میں لکھتے ہیں تو دوسرے کو دیوناگری میں، اس کے علاوہ اردو میں ہندی کی قواعد اور پچاس فی صد سے زیادہ الفاظ موجود ہیں، افسوس اس کا ہے کہ لوگ اس حقیقت سے دانستہ یا نادانستہ انجان بن جاتے ہیں۔" (رسالہ سب رس دسمبر ۱۹۴۶ء)

خواتین کے کارنامے

اگرچہ گزشتہ ادوار میں خواتین کے کارناموں کا تذکرہ تقریباً نہیں کیا گیا ہے، اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ اس زمانہ میں ہماری خواتین جاہل تھیں اور ان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ ان کے کارنامے ہم سے پوشیدہ ہیں اور ہم کو جو کچھ معلومات ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، مثلاً پانچویں دور میں ایک شاعرہ شرف النساء بیگم سے واقف ہیں، جس کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے، مگر تفصیلی حالات کی خبر نہیں ہے، اسی طرح ایک اور شاعرہ کا پتہ چلتا ہے جس نے ارسطو جاہ کی مدح میں قطعہ لکھا تھا، البتہ چندا کا تذکرہ پانچویں دور میں ہو چکا ہے چھٹے دور میں چند خواتین کے کارنامے ملتے ہیں، مگر ان کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا ہے۔ ہم اپنی کتاب "خواتین دکن کی اردو خدمات" میں ان کا تعارف کرا چکے ہیں، اور پھر اکثر خواتین ساتویں دور میں باقی ہیں مثلاً صغرا بیگم ہمایوں مرزا، رابعہ بیگم، سارہ بیگم وغیرہ۔

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اب مردوں کے دوش بدوش عورتوں کے نظم و نثر کے نمونے بھی منظر عام پر نمایاں ہونے لگے ہیں، ان کی بھی تقسیم ہو سکتی ہے۔ مثلاً جامعہ عثمانیہ سے تعلق رکھنے والی اور جامعہ سے غیر متعلق وغیرہ۔۔

خواتین کے کارناموں کو بھی ہم علیحدہ علیحدہ عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔ شاعری کے لحاظ سے رحمت بیگم اسیرؔ، انیسہ بیگم شروانی، آنیسہ صغرا بیگم حیاؔ، رابعہ بیگم رابعہؔ، سارہ بیگم سارہؔ، بشیر النساء بیگم بشیرؔ، منظور فاطمہ بیگم، قیصری بیگم، احمد النساء بیگم، نوشابہ خاتون، لطیف النساء بیگم، صفیہ بیگم قمرؔ، وحیدہ نسیمؔ، سعیدہ مظہرؔ، شبیل بالا صاحب، مسز برکت رائے، نذیرہ، ناہید، رفعت، راحت وغیرہ قابل تذکرہ ہیں، مگر ہم صرف چند کا تعارف کراتے ہیں۔

شاعر خواتین عموماً مشاہیر شعراء کا تتبع کرتی ہیں۔ اقبال، جوش، حسرت، جگر، اختر شیرانی وغیرہ کا کلام ان کے لئے نمونہ ثابت ہوا ہے۔ نظمیں، غزل اور بے قافیہ نظم وغیرہ میں انہوں نے اچھا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے، غزلوں میں ان کی رنگین خیالی اور شگفتگی قابل داد ہوتی ہے، لیکن شمالی ہند کی بعض شاعر خواتین کی طرح عریانی نہیں ہوتی۔ وہ پردہ کی باتیں پردہ میں رکھتی ہیں۔

انیسہ:- انیسہ بیگم شروانی کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد آکر بس گئیں ۱۹۲۴ء سے آپ کی شاعری کا آغاز ہوا، کلام کا مجموعہ "انیسیات" کے نام سے شائع ہوا ہے، نظم اور غزل دونوں موزوں کرتی ہیں، نظمیں حمد نعت، مناظر قدرت، وصف نگاری قوم اور اخلاق کے عنوان پر ہیں، کلام میں سوز و گداز ہے اور بے ساختگی اور برجستگی بھی، طباعی ہے اور ذہانت بھی غزلوں میں لطافت بھی ہے اور شیرینی بھی لطف زبان بھی ہے اور صفائی بھی بحیثیت مجموعی کلام قابل داد ہے۔

جنگ اور خواتین

گوری قوموں میں ہم جنگ یہ برپا کیا ہے
بھائی کا بھائی عدو ہے یہ تماشا کیا ہے

ظلمتِ ظلم نے اندھیر مچا رکھا ہے
شمع تہذیب کے نیچے یہ اندھیرا کیا ہے

اشرف الخلق کو توپوں کا بنا کر ایندھن
عقل و دانش کو گیا خلق نے رسوا کیا ہے

دکھ بھری خلق کی خدمت کو فریضہ جانو
دستِ شفقت کے لئے آپنا پرایا کیا ہے

حوصلہ رکھ کے قوی زیر کرو دشمن کو
عزم راسخ کے لئے زغمہ اعدا کیا ہے

حق پسندی کی صفت ورثہ مادر کر دو
درد باطل کا بجز اس کے مداوا کیا ہے

جسم ملت کے لئے روح رواں ہو تم ہی
ہاروی تم نے ہی ہمت کو سہارا کیا ہے

کوہستان شملہ

بیان شملہ ہم نشیں
لکھوں یہ حوصلہ نہیں

ہمالیہ کے اوج میں
پہاڑیوں کے فوج میں

عجیب کوہسار ہے
بہار ہی بہار ہے

نشاط روح و قلب زار
ہوائے سرد و خوشگوار

سکون جان مضطرب
اثر ہے دلکشا عجب

مریض کی دوا ہے یہ
کہ رحمت خدا ہے یہ

وہ چوٹیاں فلک رسا — وہ گھاٹیاں خرد رسا
صنوبران سبز پوش — کھڑے ہیں صف بصف خموش
اگر سحاب آ گیا — پہاڑیوں پہ چھا گیا
نشیب میں فراز میں — ہوائے ترک تاز میں
وہ شور و باد و رعد و برق — رہا نہ روز و شب میں فرق
غضب کی سحر کاریاں — ستم کی برف باریاں
یہ کس کا سحر چل گیا — کہ رنگ ہی بدل گیا
وہ سبز پوش کیا ہوئے — کھڑے تھے جو کہ دیو سے
سفید ہیں پہاڑیاں — سفید ساری وادیاں
سڑک پہ کیا بہار ہے — کہ جان و دل نثار ہے
سحر ہے یا کہ شام ہے — ہجوم کا خرام ہے
پری رخاں شوخ و شنگ — لباس ہائے رنگ رنگ
بلا کی دل فریبیاں — غضب کی جامہ زیبیاں
وہ دل ربا نزاکتیں — وہ حسن کی قیامتیں
وہ جلوہ ہائے بے پناہ — نہ جم کے ہٹ سکے نگاہ

عجیب کوہسار ہے
بہار ہی بہار ہے

غزل

ملک الموت مجھے تھوڑی سی مہلت ویدے
اپنے معبود کو اس وقت تو راضی کر لوں

کلیم اللہ پہنچے طور تک شوق تکلم میں
وہ دل میں جلوہ فرما ہے جو چاہے گفتگو کر لے

جدہر دیکھئے فتنہ سامانیاں ہیں   ہوا و ہوس کی فراوانیاں ہیں

کب اس جہاں سے چاہ کئے جا رہی ہوں میں
جب تک بنے نباہ کئے جا رہی ہوں میں

امیر:۔ رحمت بیگم نام امیر تخلص، حیدرآباد وطن، یہاں ہی تولد ہوئیں، آپ کے والد ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب تھے، رحمت اللہ شریف صاحب سابق اول تعلقدار کی شریک حیات ہیں، تعلیم خانگی طور سے ہوئی، اردو، فارسی میں اچھی مہارت حاصل کر لی، شعر گوئی کا شوق ہے، کسی سے تلمذ نہیں۔

زیادہ تر غزل موزوں کرتی ہیں، کلام پاکیزہ اور سنجیدہ ہوتا ہے، خیالات میں جدت پائی جاتی ہے، تخیل کی رفعت اور بیان کی ندرت بھی قابل داد ہوتی ہے، کلام کا نمونہ پیش ہے۔

دیکھنا پیدا نہ ہو اس سے کسی کو اشتباہ   روئے زیبا پر نگاہ شوق جم جانا نہیں

خوب ہم سمجھے ہوئے ہیں ہم کو سمجھانا نہیں　　ناصحا اس لطف سے بالکل ہے تو نا آشنا
ہم نے کب ملنے کو ان کے مغتنم جانا نہیں　　اشتیاق دید میں ہر دم گزرتا ہے اسیر

فکر فردا ہے نہ اب ہم کو خیال دوش ہے
ایک ہم ہی کیا ہیں ساری بزم ہی مدہوش ہے
بڑھ گئی ہیں بحر آزادی کی طوفاں خیزیاں
ایک سفینہ وہ بھی اب طوفاں سے ہم آغوش ہے
دعوت دیوانگی دیتی ہے یہ دار فتگی
موج صبائے تفکر بھی جنوں بردوش ہے
مائل تقلید کیوں ہے آج کل ذوق سلیم
چشم بینا بند ہے اور عقل بھی روپوش ہے
کس قدر باغی آئین فطرت ہے اسیر
روح آزادی کا یہ جذبہ جراحت کوش ہے

بشیر:۔ بشیر النساء بیگم نام بشیر تخلص، حیدرآباد وطن، یہیں تولد ہوئیں، اور گھر پر عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم پائی، گھر میں علمی ماحول ملا، شادی کے بعد بھی خسر اور شوہر صاحب ذوق اور سخن فہم ملے، ان کی قدر دانی اور ہمت افزائی نے بشیر کے ذوق سخن کو اور زیادہ چمکا دیا۔

ان کے کلام میں پاکیزگی، حلاوت، انسانیت کا درد اور تصورات کی رفعت ملتی ہے، ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ

دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ بشیر کے کلام کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے بیحد متاثر ہیں، لیکن ان کی اپنی انفرادیت نے ہر مقام پر ندرت اور نفاست کے کنول کھلائے ہیں۔ کلام پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبال کی شاگردی ہیں جنہیں استاد نے خود اپنا رنگ سخن بخش دیا ہے،

بشیر کے کلام کا مجموعہ "آبگینہ شعر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں نظمیں، مرثیے، قصائد، غزلیات سب کچھ شامل ہیں، نظموں میں واقعہ نگاری بھی ہے اور مناظر قدرت کی وصف نگاری بھی، ان کا تسلسل بیان اور تخیل کی بلندی قابل داد ہے، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

داستانِ اقبال

چھائے آثار خزاں جب گلستان ہند پر ــــ اور گھرے ظلمت کے بادل آسمان ہند پر
ثبت مہر خاموشی تھی جب وہاں ہند پر ــــ نغمۂ حرف مدعا اک بھی زبان ہند پر

زندگی اور موت کا احساس تک باقی نہ تھا
کوئی اس اجڑے ہوئے مے خانہ کا ساقی نہ تھا

جب تباہ ہونے کو تھے ہم مغربی سیلاب سے ــــ آفتاب قوم چمکا مطلع پنجاب سے
زندگی کی لہر دوڑی اس کی آب و تاب سے ــــ نوجوانانِ وطن اٹھنے لگے پھر خواب سے

دھیمی دھیمی دور سے دلکش صدا آنے لگی
کاروان خفتہ میں "بانگ درا" آنے لگی

جادہ پیما سوئے منزل کارواں ہونے لگا ــــ پرچم اقبال کو تھامے رواں ہونے لگا

ذرہ ذرہ زندگانی کا جواں ہونے لگا　　آسماں پر شہرۂ ہندوستاں ہونے لگا

"شکوہ" اہل زمیں افلاک پر جانے لگے

بال جبریل امیں سوئے زمیں آنے لگے

آہ اے مسلم ترا آرام جاں جاتا رہا　　خون رو اے ہند تیرا پاسباں جاتا رہا

نظم ہستی کا وہ سچا ترجماں جاتا رہا　　وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

ملت آوارہ ہے میر کارواں رخصت ہوا

جب بہاریں آ رہی تھیں باغباں رخصت ہوا

اے عروج شاعری اب تیری قسمت لٹ گئی　　جس نے بخشی تھی حیات تو وہ دولت لٹ گئی

فخر حاصل جس سے تھا تجھ کو وہ نعمت لٹ گئی　　شعریت کی وہ ترنم ریز لذت لٹ گئی

قلب کو مسحور کر لیتا مگر ساحر نہ تھا

تھا امیں راز قدرت آہ وہ شاعر نہ تھا

طویل نظم ہے۔

ترقی پسند فن کار سے

اے ہم صفیر گو تری پرواز ہے بلند　　لیکن ترا کسی کو ترقی ہے ناپسند

میری نظر سے تیرے مقاصد نہاں نہیں　　تیرے خلوص عزم سے میں بدگماں نہیں

ہے تلخی حیات سے معمور تیرا جام　　تیری نظر میں قہر ہے بے ربطیٔ نظام

تیری نوا میں جذب ہے آواز زندگی　　تیرے نفکرات ہیں دم ساز زندگی

دل تیرا کائنات کا آئینہ دار ہے　　تیری صدا شکستہ دلوں کی پکار ہے

فطرت کو تو نے طرزِ تکلم سکھا دیا　　احساسِ زندگی کو ادب میں بسا دیا
لیکن سمجھ رہا ہے یہ سارا زمانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

سن میں بتاؤں اصل حقیقت عتاب کی　　اور اہلِ فن کی برہمی و اجتناب کی
وابستہ ہے جو نیشہ گران ہنر سے تو　　ہے دور دور اس لئے اہلِ نظر سے تو
رشحاتِ فکرِ خام کا تو پردہ وار ہے　　مہمل نگار شات کا خود اشتہار ہے
بن کر سحابِ فیض زمانے پہ چھائے جا　　انسانیت نواز ترانے سنائے جا
افکارِ نو میں وحدت نوعی تلاش کر　　اور سرمدی حیات کے اسرار فاش کر
تیرا پیام فکر و نظر عالمی رہے　　سر رشتہ فروغ عمل باہمی رہے
پیدا جہان تازہ ہو تیری نگاہ سے　　روشن ہو چشم دہر تری جلوہ گاہ سے
وابستہ تیرے دم سے ہے رنگینیٔ حیات　　تیرے لہو سے گرم و رواں روحِ کائنات
احساں گردعوتِ احساں کو بھول جا　　سوزِ یقیں میں شہرتِ ارزاں کو بھول جا

ذوقِ سفر پہ عشرتِ منزل حرام ہے
تیرا تو ہر مقام سے آگے مقام ہے

بشیر کی غزلیں بھی اقبال کے رنگ میں ہیں، ان میں سوز و ساز ہے، درد و غم ہے، تخیل کی بلندی ہے، جذبات کی روانی ہے، ندرتِ خیال ہے، لطفِ زبان ہے۔

بتاؤں کیا تمھیں میں کون ہوں کیا ہوں بہر صورت
سراپا درد ہوں اک ہستیٔ محرومِ درماں ہوں

میں یکتا ہوں نرٹ پنے، تلملانے، جان دینے میں
کبھی برق جہندہ ہوں کبھی میں ابر باراں ہوں
چمن میں پھول ہوں گل میں برنگ بو ہوں پوشیدہ
کہیں تعبیر ہستی ہوں کہیں خواب پریشاں ہوں

جو لذت میسّر ہے ذوق طلب میں　　نہیں اس سے واقف ترے عرش والے

فرشتے بھی نہ تھے واقف کہ یوں بن جائے گی دنیا
نہاں رازِ حیات دہر تھا گندم کے دانوں میں

مری فطرت کا ہر ذرہ ہے محو خود فراموشی
بظاہر آئینہ ہوں اور بباطن راز پنہاں ہوں

گردش چرخ کہہ رہی ہے بشیر　　جذب کامل سے کیا نہیں ہوتا

حیاء:۔ صغرا بیگم نام حیا تخلص بیگم ہمایوں مرزا حیدرآباد کی مشہور مصنفہ ہیں، آپ کا مفصل تذکرہ نثر نگار خواتین میں آئے گا، شاعری سے بھی آپ کو شغف ہے، حضرت جلیل مرحوم سے تلمذ حاصل تھا، زیادہ تر غزل اور سلام و نوحہ لکھا کرتی ہیں۔ کلام کا مختصر مجموعہ "انوار پریشاں" کے نام سے شائع ہوا ہے، کلام صاف اور سلیس ہے۔

مسکراتے ہیں بہت آج خدا خیر کرے　　نہیں معلوم کہ وہ کس سے دغا کرتے ہیں

کر چکے عشق بتاں ترک حیاءؔ اب تو ہم ذکر خدا کرتے ہیں

بت نہیں ہوتے وفادار کبھی ناز معشوق اٹھانا ہے عبث

سبھی مطلبی ہیں غرض کے ہیں بندے نہیں کوئی اب منہ لگانے کے قابل

مسز ڈی برکت رائے:۔ حیدرآباد کے مشہور دیوان راجہ چندو لال اور مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، ۱۸۹۴ء میں تولد ہوئیں، فارسی، اردو اور ہندی کے ساتھ انگریزی تعلیم گھر پر پائی، اردو اور ہندی شاعری اور مضمون نگاری سے دلچسپی ہے، قومی اور ملکی کاموں میں زیادہ حصّہ لیتی ہیں، بھگوت گیتا کا ترجمہ اردو نثر میں اور بچوں کے لئے نظمیں "بچوں کے تماشے" کے نام سے شائع کی ہیں پبلک جلسوں اور گھر میں ٹھیٹ اردو بولتی ہیں، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو،

برسات

کالے کالے بادل آئے پانی دیکھو بھر کر لائے
خشک زمیں میں آشا آئی پودوں کی امید بر آئی
ایشور نے یہ دن ہے دکھایا دیکھتے دیکھتے پانی آیا
دیکھو برسے بانہ برسے بارش کے لئے سول ہیں ترسے
اے لو بوندیں لگی برسنے بادل بھی لگے خوب گرجنے

اب تو موسلا دھار ہے پانی — جل تھل سب پانی ہی پانی
پیڑوں کا اشنان ہوا ہے — پودوں کا حمام ہوا ہے
نہا نہا کر سب نکھر گئے ہیں — بادل بھی اب بکھر گئے ہیں
خوشی سے پودے جھوم رہے ہیں — قدم ہوا کے چوم رہے ہیں

خوشی کسانوں پر ہے چھائی
امیدان کی بھی بر آئی

پہلے تو دیس بھارت امن و امان کا گھر تھا
رہتے تھے سب اکٹھے کوئی نہ خوف ڈر تھا
کیا ہو گیا ہے اب یہ جھگڑے کی ہے سمائی
کچھ بھول ہو گئی ہے سدھ اپنی ہے گنوائی
اپنے ہی بھائیوں پر آفت جو ڈھا رہے ہیں
آپس میں پھوٹ کر کے عزت گنوا رہے ہیں
امن و اماں کی دنیا برباد کر رہے ہیں
ناحق و ناروا ہی فریاد کر رہے ہیں
سنتا ہے کون اپنی ہم کس کو یہ سنائیں
یہ بھول ہے سراسر کس طرح یہ بتائیں

راحت:- راحت النساء بیگم نام اور راحت تخلص، حیدرآباد وطن سنہ ۱۳۳۰ھ میں تولد ہوئیں، اردو، فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی، شاعری کا

شوق کم سنی سے ہے غزل، نوحے، سلام اور مرثیے موزوں کرتی ہیں، کلام میں رنگینی اور شگفتگی پائی جاتی ہے، قدیم اسکول کی شاعری سے وابستہ ہیں، جدید رنگ سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

نیند کچھ ایسی ہی اللہ ہمیں آئی ہے — ہم نے کروٹ بھی بدلنے کی قسم کھائی ہے
جانتے ہیں خط قسمت نہ مٹے گا لیکن — ہم ہیں، چوکھٹ ہے تری اور جبیں سائی ہے
رنگ ایک بولتا جادو ہے ارے کیا کہنا — تجھ سے بڑھ کر تری تصویر میں گویائی ہے

دیر و حرم کا جھگڑا مدت سے ہو رہا ہے
کیوں بیچ میں پڑیں ہم قصے ہیں یہ پرانے
ہاں اب سمند ہمت آگے بڑھا کے دیکھو
کھاتے رہو گے کب تک ذلت کے تازیانے

شیل بالا:- آپ کے والد شری منگل پرشاد صاحب کا وطن آگرہ ہے، مگر اب شیل بالا صاحبہ، کنول پرشاد صاحب کی شریک زندگی ہونے سے حیدر آباد کو وطن بنالیا ہے، بی۔ اے اور بی ٹی میں کامیاب ہیں، زنانہ مڈل اسکول کی صدارت پر مامور ہیں زمانہ تعلیم ہی سے افسانہ نگاری اور ڈرامہ نگاری، شاعری اور اداکاری کا شوق رہا۔ ہندی اور اردو دونوں رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا ہے۔ اگرچہ ہنوز کلام کا مجموعہ شائع نہیں ہوا مگر بہت کچھ کلام جمع ہو چکا ہے۔ آپ کی شاعری کو "ہندوستانی" کہنا چاہیئے، زیادہ تر گیت لکھا کرتی ہیں۔

کس کو بھولوں کیا یاد کروں

سکھ دکھ دونوں ہی اپنے تھے — کس کو بھولوں کیا یاد کروں
دیکھو کے پلنوں پر پل کر — سکھ کے اس ورت رتھ پر چڑھ کر
میں نے تیا جیون دیکھا تھا — جیون کی گتی پہچانی تھی
میرے سپنوں کی الکا تب — سکھ میں جھومی مستانی تھی
پر بیٹا پنچھی وہ اندر جال — کھو گئیں سنہری بینار بن
ٹوٹے گنبد پر اساروں کے — ڈھ گئی دلکشی دیوار بن

جیون کے سونے سم تل کو
کیسے پھر سے آباد کروں

۲

چھائے تھے مدماتے بادل — مانو بھولے ہوں نیل کمل
مدھو کے کن رم جھم رم جھم — میرے مدھوبن میں بھرتے تھے
رک گئے اچانک کومل سر — جل دھر میں بجلی کڑک اٹھی
پرتھوی کے پلکت آنچل پر — جوالا اک پھر سے بھڑک اٹھی
مدھوبن کے مرد تھل پر بیٹھی — ہنس لوں میں یا کہ شاد کروں

کس کو بھولوں کیا یاد کروں

قمر:- صفیہ بیگم، قمر تخلص، آپ کے اجداد کا وطن لکھنو تھا مگر گزشتہ اسّی سال سے آپ کا خاندان حیدر آباد میں مقیم ہے، قمر کی ابتدائی تعلیم

اور تربیت حیدر آباد میں ہوئی، خاندان کے ماحول کے مد نظر کم سنی سے شعر کہنے کا شوق ہوا۔ زیادہ تر نظمیں لکھا کرتی ہیں، کلام میں سادگی، نفاست اور پختگی ہے

عورت

تکمیل ہوں انسان کی تفسیر وفا ہوں
طاعت کے طریقوں میں ملک سے بھی سوا ہوں
آلام و مصائب کی میں ہی عقدہ کشا ہوں
اور منزل الفت کی میں ہی راہ نما ہوں
انسان کی صورت میں آواز خدا ہوں

تاریخ کو الٹو مرے عادات کو دیکھو
ماضی کا سبق پڑھ کے ارادات کو دیکھو
طوفان حوادث میں مہمات کو دیکھو
اور باغ جہاں میں مرے ثمرات کو دیکھو
میں قافلہ والوں کے لئے بانگ درا ہوں

تہذیب و تمدن میں سدا ہاتھ بٹایا
انسان کو احساس فرائض کا سکھایا
خود صبر و قناعت پہ عمل کر کے دکھایا
اور خوگر ہمدردی و ایثار بتایا
واقف ہے ہر اک اہل بصیرت کہ میں کیا ہوں

قائم ہے مرے دم سے یہ سب شان بشر کی
شمشیر بکف رن میں تو رونق ہوں میں گھر کی
حامی ہوں ہمیشہ سے میں ایجاد و ہنر کی
بے میری حمایت کے مہم کونسی سر کی
لاریب میں ہم رتبہ مردان خدا ہوں

گرداب میں ہے کشتئ عمر اپنی پھنسائی
ہر منزل دشوار میں کی راہ نمائی
افسوس پسند اس پہ نہ خدمت مری آئی
رسوائی و ذلت ہی صدا حصہ میں آئی
ہر بیکس و مظلوم کی آواز دعا ہوں

مظلوم کی آہوں میں وہ قوت ہے اثر کی — خالی نہیں جائے گی دعا شام وسحر کی
رحمت سے ہم آغوش ہے فریاد قمر کی — امید قوی ہے مجھے راحت کے ثمر کی

جز درگہ حق کیوں میں کہیں ناصیہ سا ہوں

بیٹی کی قربانی

تمہارے دل کو دکھ ہوگا نہ کھلواؤ زبان میری
بہت پر درد ہے پیاری جمیلہ داستان میری
اسے شادی کہوں حیرت میں ہوں یا اپنی بربادی
کہ جس نے چھین لی مجھ سے مری بچپن کی آزادی
مرے ماں باپ ہیں اب کیا کہوں اُس کے سوا ان کو
کیا جو کچھ اونہوں نے خیر خوش رکھے خدا ان کو
خدا جانے کہ ان پر کیوں میں کمبخت ایسی بھاری تھی
نکل جاؤں میں گھر سے کیوں انہیں یہ بیقراری تھی
کہ جھونکا بھاڑ میں لخت جگر کو اپنے ہاتھوں سے
خوشی کیا خاک ہو سوچو تمہیں ایسی براتوں سے
وہ کہلاتا ہے بوڑھا جو ہوا چالیس سے اوپر
مرے وہ ہیں خدا رکھے اب اڑتالیس سے ڈیڑ
مرے سترہ برس میں بھی کئی ہفتے ابھی کم ہیں

مگر بیوی ہوں میں وہ میرے شوہر میرے ہمدم ہیں
ادھر سترہ ادھر کچھ کم پچاس اچھا بلا جوڑا
مرے جی کے جلانے کو یہی اک غم تھا کیا تھوڑا
کہ اس پر اک بلا سوکن کی بھی موجود ہے گھر میں
کسے معلوم تھا یہ کچھ لکھا ہے اس مقدر میں
یہ کہوں عقلوں پہ پردے پڑ گئے کیسا وبال آیا
کہ ابا کو نہ اماں کو کبھی اتنا خیال آیا

طویل نظم ہے۔

لطیف:۔ لطیف النساء بیگم، لطیف تخلص، سید مظفر الدین صاحب کی دختر، سید یوسف علی صاحب لکچرار سٹی کالج کی شریک زندگی محبوبیہ اسکول اور جامعہ عثمانیہ سے استفادہ کیا۔ ایم۔ اے میں کامیاب ہیں، نظم اور نثر دونوں میں مہارت ہے، نثر میں "من کی بپتا"، ولی کا تخیل، اردو شاعری میں تصوف آپ کے قابل قدر مقالے ہیں،

لطیف النساء بیگم بچوں کی نظمیں بڑی اچھی لکھا کرتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی زبان میں ماں کا دل بول رہا ہے، غزلوں میں تسلسل خیال پایا جاتا ہے جدید ندرت کے ساتھ صفائی اور سادگی بھی پائی جاتی ہے، سلام اور نوحہ بھی لکھا کرتی ہیں ایام عزا میں ممبر سے جادو بیان کرتی ہیں،

تب سوز غم سے جلا چاہتی ہوں گناہوں کی اپنے سزا چاہتی ہوں
ہوئی زندگی تلخ ہاتھوں سے جس کے اس کا ہمیشہ بھلا چاہتی ہوں

عشق نا فرجام کا انجام ہے — کو بکو بیمار غم بدنام ہے
اہل دنیا موت کہتے ہیں جسے — اک سکون قلب ہے آرام ہے

ہر اک ذرہ سے آتی ہے صدا یہ — نشانی ہے یہیں اس بے نشاں کی

اشارہ نزع میں ہے نیم باز آنکھوں کا — خمار محفل عیش و سرور باقی ہے
اگرچہ خرمن امید لٹ چکا اپنا — پہ سوزش دل اہل حسود باقی ہے

تاروں کا مدرسہ

فلک پہ جو تارے ہیں یہ جگمگاتے — کہاں سارا دن امی جاں ہیں یہ جاتے
ہے شاید کوئی مدرسہ ان کا امی — اندھیرے ہی سے جس کی بجتی ہے گھنٹی
بہت ہی سویرے سے تیار رہ کر — یہ سب وقت پر جا کے ہوتے ہیں حاضر
وہیں ہونگے دن بھر یہ سب لکھتے پڑھتے — حساب اور قواعد بھی ہونگے یہ کرتے
وہ تارا کتنا ہیں بڑی ہو گا پڑھتا — یہ ننھا سا پڑھتا الف با بے تے ہو گا
بہت دور گھر سے یہ بیچارے دن بھر — پڑے رہتے ہونگے جماعت کے اندر
بڑے ہوں گے استادوں کے غصیلے — جگہ سے سرکنے بھی ہوں گے نہ دیتے
جو ہو گا کوئی بھی ذرا جھانک لیتا — تو کونے میں ہو گا کھڑا ہونا پڑتا
یہ تاروں کا ہے مدرسہ کیسا امی — بڑی دیر سے اس کو ہوتی ہے چھٹی
نظر آتے ہیں بعد مغرب کے تارے — نہیں دیکھتے ماں کو دن میں بچارے
ترس ان پہ آتا ہے امی مجھے تو — اندھیرے میں آتے ہیں بیچارے گھر کو

پلٹنے والے گووہوں میں احمد مختار کی
جو سننے والے زبان کو خنجر اسرار کی
واہ کیا کہنا ترا! اے راکب دوش نبی
تو نے دی تاثیر دکھلا فاطمہ کے شیر کی
حشر تک باقی رہا اسلام پر احساں ترا
کارنامہ نے ترے تاریخ کو چمکا دیا
ٹوٹتا ہے کفر کیونکر تو نے بتلایا ہمیں
کس طرح مرتے ہیں حق پر تو نے دکھلایا ہمیں
رجس سے ہے دور تو وہ پیکر تنویر ہے
جس پر قدرت نے قلم توڑے تو وہ تصویر ہے

مظہر:- سعیدہ بیگم نام مظہر تخلص، آپ کے والد سررشتہ تعلیمات میں ملازم تھے اس لئے سعیدہ بیگم کو بچپن سے علمی دلچسپی رہی، جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی، ایم۔ اے میں آپ کا مقالہ نظیری نیشاپوری پر تھا جس کو آپ نے نہایت تلاش اور تحقیق سے قلمبند کیا ہے اس میں نہ صرف نظیری کے حالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اس کے کلام پر تنقید بھی ہے۔ مظہر کو شاعری، افسانہ نگاری دونوں میں مہارت ہے، آواز بھی خداداد ہے، اس لئے جب وہ اپنی نظم سناتی ہیں تو ایک عجیب سماں بندھ جاتا ہے، ان کے افسانے پلاٹ، کردار کے لحاظ سے قابل ستایش ہوتے ہیں۔ ان میں روانی اور لطافت پائی جاتی ہے، ڈرامہ نگاری میں بھی دخل ہے کئی اچھے ڈرامے لکھے ہیں، مس پرل بک کے ایک ناول کا ترجمہ فنیغم کے نام سے شائع کیا ہے، ادب اطفال میں اونھوں نے کئی ایک کتابیں لکھی ہیں،

شاعری میں نظم اور غزل دونوں موزوں کرتی ہیں، ان کے کلام میں تخیل کی بلندی، اسلوب کی ندرت اور زبان کی شگفتگی پائی جاتی ہے، پولیس ایکشن کے بعد اونھوں نے حیدرآباد کو چھوڑ کر پاکستان کو وطن بنا لیا ہے اور وہاں ادبی

خدمت میں مصروف ہیں، چونکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ حیدرآباد میں بسر ہوا، اور یہاں ہی سے ان کی ادبی خدمات کی ابتدا ہوئی اس لئے "دکن میں اردو" میں ان کا تذکرہ نہ کرنا صحیح نہ ہوگا۔

کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

نوشابہ:- نوشابہ خاتون، نام نوشابہ تخلص، آپ کے والد مولوی عبدالحق صاحب، نائب ناظم پولیس اضلاع تھے، ۱۳۳۰ھ میں نوشابہ خاتون[۱] کی ولادت حیدر آباد میں ہوئی، گھر پر تعلیم ہوئی، خانگی تعلیم سے پنجاب یونیورسٹی کا امتحان منشی فاضل اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی، آپ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے جامعہ عثمانیہ سے یہ ڈگری اس وقت حاصل کی جبکہ زنانہ کالج بھی قائم نہیں ہوا تھا، دس سال کے سن سے شاعری کا شوق ہے، اور عمر کے ساتھ وہ پختہ ہوتی گئی، کسی سے تلمذ نہیں ہے، "موج تخیل" کے نام سے نوشابہ کا مجموعہ کلام شائع ہو گیا ہے، ہر صنف سخن میں آپ نے فکر کی ہے، کلام میں سادگی، صفائی، تاثر موجود ہے، طرز ادا کی جدت، تخیل کی بلند پروازی قابل داد ہے۔

مدت تک زنانہ کالج میں عربی کی لکچرار رہیں، مگر اب کئی سال سے دماغی ضعف اور بیماری نے آپ کو ہر قسم کے کام سے معطل کر دیا ہے، خلافت کے جلسوں میں آپ کی نظمیں جوش پیدا کر کے خراج تحسین حاصل کرتی تھیں، اسی زمانہ میں بعض نظمیں بھی شائع ہوئیں، اور عام خاص میں مقبول ہوئیں۔ غزلوں کا حصہ آپ کے مجموعہ میں کم ہے، زیادہ تر نظمیں ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے۔

خسرو خاور

شق ہونے لگا ہے پردۂ شب اب خسرو خاور آتا ہے

ہے رخ پر مقنع کرنوں کا وہ مہر منور آتا ہے

کیا دوش پہ ڈالے ستار ہ رده نور کی چادر آتا ہے
لو رنگ سحر بھی کھلنے لگا ظلمات کا بادل چھٹنے لگا
دامان شفق جو سمٹنے لگا خورشید نقاب الٹنے لگا
کیا جلوہ گری صناعِ ازل مہر فلک کو بخشی ہے
مر ہون کرم ہر تار نفس شرمندۂ احسان ہستی ہے
آباد اشارے سے جس کے دنیا کی یہ ساری بستی ہے
یہ سارے کرشمے اس کے ہیں جو خالق ہے جگت داتا ہے
جو سندر سندر روپ نئے ہر آن ہمیں دکھلاتا ہے

طویل نظم۔ ہے سری نگر کے شالا شاہی باغ پر ایک عمدہ نظم ہے ۔
ملاحظہ ہو

اٹھ دا ابر کوہ سے، ہونے لگا گہر فشاں　　چوٹی بھی کس شکوہ سے بادلوں سے ہے ہمعناں

دامن کوہسار سبز
وادی و شاخسار سبز
آئی ہے جو بہار سبز
سارے ہیں برگ و بار سبز

فرش زمیں زمردیں نیلگوں چتر آسمان　　موج ہوا عنبریں، قطعہ ہے سارا بوستان

قلۂ کوہسار برف
منظر پہ بہار برف
کیوں نہ ہو آبدار برف

یاں ہے گہر نثار برف

قدرت کردگار ہے، ذرہ خاک سے عیاں　　ظاہر و آشکار ہے شان خدائے دو جہاں

باغ و راغ گل بدوش

قوت نامیہ بجوش

ساری زمیں ہے سبز پوش

دامن کوہ گل فروش

رنگ شفق لالہ گوں خرچ کا دل ہوا ہے خوں　　نور سپہر ہے فزوں چادر آب سیمگوں

باندھے ہوئے ہیں صف دیار

سرو کہیں، کہیں چنار

بید کہیں ہیں سایہ دار

سیب کہیں، کہیں انار

تازگی بخش ہے فضا اور سماں نشاط روح　　موج ہوا وہ دلفزا جس سے ہو انبساط روح

نغمہ سرا ہیں یاں ہزار

گونج رہے ہیں سبزہ زار

جھوم رہے ہیں شاخسار

مست ہیں سارے جاندار

نقرئی جوئبار ہے سیمگوں آبشار ہے　　منظر پر بہار ہے رحمت کردگار ہے

نکہت گل ہے عطر بار

دشت و جبل ہیں لالہ زار

وردو سمن کی ہے بہار
قدرت حق ہے آشکار
روح فزا نسیم ہے پھیلی ہوئی شمیم ہے
فضل خدا عمیم ہے خطہ یہی نعیم ہے

جامۂ ہستی کی اے وحشت اڑا دے دھجیاں
اب جدا مہمان ترا دنیائے دوں ہونے کو ہے
کیوں تری حسرت پہ نوشابہ نہ روئے بیکسی
تھا جو قسمت کا لکھا پورا وہ یوں ہونے کو ہے

اپنی ہستی کو مٹا کر بن فروغ انجمن
شمع سے کچھ سیکھ لے سوز و گداز زندگی
منتشر شیرازۂ اوراق ہستی جب ہوا
آشکارا ہو گیا دم بھر میں راز زندگی

پھونک ڈالے جرعۂ خوش رنگ نے قلب و جگر
جس طرح پھولوں نے ہو خون عنادل پی لیا
روح فرسا ہو چکی ہے تلخیٔ صہبائے غم
ہم نے سرشاری میں خمخانہ ہی کامل پی لیا

نسیم:- وحیدہ خاتون، نسیم کے اجداد کا وطن یو۔ پی ہے، مگر گزشتہ اسّی سال سے آپ کے آباء و اجداد حیدرآباد میں رہتے ہیں، ان کے والد مولوی محمد فریدالدین اورنگ آباد میں وکیل ہیں ۱۹۲۵ء میں وحیدہ نسیم کی ولادت ہوئی، اورنگ آباد ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد جامعہ

عثمانیہ سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی، اس طرح آپ سائنس کی اسکالر ہیں
نسیم شاعری کی فضاہیں پروان چڑھیں ان کے نانا اعجاز حسین اعجاز اور چچا خورشید احمد
خاور دونوں اچھے شاعر تھے، اس طرح نسیم کو کم عمری سے شاعری کا شوق ہوگیا،
اسکول کے زمانہ سے ان کی شاعری کا چرچا تھا، "نغمہ اسکول" لکھ کر انعام حاصل کیا،
آپ بڑی پرگو شاعر ہیں، اگرچہ اب تک کلام کا مجموعہ شائع نہیں ہوا، مگر پانچ ضخیم
حصے مرتب ہوگئے ہیں جن کو علحدہ علحدہ ناموں سے موسوم کیا ہے کوثر و تسنیم
میں مختلف موضوع کی نظمیں ہیں، ساغر صہبا میں غزلوں کو شامل کیا ہے تبسم حیات
مزاحیہ کلام ہے، طفلستان بچوں کے لئے نظمیں ہیں، اور ورد لادوا میں سیاسی
نظمیں ہیں، وحیدہ نسیم کی شاعری سادگی، نازک خیالی، تاثر کا مجموعہ ہے، واقعہ نگاری
اور وصف نگاری میں جدت ہے خیالات میں عمق ہے، مزاحیہ شاعری میں
مزاح ہے ہجو نہیں ہے، غزل میں سوز و گداز ہے، رنگینی اور لطافت ہے، کلام
کا نمونہ یہ ہے۔

تلاش سکون

دریا کا ہے کنارہ اور شام ہے سہانی
خاموشیوں میں دیکھی دریا کی ہے روانی
لیلائے شام نے جب زلف سیاہ کھولی
پھیلی ہے بن کے افشاں تاروں کی ساری ٹولی
جوڑا عروس شب نے پہنا ہے آسمانی

اور اس پہ پھر بنائی قدرت نے کامرانی
تاروں کی یہ نگاہیں کس چیز پر گڑی ہیں
صحرا کی جھاڑیاں سب کس سوچ میں پڑی ہیں
رونق وہ دن کی کیوں اب کم سب کو ہو گئی ہے
تاروں کی چھاؤں میں کیا ہستی بھی کھو گئی ہے
اے چھوٹے چھوٹے تارو ہر دم چمکنے والو
اوج فلک کا کوئی قصہ مجھے سناؤ
غائب وجود ہو گا ہو گا سکون طاری
ہاں موت ہی سکوں ہے ہستی ہے بے قراری
گزریں یہ ساری باتیں خواب و خیال ہو کر
اک بات رہ گئی ہے دل میں سوال ہو کر
نکروں سے یہ کیا تاروں کی بھی جبیں ہے
دنیا میں کیا کہتی اصلی سکوں نہیں ہے

وحیدہ نسیم ترقی پسند شعرا سے متعلق نہیں ہیں مگر پھر بھی "مزدور" پر ایک دلچسپ نظم لکھی ہے۔

سامنے دیکھوں وہ اک مزدور ہے
مفلسی ہے سخت اور مجبور ہے
دھجیوں سے کچھ ڈھکا ہے اس کا تن
جال ہے نیلی رگوں کا یا بدن
دوپہر ہے سخت لو ہے چل رہی
آگ سے ساری زمیں ہے جل رہی
حال اس کا ہو گیا ایسا برا
بوجھ اٹھانے کی نہیں طاقت ذرا

بوجھ بھاری یہ نحیف و ناتواں — جسم میں آخر نہیں کیا اس کے جان
یہ ضعیفی اور مزدوری کرے — آہ وہ بھی چند پیسوں کے لئے
اک دفعہ پھر اس نے دیکھا اپنا حال — آگیا پھر بھوکے بچوں کا خیال
بے کس و لاچار جو انسان ہے
آہ وہ مزدور ہندوستان ہے

غزلوں کا نمونہ۔

لب پر لاکر حرف محبت عشق کو رسوا کون کرے
وہ بھی چپ ہیں ہم بھی چپ ہیں راز کو افشا کون کرے
جو زخم لگایا اوروں نے اس زخم کو اچھا دل نے کیا
جو زخم لگایا خود دل نے اس زخم کو اچھا کون کرے

اپنے ذوق نظر کی غلطی تھی — ہم سے بت کو جو پارسا سمجھے
کہہ دیا ہم نے سب کچھ اس سے نسیم — اب نہ سمجھے تو پھر خدا سمجھے

نگہ ناز سے بس ایک اشارہ پا کر تو
یوں مچل جائیں گے ارماں مجھے معلوم نہ تھا
ان کی نظروں سے نسیم اپنی لڑا کر نظریں
آنکھیں بن جائیں گی نیساں مجھے معلوم نہ تھا

جام مے سے نہ تعلق رہا مے خانہ میں — تری آنکھوں ہی سے پی ساغر و صہبا کی قسم

تو ہر جگہ ہے سجدہ کعبے کو کس لیے　　وہ کون سنگ ہے جو ترا آستاں نہیں

مزاحیہ نمونہ یہ ہے۔

کیا کروں حال ہوسٹل کا بیاں　　جو رہیں گے انہیں یہ ہوگا عیاں
اس کی تعریف میں جو نظم کہوں　　ایک جنجال میں خود ہی پھنسوں
بات سچی ہے بے مزہ لگتی　　میں کہوں گی مگر خدا لگتی
نام مت لیجئے سیویوں کا　　کھیر ٹیڑھی ہے کھیر کا پکنا
نہ جلیبی کا یاں پہ حلوا ہے　　نہ تو قسمت سے اپنی حلوا ہے
عید کا چاند ہے سوہن ہپڑی　　اور نایاب ہے یہاں برفی
طرفہ ہے ایک اور کھٹی دال　　کھانا جس نے کہ کر دیا ہے محال
گوشت کی روح سوختہ ہوئی ہے　　کوفتے کھا کے کوفت ہوئی ہے
ہم خود ہی جبکہ ہیں کباب سیخ
کس طرح سے لگیں کباب سیخ

"دھوبن کی یاد" کے چند بند یہ ہیں۔

چادر بہت ہے میلی بستر یہ کیا بچھائیں　　میلے غلاف ہیں سب تکیہ کیا چڑھائیں
بستر کی دیکھ حالت مٹی نے لی بلائیں　　تو ہی بتا دے دھوبن کالج کو کیسے جائیں
میلی پڑی ہوئی ہیں سب ساڑیاں ہماری
غصے میں خوب اکتے ہم سب بھرے ہوئے ہیں　　دھوبن کے پاس آدھے کپڑے گئے ہوئے ہیں
اور اس سے زیادہ جواب میلے پڑے ہوئے ہیں　　باقی بچے ہیں جو کچھ تن پر چڑھے ہوئے ہیں
خالی پڑی ہوئی ہیں الماریاں ہماری

نثر نگاری:- نثر نگار خواتین میں افسانہ نگار بھی ہیں اور نقاد بھی، ادیب بھی ہیں اور انشاء پرداز بھی، مقالہ نگار بھی ہیں، اور مؤرّخ بھی شاعر خواتین سے ان کی تعداد زیادہ ہے۔ مگر ہم چند مشہور نثر نگار خواتین کا تعارف کراتے ہیں، جن کے کارنامے ہر آئینہ قابل قدر اور لائق ستائش ہیں۔

پہلے ہم ان خواتین کا تعارف کراتے ہیں جو چھوٹے دور سے ادبی خدمات میں مصروف ہیں اور ان کو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں ہے، ایسی خواتین کی تعداد اچھی خاصی ہے مگر ہم صرف چند کا بیان ذکر کرتے ہیں۔

صغرا بیگم:- صغرا بیگم ہمایوں مرزا حیدر آباد کی مشہور خاتون ہیں جنہوں نے مختلف حیثیتوں سے نام آوری حاصل کی ہے، وہ شاعرہ بھی ہیں اور نثر نگار بھی، ان کی قومی اور ملکی خدمات بھی ہر آئینہ لائق ستائش ہیں، مسلم خواتین میں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے پردہ سے باہر آکر مردوں کے مجمع میں تقریر فرمائی اور دوسروں کے لئے ایک مثال اور نمونہ پیش کیا، ۱۸۸۴ء میں حیدر آباد میں آپ کی ولادت ہوئی اور خانگی طور پر اردو فارسی کی تعلیم پائی، پٹنہ کے متوطن سید ہمایوں مرزا صاحب سے آپ کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد مرزا صاحب نے حیدر آباد کو وطن بنا لیا، صغرا بیگم نے اپنے شوہر کے ساتھ یورپ اور مقامات مختلفہ کی سیاحت کی، ہندوستان کے شمال اور جنوب اور مشرق کے دور دور تک سفر کیا اور سفر نامے قلمبند کئے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً پندرہ ہے جس میں زیادہ تر سفر نامے شامل ہیں، ناول اور مختصر افسانے بھی لکھے ہیں، اور اصلاحی اور معاشرتی مضامین بھی، مضامین کا ایک مجموعہ

"مقالات صغریٰ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اور کثیر مضامین رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، صغرا بیگم کے ناول اور افسانے سماجی اور اصلاحی ہیں، ان کا اسلوب بیان صاف اور سادہ ہوتا ہے، وہ عام فہم ہوتے ہیں، یورپ میں بھی آپ نے اردو میں تقریر کی تھی، ایک زنانہ مدرسہ "صغریہ" قائم کیا ہے، جس میں تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت دستکاری سکھائی جاتی ہے، اپنی ایک بڑی جائداد اس کے لیئے وقف فرمائی ہے۔

آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"ایک نہایت حسین لینڈو گاڑی جس میں مشکی رنگ کے ولیر گھوڑوں کی جوڑی جتی ہوئی ہے۔ ایک خوبصورت و عالی شان کوٹھی میں جو ایک خوش منظر مقام پر واقع ہے جس کا چمن اقسام کے پھول پتوں سے لہلہا رہا ہے داخل ہوئی، سیدھی زنانہ ڈیوڑھی پر جا کھڑی ہوئی، ڈیوڑھی وارنی نے اندر جا کر خبر کی ایک پیش خدمت کو صاحب خانہ نے حکم دیا کہ جا کر سواری اتار دو جو بیوی اس گاڑی میں آئی تھیں اتر کر محل سرا میں داخل ہوئیں، صاحب خانہ نے نہایت تپاک سے اپنے مہمان کو گلے لگایا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈرائینگ روم میں لے گئیں اور کہا ہاجرہ تم تو ٹھیک وقت پر آگئیں اب مسز عون وغیرہ کا انتظار ہے۔ ہاجرہ: کہئیے اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟ مجھے تو رات کو رہ رہ کر بیچاری استانی کا خیال آیا کیا۔ دراصل قابل رحم ہے، ہر طرح سے لٹ گئی۔ سارا میری بھی یہی کیفیت رہی۔ ان کی تکالیف کا سماں آنکھوں کے سامنے کھچا رہا"۔ (سرگزشت ہاجرہ)

"گاندربل سے مانس بل آٹھ نو میل ہے، کشمیر میں یہ جھیل نہایت خوبصورت

سمجھی جاتی ہے، اس لئے میں دیکھنے گئی ایک طرف سر بفلک پہاڑوں کا سلسلہ ہے، ان پہاڑوں پر درخت نہیں ہیں، مٹی اور پتھر کے پہاڑ ہیں ان پہاڑوں کے دوسری طرف بستی و آبادی ہے اور بیچ میں جھیل مانس بل ہے، اس جھیل میں سرخ سرخ کنول کے پھول سبز سبز پتوں میں نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے، یہ پھول فروخت ہوتے ہیں اس کا ایک ٹھیکہ دار ہے وہ بیچتا ہے ہم نے خرید کئے، ایک طرف میدان ہے۔ یہاں چھوٹا سا باغ ہے اس جگہ ایک فقیر کا غار ہے جس کو گفہ کہتے ہیں اس فقیر کا نام احمد شاہ تھا۔ اس کا مزار اسی غار کے قریب ہے، مسجد بھی ہے ان کی اولاد بھی ہے وہ لوگ ہمارے پاس آئے اور احمد شاہ کے حالات بیان کئے۔ اور ایک چراغ روشن کر کے ہم کو اس غار کے اندر لے گئے۔ دس گز لمبا غار ہے۔ فقیر کی غار کی جگہ بھی وہیں ہے''

(رہبر کشمیر ص ۸۸)

سارا بیگم:۔ آپ کے والد مولوی احمد مدنی مدرسہ دار العلوم میں مدرس تھے اور والدہ رقیہ بیگم محبوبیہ زنانہ مدرسہ میں عربی، فارسی اور اردو کی معلمہ تھیں، ۱۳۱۱ھ میں سارہ بیگم کی ولادت ہوئی، گھر پر والدین اور نانا سے عربی، فارسی، اردو کی تعلیم پائی، پھر محبوبیہ اسکول میں شریک ہوئیں۔ مضامین نویسی اور افسانہ نگاری میں انعامات حاصل کئے۔ ۱۹۱۶ء میں اسی مدرسہ میں آپ کا تقرر ہوا۔ چند سال کے بعد بوجہ خرابیٔ صحت وظیفہ حاصل کر لیا۔

''ماتم سروش'' اساس القواعد، انسداد گداگری۔ آپ کی مستقل تصانیف ہیں، شاعری میں بھی دخل ہے، سارہ تخلص کرتی ہیں،

"ماتم سروش" میں اپنے بھائی ابو نصر فتح اللہ بی۔ اے۔ ایچ۔ سی۔ ایس کے حالات قلمبند کئے ہیں، جو عالم جوانی میں قضا کر گئے تھے۔ کئی مضامین رسالہ افادہ میں شائع ہوئے ہیں سارہ بیگم کا اسلوب بیان صاف سادہ ہوتا ہے، نمونہ عبارت پیش ہے۔

"جیبیہ کے پھول پہنانے کے بعد بھائی بہنوئی سب بیٹھے ہیں ہنسی دل لگی ہو رہی ہے، اور دولہا دولہا کہکر اسے چھیڑ رہے ہیں، ایک طرف گراموفون بج رہا ہے، اور میں ایک طرف (اس دن طبیعت اچھی نہیں تھی) پلنگ پر پڑی ہوئی ہوں، ایک دم میرے دل میں آگیا

جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

اور اسی خیال کے ساتھ ہی میں ایک جھرجھری لے کر اٹھ بیٹھی کہ نہیں یوں ہونا چاہئے جہاں ماتم ہوتے ہیں وہاں نقارے بھی بجتے ہیں، ماتم تو ہو چکے اب نقارے بھی بجنے چاہئیں، اتنے میں طاہرہ نے عجب طرح سے تڑپ کر کہا کہ ارے اتنی خوشی مت کرو کہ خدا کو بُری لگے، یہ سُن کر نواب ذرا چیں بہ جبیں ہو گیا کہ آپا آپ لوگوں کی کیا باتیں ہیں خوشی کے موقع پر بھی خوشی کرنے نہیں دیتے۔ طاہرہ نے کہا ہاں زیادہ خوشی مت کرو میرے دل میں وہم آتا ہے۔"[1]

بیگم منیر الزماں:۔ اگرچہ آپ کے بزرگوں کا وطن شمالی ہند ہے، مگر عرصہ دراز سے آپ کا خاندان حیدرآباد میں مقیم ہے، اور اسی کو وطن بنالیا ہے، بیگم منیر الزماں نے ایک علمی ماحول میں پرورش

---

[1] ماتم سروش صفحہ ۴۶

پائی اور گھر میں خانگی طور سے عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم پائی، آپ کی ایک تصنیف "رنگین لباس" شائع ہوئی ہے، اس کا پیش لفظ مسز سروجنی نائیڈو اور "مقدمہ" مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے لکھا ہے، اس کتاب میں مختصر طور پر رنگوں کے سائنس، نفسیات اور زندگی پر ان کے اثرات سے بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ لباس اور سنگھار میں ان کی شان اور موزونیت کس طرح قائم رکھی جائے۔

بیگم منیر الزماں ایک پاکیزہ ذوق اور گہری نظر رکھتی ہیں، ان کی تحریر دلچسپ اور عام فہم ہوتی ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

"کسی مفکر کا مقولہ ہے کہ "کوئی عورت اس حسن کو نظر انداز نہیں کر سکتی جو رنگ اس کو عطا کرتا ہے" اس ہتھیار سے وہ ہمیشہ مسلح رہنا چاہتی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ایسے دلکش اور دلفریب ہتھیار سے وہ ہاتھ دھو بیٹھے عورت رنگ کے جادو سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اس کی ہمیشہ تمنا رہی ہے اور رہے گی کہ اس تیز ہتھیار پر توازن و تناسب کی دھار چڑھتی رہے، کون چاہ سکتا ہے کہ رنگ کی سحر آفرینی اس کی معاون نہ ہو اور کس کی خواہش ہو سکتی ہے کہ حسن میں ناموزون رنگ سے ضعف پیدا ہو جائے آج کل تقریباً ہم سب لباس کے بارے میں مروجہ فیشن کو برحق سمجھتے ہیں، بڑے بڑے پارچہ باف رنگریز دکاندار تاجر اپنے فائدے کی خاطر نئے نئے فیشن نکالتے ہیں"۔

گوری صورت، اس سے وہ گوری صورت مراد ہے جس میں پیلا پن ہو زردی کی جھلک کہیں کہیں معلوم ہوتی ہو اور رنگ سفید گلاب کی پتی کا سا ہو

یا سنہرا پن نمایاں ہوتا ہو۔

اس نسوانی حسن میں ہلکاپن اور نزاکت دونوں معلوم ہوتے ہیں مگر عام طور پر چونکہ جوش اور گرمی حسن کا شائبہ نہیں ہوتا اس لئے اس کے جوڑ کے لئے ایسے رنگوں کا انتخاب کرنا چاہیئے جن سے پھیکا پن نہ بڑھے بلکہ سرخی کی جھلک پیدا ہو اور گرمی حسن میں ترقی ہو .... مذکورہ بالا اغراض پورے کرنے کے لئے موزوں ترین رنگ سبز ہے۔" (رنگین لباس)

پادشاہ بیگم صوفی:۔ نواب محمد یار جنگ (مولوی غلام محمد صاحب) کی دختر ہیں، نواب صاحب عربی اور فارسی کے عالم تھے، اور انگریزی سے ناواقف ہونے پر بھی اپنی اولاد کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلائی، بادشاہ بیگم آپ کی بڑی دختر ہیں ۱۳۱۷ھ میں تولد ہوئیں۔ گھر پر تعلیم پائی پردہ کی پابندی کے ساتھ مدراس یونیورسٹی سے ایف۔ اے میں کامیاب ہوئیں اور شادی اور صاحب اولاد ہو کر علی گڈھ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں لیں اور پھر یورپ جا کر ڈپلوما حاصل کیا۔

اولاً محبوبیہ اسکول میں عربی، فارسی کی تعلیم پر مامور ہوئیں پھر مہتمم مدارس کی خدمت کو عرصہ تک انجام دیا، اور اب وظیفہ حاصل کر لیا ہے، مضمون نگاری سے دلچسپی ہے، رسالہ سب رس، شہاب وغیرہ میں آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں، نشرگاہ حیدرآباد سے آپ کے مضامین نشر ہوتے ہیں شہزادی درشہوار کو آپ ہی نے اردو کی تعلیم دی۔ آپ کی تحریر عام فہم معلومات آفرین اور دلچسپ ہوتی ہے۔

"ایک مشنری میم بازو کی کرسی پر آکر بیٹھی اور مجھ سے مخاطب ہوئی مختلف مضامین پر مکالمہ شروع ہوا میں نے کہا میں اس امر کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں کہ مشنریوں نے ہندوستان کی ایک گونہ خدمت کی ہے، دور دراز مقامات میں و شوار گذار دیہات میں آپ نے ہسپتال بنائے ہیں، مدرسے قائم کئے ہیں، بیشک دہقان آپ کے وجود کو خدا کی نعمت سمجھتے ہوں، گو آپ کی اصلی غرض اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت ہوتی ہے، لیکن آپ کی ایثار نفسی، عزم و استقلال و بنی نوع انسان کی خدمت قابل ستایش و قابل رشک ہے"[1]

رابعہ بیگم:- احمد مدنی صاحب کی دختر سارا بیگم کی چھوٹی بہن، حیدرآباد میں ۱۳۱۸ھ میں تولد ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی اور پھر محبوبیہ اسکول سے جونیر کیمبرج کا امتحان پاس کیا، اسی مدرسہ میں عرصہ تک عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم دیتی رہیں۔

اردو شاعری اور نثر نگاری سے پوری دلچسپی ہے، حیدرآباد کے معیاری رسالوں افادہ، سب رس وغیرہ میں آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ نشرگاہ سے آپ کی تقریریں نشر ہوتی ہیں، علمی اور معاشرتی انجمنوں میں آپ کی تقریر معلومات آفرین اور دلچسپ ہوتی ہے۔

"سوتیلی ماں" آپ کی ایک تصنیف شائع ہو چکی ہے، جس میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ "سوتیلی ماں" کا رشتہ کس طرح کامیابی سے ہو سکتا ہے اور وہ کیا طریقہ ہے جس سے سوتیلی ماں حقیقی ماں کا نمونہ بن سکتی ہے۔

---

[1] رسالہ سب رس جولائی ۱۹۳۸ء

"دنیا میں فسادات کی جڑ حق تلفی ہے۔ اگر سب متعلق ہستیاں ایک دوسرے کے حقوق پر نظر رکھیں تو ناخوش گوار واقعات پیش ہی نہیں آسکتے، دوسرے کو اس کے حق سے کم دینا اور اپنے حق سے زیادہ لینے کی ہوس کرنا انسانیت نہیں درندگی ہے، اگرچہ تنازع للبقا کا مسئلہ فطری ہے لیکن اس کے جواز نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے کھا جانے کا حق نہیں دیا۔ جو اس قسم کی ذہنیت رکھے وہ بے شبہ انسان نما درندہ ہے۔ خواہ وہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہو یا اجتماعی شخصیت کوئی شریف اور شریف النفس شخص حق دار کا حق تلف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" (سوتیلی ماں صفحہ ۲۵)

"تمدن و تہذیب اور ترقی و تنظیم ملک کے لئے وسیع عمدہ اور مصفا سڑکیں بھی ایک جزو اعظم کی حیثیت رکھتی ہیں، تجارتی سہولت کاروباری آسانیوں، اقتصادی ترقیوں، بیرونی افراد کے ساتھ باہم معاملت کی مشکلات کے حل کا راز اسی میں پنہاں ہے، جب تک کہ کسی ملک کے داخلی وسائل حمل و نقل اور ذرائع آمد و رفت وسیع اور کافی نہ ہوں صحیح معنوں میں وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا قیاس کیا جاتا ہے کہ جاپان کی ترقی کا ایک سبب اس کی کثیر و وسیع سڑکیں بھی ہیں۔ بیسویں صدی سے پہلے ریاست حیدرآباد کی سڑکوں کی جو حالت تھی اس کی زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں سڑکوں کا مجموعی طول صرف ایک ہزار میل تھا۔" (نذر دکن صفحہ ۸۹)

جہاں بانو بیگم:۔ جہاں بانو بیگم کی دادیال صوبہ بہار سے آ کر حیدرآباد میں بس گئی اور نانہال ایران سے تعلق رکھتا ہے

جہاں بانو کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۰۹ء میں ہوئی، نامپلی اسکول میں تعلیم ہوئی پھر جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں لیں، بچپن سے علمی ماحول ملا، شادی کے بعد بھی شاعر اور علم دوست شوہر ملا۔ اولاً سررشتۂ تعلیمات میں ملازم ہوئیں، اب زنانہ کالج میں اردو کی ریڈر رہیں۔

جہاں بانو اس دور کی ممتاز نثر نگار اور انشاپرداز ہیں وہ ادیب بھی ہیں اور نقاد بھی، افسانہ نگار بھی ہیں اور مقالہ نگار بھی، انگریزی سے ترجمہ کرنے کی بھی خاص مہارت ہے وہ ترجمہ کو اپنا لیا کرتی ہیں، طنزیہ نگاری کی کافی مشق ہے، افسانے تخیل، کردار، پلاٹ، مکالمہ ہر حیثیت سے قابل ستائش ہوتے ہیں۔ دنیائے اردو میں اونہوں نے اپنے نقش قلم سے کافی شہرت حاصل کرلی ہے معیاری رسالوں میں مضمون شائع ہوتے ہیں، نشرگاہوں سے تقریریں نشر کرتی ہیں، اب تک جو کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) رفتار خیال۔ادب لطیف اور افسانوں کا مجموعہ (۲) رموز خانہ داری (۳) محمد حسین آزاد (مولانا آزاد کے متعلق تنقیدی و تحقیقی مقالہ) (۴) ربط ناہید اصلاحی اور طنزیہ خطوط کا مجموعہ (۵) فتراک سبق آموز اصلاحی، معاشرتی مضامین کا مجموعہ (۶) عرب اور عربستان، عرب کے متعلق بچوں کے متعلق عام فہم معلومات (۷) ولی کا فن شاعری ان کے علاوہ جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کا مجموعہ ضخیم ہوسکتا ہے۔

جہاں بانو بیگم کی زبان صاف، شستہ، رواں اور دلچسپ ہوتی ہے وہ قلم برداشتہ لکھتی جاتی ہیں کسی مضمون کے لئے سوچنے تیار ہونے کی ضرورت

نہیں ہوتی - آپ نثر میں شاعری کرتی ہیں، اور حجابجا ایسے شعر لکھتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی مقام کے لئے موزوں کیا تھا - ان کے افسانے سماجی اور اصلاحی ہوتے ہیں، وہ سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگاتی ہیں، سماج کے تصنع کا پول کھول دیتی ہیں،

ربط ناہید کے خطوط، اپنی رنگینی اور لطافت کے لحاظ سے قابل قدر ہیں تحقیقی اور تنقیدی مضمون میں وہ پوری تحقیق کرتی اور عمیق نظر سے داد تحقیق دیتی ہیں، ان کی تنقید غیر جانب دارانہ واقفیت پر مبنی ہوتی ہے - عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

" آزاد کے خیالات کی روانی کو ایک دریا سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو بہتا ہے - اور اس کا تسلسل بوقلموں تغیرات کا حامل ہوتا ہے، کبھی مرغزاروں میں سے اس کا گزر ہوا تو وہاں کے پر کیف مناظر قدرت اور دلآویز نظارے اس کی سیدھی سادھی روش میں ایک لوچ پیدا کر دیتے ہیں، کہیں یہ لق و دق میدانوں میں سے ہوتے ہوئے گزرتا ہے، تو کہیں سنسان وادیوں اور ویران صحراؤں کے خشک پتھریلے آغوش میں جگہ پا کر سحر آگیں نغموں سے ایک سنسنی خیز موسیقی پیدا کر دیتا ہے - کبھی اپنے امواج کے لئے بے پناہ تھپیڑوں سے سنگین چٹانوں کو ٹکرا کر دل گداز نالے پیدا کرتا ہے، تو کہیں پہاڑوں کی بلندیوں اور کہسار کے سایہ میں آبشار کے بھیس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے فضا میں اپنی وجدانی کیفیات و جذبات کو منتشر کرتا رہتا ہے - غرض یہ کہ ایک گم کردہ راہ مسافر کی طرح جس کو منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد

اطمینان و آسودگی نصیب ہوتی ہو۔ یہ بھی بحرِ ناپید اکنار سے وابستہ ہو کر اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے، بعینہٖ یہی حال آزاد کی ادبی روانیوں کا ہے کہ ہر منزل پر اس کے ادب کا سر چشمہ ایک نئے قسم سے جلوہ نما ہوتا ہے۔" (محمد حسین آزاد صفحہ ۱۹۱)

"اس وقت موسم سرما کی چمکیلی دھوپ میں تم بے اختیار یاد آگئیں، تمہاری سنہری زلف نے عالم تصور کے گلے میں پھانسی ڈالدی۔ تمہاری سیاحت اور سیاہی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ تمہاری بوڑھی خادمہ "زوناش" کیسی ہے؟ تمہارے ڈاکیہ کے انتظار نے ایک زمانے کی یاد دلادی اور کچھ عرصے تک مجھے دنیا و مافیہا سے بیخبر کر دیا، ایک مغربی شاعرانہ خیال ہے زمانہ گزشتہ کا تصور مسرور کن و مسرت بخش ہوتا ہے، لیکن میرے لئے تو اس سے زیادہ الجھن انگیز کوئی اور چیز نہیں، مجھے تو اس میں کوئی اصلیت نظر نہیں آتی۔ دردِ سر کا علاج تاج سے نہیں ہوتا!!!

پیاری سلمیٰ زمانہ کیسا جلدی بدل جاتا ہے، دن کیسے نکل جاتے ہیں طبیعتیں کس طرح پلٹا کھاتی ہیں، عبرت عبرت۔" (بربطِ ناہید صفحہ ۹ و ۱۰)

ثریا سلیم صاحبہ:۔ احمد النساء بیگم نام ثریا تخلص، آپ کے والد مولوی سید ظہور الحق صاحب دائرۃ المعارف کے مہتمم تھے، ۱۳۳۰ھ میں ثریا کی پیدائش ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر زنانہ مدارس سے استفادہ کیا، جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے اور ڈپ ایڈ (بی۔ ٹی) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم۔ اے کے امتحان کے لئے

آپ نے مولانا جامی پر مقالہ قلمبند کیا تھا، اس میں جامی کی سیرت اور کلام دونوں پیش کئے گئے ہیں اور کلام میں محققانہ تنقید فرمائی ہے، ثریا صاحبہ کو کم عمری سے شاعری اور مضمون نگاری کا شوق ہوا، مضامین ادبی، تنقیدی اور تاریخی ہوتے ہیں۔ شاعری میں اردو اور فارسی دونوں سے دلچسپی ہے، اپنے باپ سے تلمذ تھا، زنانہ جلسوں میں آپ کی نظمیں پسند کی جاتی تھیں، نثر کی عبارت صاف سادہ اور عام فہم ہوتی ہے، پولس ایکشن کے بعد حیدرآباد سے ہجرت کر کے پاکستان میں مقیم ہو گئی ہیں، اور وہاں اردو کی خدمت کے ساتھ قومی اور ملکی کاموں میں مصروف ہیں، ثریا کو تقریر کرنے کا بھی سلیقہ حاصل ہے، ان کی تقریر موثر اور معلومات آفرین ہوتی ہے۔

آصف جہاں:- آصف جہاں بیگم کے والد عبدالمجید صاحب بلگرام کے مردم خیز قطعہ سے تعلق رکھتے تھے، عرصہ تک مددگار مہتمم تعمیرات کی خدمت پر مامور رہے۔ حیدرآباد میں ان کا انتقال ہوا۔

آصف جہاں کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۲۴ء میں ہوئی، اگرچہ مدرسہ میں صرف فوقانیہ حد تک تعلیم پائی مگر مطالعہ کی بدولت اچھی قابلیت پیدا کر لی۔ کم عمری سے لکھنے کا شوق ہوا، مزاحیہ مضمون نگاری میں مہارت حاصل کر لی، ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "گل خنداں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کا پیش لفظ مشہور مزاحیہ نگار ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے لکھا ہے، اس میں آصف جہاں کی مزاحیہ نگاری کے متعلق حسب ذیل

صراحت فرمائی ہے :-

"یقین مانئے کہ مضمون واہ واہ ہے۔ مضمون پڑھتا تھا اور دل میں سوچتا تھا کہ یا اللہ اب کیا ہونے والا ہے، ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضامین لکھنا صرف مردوں ہی کا حصّہ ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ صنفِ نازک بھی ہماری حصّہ دار بن گئی ہیں .... ہم مذاق سے مطلب کسی ہنسی کی بات پر نہیں لیتے تھے۔ مگر یہاں ہر فقرہ میں چٹکیاں لی گئی ہیں اور مزا یہ ہے کہ ہر فقرے پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے" اس سے واضح ہے کہ آصف جہان بیگم کس پایہ کی لکھنے والی ہیں، اور ان کا کیا مرتبہ ہے،

"یا اللہ اگر بی مغلانی کو زندہ رکھنا ہی تھا تو پھر یہ بتا دے کہ بیسویں صدی کیوں آئی؟ اور اگر بیسویں صدی آئی تھی تو ہم کیوں آئے، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ بی مغلانی، ہم اور بیسویں صدی تینوں یکبارہ کر گزر سکیں، پروردگار عالم تو بڑا کارساز ہے، تو اس دنیا میں سے کم سے کم ایک کو تو ضرور اپنے پاس بلا لے،

آپ کا وہ ساڑھے پانچ فٹ کا بوٹا سا قد۔ وہ ڈھائی سو پونڈ وزن کا لاغر جسم۔ وہ تربوز نما سر، وہ ایک کان سے دوسرے کان تک چرا ہوا تنگ دہانہ، وہ کاجو جیسی ناک ...."

"اکثر اوقات جب چار پانچ بڑے مل کر گپیں ہانکنے بیٹھ جاتے ہیں، اور کوئی پھیری والا قلاقند۔ سیو دال وغیرہ بیچتا ہوا ادھر آجاتا تو بلیٹوں سیو دال اور قلاقند چٹ کر جاتے ہیں لیکن اگر کبھی ہمارا جی چاہا اور ہم نے کھانے کی

فرمائش کی تو چٹورپن اچھا نہیں ہوتا اور بے وقت کوئی چیز نہیں کھائی جاتی کہکر نصیحت کی جاتی ہے "

"مثال کے طور پر شکور میرے چچازاد" وکیل بھائی" جل ترنگ بجانے کے سلسلے میں ہمارے خاندان بھر میں مشہور ہیں، یہ حضرت جان جانتے ہیں کسی نہ کسی کو تختۂ مشق بنانے کے لئے منتخب کر لیتے ہیں اب جس شخص پر جل ترنگ بجائی جاتی ہے اس کی تو بس جان پر بن جاتی ہے۔ مگر سننے والے لطف اٹھاتے اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں "

"کئی دن سے بیمار ہوں، بستر پر پڑے پڑے طبیعت گھبرا گئی ہے۔ میوہ اور پھلوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ دواؤں کے نام سے متلی معلوم ہونے لگتی ہے، اناج اور مرچ کھانے کے لئے دل تڑپ رہا ہے، اب دوا پیتے وقت کسی چیز کی فرمائش کرنے کے بجائے التجا کرتی ہوں کہ کچھ نمکین چیز دو، لیکن یہ التجا بالکل بیکار جاتی ہے " (گل خنداں)

زینت ساجدہ:۔ آپ ایک تقدس مآب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، جن میں حضرت شاہ محمد قادری نوردریا رائچوری اور قاضی محمود بحری وغیرہ شامل ہیں، زینت ساجدہ حیدرآباد میں ۱۳۴۰ف میں تولد ہوئیں، مدرسہ میں پہلی جماعت سے شریک ہوئیں، اور پہلی جماعت سے لے کر میٹرک تک جماعت میں اوّل آتی رہیں اور پھر کالج میں ایف۔اے سے لے کر ایم۔اے تک بھی ریکارڈ قائم رکھا۔ جامعہ عثمانیہ میں آپ کی تعلیم ہوئی ہے، اب زنانہ کالج میں اردو، ہندی کی لکچرار ہیں، ایم۔اے

امتحان کے لئے آپ نے اردو غزل پر مقالہ قلمبند کیا تھا، مقالہ میں غزل کے داخلی پہلو پر روشنی ڈالی تھی اگرچہ یہ مقالہ ہنوز شائع نہیں ہوا۔ مگر جن اصحاب نے دیکھا ہے وہ اس کی خوبیوں کے معترف ہیں، زینت ساجدہ نے بڑی محنت اور کدو کاوش سے نہایت تحقیق کے ساتھ اس کو لکھا ہے، ان کی دو کتابیں بچوں کے لئے ہیں "حکمران عورتیں" اور "محب وطن عورتیں"۔ تیسری کتاب افسانوں کا مجموعہ "جل ترنگ" شائع ہوئی ہے، یہ ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں، مگر ان کے افسانوں میں عریانی نہیں ہوتی۔ وہ اکثر حقیقت کو افسانہ کا رنگ دیتی ہیں، اور صالح ادب پیش کرتی ہیں، ان کے افسانوں میں خاکہ (پلاٹ) اور کردار دونوں نہایت خوبی کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں، ان میں جان ہوتی ہے شگفتگی پائی جاتی ہے، اثر ہوتا ہے۔ زینت ساجدہ انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے اپنے افسانوں میں اس پہلو کو خصوصیت سے پیش کرتی ہیں، ادب اور آرٹ سے خاص دلچسپی ہے سیکڑوں شعر از بر ہیں۔ شاعر نہیں ہیں مگر شعر سے خاص مذاق ہے، افسانوں کے علاوہ سماجی، اصلاحی اور تنقیدی مضمون بھی لکھا کرتی ہیں، نشرگاہ سے اکثر آپ کی تقریریں نشر ہوتی ہیں کبھی طنزیہ مضمون بھی لکھا کرتی ہیں، زبان صاف اور شیریں ہوتی ہے، نمونہ پیش ہے۔

"اسی لمحے کسی نے اس کے پاس تحفہ بھیجا، ناچتے ناچتے رک کر اس نے اپنی لمبی سفید انگلیوں سے چاندی کی بڑی ڈبیا کو کھول کر دیکھا تو اس میں زرد پھول تھا بندیا کا قمقم تھا۔ ابرک ملا گلال تھا۔ اور مانگ کا سیندور۔ ایک پرچے پر لکھا تھا "بسنتی کا گہنہ" اس کی بادامی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اس نے

بڑی عقیدت سے اپنے جسم پر گلاب چھڑکا ماتھے پر بندیا لگائی۔ زرد پھول کو بالوں میں اڑس لیا۔

اور دوسرے دن جب ماں نے اس کے بیاہ کی بات چھیڑی تو اس نے انکار کر دیا۔" (بارو، از جل ترنگ)

رفیعہ سلطانہ:۔ اورنگ آباد آپ کا وطن ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی پھر جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ زنانہ کالج میں لکچرار ہیں، ڈاکٹریٹ (پی۔ ایچ۔ ڈی) کے لئے ریسرچ کر رہی ہیں، ایم۔ اے کے لئے جو مقالہ قلمبند کیا تھا وہ "اردو ادب میں خواتین کا حصہ" کے عنوان پر تھا۔ اگرچہ ہنوز یہ شائع نہیں ہوا۔ مگر موضوع کی حد تک اونہوں نے محنت سے اس کو مرتب کیا ہے، رفیعہ سلطانہ کو افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری اور تنقیدی مضامین کا سلیقہ حاصل ہے۔ آپ کے مختلف فیچر اسٹیج ہو چکے ہیں، افسانوں کا مجموعہ "کچے دھاگے" شائع ہو چکا ہے، رفیعہ سلطانہ کے افسانوں میں انسانی فطرت کی بوقلمونی رنج و مسرت، حزن و یاس اور مظلومی کا تذکرہ بڑی اچھی طرح ہوتا ہے۔ موجودہ دور کے انسانوں کے کردار کی اچھی تصویر کھینچتی ہیں۔ کردار کی تحت الشعوری کیفیتوں کو بھی واضح کرتی ہیں، جنسی کشمکش کو پیش کرتی ہیں مگر ساتھ ساتھ عورت کے وقار کو صدمہ ہوتا ہے اور نہ عریانی پائی جاتی ہے۔ وہ مردوں کی ہرجائیت اجاگر کرنے میں ان کا قلم بڑا زور دکھاتا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"محبت کے جذبات پیدا ہونے تو درکنار مجھے اس کی بے نیازی پر غصہ

آگیا، عموماً لڑکیاں مجھ سے بہت زیادہ اخلاق سے ملا کرتیں اور گفتگو کی خواہش مند رہتیں، یہ عجیب لڑکی میں نے دیکھی جس پر ذرا بھی میرا رعب نہ جم سکا، مجھے اس کے برتاؤ میں اپنی شکست محسوس ہوئی، لیکن اس میں مجھے جاذبیت نظر آئی، جواب سے پیشتر کسی لڑکی میں مَیں نے نہیں دیکھی تھی۔"

"آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے، ان میں سے کبھی کبھی چانداس طرح چمکتا تھا جس طرح کسی مہجور کی دنیائے یاس میں شعاع امید مسکراتی ہے۔ میں نے اپنی برساتی اوڑھ لی اور چہل قدمی کے لئے نکل گئی، سامنے کی کوٹھی میں چہل پہل نظر آرہی تھی۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ اس میں کرایہ دار آگئے ہیں، گھر کے برآمدہ میں ایک لڑکی نظر آئی جو کتاب کے مطالعہ میں غرق تھی، میں نے دیکھا کہ وہ کتاب اس پر خاص اثر کر رہی ہے کیونکہ اس کے چہرے کی کیفیت بتا رہی تھی کہ اس کتاب کا اس پر خاص اثر ہو رہا ہے۔"

منیرہ بانو کاؤس جی:۔ آپ حیدرآباد کے ایک معزز پارسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، جو صاحب علم ہے حیدرآباد میں منیرہ بانو پیدا ہوئیں، سنٹ جارجز گرلز اسکول میں ان کی تعلیم ہوئی اس کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں شامل ہوگئیں، علم کے شوق کے مد نظر جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے اور ڈپ ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم۔ اے کے لئے جو مقالہ قلمبند کیا اس کا عنوان "مولانا حالی اور ان کا کلام" ہے، مولانا کی سیرت اور ان کے کردار کے ساتھ کلام پر نہایت عمدہ تنقید کی گئی ہے اور ان کے ہمعصراُن پر ترجیح کی وجہ کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے۔ منیرہ بانو کی ایک دوسری

کتاب "کلید معرفت" ہے اس میں زردشتی مذہب کی عام عبادتوں کا اردو میں ترجمہ ہے، اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے۔ منیزہ بانو کے اصلاحی اور سماجی تنقیدی مضمون قابل قدر ہوتے ہیں، ان کے مضامین اکثر رسالوں میں شائع ہو کر پسند کیے جاتے ہیں، نشر گاہ سے بھی ان کو موقع ملتا ہے۔ ایک پارسی عورت کا اردو ادب میں کامیابی سے حصہ لینا اس امر کو واضح کر سکتا ہے کہ حیدرآباد میں اردو نے کہاں تک ترقی کی تھی۔ منیزہ بانو کی اردو صاف، شستہ عام فہم ہوتی ہے۔ساتھ ساتھ دلچسپی بھی پائی جاتی ہے۔

"زمانہ اگر موافق نہیں تو سوائے اس کے کوئی علاج نہیں کہ ہم انقلابات کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور اپنے آپ کو زمانہ کے موافق بنالیں۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

زمانہ انقلاب بدوش رہتا ہے، روز ازل سے اس کی یہی رفتار ہے۔ یہی انداز ہے جو اس کے شاکی رہتے ہیں۔ انہیں زمانہ کی ہوا ہمیشہ بگڑی ہوئی نظر آتی ہے، زمانہ کے خلاف کوئی کتنا ہی زہر اگلے زہر کے گھونٹ نگلے۔ ناگوار کو گوارا کرنے کے سوا چارہ نہیں اس پر نہ کسی کا قابو نہ کسی کا بس زمانہ کا دھارا اپنے اندر سینکڑوں طوفان صدہا بجلیاں ان گنت جھگڑے چھپائے ہوئے ٹھاٹھیں مارتا ہوا آگے بڑھتا ہے اس کے بہاؤ میں غیر معمولی قوت ہوتی ہے اس کے خلاف جو نعرے لگاتے ہیں مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں (روح ترقی ۱۳۶۸ھ)

عزیز النساء بیگم حبیبی: حبیبی ایک دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں، جہاں عموماً علمی ماحول نہیں

ہوتا۔ مگر اس کے باوجود عزیز النساء کا علمی وقار حاصل کرنا اور ادب میں نام و نمود حاصل کرنا ان کی انتہائی ادبی دلچسپی کو واضح کرتا ہے اور پھر وہ سائنس کی طالبہ ہیں، بی۔ ایس۔سی اور ڈپ ایڈ کی ڈگریاں جامعہ عثمانیہ سے حاصل کی ہیں، سررشتۂ تعلیمات میں ملازم ہیں، انھوں نے افسانہ نویس کو اپنی ادبی خدمت کا مرکز بنایا ہے۔ایک مجموعہ "تم بڑی سنگدل ہو" شائع ہو چکا ہے۔ ان کے افسانوں میں عموماً صرف رومان ہی رومان ہوتا ہے، مشرقی عورت کی رومانی زندگی جس میں زیادہ ترموت ہوتی ہے پیش کرتی ہیں۔ ان کے جملوں میں لوچ ہوتا ہے، میٹھی میٹھی دھڑکنیں ہوتی ہیں، جلے دلوں اور جواں روحوں اور جواں جسموں کی سرگوشیاں ہوتی ہیں، عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"سیدہ پھڑک کر درمیان میں بولی —— اری پگلی ہم میں سے ہر لڑکی یہی چاہتی ہے کہ کاش میں سمینہ ہوتی، اور ملک کا سب سے ہونہار ڈرامہ نگار۔سب سے کم عمر فن کار میرے حسن کی بھی یوں ہی تعریف کرتا میری محبت میں دیوانہ بنا رہتا۔ —— یہی تو ہماری رقابت کی وجہ ہے۔ جنس سے اسے کیا تعلق —— اور تم نے سنا نہیں ہماری مملکت کے سب سے مشہور اور بزدل عزیز ادیب نے بھی اس کی کہانیوں سے متاثر ہو کر اس کے فن پہ ایک بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔"

"اس نے ہر پھول کو دیکھا —— ہر کلی کا دل ٹٹولا —— لیکن جانے کیا بات تھی کہ اس کی تلاش آسودہ نہ ہو سکی اسے ہمیشہ سے کلیاں پسند تھیں —— کلیاں —— سمٹی سمٹائی کلیاں —— جھکی جھکی کلیاں —— لجاتی سرماتی کلیاں —— !! وہ کلیوں کو اپنی ہم عمر سہیلیاں سمجھتی تھی۔

مانوان، ہم مذاق اور شوخ و شریر بار سہیلیاں جنہیں شرمانے اور مسکرانے کے سوائے کوئی کام نہ تھا۔"

خدیجہ بیگم:۔ آپ کے والد حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر سید احمد صاحب تھے نواب اعظم جنگ کی آپ بہن ہیں، حیدرآباد میں تعلیم ہوئی۔ سینئر کیمبرج کے بعد یورپ جا کر مانٹی سری طریقہ تعلیم کا ڈپلوما حاصل کیا۔

خدیجہ بیگم نے بچوں کے لئے ڈرامے اور کہانیاں لکھی ہیں، ڈرامے بیسیوں مرتبہ اسٹیج کئے گئے ہیں، نورجہان، شاہ جہان، گوتم، ابوالحسن وغیرہ آپ کے مشہور ڈرامے ہیں۔

مسز شانتی بائی:۔ آپ مسٹر سری کرشن سہنا کی شریک زندگی ہیں، لکھنو یونیورسٹی سے بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی ہے وسیع مطالعہ کے علاوہ یورپ کی سیر کر کے وہاں کے حالات کا بچشم خود معائنہ کیا ہے۔ ادب اردو سے خاص دلچسپی ہے آپ کے شوہر بھی ایک مشہور ترقی پسند مصنف اور افسانہ نگار ہیں، شانتی بائی کی ایک کتاب "نیا روس" شائع ہوئی ہے اس میں روس کی ترقی کا تذکرہ ہے، آپ کی ادبی دلچسپی اس سے بھی واضح ہو سکتی ہے کہ آپ نے اپنی کتاب کو بڑی جدت سے انتساب کیا ہے۔ چنانچہ لکھتی ہیں۔

"اس جذبے کے نام جو غالب کے اس شعر میں پنہاں ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے اوپر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا"

شانتی بائی کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"روس کی انیسویں صدی کی سیاسی زندگی پر انقلاب فرانس کا رنگ غالب تھا۔ مساوات، یکسانیت، اور برادریت کے تخیلات سیاسی مفکر کے دل میں گھر کر چکے تھے، ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ جادو کی طرح سر پر چڑھ کر بول رہا تھا، لیکن شاہی اقتدار اس کو رکیک اور بے معنی سمجھ کر اپنی مطلق العنانی کے قائم رکھنے پر مصر تھا۔"

"انتہائی اشتراکیت میں حکومت کا تخیل عنقا ہے، خود لینن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ بتدریج حکومت نیست و نابود ہوتی جائے گی، بہ الفاظ دیگر امور مملکت کے چلانے کے لئے کسی مرکزی ادارے کی ضرورت نہیں رہے گی، خود لوگ امور مملکت کو بھی انفرادی اور غیر شعوری طور پر چلانے کے عادی ہو جائیں گے لیکن عصر جدید کے سیاست دان حکومت نہ ہونے کو نراجیت سے تعبیر کرتے ہیں، انقلاب روس کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ حالات پر قابو پانے اور ملک کی اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لئے ایک مرکزی ادارے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انقلابیوں نے اس کو آہستہ آہستہ تعمیر کیا۔" (نیا روس)

حفیظ جمال بیگم:۔ مولوی عبدالرؤف صاحب مرحوم کی دختر، برہان الدین حسین صاحب کی شریک زندگی ۱۳۵۸ھ میں پیدا ہوئیں گھر پر خانگی طور پر فارسی اور اردو کی تعلیم ہوئی، مگر مطالعہ کے ذریعہ اور ذہن کی ذکاوت سے بڑی ترقی کر لی، معلومات وسیع اور خیالات بلند ہیں، دکن اور شمالی ہند کے معیاری رسالوں میں مضامین شائع ہوتے ہیں، جو سیاسی، تاریخی، سماجی

اور اصلاحی اور سبق آموز ہوتے ہیں، خواجہ حسن نظامی صاحب اور حضرت امجدآپ کے
طرز تحریر اور انداز بیان کے معترف ہیں، چنانچہ حضرت امجد کہتے ہیں کہ
"بہت دیر تک پڑھتا رہا اور متاثر ہوتا رہا ــــ اللہ کرے حسن رقم اور
زیادہ"

ڈرامہ اور اداکاری:- ڈرامہ نگاری ادب کی ایک بہت ہی اہم صنعت ہے، اس کے ذریعہ زبان کی خدمت
کا بہت بڑا حق ادا ہوجاتا ہے،

اُردو ڈرامہ کی ابتدا بلاشبہ لکھنو سے ہوئی، امانت نے اندر سبھا لکھ کر
اس کی بنیاد رکھی، اس کے بعد دوسرے افراد نے ڈرامے تالیف اور ترجمے کئے
اس کی وضاحت ہمارے موضوع سے جدا ہے۔

ہم کو یہ بتانا ہے کہ حیدرآباد میں اردو ڈرامہ کب لکھا گیا؟ جہاں تک معلوم
ہے سب سے پہلے مسٹر سہراب جی کانگا نے "میکبتھ" کا ترجمہ کیا اور "تلاطم ایران"
کے نام سے اس کو شائع فرمایا، اس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے اس کے علاوہ
اسی زمانہ میں ظفر علی خان صاحب نے جنگ روس و جاپان اور مرحوم عزیز مرزا
نے "دکرم ورسی" شائع کیا ان کے سوا منشی انوار الدین صاحب مخلص نے بعض
ناٹک کمپنیوں کے لئے چند ڈرامے لکھے مثلاً ہار جیت، دھوپ چھاؤں،
کالی ناگن اور منشی یاور علی صاحب اعظم نے "دکھیا دلہن" جور مالن، "آج کل"
وغیرہ اسی غرض سے لکھے۔

---

[۱] اردو ڈرامہ نگاری مؤلفہ سید بادشاہ حسین (حیدرآبادی)

حیدرآباد کے اردو ڈرامہ کی یہ مختصر تاریخ ہے، زیر ذکر دور میں اور اصناف ادب کی طرح ڈرامہ کو بھی خاص ترقی حاصل ہوئی ہے، سب سے پہلے مولوی تفضل حسین مرحوم کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے شکسپیر کے ڈراموں کا کامیاب ترجمہ کیا، اس کے بعد مسٹر فضل الرحمان قابل تذکرہ ہیں ان کے ترجمے اور طبع زاد ڈراموں نے خاص وقعت حاصل کر لی ہے، ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ پیش بھی کئے جا چکے ہیں، ظاہر و باطن، اور نئی روشنی، نوٹیر بڈن کے ترجمہ ہیں، حشرات الارض اور پردہ اور کارخانہ طبع زاد ہیں۔

تمکین کاظمی اور سعیدی صاحبان نے ارنسٹ کا ترجمہ شائع کیا ہے عصمت اللہ بیگ صاحب نے غلط در غلط مرتب کیا ہے، ان کے علاوہ نظام کالج کے طلبہ سے ناکارہ صاحب اور سید بادشاہ حسین صاحب نے کئی ڈرامے لکھے ہیں اسی طرح طلبہ عثمانیہ کالج میں سے، محمد اکبر وفا قانی صاحب، عزیز احمد صاحب، ظفر الحسن صاحب، مخدوم محی الدین صاحب، میر حسن صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان اصحاب نے کئی ڈرامے لکھے اور ان میں سے اکثر اسٹیج پر پیش ہو کر کامیاب ثابت ہو چکے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی بعض طالبات نے ڈرامے اور فیچر لکھے ہیں رفیعہ سلطانہ، سلطانہ بیگم وغیرہ قابل تذکرہ

اس دور کے ڈراموں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ ترجمہ ہوں یا طبع زاد وہ ڈرامہ نگاری کے صحیح اصولوں پر مرتب کئے گئے ہیں، ان میں سے اکثر ڈرامے مجموعی حیثیت سے قابل تعریف ہیں،

ڈرامہ کے ساتھ اداکاری کا بیان بھی ضروری ہے حیدرآباد کا سب سے

پہلا تھیٹر وہ تھا جو "دال منڈی" کے نام سے موسوم تھا، "جگیا" اس کا منتظم اور "محبوب جان" ممتاز اداکار تھی [1]

اس کے بعد ایسی کوئی مشہور تھیٹر کمپنی حیدر آباد میں قائم نہیں ہوئی جو قابل تذکرہ ہو، البتہ بمبئی وغیرہ سے مختلف ناٹک کمپنیاں آئیں اور خوب روپیہ کمائیں، غرض آج سے پہلے ڈرامہ کو ترقی دینے کے لئے کوئی بزم قائم نہیں تھی۔

اس دور میں اس پر بھی توجہ ہوئی اور انجمنیں قائم ہوئیں جن میں سے "انجمن ترقی ڈرامہ" بزم تمثیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انجمن ترقی ڈرامہ کے ارکان میں مرزا شکور بیگ، فضل الرحمان، مرزا محی الدین بیگ، محبوب علی طاہر، ابوالنصر عبدالوحید، عبدالقیوم خان وغیرہ قابل ذکر ہیں اس انجمن کی جانب سے جن اصحاب نے اداکاری کی مشق کی اور کامیاب اداکار ثابت ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔

ظفر علی مرزا صاحب، شکور بیگ صاحب، شرافت اللہ بیگ صاحب ظفر الحسن صاحب، عبدالرب صاحب اور غ۔ نوی، شہریار وغیرہ۔

بزم تمثیل کے کامیاب اداکاروں میں محمد اکبر وفا قانی، مخدوم محی الدین، جمیل احمد، عباس علی خان وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

مدارس سرکاری مثلاً عثمانیہ کالج، نظام کالج، سٹی کالج، اورنگ آباد کالج، ورنگل کالج وغیرہ میں بھی ڈرامے ہوتے اور طلبہ دلچسپی سے حصہ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں صدر الذکر اداکاروں میں بڑا حصہ کالج کے طلبہ ہی کا ہے۔

---

[1] اردو میں ڈرامہ نگاری

کلیہ اناث میں بھی ڈرامے ہوا کرتے ہیں، اور طالبات اس میں حصہ لیتی ہیں اور اپنی اداکاری کے لحاظ سے کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

اردو ڈرامہ میں اداکاری کی حیثیت سے جس خاتون نے مردوں کے ساتھ پہلی مرتبہ حصّہ لیا ہے وہ مس مے مچایا ہیں، انہوں نے "طبیب حاذق" کے ڈرامہ میں جو مسٹر ظفر الحسن کا مرتبہ تھا اداکاری کی تھی،

اسی ضمن میں سید بادشاہ حسین کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے "اردو میں ڈرامہ نگاری" لکھ کر ڈرامہ کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس موقع پر فضل الرحمان صاحب اور سید بادشاہ حسین صاحب کا تذکرہ ضروری ہے۔ جنہوں نے ڈرامے اور تاریخ ڈرامہ لکھ کر اردو زبان کی خدمت انجام دی ہے

فضل الرحمان صاحب:- شعرا کے تذکرہ میں فضل الرحمان صاحب کا تذکرہ ہو چکا ہے آپ ایک بہترین انشاء پرداز اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ آپ کے ڈراموں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف فنی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہیں بلکہ اسٹیج کے بھی قابل ہیں، چنانچہ آپ کے ڈرامے کئی مرتبہ حیدرآباد وغیرہ میں اسٹیج ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں پانچ ڈرامے اب تک لکھے گئے ہیں ان میں سے دو ترجمے ہیں اور تین طبع زاد مگر جو ترجمے ہیں وہ بھی صرف ترجمے نہیں بلکہ ان کی حالت تصنیف جیسی ہو گئی ہے۔ یہ ڈرامے ظاہر و باطن، حشرات الارض، کارخانہ اور نئی روشنی پر ہیں، ان کی زبان نہایت صاف سادہ ہے، مکالمے برجستہ اور شگفتہ ہیں، پلاٹ کی خوبی اور کردار کے لحاظ سے بھی ان کو بلند مرتبہ حاصل ہے، بہر طور اردو ڈراموں میں ان کا معیار اعلیٰ

اور بلند ہے، عبارت کا نمونہ پیش ہے۔
"شہر بانو۔ کہئے زینت کا بیاہ کب رچیگا؟
اعزاز۔ بہن آپ کو تو بس بیاہ ہی کی لگی ہے، اور یہاں زندگی کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ملتی۔
شہر بانو۔ یہ بکھیڑے تو دم کے ساتھ ہیں کیا ان کی خاطر کوئی دنیا کے کام بند کر دے گا؟
اعزاز۔ نہیں بہن! دنیا کے کاروبار کیسے رک سکتے ہیں۔
شہر بانو۔ ہماری طرف سے تو سب تیاریاں ہو چکیں، کہئے آپ کو کونسی تاریخ پسند ہے؟
اعزاز۔ (کسی قدر جھجک کر) بہن یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے، میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتا۔
شہر بانو۔ کیوں کیا آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں؟
اعزاز۔ توبہ! یہ کس نے کہا۔
شہر بانو۔ پھر آخر عذر کیا ہے۔
اعزاز۔ بات یہ ہے۔ لڑکی ابھی زیر تعلیم ہے۔ اور پھر لڑکا بھی نوکر نہیں، ایسی شادی سے کیا فائدہ جس میں راحت نصیب نہ ہو[1]

فیتن۔ آپ نے دھواں دھار تقریریں کیں اور میں نے آتش فشاں مضامین لکھے لیکن نتیجہ کیا نکلا۔

---

[1] حشرات الارض صفحہ ۴۹، ۵۰

افسر۔ آپ سائنس کے ماہر بن گئے اور میں آرٹ کا نمونہ۔
فینتن۔ میں سائنس کا ماہر نہ سہی لیکن آپ آرٹ کا نمونہ ضرور بن گئی ہیں۔
افسر۔ (طنزاً) شکریہ یہ تعریف ہے یا مذمت؟
فینتن۔ نہ یہ تعریف ہے نہ مذمت بلکہ واقعہ کا اظہار ہے۔
افسر۔ آرٹ کے بارے میں اب بھی آپ کا وہی نظریہ ہے
فینتن۔ کیوں نہیں، میں ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں اور ہمیشہ یہی کہوں گا کہ آرٹ نیچر کی ترقی کا آخری زینہ ہے وہ آرٹ نہیں جو اصلیت کو بگاڑے۔ یا اس کی نقالی میں اپنا سارا کمال صرف کردے۔ بلکہ وہ آرٹ جو اصلیت کو چار چاند لگادے۔ اور کچھ ایسے ہی آرٹ کا نمونہ اس وقت میرے سامنے ہے[1]۔

سید بادشاہ حسن:۔ حیدر آباد کے متوطن نظام کالج کے ایم۔ اے اردو کے ادیب سید بادشاہ حسن بھی اس دور کے ایک ممتاز اہل قلم ہیں، آپ ڈرامہ نگار بھی ہیں اور نقاد بھی، افسانہ نگار بھی ہیں اور مؤرخ بھی، آپ کی کتاب "اردو میں ڈرامہ نگاری" اپنے فن کی بے مثل کتاب ہے۔ فن ڈرامہ کی تاریخ اور زبان اردو میں اس کی ابتدا اور ارتقا کا حال نہایت خوبی سے قلمبند کیا ہے، اس کتاب سے واضح ہوسکتا ہے کہ ڈرامہ کس کو کہتے ہیں، اس کی ابتدا کب ہوئی، اردو میں کب ابتدا ہوئی فن ڈرامہ کی خصوصیات کیا ہیں، اردو میں پہلا ڈرامہ کس نے لکھا، کن کن کے ڈرامے مشہور ہیں، کون کون ناٹک کمپنیاں عالم وجود میں آئیں؟ اس کتاب کے بعض

---

[1] آئندہ زمانہ صفحہ ۲۴

مضامین حسب ذیل ہیں:۔

ڈرامہ کی ابتدا، ڈراما کی قسمیں، ڈراما اور تھیٹر، اردو ڈراما کی پیدائش، اندرسبھا قدیم اردو ڈراموں کی بعض خصوصیات، شکسپیر کے ترجمے، قدیم ناٹک کمپنیاں، طرز جدید کے پیش رو اور رہبرو، فلم اور اردو ڈراما اردو ڈراما کا مستقبل۔

سید بادشاہ حسن صاحب کی دوسری مشہور کتابیں "سلاطین آصفیہ کے رعایا سے تعلقات" اور "دیوان تاباں" معہ حیات اور شاعری پر تنقید ہے۔

سید بادشاہ حسن صاحب کی نثر میں لوچ اور اثر ہوتا ہے، اس کی روانی اور سادگی بھی قابل قدر ہے،

عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"ارسطو نے ڈراما کے چھ حصے کئے، قصہ، کردار، الفاظ، خیال، آرائش اور موسیقی، ان سب میں زیادہ اہمیت قصہ کے تسلسل کو دی کیونکہ اس کے خیال میں حزنیہ نقل ہے انسانوں کی نہیں بلکہ افعال کی، ایسے افعال جو زندگی کی تگ ودو میں انسان سے سرزد ہوتے ہیں، زندگی کی ابتدا اور انتہا انسانی افعال ہیں، اور دراصل انہیں افعال پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔ دوسرے الفاظ میں افعال ہی اسباب ہیں طربیہ اور حزنیہ کے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر قصہ کے چاہے وہ کس قدر موہوم ہی کیوں نہ ہو کوئی ڈراما وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ڈرامہ حقیقت میں، ایک قصہ کا نام ہے جو مکالمہ کی شکل میں بیان کیا گیا ہو، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ڈرامہ کا سب سے زیادہ اہم حصہ ہے . . . .

واجد علی شاہ کے دربار میں جتنی چیزیں گائی جاتی تھیں، جتنے جلسے اور رہس کھیلے جاتے تھے، ان کا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہوتا تھا۔ کوئی ایسا درباری شاعر مخصوص نہ تھا کہ ٹھمری کہہ کہہ کر گانے والیوں کو دیتا، یا رہس اور جلسہ تیار کرتا بلکہ اکثر ایسی چیزیں "رنگیلے پیا" جان عالم اور اختر کی ہوتی تھیں، واجد علی شاہ کی طبیعت کا رجحان طور طریق اور عادات سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے امانت کو کبھی اندر سبھا تیار کرنے کا حکم نہ دیا تھا۔ اوّل تو یہی ثابت نہیں کہ امانت واجد علی شاہ کے درباری شاعر تھے یا کم از کم مصاحب"۔[1]

خطیب اور وکلاء وغیرہ:

اس موقع پر وہ اصحاب بھی قابل ذکر ہیں جنہوں نے خطیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ اور اردو میں اپنی جادو بیانی سے سکہ قائم کر دیا۔ یوں تو اس زمرہ میں کئی اصحاب شامل ہیں مگر ہم صرف مشہور اصحاب کا تذکرہ کریں گے۔

سب سے پہلے نواب بہادر خان (بہادر یار جنگ) کا نام لینا ضروری ہے جو ایک معزز جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں تولد ہوئے اور دارالعلوم میں میٹرک تک تعلیم پائی مگر اپنی خداداد طبیعت کی روانی اور ذہانت کی تیزی سے وہ رتبہ حاصل کر لیا جو بہت کم کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے جو نام اور نمود انہوں نے حاصل کیا وہ حیدرآباد کی تاریخ میں جلی حروف میں نمایاں رہے گا۔ بحیثیت خطیب بہادر خان کو جو مقام حاصل تھا وہ اردو زبان کے لئے قابل فخر ہے کہ اس زبان میں تقریر

---

[1] اردو میں ڈرامہ نگاری صفحہ ۸۰ و ۸۱۔

کرنے والا اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کر لیتا تھا۔ ان کی جادو بیانی صرف حیدرآباد تک محدود نہیں بلکہ برطانوی ہند میں بھی ان کی پرزور اور اثر آفرین تقریر کا کوئی جواب نہیں تھا۔ افسوس ہے کہ جوانی میں موت نے ان کو ہم سے چھین لیا۔

دوسرے خطیب سید قاسم رضوی ہیں، جن کے اجداد لکھنؤ میں خاندان اودھ کے زمانہ میں دیوانی کی تھی اور اس کے بعد حیدرآباد آکر بس گیا تھا۔ سید قاسم رضوی کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی ابتدائی تعلیم کے بعد وہ علی گڈھ بھیجے گئے۔ اور وہاں سے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگریاں حاصل کر کے وکالت شروع کی۔ اور مجلس اتحاد المسلمین کے صدر بنے، ان کی تقریر بھی اردو میں ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر سے بڑا اثر پیدا کر دیا تھا۔ زور بیان اور انداز بیان قابلِ داد ہوتا تھا۔

مولوی میر مظہر علی، سید محمد بادشاہ حسینی مولانا حسام الدین، مولوی مناظر الحسن وغیرہ دوسرے منجھے ہوئے لوگ تھے، جنہوں نے اس دور میں اردو خطیب کی حیثیت سے نام اور نمود حاصل کر لیا تھا۔

اردو میں وکالت کرنے والے ایڈوکیٹ یا بیرسٹر وغیرہ بھی کئی نامور ہوئے جن میں سے بعض یہ ہیں، میر اکبر علی خاں، خواجہ عبد العزیز مرحوم، مولوی فیض الدین سید عسکری حسن (عسکر یار جنگ)، مولوی ابوالحسن سید علی کلیم الدین انصاری، انیس الدین، ارمہ النگار، بی رام کشن راؤ، راماچاری جوشی، گوپال راؤ بھوٹے ونانک راؤ باسٹر، رام چندر نانک راجہ رام نارو وغیرہ جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی وکلاء اور بیرسٹر بیسیوں ہیں، جو اردو میں پیروی کرتے ہیں، علاالتول لور

مالگذاری کے دفاتر میں اردو سرکاری زبان ہونے سے پیروی کا دارومدار اردو کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اس لئے عام طور سے زبان اردو وکلا کی پیروی اور بحث کی زبان ہوتی تھی۔

اردو کی ترقی کا ایک بھی اہم ذریعہ ثابت ہوا تھا۔

نستعلیق ٹائپ:۔ زبان کی ترقی کے لئے مطابع کا وجود بمنزلہ روح کے ہے، حیدرآباد میں پانچویں دور میں ہی مطابع کا وجود ہو گیا تھا، ۱۲۵۰ھ میں[1] پہلا مطبع قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد شمس الامرا نے اپنا مطبع قائم کیا۔ رفتہ رفتہ حیدرآباد میں مطبعوں کی تعداد زیادہ ہوتی گئی۔ اسی دور میں برقی پریس بھی قائم ہو گئے۔ اور رنگین طباعت بھی ہونے لگی۔

مطابع کی دو قسمیں ہیں ٹائپ اور لیتھو، نسخ ٹائپ میں اردو زبان کی کتابوں کی طباعت عرصہ دراز سے حیدرآباد میں ہوتی چلی آئی ہے، اردو زبان کے لئے نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی کوشش ایک عرصہ دراز سے جاری تھی مگر خاطرخواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

خود حیدرآباد میں بھی اس قسم کی کوشش عرصہ سے جاری تھی اب حال میں انجمن ترقی اردو، اور سرکار عالی کے دارالطبع میں پھر کوشش کی گئی، دونوں جگہ ٹائپ تیار کیا گیا، اور جب یہ مکمل ہو گیا تو ہندوستان کے کئی ماہرین فن کی کمیٹیاں مختلف اوقات میں ہوئیں، اور آخر کار سرکار عالی کے دارالطبع کا تیار کردہ نستعلیق

---

[1] عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ میں ۱۲۵۰ھ میں طبع شدہ کتاب موجود ہے۔

ٹائپ پسند کیا گیا، اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے مفید اور کارآمد قرار دیا گیا ہے۔

نستعلیق کا مخزن حسب ذیل (۴۹۵) حروف پر مشتمل ہے۔

(۱) مفرد ۳۵۷

(۲) مرکب ۱۰۲

(۳) زوائد ۳۵

مرکبات صرف اس خیال سے کہ الفاظ کی خوش نمائی میں کوئی فرق نہ آئے خود علیحدہ ڈھال لئے گئے ہیں۔

اس ٹائپ کی تیاری اور اس کو روزمرہ کاروبار میں مفید اور سودمند بنانے میں سررشتہ دارالطبع نے جو جد و جہد کی ہے وہ بہت قدر کے قابل ہے۔

اردو کرنسی نوٹ:۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مملکت آصفیہ کی سرکاری زبان اردو تھی اس سے ظاہر ہے کہ جس قدر سرکاری کاروبار خواہ وہ کسی قسم کے ہوں اردو میں ہوا کرتے تھے چنانچہ کرنسی نوٹ بھی اردو میں جاری ہو گئے۔ اور اردو کا سکہ کاغذ پر بھی چلنے لگا۔

اخبارات اور رسالے

اس دور میں اخبارات اور رسالوں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے ان کی پوری تفصیل دشوار ہے تاہم ایک مختصر فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس فہرست سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بلحاظ اخبارات اور رسائل کے بھی اس دور کو اپنے ماسبق ادوار پر تفوق حاصل ہے۔

شمار	نام	نوعیّت	کیفیت
۱	مشیر دکن	روزانہ	اس کے متعلق قبل ازیں صراحت ہو چکی ہے
۲	صحیفہ	”	اکبر علی صاحب کا انتقال ہونے پر محمد مظہر صاحب چند ماہ تک ادارت کرتے رہے۔ پھر اکبر علی صاحب کے فرزند اس کو چلاتے ہیں۔
۳	رہبر دکن	روزانہ	اسی دور میں اس اخبار کی اجرائی ہوئی ہے اولاً سید احمد محی الدین صاحب اس کے اڈیٹر تھے بڑی تختی کے چھ اور کبھی آٹھ اور بارہ صفحہ پر شائع ہوتا تھا۔ کبھی تصاویر یں ہوتی تھیں خاص و عام میں مقبول تھا۔ سالنامہ نہایت اہتمام سے شائع ہوتا تھا جس میں قابل قدر مضامین اور

		عمدہ تصویریں ہوتی ہیں۔ احمد محی الدین صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند محمود وحید الدین بی۔ اے عثمانیہ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ پولیس ایکشن کے بعد بند کر دیا گیا۔
۴۔ صبح دکن	روزانہ	احمد عارف صاحب ایک قابل نوجوان اس کے اڈیٹر تھے بڑی تختی کے چھ صفحوں پر یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد ہو گیا۔
۵۔ منشور	"	یہ اخبار بھی بڑی تختی کے چھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا عبدالرحمن صاحب رئیس اسکے اڈیٹر تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد بند ہو گیا۔
۶۔ پیام	"	قاضی عبدالغفار صاحب کی اڈیٹری میں تھا یہ اخبار سنہ ۱۳۴۴ فصلی میں جاری ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے چند سال کے بعد اختر حسین صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کو اپنے بجائے اڈیٹر کر دیا۔
۷۔ رعیت	ہفتہ وار	مسٹر نرسنگ راؤ اس کے اڈیٹر ہیں۔ راؤ صاحب نے مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی اور فارسی کا آخری امتحان دبیر کامیاب کیا۔ اخبار کو محنت و دلدہی سے مرتب کرتے ہیں اور آزادانہ رائے کا اظہار ہوتا ہے۔ اب بند ہو چکا ہے۔

۸ - نظام گزٹ	روزانہ	ابتدا میں اس کے اڈیٹر حبیب اللہ صاحب رشدی اور وقار احمد صاحب تھے اب صرف آخر الذکر کی ادارت میں یہ شائع ہوا کرتا ہے دونوں اصحاب جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ اولاً ہفتہ وار تھا اس کے بعد روزانہ ہوگیا سالگرہ نمبر وغیرہ خاص اہتمام سے شائع کرتے تھے
۹ - الاعظم	ہفتہ وار	پہلے یہ اخبار ضلع بیڑ سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد حیدرآباد سے شائع ہوتا رہا آزاد انصاری صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔
۱۰ - راز	ہفتہ وار	مولوی احمد اللہ صاحب روحی اس کے اڈیٹر تھے۔
۱۱ - واعظ	ہفتہ وار	مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب اس کے اڈیٹر تھے یہ ایک مذہبی پرچہ ہے اضلاع کے واعظین کے لئے خاص کر مضامین شائع کرنا اس کا مقصد تھا
۱۲ - سلطنت	روزانہ	سید احمد اللہ قادری اس کے اڈیٹر ہیں اولاً ہفتہ وار شائع ہوا۔ اس کے بعد روزانہ ہوگیا۔
۱۳ - حمایت دکن	روزانہ	اولاً ہفتہ وار تھا پھر روزانہ ہوگیا تھا۔

۱۴- میزان روزانہ غلام محمد صاحب اڈیٹر تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے بعض قابل فرزند اس کے اسٹاف میں شامل تھے اردو کے ساتھ انگریزی میں شائع ہوتا تھا بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی اور عام و خاص میں مقبول ہوگیا تھا پولیس ایکشن کے بعد بند کر دیا گیا۔

۱۵- پرچم ہفتہ وار فصیح الدین صاحب۔ یہ اخبار ۱۹۴۷ء میں شائع کرنے لگے تھے، باتصویر اخبار تھا اپنی مختصر زندگی میں خاصی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد بند ہوگیا۔

اب اس دور کے ماہوار علمی اور ادبی رسالوں کی تفصیل کی جاتی ہے۔

شمار	نام	نام اڈیٹر	سنہ اجرائی	کیفیت
۱	افادہ	مرزا نظام شاہ لبیب	۱۹۱۶ء	قابل اڈیٹر کی وجہ سے بلند پایہ مضمون نگار فراہم ہو گئے تھے اپنی نوعیت کا بہترین رسالہ تھا۔ چند سال کے بعد اڈیٹر کی دوسری مصروفیتوں کے باعث بند ہوگیا۔
۲	المعالج	حکیم بشیر احمد	۱۹۱۷ء	یہ ایک طبی رسالہ تھا طب یونانی کے متعلق اچھے مضمون شائع ہوتے

تھے چند سال کے بعد جب اڈیٹر صاحب کے مریضوں کی تعداد کافی ہو گئی تو وہ رسالہ کی طرف توجہ نہ دے سکے اس لئے رسالہ بند ہو گیا۔

۳ - اتالیق	عبدالرب کوکب	۱۹۱۷ء	یہ ایک ماہوار بچوں کا رسالہ تھا جو سررشتہ تعلیمات کی سرپرستی سے جاری ہوا تھا، کئی سال تک جاری رہا، بچوں کے لئے اچھے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔
۴ - رہبر مزارعین	مظہر حسین	۱۹۱۸ء	یہ رسالہ سررشتہ زراعت سے شائع ہوتا تھا ناظم سررشتہ اس کے اڈیٹر تھے، جب ان کی مصروفیت زیادہ ہو گئی تو رسالہ بند ہو گیا۔
۵ - ثمرۃ الادب	عبدالوسیع صاحب	۱۹۱۸ء	یہ رسالہ انجمن ثمرۃ الادب دار العلوم سے شائع ہونے لگا، راقم الحروف اس کا منیجر تھا، اڈیٹری کے فرائض بھی بہت کچھ انجام دیا کرتا، اساتذہ وغیرہ کے بعض اچھے اور بلند پایہ

			مضامین شائع ہوئے میرے تعلیمی سلسلہ کے موقوف ہونے پر رسالہ بھی بند ہوگیا۔
۶ - شعلہ	سید نوازش علی لمعہ	سنہ ۱۹۱۸ء	لمعہ حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے ان کی وجہ سے جلد رسالہ نے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی، مگر بہت جلد رسالہ بند ہوگیا۔
۷ - النساء	صغرا بیگم ہمایوں مرزا	سنہ ۱۹۱۹ء	یہ ایک نسوانی رسالہ تھا جس میں زیادہ تر خواتین کے مضامین ہوتے تھے مگر زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ بیگم صاحبہ کے سفر یورپ کے باعث بند ہوگیا۔
۸ - نونہال	مرغوب الدین	سنہ ۱۹۲۰ء	یہ ایک تعلیمی رسالہ تھا۔
۹ - اردو	مولوی عبدالحق صاحب	سنہ ۱۹۲۱ء	یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ اسی دور میں جاری ہوا، اس رسالہ کے متعلق کسی صراحت کی اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بلند پایہ مضامین سے دنیائے اردو بخوبی واقف ہے، اولاً اورنگ آباد

			پھر اس کے بعد دہلی سے اس کی اجرائی ہونے لگی اب کراچی سے شائع ہوتا ہے اس رسالہ نے اردو زبان اور ادب کی جو خدمت اب تک انجام دی ہے وہ محتاج تعارف نہیں ہے۔ چونکہ اس کی ابتدائی اجرائی اورنگ آباد سے ہوئی اس لئے اس دور کو اس رسالہ کے باعث اہمیت حاصل ہے۔
۱۰ - نمائش	مرزا رفیق بیگ	۱۹۲۲ء	ایک صنعتی رسالہ تھا مگر اس میں ادبی مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے مولوی مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب کے مضامین کی ابتدا اس رسالہ سے ہوئی مرزا الم نشرح کے نام سے وہ مضمون لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء تک جاری رہا اس کے بعد بند ہوگیا۔
۱۱ - ترقی	ابوالمکارم محمد انوار اللہ	۱۹۲۲ء	یہ رسالہ نہایت ٹھوس اور معیاری مضامین کا حامل تھا، حیدرآباد کے بعض قابل افراد اس رسالہ کے

مضمون نگار اور سرپرست تھے۔ اڈیٹر کی طویل علالت کے باعث بند ہوگیا۔

۱۲- خادمہ — مریم بیگم — سنہ ۱۹۲۲ء — ایک زنانہ رسالہ تھا اوسط درجہ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

۱۳- لسان الملک — سید محمد ضامن کنتوری — سنہ ۱۹۲۲ء — اس رسالہ نے بھی اپنے قابل اڈیٹر اور مضمون نگاروں کی اعلیٰ قابلیت کے باعث جلد شہرت حاصل کر لی تھی مگر زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

۱۴- تاج — غلام محمد وفا — سنہ ۱۹۲۳ء — یہ رسالہ گزشتہ دور میں اجرا ہوا تھا، کچھ عرصہ تک بند رہ کر پھر اس دور میں جاری ہوا۔ رسالہ کا سائز بھی بڑا کر دیا گیا تھا۔ بقول سید سلیمان ندوی یہ رسالہ ہندوستان کے معیاری رسالوں سے بہتر تھا۔ ملک کے اکثر انشاپرداز اس کے مضمون نگار تھے، حضرت امجد کا کلام بھی اسی میں شائع ہوتا تھا، افسوس ہے

				اس مرتبہ بھی اس رسالہ کو بند ہو جانا پڑا۔
۱۵ - نظام کالج اردو میگزین	محمد میر خان	۱۹۲۳ء	نظام کالج کے طلبہ نے اس کو جاری کیا تھا۔ میر خان (میر نواز جنگ) کے تعلیمی سلسلہ کے ختم ہونے پر رسالہ بند ہو گیا۔
۱۶ - المصدق	سید محمود	۱۹۲۳ء	مہدوی اصحاب کا یہ علمی رسالہ رسالہ تھا کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔
۱۷ - المعلم	محمد عظمت اللہ خان	۱۹۲۳ء	سررشتۂ تعلیمات سے اولاً اس کی اجرائی ہوئی۔ پھر ٹریننگ کالج سے جاری ہونے لگا، مولوی سجاد مرزا صاحب کے زمانہ میں اس رسالہ نے بڑی ترقی حاصل کی تھی، عرصۂ دراز تک آب و تاب سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے فنی اور ادبی مضامین بڑے اعلیٰ پایہ کے ہوتے تھے۔
۱۸-۱۹ - معلم العلوم اور توحید	سراج الدین	۱۹۲۳ء	یکے بعد دیگرے دو رسالے جو مذہبی تھے جاری ہوئے مگر جلد بند ہو گئے۔

۲۰ - النور	سید باقر حسین طارق	۱۹۲۳ء	ایک مذہبی رسالہ تھا جو مولوی عبدالقدیر صاحب صدیقی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔
۲۱ - صراط المستقیم	ابوالقدر نور محمد	۱۹۲۳ء	ایک مذہبی رسالہ تھا۔
۲۲ - تحفہ	محب اللہ عالی	۱۹۲۳ء	انجمن ارباب اردو کا ماہوار رسالہ تھا عموماً دکن کے ذی علم اصحاب اور خصوصاً طلبہ جامعہ عثمانیہ کے مضامین شائع ہوتے تھے مگر ایک سال کے بعد بند ہوگیا مگر اس کے ٹھوس علمی اور ادبی مضمون حیدرآباد کے علمی ذخیرہ میں اضافہ کا موجب ہوئے ہیں۔
۲۳ - ارتقاء	افضل شریف	۱۹۲۴ء	یہ رسالہ سکندرآباد سے شائع ہونے لگا تھا دو سال تک جاری رہا۔
۲۴ - ترجمان	ابوالمکارم انواراللہ	۱۹۲۴ء	ترقی کے بعد اس کو شائع کرنے کا ارادہ کیا اور ایک پرچہ بھی شائع ہوا مگر اس کے بعد دوسرا پرچہ شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

۲۵ سائیں کی صدا	بھوانی پرشاد	۱۹۲۵ء	ایک مذہبی اور اخلاقی رسالہ تھا تصوف کے اکثر مضامین شائع ہوتے تھے۔
۲۶ - مجلہ عثمانیہ		۱۹۲۶ء	طلبہ جامعہ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی رسالہ ۱۹۲۶ء سے شائع ہونے لگا، ہر سال کے اڈیٹر تبدیل ہوتے ہیں، اساتذہ اور طلبہ موجودہ اور طلبہ قدیم کے مضامین نظم ونثر شائع ہوتے ہیں، کسی زمانہ میں اس کے مضامین بلند پایہ ہوتے ہیں اور کبھی ان کا معیار کمزور ہو جاتا ہے جامعہ عثمانیہ کا آرگن ہونے سے اس رسالہ نے اچھی ترقی کی، بعض خاص نمبر قابلِ قدر شائع ہوئے ہیں جو دنیائے اردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔
۲۷ - تجلی	سید سردار علی	۱۹۲۶ء	یہ رسالہ اپنے قابل اور کہنہ مشق مضمون نگار کے باعث بڑی آب وتاب سے شائع ہوا اس کے ٹھوس علمی اور ادبی مضامین قابلِ قدر

			ہوتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔
۲۸ - آئین دکن	فدا حسین	سنہ ۱۹۲۶ء	ایک قانونی رسالہ تھا، جو اڈیٹر صاحب کے انتقال پر بند ہو گیا۔
۲۹ - ورزش جسمانی	محمد صالح	سنہ ۱۹۲۹ء	یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا جو ورزش جسمانی کے متعلق شائع ہوتا تھا۔
۳۰ - تاریخ	حکیم شمس اللہ قادری	سنہ ۱۹۲۹ء	حکیم صاحب دکن کے مشہور مؤرخ ہیں۔ ان کی ادارت میں یہ سہ ماہی رسالہ شائع ہوتا تھا، کچھ عرصہ کے بعد ادارت آپ کے فرزند سید احمد اللہ قادری انجام دینے لگے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔
۳۱ - مجلہ مکتبہ	عبد القادر سروری	سنہ ۱۹۲۹ء	مکتبہ ابراہیمیہ کی جانب سے یہ رسالہ شائع ہونے لگا تھا، طلبہ جامعہ عثمانیہ اور ملک کے دیگر اصحاب قلم کا تعاون حاصل تھا کئی سال تک،

			جاری رہا۔ اس میں بھی معیاری اور ٹھوس مضمون شائع ہوئے ہیں۔
۳۲۔ سائنس		۱۹۲۹ء	انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہونے لگا۔ اڈیٹر تبدیل ہوتے رہے جب انجمن کا مستقر اورنگ آباد سے دہلی کو منتقل ہوگیا تو رسالہ بھی وہاں سے شائع ہونے لگا تھا۔
۳۳۔ حیدرآباد ٹیچر		۱۹۲۹ء	ارباب تعلیم کی جانب سے شائع ہونے لگا تھا۔
۳۴۔ ارشاد	یوسف الدین صاحب	۱۹۲۹ء	ایک مذہبی اور علمی رسالہ تھا عرصہ تک جاری رہا۔
۳۵۔ نورس		۱۹۲۹ء	طلبہ اورنگ آباد کالج کی جانب سے شائع ہونے لگا۔
۳۶۔ کشافہ		۱۹۲۹ء	اسکاؤٹ کی جانب سے شائع ہونے لگا تھا، ڈاکٹر حمید اللہ نے بھی اس کی ادارت کی ہے۔
۳۷۔ ہمجولی	بیگم ابوبکر خان جونگی	۱۹۲۹ء	خواتین کے لیے یہ رسالہ جاری ہوا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس

رسالہ نے بڑی شہرت حاصل کی، حیدر آباد کے چوٹی کے رسالوں میں اس کو شمار کرنا چاہیئے جس نے اردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔

۳۸۔ سفینۂ نسواں — عماد قمر قریشی — ۱۹۲۹ء — یہ رسالہ بھی خواتین کے لئے جاری ہوا تھا۔ کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔

۳۹۔ خلیق — امام بیگ رونق — ۱۹۲۹ء — ایک نیم مذہبی رسالہ تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔

۴۰۔ ترجمان القرآن — ابوالاعلیٰ مودودی — ۱۹۳۰ء — کئی سال تک نہایت عمدگی اور بلند معیار کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ مودودی صاحب کے منتقل ہو جانے سے بند ہو گیا۔

۴۱۔ حسن کار — محمد اکبر فانی — ۱۹۳۲ء — پندرہ روزہ رسالہ تھا "آرٹ" کی بڑی اچھی خدمت کی کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔

۴۲۔ شہاب — عبدالرزاق بسمل — ۱۹۳۳ء — یہ رسالہ اب تک شائع ہو رہا تھا۔ خواتین کے مضامین بھی خصوصیت سے اس میں شائع ہوتے تھے۔ اوسط

			معیار کا رسالہ تھا۔ اب بند ہو گیا ہے
۴۳۔ الموسٹی	طلبہ سٹی کالج	۱۹۳۳ء	مجلہ عثمانیہ کی طرح یہ طلبہ سٹی کالج کا آرگن ہے۔
۴۴۔ ورنگل کالج میگزین	طلبۂ ورنگل کالج	۳۵ء	طلبہ ورنگل کالج نے اس کو جاری کیا ہے۔
۴۵۔ آئینۂ ادب	مونس احمد	۳۶ء	نواب فصاحت جنگ جلیل کے فرزند نے اس کو جاری کیا تھا کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔
۴۶۔ مجلہ طیلسانین	طلبۂ قدیم جامعہ عثمانیہ	۳۷ء	یہ ایک بلند پایہ سہ ماہی رسالہ تھا جو بعض قابل فرزندان جامعہ کی وجہ سے شائع ہونے لگا تھا، اس کے بلند پایہ معیاری تحقیقی مضامین دنیائے اردو میں بڑی اہمیت سے دیکھے جاتے تھے، جن اصحاب کو اس سے دلچسپی تھی ان کے انجمن سے علیحدہ ہو جانے پر رسالہ بند ہو گیا۔
۴۷۔ سب رس	ڈاکٹر سید محی الدین زور	۳۸ء	ادارہ ادبیات اردو کا ایک ماہوار رسالہ اب تک شائع ہو رہا ہے

			کچھ عرصہ تک اس کے مضامین اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے، اس کے بعد اس میں پستی آ گئی تھی اب پھر رسالہ بتدریج بلند معیار کی طرف لوٹ رہا ہے،
۴۸۔ سب رس اطفال	سعد الدین	سنہ ۱۹۳۸ء	بچوں کے لئے یہ رسالہ شائع ہونے لگا۔ ڈاکٹر زور صاحب اس کی بھی نگرانی کرتے ہیں۔
۴۹۔ ہندوستانی ادب	غلام محمد خان	سنہ ۱۹۳۹ء	اوسط درجہ کا یہ رسالہ ہے۔ جو اس وقت بھی شائع ہو رہا ہے
۵۰۔ روح ترقی	حافظ محمد مظہر	سنہ ۱۹ء	مولوی مظہر صاحب کی ارادت میں یہ رسالہ شائع ہونے لگا اور اپنی مختصر حیات میں بلند پایہ معیاری مضامین شائع کرتا رہا۔

ان پچاس رسالوں کے علاوہ بیسیوں اور بھی رسالے اس دور میں جاری ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گئے۔ ایسے چند رسالے یہ ہیں "فکر نو" جو دار العلوم کالج سے شائع ہونے لگا تھا۔ تہذیب، ساز نو، "شعاعیں"۔ اولڈ بوائے طلبہ علی گڈھ کا رسالہ تھا منظر علی اشہر اس کے اڈیٹر تھے)

اکبر علی:- مولوی اکبر علی صاحب ۱۳۰٦؁ھ میں اورنگ آباد میں تولد ہوئے مدرسہ تعلیم المعلمین سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مڈل کامیاب ہو کر مدرسہ دار العلوم میں شریک ہوئے، اور پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل میں کامیابی حاصل کی، اولاً صدر محاسبی میں ملازم ہوئے، مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کو ترک کر دیا۔

اکبر علی صاحب کو زمانہ تعلیم سے قومی اور علمی کاموں سے دلچسپی رہی، وہ مدرسہ دار العلوم کی انجمن ثمرۃ الادب کے قیام کے بانیوں میں سے ہیں، وصول چندہ کا کام آپ کے متعلق تھا، تعلیم کے بعد ملا عبد القیوم صاحب کے ساتھ ساتھ رہنے کا موقع ملا، ملا صاحب کے علم و فضل اور قومی خدمات کا آپ پر اثر ہوا۔ رسالہ صحیفہ کی اجرائی اسی صحبت کا اثر تھا۔ جنگ بلقان اور طرابلس کے زمانہ میں انجمن ہلال احمر کے کاموں میں آپ کو بہت زیادہ انہماک رہا۔ اور انجمن طلبہ قدیم دار العلوم اور حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب کو مدد دیتے رہے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں حیدر آباد میں باہر کے روزانہ اخباروں کی بڑی مانگ ہونے لگی، اور لوگوں کی دلچسپی اخبار بینی کی طرف زیادہ ہو گئی اور حیدر آباد میں بجز مشیر دکن کے اور کوئی روزانہ اخبار نہیں تھا۔ مولوی اکبر علی نے اس موقع پہ اپنے ماہوار رسالہ صحیفہ کو روزانہ اخبار کی صورت میں بدل دیا۔ اور انہماک کے ساتھ اس کو چلانے لگے، چنانچہ اپنے انتقال تک وہ اخبار صحیفہ شائع کرتے رہے، مولوی اکبر علی ایک خاص پالسی کے تحت کام کرتے تھے، جو بڑی حد تک مذہبی بلکہ تاریک خیالی سمجھی جانے لگی تھی، مگر اس میں شک نہیں برسوں آپ کے اخبار صحیفہ نے ملک اور قوم کی

خدمت کی ہے، اور ملک کے بیدار کرنے میں حصہ لیا ہے۔

مولوی اکبر علی نے ایک عربی ناول کا ترجمہ معجزۂ محبت کے نام سے شائع کیا ہے۔ اور آصف جاہ سابع کے سفرنامہ دہلی کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے اخبار صحیفہ میں آپکے خصوصی مضمون اکثر قابل قدر ہوتے تھے۔ ۱۳۶۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

سید احمد محی الدین صاحب :-

آپ مولوی سید ضیاء الدین صاحب کے فرزند ہیں، ضیاء الدین صاحب کے والد مدراس سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے، احمد محی الدین صاحب کی ولادت ۱۳۰۹ھ میں بمقام ضلع کریم نگر ہوئی، مدرسہ آصفیہ میں ابتدائی تعلیم ہوئی مڈل کی کامیابی پر علی گڈھ روانہ کئے گئے اور وہاں سے میٹرکس اور ایف اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد نظام کالج حیدرآباد میں شریک ہوئے اور بی اے تک تعلیم پائی، کچھ عرصہ تک مہتممی آبکاری کی خدمت کے امیدوار رہ کر کام کرتے رہے مگر پھر ملازمت کے خیال کو بالکل ترک کر دیا، اور صحافت کی لین میں آگئے۔ "رہبر دکن" کے نام سے روزانہ اخبار شائع کرنے لگے، جس نے بڑی ترقی کر لی۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے ساتھ آپ شریک کار رہے، انجمن اتحاد المسلمین سے آپ کو مرتے تک تعلق رہا۔ اور نہایت جوش اور مستعدی سے انجمن کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے رہے،

"رہبر دکن" حیدرآباد کا ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند کے تمام اردو اخباروں میں کثیر اشاعت تھا، آٹھ دس ہزار کی تعداد میں روز شائع ہوتا تھا۔ کئی سال تک رہبر دکن کا

سالنامہ نہایت اہتمام سے آپ شائع کرتے رہے، جو ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے انگریزی سالناموں کے مماثل ہوتا تھا۔ مولوی احمد محی الدین صاحب کے اڈیٹوریل مضمون اکثر بڑے قابل قدر ہوتے تھے، جمہور کی رائے کا آپ کو بڑا خیال رہتا تھا مفاد عامہ کے لئے آپ کا قلم بڑی جولانی ظاہر کرتا تھا، آپ کا اخبار نواب بہادرخان اور اتحاد المسلمین کا آرگن تھا۔ اصلاحات ملک اور حیدرآباد کی ترقی میں اخبار رہبر دکن کا بڑا حصہ ہے۔ اور اس کے لئے مولوی احمد محی الدین صاحب کی خدمات ملک وملت ہر آئنہ لائق ستائش قرار پاتی ہیں۔

۱۳۶۵ھ میں احمد محی الدین صاحب کا جبکہ ان کی ملک کو بیحد ضرورت تھی انتقال ہوگیا۔

قاضی عبدالغفار:۔ قاضی صاحب کا وطن یو۔پی ہے، یونیورسٹی سے ڈگری لے کر عملی دنیا میں مصروف عمل ہوئے، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کا ساتھ رہا، مولانا محمد علی کے ساتھ ان کے اخبار کے سٹاف میں شامل رہے، اڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے، وفد خلافت کے ساتھ لندن گئے، اور وفد کے کاموں کے ساتھ ساتھ "فن اخبار" کے متعلق معلومات کا ذخیرہ لائے۔

کچھ عرصہ کے بعد حیدرآباد آئے، یہاں آپ کا کسی عہدہ پر مامور ہوجانا ممکن تھا مگر قاضی صاحب نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور آزادرہ کر ملک، وطن کی خدمت کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ ۱۳۴۴ف (۱۹۳۵ء) سے روزانہ اخبار "پیام" شائع کرنے لگے۔ اخبار پیام نے یہاں کی صحافت کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کردیا

حق اور صداقت کا پرچار کرنا۔ کانگریس کی پالسی پر عمل کرنا اس کا مقصد تھا۔ صحیح راہ نمائی اور آزادی رائے اس کے نصب العین تھے۔ پیام کی اس پالسی کے باعث یہاں کے کئی اخبار اس کے مخالف ہو گئے۔ اور مخالفت میں جدوجہد شروع کر دی، مگر "پیام" کی پالسی میں کوئی فرق نہیں آیا قاضی صاحب کے قدم استقامت کو لغزش نہیں ہوئی ایک بہت بڑی جماعت پیام کو محبوب رکھتی اور اس کی آواز پر لبیک کہتی رہی۔

سر مرزا اسمٰعیل کی صدارت اعظمی کے دور میں ان کے اصرار پر قاضی صاحب نے دفتر معلومات عامہ کی نظامت قبول کی مگر سر مرزا کے سبکدوش ہونے پر آپ بھی کنارہ کشی اختیار کر کے لکھنؤ چلے گئے۔

تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اردو کی باگ آپ نے سنبھالی ہے اور ہندوستان میں اردو کے بقا اور ترقی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

قاضی صاحب ایک ترقی پسند ادیب ہیں، آپ کے ادبی کارنامے ہر آئینہ قابل قدر اور لائق داد ہیں، شائقین ادب اردو کا شائد ہی کوئی فرد ہو گا جو آپ کی تصانیف سے بے خبر ہو۔ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری آپ کی وہ مشہور کتابیں ہیں جو اردو کے ادبی ذخیرہ میں انمول نگینے شمار ہوتے ہیں۔

بہر حال حیدرآباد کی صحافت میں قاضی صاحب کے کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

نرسنگ راؤ:۔ مسٹر نرسنگ راؤ ضلع محبوب نگر کے وطن دار ہیں، قطب شاہی دور اس کے بعد عالمگیری زمانہ میں آپ کے خاندان کے افراد اس خدمت کو انجام دیتے رہے، چنانچہ عالمگیری اسناد بھی آپ کے خاندان

ہیں موجود ہیں، آصفی عہد میں بھی بدستور وطن داری او   کے فرائض انجام دیتے رہے،

نرسنگ راؤ صاحب ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ دار العلوم میں شریک ہوئے اور فارسی کے امتحانات منشی اور "دبیر" میں کامیابی حاصل کی۔ راقم الحروف کے ساتھ انجمن ثمرۃ الادب کاموں میں حصہ لیا۔ اور بڑی دلچسپی سے علمی اور ادبی خدمت انجام دیتے رہے، جامعہ عثمانیہ کے لئے جو انگریزی تعلیمی جماعتیں قائم ہوئیں ان سے بھی استفادہ کیا۔ مگر اس کے بعد وکالت کا امتحان دے کر وکالت شروع کی کچھ عرصہ کے بعد اس کو اپنی طبیعت کے موافق نہ پاکر صحافت کی لین میں آ گئے چنانچہ اولاً اخبار "رعیت" ہفتہ وار شائع کرنے لگے، رعیت کے مضامین تعلیم یافتہ طبقہ میں پسند کئے جاتے تھے مگر حکومت کی پالسی کے خلاف تھے اس لئے چند سال کے بعد اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد پھر روزانہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔ ملک کو بیدار کرنے اور اضلاع اور دیہات کی رعایا میں تعلیمی شوق کو زیادہ کرنے میں "رعیت" نے بڑا حصہ لیا ہے۔

پولیس ایکشن کے بعد کچھ عرصہ تک ہفتہ وار اخبار کی صورت میں "رعیت" شائع ہو رہا ہے۔ مسٹر نرسنگ راؤ نے وطن اور اہل وطن کی جو خدمت اپنے اخبار کے ذریعہ کی ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

اختر حسین صاحب:۔ آپ کے اجداد دہلی سے آ کر حیدرآباد میں بس گئے تھے، اختر حسین صاحب کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی .... جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی

اور ورنگل کالج میں لکچرار کی حیثیت سے مامور ہوئے،

قاضی عبدالغفار صاحب حیدر آباد سے اخبار پیام شائع کرتے تھے۔ قاضی صاحب جب سر مرزا اسمٰعیل کے زمانہ میں ناظم دفتر اطلاعات پر مامور کئے گئے تو اخبار پیام اختر حسین صاحب نے خرید لیا اور ملازمت ترک کرکے پیام کی ادارت کرنے لگے،

ایک زمانہ تک اخبار پیام کانگرس کا آرگن رہا، مگر اس کے بعد اس نے اپنی پالیسی بدل لی۔ اشتراکیت کی تبلیغ اس اخبار کی پالیسی ہے، ترقی پسند جماعت سے اس کا تعلق ہے، اور اختر حسین صاحب ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں، عرصہ تک اسی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے سیکرٹری رہے، آپ کے سیکرٹری شپ کے زمانہ میں ہر ہفتہ انجمن کے جلسے ہوتے تھے، مضامین اور نظمیں سنائی جاتیں اور ان پر رد و قدح اور تنقید بھی ہوتی تھی۔ اس بحث اور مباحث میں اختر حسین صاحب کا بڑا حصہ ہوتا۔ اختر حسین صاحب معہ خاندان ترقی پسند ہیں چنانچہ ان کی دو بہنیں رضیہ بیگم ایم۔ اے، رابعہ بیگم ایم۔ اے اور آپ کی شریک زندگی ریاست خانم صاحبہ بی۔ اے بھی اچھی ادیب اور ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں،

سید احمد اللہ قادری:۔ آپ حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب کے بڑے فرزند ہیں جن کا تذکرہ گزشتہ دور میں ہو چکا ہے، سید احمد اللہ قادری کی پیدائش ۱۳ ھ میں ہوئی۔

ابتدا میں جامعہ عثمانیہ کے پریس میں ملازم ہوئے پھر ترک ملازمت کرکے اخبار شائع کرنے لگے۔ اخبار "سلطنت" ایک روزانہ اخبار آپ کی ادارت میں شائع

ہوتا ہے۔

سید احمد اللہ صاحب قادری مصنف بھی ہیں کئی ایک کتابیں شائع فرمائی ہیں چنانچہ

چاند سلطانہ؛

آپ کی قابل قدر کتابیں ہیں، فن تاریخ سے آپ کو زیادہ دلچسپی ہے

سید احمد اللہ قادری کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"علی عادل شاہ کے عہد حکومت میں چاند بی بی نے اپنی زندگی کا جو زمانہ بیجاپور میں بسر کیا اس کے واقعات تاریخوں میں نہیں ملتے ہیں، البتہ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی تخت نشینی کے بعد سے چاند بی بی سلطنت بیجاپور کے استحکام و انتظام میں منہمک نظر آتی ہے، اس زمانہ سے اس کا نام بیجاپور کی تاریخوں میں نمایاں ہوا ہے چنانچہ جب سلطان ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا اس وقت اس کی عمر نو سال کی تھی۔ سلطان اس عمر سے سن تمیز کو پہنچنے تک چاند بی بی کے ذریعہ پرورش رہا۔"

انجمنیں

گزشتہ دور میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ کئی علمی انجمنیں بھی اردو کی خدمت بجالائی ہیں، اوران انجمنوں کی وجہ سے اردو زبان اور ادب کو ترقی ہوئی ہے، اس دور میں بھی کئی انجمنیں اسی قسم کی قائم ہوئیں، جن کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ انجمن ترقی اردو:۔ انجمن ترقی اردو اسی دور کے ابتداء میں بدستور قائم رہی اور اس کا مستقر اورنگ آباد رہا۔ انجمن کی جانب سے کتابیں شائع ہوتی رہیں سہ ماہی رسالہ اردو اور علم سائنس کا رسالہ شائع ہوا — اصطلاحات کا کام اور ترتیب لغت کا کام جاری رہا۔

مگر پھر اسی دور میں انجمن ترقی اردو کا مستقر دہلی قرار دیا گیا۔ اور حیدرآباد میں اس کی ایک شاخ قائم رہی، پولیس ایکشن کے بعد انجمن ترقی اردو کا مستقر علی گڑھ قرار دیا گیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب معتمد اور ذاکر حسین صاحب صدر انجمن ہیں۔ حیدرآباد جو شاخ قائم ہے اس کے معتمد صاحب ہیں۔

۲۔ ادارہ ادبیات اُردو:۔ اس دور کی ایک اہم اور قابل قدر انجمن ادارہ ادبیات اردو ہے، جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور ان کے بعض ہم خیال احباب یعنی سید عبدالقادر سروری، عبدالمجید صدیقی وغیرہ نے ۱۹۳۱ء میں قائم کیا، ادارہ کے مختلف شعبے قرار دئے گئے

اضلاع اور دیہات میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں دار المطالعہ کھولے گئے، ادارہ کی جانب سے ایک سو سے زیادہ کتابیں شائع کی گئیں، جو تاریخ، سوانح، ادب، سائنس وغیرہ علوم پر مشتمل ہیں،

اردو کی ترقی کے لئے اردو دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کا سلسلہ شروع کیا گیا سالانہ امتحانات ہوئے اور کامیاب شدہ اصحاب کو اسناد اور تمغے دئے جاتے تھے۔ حیدرآباد کے علاوہ اضلاع میں امتحانات کے سنٹر مقرر ہوتے تھے۔ بلا مبالغہ ہزاروں اصحاب جن میں ہر قوم اور ملت کے ذکور اور اناث اور بچے شامل تھے امتحانات میں شریک اور کامیاب ہوئے۔

انجمن کی جانب سے ایک ماہوار رسالہ "سب رس" اور دوسرا اسی نام سے بچوں کے لئے شائع کرنے کا انتظام کیا گیا، چنانچہ یہ دونوں رسالے بدستور شائع ہو رہے ہیں۔

ادارہ ادبیات نے مخطوطات اور مطبوعات کو جمع کرنے کے لئے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا اور ہر قیمت پر کتابیں خرید کر کے محفوظ کی جانے لگیں، چنانچہ اب تک اردو، فارسی اور عربی کی ہزاروں کتابیں ادارہ کے کتب خانہ میں جمع ہو گئی ہیں اور ان کی ایک مفصل فہرست مغربی طرز پر شائع ہو گئی ہے اور دوسری جلد زیر اشاعت ہے۔

ادارۂ ادبیات میں نہ صرف کتابوں کے جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہے بلکہ نایاب تاریخی اشیاء اور اردو کے مصنفین کے خطوط، قدیم اخبارات اور رسائل بھی جمع اور محفوظ کئے گئے ہیں، اس قسم کا بھی خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔

مرحوم شعراء اور نثر نگاروں کی قبروں کا تحفظ اور ان پر کتبات نصب کر کے بھی اردو کی یاد کو تازہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔

ادارہ کے کئی سالانہ جلسے نہایت شاندار اور اعلیٰ پیمانہ پر کیئے گئے اور ان جلسوں کی صدارت خاندان شاہی کے افراد اور ذی مرتبہ رؤساء نے فرمائی۔

ادارہ نے اپنی مالی استواری کی بنیاد حکومت کی امداد یا عام چندوں کے انتظار اور بھروسے پر نہیں رکھی بلکہ بڑی حد تک اس کو خود مکتفی بنانے کی کوشش کی گئی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی، ادارہ کی کتابیں خاصی فروخت ہوئیں۔

ادارہ ادبیات اردو دو طریقوں سے اردو کی خدمت انجام دیتا رہا ادبی اور تحقیقی، اس نے تعلیم اور تحقیق کا جو کام انجام دیا ہے وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ادارہ کی جانب سے سالانہ روئدادیں شائع ہوتی ہیں جس سے اس کے کام کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے، یہ ادارہ اب بھی موجود ہے۔

۳۔ حیدر آباد اکیڈیمی :۔ ڈاکٹر میر ولی الدین اور پروفیسر عبدالرحمن خاں صاحب نے اس ادارہ کی بنیاد ڈالی، اصحاب علم و فن کی ایک جماعت اس ادارہ کی رکن ہے۔ اکیڈیمی کی جانب سے سالانہ علمی مقالات شائع ہوتے ہیں اور لکچر بھی ہوتے رہے۔ اکیڈیمی کے لکچر اور مقالات دونوں تحقیقی ہوتے تھے، ان کا باہر کی علمی دنیا نے بڑا خیر مقدم کیا۔

۴۔ اردو مجلس :۔ مولوی مرزا فرحت اللہ صاحب مرحوم نے اردو مجلس کے نام سے ایک ادارہ اردو کی خدمت کے لئے قائم فرمایا، اس مجلس کی طرف سے ماہوار کسی علم دوست شخص کے اہتمام میں جلسہ ہوتا

اور ایک علمی مقالہ سنایا جاتا مقالہ کے بعد شعراء اپنا تازہ کلام سنایا کرتے ۔

مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرنے کے بعد مولوی غلام یزدانی صاحب اس مجلس کے معتمد قرار پائے ہیں اور سجاد مرزا صاحب بھی اس کے روح رواں ہیں ۔ خاموشی کے ساتھ اردو کی خدمت میں یہ مجلس مصروف ہے ۔

۵ ۔ انجمن ارباب اردو :۔ نواب محب اللہ خاں صاحب صاحبزادہ نے یہ علمی انجمن اپنے مسکن سرونگر میں قائم کی تھی ، بعض علم دوست اور ذی علم اصحاب نواب صاحب کے شریک کار تھے ، ابو محمد عمر یافعی صاحب اس کے روح رواں تھے ، "تحفہ" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہونے لگا ، اور اپنی ایک سالہ عمر میں اسی رسالہ نے خاصہ ادب فراہم کر دیا ۔

۶ ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین :۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن بھی اسی دور کی یادگار ہے ۔ اولاً عابد علی خاں صاحب اس کے سیکرٹری تھے ، پھر اختر حسین صاحب اس خدمت کو انجام دینے لگے ، انجمن کی جانب سے ہفتہ وار علمی جلسوں کا انتظام کیا گیا تھا جس میں مضمون اور نظمیں سنائی جاتیں اور ان پر تنقید ہوا کرتی تھی ۔

انجمن کے کئی عام جلسے ہوئے جس میں ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین اور شعراء جمع ہوئے ، اور اپنی تقریروں اور تحریکات سے انجمن کی زندگی کا ثبوت دیا ۔

۷ ۔ بزم اقبال :۔ علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی یادگار میں ایک علمی انجمن بزم اقبال کے نام سے قائم ہوئی ۔ اور اس نے اقبال کے

کلام کی نشر و اشاعت کا کام کیا۔ کئی کتابیں اور مقالے اس بزم کی جانب سے شائع ہوئے۔ اسی طرح اردو زبان کی خدمت بھی اسی بزم کی جانب سے ہوتی رہی۔ سالانہ یوم اقبال منایا جانے لگا، جس میں کلام اقبال کی خصوصیات بیان کرنے اور پیام اقبال کو پہونچانے کا فریضہ انجام دیا جاتا رہا۔ بزم اقبال نے بڑی ترقی کر لی تھی۔

۸۔ انجمن طیلسانین عثمانیہ:۔ یہ انجمن عثمانیہ یونیورسٹی کے قدیم طلبہ کی انجمن تھی، اس کے روح رواں میر اکبر علی خاں صاحب پھر مرزا ڈاکٹر محمد غوث صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تھے، ان کے علاوہ کئی اور ممتاز عثمانین اس سے دلچسپی لیتے رہے۔ ایک کتب خانہ فراہم کیا گیا تھا، اور سہ ماہی رسالہ مجلہ طیلسانین کے نام سے شائع ہوتا تھا، مجلہ نے اپنی چند سالہ زندگی میں اردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی، کئی مقالے جو تحقیقی اور ادبی لحاظ سے قابل قدر رہیں شائع کئے۔ "ایم۔ اے" کے طلبہ کے مقالات شائع کرنے کا بھی اس مجلہ نے بیڑا اٹھایا اور چند مقالے شائع کئے۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی دوسری شاخیں جو نمائش مصنوعات ملکی وغیرہ سے متعلق رہیں ان کا تذکرہ یہاں غیر ضروری ہے، کیونکہ اردو کی ترقی کے ضمن میں ان کو متعارف نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ انجمن طلبہ قدیم دار العلوم:۔ یہ انجمن اگرچہ گوشہ گمنامی رہی مگر اس نے مدرسہ دار العلوم کا نود سالہ جشن منا کر اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ جشن کے موقع پر تذکرہ دار العلوم کے

نام سے ایک مقالہ شائع کیا۔ اور ثقافت اسلامی کی نمائش کی۔

۱۰۔ پریم چند سوسائٹی:۔ ترقی پسند مصنفین نے پریم چند سوسائٹی کے نام سے ایک بزم قائم کی ہے، پریم چند کے افسانوں نے جو مقبولیت حاصل کرلی، وہ دنیائے اردو سے مخفی نہیں ہے۔ اکثر اس سوسائٹی کے جلسے ہوتے ہیں اور افسانے وغیرہ سنائے جاتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے سالانہ جلسے بھی کامیابی سے ہوتے ہیں۔

۱۱۔ کالجوں میں نئی بزمیں:۔ حیدرآباد اور اضلاع کے کالجوں میں مختلف بزمیں قائم ہیں، جن میں طلبہ اور طالبات حصہ لیتے ہیں۔ اس قسم کی بزموں سے بھی اردو زبان اور ادب کی ترقی ہوتی ہے۔ ان بزموں سے بین الکالج تقریر اور مباحثوں کے مقابلے بھی ہوتے اور انعامات دئے جاتے ہیں۔ "بزم اردو" کے علاوہ دوسری بزموں مثلاً بزم تاریخ، بزم فلسفہ، بزم معاشیات، وغیرہ میں بھی اردو میں بھی تقریریں ہوتی ہیں، ان سے نہ صرف طلبہ میں اردو کا صحیح مذاق پیدا ہوتا ہے بلکہ اردو کی ترقی میں بھی مدد ملتی ہے۔

۱۲۔ ادارۂ اشاعت علوم وفنون:۔ چند ارباب علم نے جن میں ہندو اصحاب کی تعداد زیادہ ہے، اشاعت علوم فنون، کے نام سے ایک ادارہ قائم فرمایا ہے۔ ادارہ کی جانب سے چھوٹی بڑی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی تعداد تقریباً دو درجن ہے، برج لال صاحب اس ادارہ کے معتمد ہیں، ایک ماہوار رسالہ رہبر تعلیم کی اشاعت بھی ادارہ

کی جانب سے ہوئی تھی۔ اس ادارہ نے اردو کی خدمت گذاری کا ایک اچھا حق ادا کیا اور یہ ثابت کردیا کہ دکن کے ہندو اصحاب بھی اردو سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

۱۴۔ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید:۔ اگرچہ اس ادارہ کا مقصد دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن مجید کی اشاعت ہے مگر اس سلسلہ میں ادارہ کی جانب سے اردو میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ہی شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح اردو میں قرآن شریف کے متعلق بہت کچھ ذخیرہ فراہم ہوگیا۔

خاتمہ:۔ تاریخ ادب اردو کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لانے کا کام تیس سال پہلے طالب علمانہ طریقہ پر آغاز کیا گیا اس تیس سالہ زمانہ میں کوشش و سعی کا جو سلسلہ جاری رہا اس کا نتیجہ اب یہ ایک ضخیم مجلد ہے۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس امر کا صدق دل سے اعتراف ہے کہ تحقیق و کاوش اور تنقید و تبصرہ کا ابھی بہت بڑا میدان طے ہونا ہے، لیکن اب یہ کام ان افراد کے ذمہ ہے جن کے دماغ تازہ تر اور جو خالص علمی کام کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

صفحات گزشتہ سے اس امر کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ دکن میں چھ صدیوں سے اردو ادب کی ترقی کے مدارج طے ہوتے رہے، اور اس کی تخلیق اور ارتقا میں اگر ایک طرف معمولی شہریوں نے اپنی کوشش کا حق ادا کیا ہے تو دوسری طرف خود شاہان وقت نے بھی برابر سعی کی ہے۔ ان کی سرپرستی اور سعی نے ہی اردو کو

اس قابل کیا کہ خود سرزمین دکن میں اس کی پہلی جامعہ کھول لی گئی۔

جامعہ عثمانیہ اردو زبان کی ترقی کی وہ منزل تھی، جہاں یہ کاروان صدیوں کے مراحل سفر طے کرنے کے بعد پہنچا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے عالم وجود میں آجانے کے بعد حیدرآباد پر جو علمی فضا چھائی ہوئی تھی، وہ ادب اردو کے لئے ایک نہایت پرشان و شکوہ مستقبل کی کفیل تھی۔

۱۹۴۸ء کے پولس ایکشن کے بعد یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ خدمت اردو کی قدیم روایات اب پائدار اور استوار رہ سکیں گی، لیکن تاریخ ہمیشہ یہ دکھاتی آئی ہے کہ متوقعہ اور متصلہ نتائج میں بڑا فرق رہتا ہے۔ فقط

ہاشمی